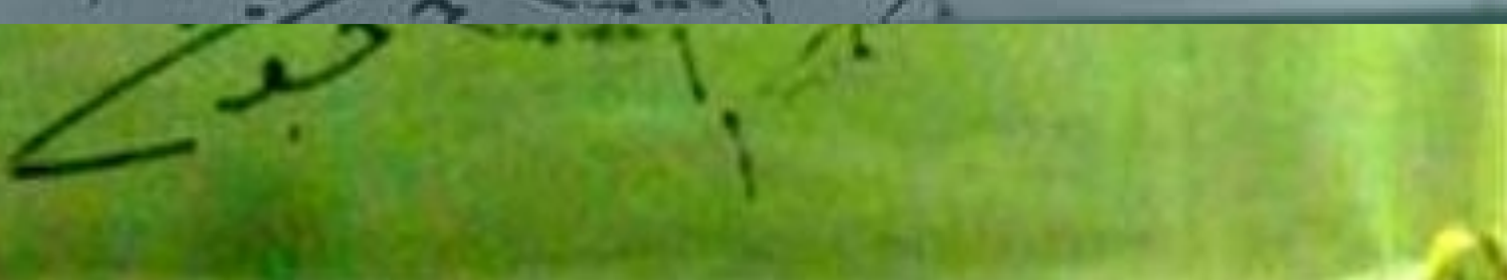
یادوں کی برات

جوش ملیح آبادی

www.bookmaza.com



یادوں کی برات ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی زندگی کا دلکش مرقع ہے۔
اس مرقعے میں آپ کو وادیِ گنگ وجمن اور سرزمینِ دکن کے قدیم وجدید معاشرے کی خوشنما جھلکیاں نظر آئیں گی۔ مصنف نے اپنے ایامِ طفلی و جوانی کے خوشحال طبقوں کی سماجی قدروں پر، ان طبقوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز پر، ان کے عقیدوں اور وہموں پر، ان کے شوق اور مشغلوں پر، ان کے تیوہاروں اور تقریبوں پر، ان کے رہن سہن اور رسوم و رواج پر روزمرہ کے واقعات کے حوالے سے بڑے دلچسپ تبصرے کیے ہیں۔

یادوں کی برات جوش ملیح آبادی کے ستر سال کے تجربوں اور مشاہدوں کی برات ہے۔ اس برات میں فکر ونشاط کی شہنائیاں بجتی ہیں۔ جنون وحکمت کے زمزمے گونجتے ہیں۔ رامش ورنگ کی محفلیں سجتی ہیں۔ لالہ رخوں کے لب و عارض کی دل نشیں حکایتیں بیان ہوتی ہیں۔ یارانِ میکدہ کی محبتوں اور بےمہریوں کے قصے سنائے جاتے ہیں اور اربابِ ثروت وسیاست کی تنگ حوصلگیوں کے تذکرے چھڑتے ہیں۔ شاعرِ امروز وفردا کی یادوں کا یہ قافلہ کبھی کہکشاں سے ہوکر گزرتا ہے اور کبھی بحرِ ظلمات سے، لیکن مسرت کی خیرہ سامانیوں سے اُن کے ایمان ویقین میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ طوفانِ حوادث کی تیرگیوں سے اُن کے پائے صداقت ڈگمگاتے ہیں۔ اُن کا کاروانِ حیات خرد کی مشعل لیے اور انسان دوستی کے رجز پڑھتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

سعید خان

www.pdfbooksfree.pk

saeedk86@gmail.com Cell# 03459404940

انتساب

میں اپنی اس کتاب کو اپنے محسن اور دوست روشن علی بھیم جی کی ذات گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔



چند ابتدائی باتیں

سب سے پہلے یہ باتیں سن لیجئے۔ان سے آگے چل کر،میرے سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی۔

(۱)

میں نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں کامل چھ برس تک،زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا۔اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا،اس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا۔پھر ڈیڑھ پونے دو برس صرف کرکے نوسو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا اور تین ہزار میں اس کی کتابت بھی مکمل کرالی۔مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے،جو صبح کو بیدار ہوکر رات کے خواب کو،اس خوف سے جلدی جلدی الٹا سیدھا لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ اس کے ذہن کی گرفت سے نہ نکل جائے۔

اور خدا خدا کرکے اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جارہا ہے۔

اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا کہ مزید عرق ریزی کرکے پانچواں مسودہ لکھوں اور اسے بھی قلم زد کردوں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔اور ”جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا۔“ کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آرہی ہیں۔اور یہ مصرعہ کہ:نسیم جاگو کمر کو باندھو۔اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے:۔

دل میں گونجتا رہتا ہے۔اور دل میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔کہ تحریر ہی میں خدا کے فضل سے موت آجائے،اور مسودہ نا تمام پڑا رہے۔اس لئے اب جیسا بھی ہے۔یہ چوتھا مسودہ پیش کررہا ہوں۔۔

حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی۔ صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو کہیئے کہ ایک میرے ہم عمر ٹہلتے ہوئے مل گئے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں ایک برساتی نالے کے قریب جو ایک گنبد والا مکان ہے۔ کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر پہنچا دیا۔ اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجیئے گا۔ میں نے فرط شرم سے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔

اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کرنے کی باری آئی تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص یاد نہ آجاتا تو یقین فرمایئے کہ میرا دم نکل جاتا۔

میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی میں کسی واقعے کی کمی بیشی یا تقدم و تاخر نظر آئے تو اسے آپ میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اسے معاف کر دیں۔

(۳)

حالات قلم بند کرنے کی جگر کاویاں

پچھتر برس کی پہاڑسی زندگی کا احاطہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔میں نے بجھے ہوئے حافظے کے تہہ در تہہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر یہ سفر طے کیا ہے۔ان اندھیاروں میں میرے حالات اس قدر الجھے اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ملے کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا واقعہ مقدم ہے اور کون موخر۔اور نسیان کا غول بیابانی مجھے کس طرف لیے جا رہا ہے۔پھونک پھونک کر،قدم رکھتا آگے بڑھتا رہا۔اپنی پیری کو لڑکپن کی سرحدوں تک کھینچ کر لے گیا۔لڑکپن سے ریعان شباب کی جانب باگ موڑی،ریعان شباب سے بھر پور جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر کے کوہ و بیابان طے کرتا ہوا بڑھاپے کی اس ٹیر تک آ گیا۔کیا بتاؤں اس جان کاہ سفر میں کیا کیا جتن کرنا پڑے۔۔میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر اپنے ماں باپ کی آغوش میں بٹھایا۔اپنے گھر کی انگنائی میں کلیلیں کیں،پرانی برساتوں کو جگایا،اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا،اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا اور اپنے موت کی نیند سوئے مور خان شباب کے شانے ہلائے۔اور اپنے دور افتادہ دوستوں کو اشاروں سے قریب بلایا۔اور اپنی جوانی کے شبستانوں میں پہنچا۔جہاں زلفوں کی شمیم اب تک مچل رہی ہے۔اور ٹوٹے پیمانوں اور بجھی شمعوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔اور گیسوؤں سے گری ہوئی افشاں کے ذرے اب تک دمک رہے ہیں۔وہاں پہنچ کر اپنے بچھڑے ہوئے معشوقوں کو اس مسند پر بٹھایا قوس قزح اور کاہکشاں کے رنگ جس کا طواف کیا کرتے تھے۔اور ماضی سے جب اپنے کو ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا۔اور آپ کو سنانے بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں لکھنو میں ایک بوڑھے میرزا صاحب رہتے تھے۔جنہوں نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ایک بار چند نوجوانوں نے اصرار کیا کہ

میرزا صاحب قبلہ کچھ پرانے حالات سنایئے۔انہوں نے سینہ پیٹ کر کہا لڑکو مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی۔تمہاری تھوڑی دیر کی دل چسپی ہو جائے گی اور میں پہروں کے لئے بے کار ہو کر رہ جاؤں گا۔لیکن جب ان نوجوانوں نے ان کے قدم پکڑ لیے تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔اور حالات سناتے سناتے تھوڑی دیر میں ان کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رندھ گیا۔ہچکیاں لے لے کر رونے لگے''اور ہائے جان عالم کہہ کر بے ہوش ہو گئے''۔سو بندہ پرور اپنا حال سنا کر میں بھی اس طرح ہچکیاں لے کر رو رہا ہوں۔ہائے ماضی کے ڈنک،

اپنے کبھی کے رنگ محل میں جو ہم گئے
آنسو ٹپک پڑے در و دیوار دیکھ کر

(۴)

خودکشائی

میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں،شعر گوئی، عشق بازی،علم طلبی اور انسان دوستی۔۔ان سب کو سلسلہ وار دیکھ لیجیئے۔تا کہ آپ سمجھ لیں کہ میں کیا ہوں؟

ا۔شعر گوئی

میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی، بلکہ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما، میں شاعری کے پیچھے کبھی نہیں دوڑا بلکہ شاعری نے خود میرا تعاقب کیا۔اور نو برس کی عمر میں ہی مجھ کو پکڑ لیا۔اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں۔اور اگر وہ کوئی بری چیز ہے تو خدا کی قسم میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں۔

بار ہا گفتم و بار دیگر می گویم
کہ من دل شدہ،ایں راہ نہ خود می پویم
در پس آیئنہ طوطی صفت داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت،بگو ،می گویم

شاعری میری حاکم ہے۔میں محکوم ہوں۔وہ جابر ہے میں مجبور،وہ قاہر ہے میں مقہور وہ آمر ہے اور میں مامور۔شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک کاص دینی مصلحت کی بنا پر جس کی شرح کا یہاں موقع نہیں،یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا اطلاق ہوگا جو بالقصد کہا گیا ہو۔۔اگر یہ کلیہ تسلیم کرلیا جائے تو میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرعٔ بھی بالقصد''موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔اس لئے آپ کو اختیار کامل حاصل ہے کہ میرے تمام کلام کو شاعری سے کلیتہً خارج فرما کر میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرمادیں۔میں خوش،میرا خدا خوش۔

آپ نے مجھے شاعر ہونے کا انعام ہی کب دیا تھا کہ اب مجھے نا شاعر تسلیم فرما کر ،اس انعام سے محروم فرما دیں گے۔اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سن لیجیئے۔کہ شاعری وہ بد بلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو۔اس لئے باورچی ٹولے کا ہر لونڈا،اپنے کو نعمت خان عالی سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

جھوٹ کیوں بولوں میرے گوش مبارک میں بھی شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس و اعلیٰ اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعراء ہیں۔۔۔لیکن قوت وحیات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے۔اور وہ مجھ سے نہایت سنجیدگی اور دیانت سے کہتی ہے کہ خاں صاحب بہادر ادائے شاعری کے فریب میں نہ آجایئے۔اور وہ جو کچھ کان میں پھونک رہی ہے۔اس سے پھول نہ جایئے۔ہاں بے شک یہ ہوسکتا ہے کہ آپ شاعر یا بہت بڑے شاعر ہوں۔لیکن اس طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ معمولی شاعر،برے شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں۔اس لئے دانائی یہی ہے کہ آپ ابھی اپنے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

ذہن انسانی میں عمل ارتقابرابر جاری ہے۔اور آپ کی موت کے سو ڈیڑھ سو برس بعد بھی نقادان ادب کا ذہن اس سطح پر آجائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔اس لئے سر دست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گومگو میں رہیں۔عقل کا مشورہ باون تولے پاؤ رتی کا ہے۔اس کی معقولیت میں شک کرنا حماقت ہے۔لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہوا ہوں،ایک طرف کھوکھلا انائے شعرانہ ہے،ایک طرف ٹھوس عقل سلیم۔جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو اکڑ کر باون گز کا ہو جاتا ہوں اور جب عقل کی جانب سے ڈانٹ پڑتی ہے تو سکڑ کر بالشتیا بن جاتا ہوں۔دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے۔

۶۔عشق بازی

ہوش آتے ہی اچھی صورتیں میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں۔اور یہ شعر سب سے زیادہ مجھ پر صادق آتا ہے کہ،

ہوئے جوان،تو مرنے لگے حسینوں پر

ہمیں تو موت،ہی آئی شباب کے بدلے

یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا بہت بڑا فریب ہے۔جو اس لئے دیا جاتا ہے کہ انسان،افزائش نسل کے توسط سے موت کے مقابلے میں حیات پیدا کرتا رہے۔اپنے وجود میں کمی اور آبادی کے تن و توش میں اضافہ کرے۔اپنی جوانی گھالے۔اور فطرت کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھ کر پالے۔اپنا جو ہر گھٹائے دنیا کی رونق بڑھائے،اور جب تک جوان رہے۔

مرا مہر سیہ چشماں،ز سر بیروں نہ خواہد شد

قضائے آسمانست ایں و دیگر گوں نہ خواہد شد

کے نعرے لگاتا رہے اور پھر مرتے دم تک شیرہ ٹپکتی ہوئی جلیبی کی طرح پڑا رہے۔ لیکن یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ کل دور عشق میں روتا تھا اور اب عہد عقل

میں اپنے پر ہنستا ہوں۔لیکن اب کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، چالاک فطرت دھوکا دے کر مسکرا رہی ہے۔اور میں ایک فریب خوردہ انسان کی مانند جھینپا ہوا بیٹھا ہوں:۔

پر جھڑ گئے، دم گر گئی، پھرتے ہیں لنڈورے

لیکن ماہ رخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہو گی کہ اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ان کے عشق کے بغیر میں آدمی نہیں بن سکتا تھا۔میرا تمام کلام اور بالخصوص شاعری کی کج کلاہی انہیں متوالیوں اور مدھ مانیوں کی جوتیوں کا تصدق ہے۔ اگر ان کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے، گداختگی نہ پیدا کر دیتے تو خدا کی قسم مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد بنا رہتا۔

میں نے کوئے بتاں میں جس قدر بھی اپنی صحت، جوانی، دولت اور زندگانی مٹھیاں بھر بھر کر لٹائی ہے۔اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کر چکا ہوں۔اور مکھڑوں کے خدوخال چن چن کر میں نے اپنے گردوپیش اس قدر عظیم سرمایا جمع کر لیا ہے۔جسے آج تک گھر بیٹھے کھا رہا ہوں۔اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

رب شباب کی قسم آج بھی جب کبھی کسی نوکیلے مکھڑے کو دیکھ لیتا ہوں، وہ مکھڑا انی بن کر کچھ سے میرے سینے میں چبھ جاتا ہے۔

جانتا ہوں کہ بدتوفیق صالحین میری بات سن کر منہ بنالیں گے۔لیکن میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔لیکن بحمداللہ میرا نامہ اعمال ابھی تک سیاہ ہے۔اور آج بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ:

گرچہ پیرم تو چناں تنگ در آغوشم گیر

کہ سحر گہ، زکنار تو، جواں برخیزم

۳۔علم طلبی عشق کی طرح، مجھ کو حصول علم کو چسکا بھی لڑکپن سے ہی تھا۔میرے

www.pdfbooksfree.pk

باپ چاہتے تھے کہ مجھ کو گھر کے مکتب میں ہی پڑھائیں اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ لیکن میں نے اتنا مہنا مت مچایا کہ وہ مجھ کو باہر بھیج کر پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی تو دوسرے رئیس زادوں کی طرح جاہل رہ جاتا۔ میں بچپن میں کوئی کھیل نہیں کھیلا۔ اور ہوش آتے ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جوانی کی اندھیری برساتوں میں بھی ہر چند میری جھنجھاتی راتیں، سارنگیوں کی روں روں، مجیروں کی کھن کھن طبلوں کی ٹکوروں اور گھنی زلفوں کی چھاؤں میں پینگ لیا کرتی تھی۔ لیکن میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعروں کی تخلیق اور علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔ اور جب دن کے وقت میرے من چلے دوست راہش و رنگ کی دعوت دیتے تھے تو میں ان سے کہا کرتا تھا کہ یاروں کا تو یہ اٹل اصول ہے کہ دن کو سولجر (سپاہی) بنے رہو۔ اور رات کو لوفر (اوباش)۔

میرے دل میں، جوانی آتے ہی، دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تو' آگے چل کر گم راہ ہو جائے گا۔'' اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا' اور میں ''گم راہ'' ہو گیا اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار)۔

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر کی ابتدا ہوئی تھی۔ تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ میں کیا ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے انہیں کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے بچوں کا دل موہ کر ان سے پوچھتے ہیں ننھے بھلا بتاؤ تو ہم کیا ہیں۔

جب سن آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا پورے نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی۔ اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں۔ ذات و صفات کے تمام

مسائل کو الٹوں پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، پھٹکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں، بلواؤں، سنوں اور دیکھوں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو بار بار یہ سوال پیدا دل کو برمانے لگتا تھا کہ ارے یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی؟ یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے یا کسی اندھی توانائی کی فقط اچھل کود؟ اور یہ سب آخر ہے کیوں اس کی پشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں؟ اور اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارہ مرطوب اس قدر رپائے مال و معتوب کیوں ہے؟

میں نے ان مسائل پر غور کیا بار بار غور کیا، دم گھٹنے کی حد تک غور کیا...... اس کوچے میں برسوں پاپڑ بیلے کتابوں پر کتابیں پڑھیں ہندو مسلم یہودی، زرتشتی، بدھی، جینی اور عیسائی علماء کے سامنے برسوں دیوزہ گروں کے مانند کاسہ گدائی بڑھایا، علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑگڑا گڑگڑا کر، دامن پھیلایا لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد مدعیان معرفت یعنی صوفیا و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے ان کی جوتیاں سیدھی کیں لیکن چند اشراقی اشاروں کے سوا کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اور وہ اشارے بھی کیا سارے کے سارے وجدانی فریب۔

اس طرح عمر گزرتی اور جوانی ڈھلتی گئی اور آخر کار پیری آ گئی۔ پیری آتے ہی سر کے بال گر گئے اور کھوپڑی میں آگاہی کا اکھوا پھوٹ آیا ناتوانی نے توانائی پیدا کر دی، اور بالآخر میں نے علم کے قلعے کو فتح کر لیا۔ آپ سمجھے کیوں کر؟ یعنی مجھے اس بات کا پورا پورا علم حاصل ہو گیا کہ میں جاہل نرا کا جاہل اور بے پناہ جاہل ہوں۔

بندہ نواز ارتقاء کی اس ابتدائی طفلانہ و تاریک منزل میں ایک نیم وحشی انسان کو اپنے جہل کا پتا چل جانا ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

سن ہو گئے کان تو سماعت پائی
آنکھیں پتھرائیں تو بصارت پائی
جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم
تب ' دولت عرفان جہالت پائی

گواہ رہنا اے زمین و آسمان کہ میں نے علم کو ڈھونڈا لیکن پایا نہیں میں جاہل پیدا ہوا تھا۔ اور جاہل ہی مروں گا۔ تجھ پر ہزار افسوس اے ''خلیفہ رحمٰن'' اے ظلوم جہول انسان!!

۴۔ انسان دوستی...... (الف) ہاں انسان کرہ ارض کی جان...... انسان دشمنی' عظیم عدوان......حب انسانی' عین ایمان' انسان کا چہرہ' گیتا اور قرآن۔ اور لا سلطان الا الانسان!

اے مجھے ''کافر باللہ'' کہنے والو تم کو معلوم نہیں کہ کافر مومن بالانسان ہے۔ خود تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت' سے یہ بعید نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر دے' لیکن حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں' خدا نے اپنا اقتدار بندوں کو بخش دیا ہے۔ اور جب تک مظلوم' اپنے ظالم کو معاف نہیں کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ کافر باللہ کے لیے تو۔

شنیدم کہ درد وز امید و بیم
بداں را ' بہ نیکاں بخشد کریم

کا سہارا موجود ہے مگر کافر بالانسان کے واسطے' جب تک کہ انسان اس کو معاف نہ کر دے' بخشش کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ دوستو' انسان دوستی' کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس کوچے میں ہر قدم پر خون تھوکنا پڑتا ہے۔

رہ رو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

www.pdfbooksfree.pk

تمہاری نیت مجاہدات نفس کے سامنے حور وقصور اور کوثر وطہور کے پرے جمے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے جذبہ حب انسانی کی گلی حوران مقصورات کے خیموں کی طرف نہیں مڑتی 'براہ راست دار کی طرف لے جاتی ہے۔

جی ہاں میں خود اپنے تجربوں کی بنا پر اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ عشق شہوانی[1] بھی ایک ایسی بلائے بد ہے کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے اور کہتا پھرتا ہے۔

وہ نہیں بھولتا جدھر جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں

اور ایک عشق کی ماری نعرہ زن ہوتی ہے۔

جو سکھی ہیں جانتی کہ پیت کرے دکھ ہوئے[2]
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

لیکن عشق شہوانی اور حب انسانی کے شدائد کو جب تولا جائے تو عشق کا پلا آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور حب کا پلہ زمین سے جنبش نہیں کرتا۔ عشق ایک آنی تشنج ہے جسم کا۔ اور حب ایک ابدی اضطراب ہے روح کا...... عشق کا تعلق ہوتا ہے صرف ایک ذات یعنی محبوب سے اور حب کا تعلق ہوتا ہے۔

---

[1] شہوانی کے علاوہ عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور جسے "پاک عشق" کہا جاتا ہے وہ بھی جذبہ شہوانی کا ایک ایسا شدید تموج ہوتا ہے کہ آدمی سن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔[2] اے سکھی اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ عشق کرنے سے دکھ ہوتا ہے تو میں سارے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتی کہ کوئی عشق نہ کرے (میرا بائی)۔

روئے زمین کے اربوں انسانوں سے...... عاشق اپنی جنسی تسکین چاہتا ہے۔ اور محبّ انسان' تمام دنیا کے افراد کی تسکین کا طلب گار بھی ہوتا ہے۔ عاشق پر جب معشوق مہربان ہو جاتا ہے تو اس کے دل کی آگ بجھ جاتی ہے لیکن محبّ انسانیت کو روزگار مہربان ہو کر جب کسی نعمت خاص سے نوازتا ہے تو وہ چاروں طرف گھبرا کر

دیکھتا ہے کہ دوسروں تک بھی وہ نعمت پہنچی کہ نہیں اور جب اوروں کو اس سے محروم دیکھتا ہے تو عین محل شکر میں وہ شکایت کرتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ

داورا نہ می زیبد ' بال و پر بمن تنہا

اور خوب کان کھول کر یہ بھی سن لیجیے کہ عشق کا عقاب اڑتا ہے قیس و فرہاد کے سروں پر' اور حب انسانی کا قرآن نازل ہوتا ہے رحمتہ اللعالمین کے دھڑ کتے ہوئے دل پر ببیں تفاوت رہ' از کجاست تا بکجا۔ پہلے میں عشق کے موذی مرض میں گرفتار تھا اب حب انسانی کے مہلک مرض کا صید زبوں ہوں کل محبوب کی مفارقت میں تکیے بھگویا کرتا تھا۔ اب انسان کے مصائب پر رویا کرتا ہوں۔

ہرچند مستقبل انسانی بے حد روشن ہے۔ اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی۔ یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا' نہ عدالتیں ہی رہیں گی۔ نہ فوجیں نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے پیری' مستقل جوانی بن جائے گی۔ اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا شمس و قمر ہمارے پاؤں چومیں گے۔ ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے۔ اور قوائے کائنات خدمت گاروں کے مانند ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے لیکن اس میں لگیں گے بھی لاکھوں سال جب کہ میری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی۔

اس تصور سے جو ایک دن ایک ٹھوس حقیقت بننے والا ہے۔ ہرچند میرے دل کو بری تسکین ہوتی ہے پھر بھی یہ خلش رہ جاتی ہے کہ:

م نے مانا کہ کل وہ آئیں گے

عقل حیراں ہے' آج کیا کیجیے

آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے' اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے' اور مجھ نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے غور فرمایئے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔

جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں۔ میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں' جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں' اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ہر چند امریکہ ظالم ہے' اور ویٹ نام مظلوم' لیکن ویٹ نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں امریکہ کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بد بخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ' ہمارے جگر میں ہے

(ب) اس دردمندی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے۔

یہ ایک ناقابل ابطال حقیقت ہے کہ انفس و آفاق یعنی تمام ذی حیات و غیر ذی حیات واحد العناصر' واحد الخمیر ' واحد القوام' واحد العلت' واحد النسل' اور واحد الاصل ہیں۔ اور اس طرح واحد النسل ہیں جس طرح پلاسٹک کے کھلونے اور پلاسٹک کے پھول ہر چند اسماء اشکال اور اجسام کے اعتبار سے تمام کھلونے اور تمام پھول' ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف و متضاد نظر آتے ہیں لیکن اگر انہیں پگھلا دیں گے تو پلاسٹک کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی قیامت تو یہ ہے کہ جاہل ہوس پرور اور لئیم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے

نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

فوجی درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو' ثقافت' لسان' اوطان اور ادیان میں الجھا کر چھوٹی چھوٹی برسر جنگ ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان پر فرماں روائی کی جائے۔

انہوں نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ بین الاقوام کی ترکیب تراشی ہے اور نوع انسانی کو جو شرق سے لے کر مغرب تک صرف ایک قوم ہے۔ زبانوں' وطنوں' دینوں اور رنگوں کی آویزشوں میں مبتلا کر کے پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان ظالم مسخروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

لفظ اقوام میں کوئی جان نہیں
اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مشرک یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط
جو مشرک انساں ہے وہ انسان نہیں

لطف تو یہ ہے کہ وہ بانیان فساد' خود تو سلامتی کے گوشوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ اور روٹی کی خاطر اپنے بھائیوں کی جانیں لینے والی فوجوں کو للکار دیا ہے کہ وہ خون کی ہولی کھیلتے پھریں۔

منہ پیٹنے کی بات تو یہ ہے کہ ان روٹی کے مارے ہوئے اور حب وطن کے فریب کھائے ہوئے سپاہیوں کو جن کی کہنیوں سے ان کے بھائیوں کا تازہ خون ٹپک رہا ہے فیلڈ مارشل قومی ہیرو اور غازی اعظم جیسے خطابات مرحمت فرمائے جا رہے ہیں۔ جہالت کی لے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں آ چکے ہیں کہ ہم پاکستانی' ہندوستانی' افغانستانی' ترکستانی اور انگلستانی ہیں' اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ میں ہندو ہوں' مسلمان ہوں' عیسائی ہوں زرتشتی

ہوں' یہودی ہوں لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور اجاگر ہی نہیں ہوتا کہ میں انسان ہوں سب سے پہلے انسان ہوں اور اس کے بعد کچھ اور۔

پروپیگنڈے کی طاقت تو دیکھیے کہ دین و ملک کے چکر میں آ کر ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں' اور یہ دیکھ کر بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی میں سے' اعداد کا یہ جرار لشکر کہاں سے نکل پڑا' عینیت کے اس چشمہ شیریں میں یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا' اور اس کعبہ وحدت میں' یہ خنزیر شرک کیوں کر داخل ہو گیا...... بسوخت عقل زحیرت' کہ ایں چہ بوالعجبی!

(ج) اب دیکھیے تیسرا رخ...... سرمایہ داری کا نظام' ایک زبردست تن و توش کی جونک کے مانند' عامۃ الناس کی گردن میں منہ گاڑے بڑے مزے لے لے کر ان کا خون چوس رہا ہے۔

اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مروت لہجے سے نرمی خیالات سے ہمدردی اور دلوں کی دھڑکنیں چھین لی ہیں' اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

یقین فرمایئے کہ جب تک آدمی حجاج' ہلاکو' چنگیز' نادر' نیرو' ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا سرمایہ دار صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔

اس فریب میں نہ آ جایئے گا کہ مزدوروں' کسانوں' مفلسوں اور اس قبیل کے کروڑوں انسانوں پر جو بیت رہی ہے اس سے وہ بےخبر ہیں۔ جی نہیں ان کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے' اور یہ بھی سن لیجیے کہ وہ اس علم سے' ترس کھانے کے بدلے' الٹے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب ان کے دسترخوان پر مرغ و ماہی کی قابیں چنی جاتی ہیں تو وہ اس تصور کی چٹنی چاٹ چاٹ کر اپنے کھانوں کی لذت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں آدمی روکھے سوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے اور راتوں کو جب وہ اپنے گرم ریشمی لحافوں میں دبک کر یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے' فٹ پاتھوں پر سردی

www.pdfbooksfree.pk

سے اکڑ رہے ہوں گے تو ان کے لحافوں کی گرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ ناداروں کو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں تو ان کے حریر و پرنیاں کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے لیکن روزگار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس سے ان کی نیندیں بھی حرام ہو کر رہ گئی ہیں وہ اپنے بینکوں میں رکھے ہوئے سکوں اور اپنے کارخانوں کی چلتی ہوئی مشینوں کے ناقابل برداشت وزن کے نیچے دبے پڑے ہوتے ہیں بری طرح کراہ رہے ہیں۔ ایک بار دہلی کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار و صنعت کار نے اپنے چاندی کے سے سفید بالوں کو نوچ نوچ کر مجھ سے کہا تھا جوش صاحب آپ کوئی (شاعر) نہیں کویوں کے سر پر بھگوان کا ہاتھ ہوتا ہے آپ میرے مر جانے کی دعا کریں' اور جب میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ اس ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس آرزو میں گھلے جا رہے ہیں کہ آپ کی دولت کا دسواں حصہ ہی ان کو مل جائے تو انہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو میری بپتا نہیں معلوم' نہیں تو وہ میرا سا بننے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھتے۔ اور جب میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کی بپتا کیا ہے تو آنکھوں میں آنسو بھر کے انہوں نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں' مگر من کو چین نہیں ہر روز جب صبح کو جاگتا ہوں تو میرا دل گڑگڑا گڑگڑا کر مجھ سے کہتا ہے کہ لالہ جی آج دو پیسے اور کما لو......!!

دیکھا آپ نے اس فراوانی دولت کا انجام۔ اور افراط زر کی ناداری؟

زر دار کا خناس نہیں جاتا ہے
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا ہے
ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی
تا مرگ وہ افلاس نہیں جاتا ہے

ہاں بہت جلد وہ ساعت آنے والی ہے کہ سوشلزم کے تند جھونکے ان کے چراغوں

کو بجھا کر آوازہ بلند کریں گے:

دیدی؟ کہ خون ناحق پروانہ ...... شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را ' سحر کند!

(د) اب چوتھا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے......اور وہ ہے موت کا یقین کامل۔

چو ' پردہ دار' بشمشیری زند ہمہ را
کسے مقیم حریم حرم نہ خواہد ماند

گدا سے لے کر شاہ تک اور خرابات سے لے کا خانقاہ تک دنیا کے ہر سر اور ہر در پر موت کا خونی گدھ منڈلا رہا ہے۔ اور مہر کوچے سے رام رام ست ہے اور انا للہ وانا الیہ راجعون کی صدائیں چلی آ رہی ہیں۔ انسان بنفس مطمینہ کا طلب گار ہے' تسکین خاطر پر جان دیتا ہے۔ لیکن اس کو یہ دولت کہیں بھی نہیں ملتی اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ:

بقدر ہر سکوں' راحت بود' بنگر مراتب را
دویدن' رفتن' استادن' نشستن' خفتن و مردن

تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ اور نبضیں ڈوبنے کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اور جب اس کے کانوں میں یہ آواز بھی گونج اٹھتی ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

تو وہ زندہ در گور ہو جاتا ہے۔

ایسی زندگی کس کام کی جس کے ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے میں بھی یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ ابھی ہم کو موت نہیں آئے گی۔

موت ایسی حیات سے اچھی۔

(س) اور ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ......اللہ اللہ یہ نو جوان بیواؤں کی ٹوٹتی چوڑیاں یتیم بچوں کی یہ کچھ ڈھونڈنے والی آنکھیں' نادار بیماروں کی یہ ابھری

ہوئی پسلیاں' دولھاؤں کے زانوں پر یہ چوتھی کہ دلھنوں کی آخری ہچکیاں ...... براتوں کی یہ بھری ہوئی ڈوبتی کشتیاں عاشقوں کے سامنے معشوقوں کی یہ الٹتی پتلیاں ...... ماؤں کے آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے ......اور بوڑھے باپوں کے کاندھوں پر یہ جوانا مرگ بیٹوں کے مچاتے جنازے ......۔

اور اس کے دوش بدوش یہ جراثیم یہ بچھو یہ سانپ' یہ بستیوں کو بھسم کر دینے والی آتش زدگیاں یہ قحط' یہ کال' یہ سیلاب' یہ طوفان' یہ وبائیں۔ یہ زمہریری وجہنمی ہوائیں۔ یہ آتش فشاں پہاڑ اور شہروں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینے والے یہ بھیانک زلزلے' الامان والحفیظ......فطری طور پر' دل میں یہ سوال بار بار مچلتا ہے کہ باوا ان آفات ارضی و ساوی کی پشت پر کوئی معقول برہان اور کوئی حکیم نہ عادل اور رحمٰن کارفرما ہے کہ نہیں؟ ارے اس زمین اور اس آسمان پر ہے کوئی جو دکھیا انسان قدرت کے سوتیلے بیٹے' انسان کو اپنی پناہ میں لے لے؟ یہ گڑگڑاتی آواز' لاکھوں برس سے اس بوڑھے آسمان کی بوسیدہ ڈاٹ کے نیچے گونج رہی ہے لیکن ایک ابدی سناٹا چھایا ہوا ہے کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آتی۔

میر درد نے تڑپ کر باد صبا سے کہا تھا۔

یہی احوال درد کا کہیو
گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملیے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں لیکن کسی مددگار کی چاپ سنائی نہیں دے رہی ہے قدموں کی چاپ تو بڑی چیز ہے کوئی آواز پر آواز بھی نہیں دے رہا ہوں اے اتھاہ سناٹے ہاں تو ضرور کچھ بول رہا ہے اور میں سن رہا ہوں لیکن اسے زبان تک لانے کی جرات نہیں کر سکتا......احمقانہ شہادت پر میں تیار نہیں۔

اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ چیخ رہا ہوں کہ

ایں میر سید کہ ہر غالب ناکام چہ رفت
می نواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

ارے میں نامراد اپنا دردِ دل کس سے کہوں؟

داوری دارم بسے ، یارب کرا داور کنم!

☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

بنام قوت و حیات!

میرا حادثۂ ولادت

میں اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ زندان کون و فساد میں اوبھنے کے واسطے کب لایا گیا ہوں اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا ۔اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا

البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے سنہ ۱۸۹۶ء تھا یا سنہ ۱۸۹۸ء یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں سنہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا..... (دو برس اور بوڑھا ہو گیا ہو جانے دیجیے' جوتی کی نوک سے)۔

البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار[1] بجے پیدا ہوا تھا۔

میرا وطن

آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی ہو پی ہو سے چہکتا ملیح آباد ہندوستان کی تہذیبی جنت یعنی لکھنو سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔

---

[1] شاید یہی علت ہو میری سحر پرستی کی۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے' جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی[1] اور دوسرے گوشے میں قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آبادہیں۔

ہندوستان میں آ کر بھی اور جوار لکھنو میں رہنے کے باوصف ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین' ایک مدت دراز

تک تلوار چلتی رہی۔ اور فرنگیوں نے آ کر جب تلوار چھین لی' تو لٹھ پونگا ہونے لگا۔

ہندوستان آ کر اور خصوصاً لکھنو کی تہذیب سے متاثر ہو کر ہم لوگ ایک عجیب گنگا جمنی قوم بن گئے۔

ہمارے خون میں درہ خیبر کی شعلہ بار دوپہر مچلتی رہی اور ہمارے سروں پر اودھ کی سلونی شام گل باریاں کرنے لگی...... اور ملیح آباد لکھنو کی شائستگی و تہذیب اور قبائلی علاقوں کی بربریت ووحشت کا ایک عجیب نقطہ اتصال بن گیا۔

ہمارے یہاں ایک طرف تو لکھنو کی دپلی ٹوپیاں ململ اور ریشم کے کڑھے ہوتے شربتی انگرکھے' سلمیٰ ستاری کی رضائیاں مخمل کے لحاف چوک کا عطر قنوج کا تیل پھلیل اور مشروئے کے پائجامے راہ پا گئے۔ اور پتنگ بازیاں مرغ بازیاں بتیر بازیاں اور ان کی پالیاں ہونے لگیں......اور ہم نے اسلام علیکم کے بجائے آداب تسلیمات کورنش' اور بندگی کو اختیار کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بہت بازیاں اور مشاعرے بھی ہونے لگے۔ اور صحت زبان کے تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں......

اور دوسری طرف اللہ دے اور بندہ لے[1] قسم کے ہنگامے بھی جارے رہے اور آئے دن فوج داریاں اور خوں خواریاں بھی برابر ہوتی رہیں۔

---

[1] ہم لوگ آفریدی آدم خیل اور آدم خیلوں کی ایک شاخ ''علی خیل'' سے تعلق رکھتے ہیں۔

مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آ جاتی تھی اور وہ کسی کے دروازے کے سامنے تھوک دیتا تھا تو صاحب خانہ صاحب لٹھ لے کر گلی میں آ جاتے تھے کہ خان صاحب آپ ہمارے دروازے پر تھوک رہے ہیں اور تھوکنے والے خان صاحب اکڑ کر یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھوکا تھا تو اب تھوک رہے ہیں آخ تھو آخ تھو اور دونوں کے درمیان بڑے زور شور سے لٹھ چلنے لگتا۔ اور اگر کسی کی شادی بیاہ میں حریف گروہ آمنے سامنے کھٹولوں پر بیٹھے حقہ پیتے تھے۔ تو ان میں سے جب ایک

گروہ کا آدمی کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا تو دوسرے گروہ کے تمام آدمی اس کو اعلان جنگ سمجھ کر اسے بھی کہیں زیادہ زور سے کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک کراک کڑاک کی آوازیں نکال کر اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں سے آنچیں نکل آتی تھیں اور اس ضدم ضدا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ پل بھر میں فریقین کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے۔

لکھنو کے کمشنر یا گورنر نے ملیح آباد کے باب میں یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد درہ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے جس کا ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا ہے۔

میرے خاندان کے انحطاط کے بعد ملیح آباد کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے تینوں ڈیوڑھیوں[2] میں سے اب ایک ڈیوڑھی بھی باقی نہیں رہی ہے......اور ملیح آبادی کی دھاک دم توڑ چکی ہے۔

پھر بھی میرے ملیح آباد کے تیور ابھی تک کلیتہً بجھنے نہیں پا رہے ہیں۔ ہر چند زمینداری اور تعلقہ داری کی تنسیخ فضا پر ایک عبرت ناک سناٹے کی طرح چھائی ہوئی ہے۔مگر لوگوں میں[*] کھٹولی کا دم خم اور سپہ گری کا طنطنہ آج تک باقی ہے۔

اب ملیح آباد کی حالت لکھنو کے ان میر صاحب کی سی ہے جو شباب میں اس قدر خوبرو اور گھبرو تھے کہ بڑی بڑی نک چڑھی پری جمالوں تک کے غرور جمال کی پنڈلیاں ان کے روبرو کانپنے لگتی تھیں۔

---

[1] اونچی اور چوڑی چارپائی [2] میرے باپ اور میرے دونوں چچاؤں کی ڈیوڑھیاں۔

لیکن شباب ڈھلنے کے بعد جب وہ کسی شہر کی سرائے میں جا کر ٹھہرے اور برآمدے میں بیٹھ کر حقہ پینے لگے اور بھٹیاری کی لڑکیاں ان کے حقہ پینے کے انداز ار ہر کش پر ان کے گالوں کے نشیب و فراز پر ہنسنے لگیں تو انہوں نے جھلا کر کہا کہ ہنس لو

کالی کلوٹی چھوکریو! جی بھر کے ہنس لو اگر جوانی میں تم مجھے دیکھ لیتیں تو ہائے مرے اللہ ہائے مرے اللہ کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتیں اور چھلچھلانے لگتیں۔

اس طرح میر ملیح آباد بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

یاراں کہ سرکشند زنخوت بر آسماں
بر آستان مے کدہ ' شانم ' نہ دیدہ اند
آں ہا کہ آؤ رند سبک در نظر مرا
بے چارگاں بکوئے مغانم نہ دیدہ اند!

میری حویلی کی اندرونی فضا

ہر طرف روشنی تھی رنگینی تھی چہل پہل تھی......لونڈیاں' باندیاں' مامائیں اصیلیں مغلانیاں انائیں ردائیں کھلائیاں......استانیاں' پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔

اس مستقل آبادی کے علاوہ شریف گھرانوں کی غریب عورتیں بھی چندرے اچھے دن گزارنے کے لیے آئے دن بطور مہمان آتیں ایک ایک دو دو مہینے رہتیں اور جب چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں اُن کی جگہ آ کر پر کر لیتی تھیں۔

بیرونی فضا

خدمت گاروں' رکاب داروں فراشوں سپاہیوں مولویوں' ماسٹروں مصاحبوں داستان گویوں منشیوں ضلع داروں' اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔

ان کے علاوہ بیرونی و لکھنوی شاعروں میں سے دو چار ہمیشہ بطور مہمان رہتے اور آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

اور ہم بچے مزا لیا کرتے تھے اپنے گھر کی تتنی سے جس کو ہم گنے کھلاتے تو وہ جھومتی اور جب ہم اس کو نوری انڈا کہہ کہہ کر چڑھاتے تھے تو وہ غصے کے مارے زنجیریں تڑانے لگتی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچپن میں تھا کیا؟ شعلہ تھا کہ شب نم حدید تھا کہ حریر نوک خاردار تھا کہ برگ گل خنجر تھا کہ ہلال چنگیز خان کا علم بردار تھا کہ رحمۃ اللعالمین کا پرستار؟

ایک رخ سے تو میں اس بلا کا سریع الاشتعال تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتا اور جو بھی سامنے آتا اس کو پھاڑ کھایا کرتا تھا۔

اور ایک رخ سے اس قدر بے پناہ صاحب مہر و وفا اور اس حد کا سرچشمہ لطف و عطا تھا کہ دوسروں کے واسطے بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ رہا کرتا تھا۔

میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر کسی بات پر بگڑ جاتا تو بید مار مار کر ان بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا......

اور جب ماسٹر بن کر اپنا پڑھا ہوا سبق ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا اور دوسرے دن ان سے آموختہ دہراتا اور وہ دہرا نہ سکتے تو ان کو ڈنڈوں سے پیٹتا اور ان کے کاندھوں پر سوار ہو کر ان کو خچروں کی طرح اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن جایا کرتی تھی......

اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ وہ بھی بچپن میں میری طرح اس قدر بدمزاج زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگام جنگ میں وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی اور میں اس کے جھونٹے نوچ کر پھینک دیا کرتا تھا۔

---

[1] اور اب وہی انیس مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اور جب لکھنو جا کر اس سے ملتا ہوں تو وہ میرے گلے لگ کر جل تھل بھر دیتی ہے اور ٹکٹکی باندھ کر مجھ کو اس طرح دیر تک دیکھتی رہتی ہے کہ گویا اپنے دل کے زخموں میں ٹانکے لگا رہی ہے۔

ہر تیسرے چوتھے روز انیس[1] سے میری مہابھارت ہوا کرتی تھی اور انگنائی میں

کنویں کے گرد وپیش کا حصہ ہمارا پانی پت کا میدان تھا۔ اور ایسا میدان کہ اگر مامائیں' اصیلیں آ کر ہمیں چھیڑا نہ دیتیں تو ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر کے رکھ دیتے۔

میری ماں اپنے تمام بچوں میں سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں' اور دودھ اور شہد کا پیالہ روز صبح کو مجھے اپنے ہات سے پلایا کرتی تھیں اور اگر کسی دن دودھ کے پیالے میں کوئی ذرہ نظر آ جاتا تھا تو میں کم بخت پیالے کو تڑ سے زمین پر پٹک دیا کرتا تھا اور وہ رونے لگتی تھی۔

میں اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا اور اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا تو میری چال بدل جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ایک روز میں خربوزے کی قاشیں چاکو کی نوک سے اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا اور انہوں نے ڈانٹ کر یہ کہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے گدھے چاکو کی نوک اگر تالو میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں......تو مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہولہان ہو جاتے۔

اسی طرح میں نے ایک بار اور بھی اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی تھی۔

میرے باپ کا سختی کے ساتھ یہ حکم تھا کہ بچوں میں سے کوئی بھی ان کی اجازت کے بغیر پھاٹک سے باہر قدم نہ رکھے۔ اور جب وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے' تو چار پانچ سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ باغ تشریف لے جا چکے تھے ان کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر میں مشیر احمد خاں رام پوری کے گھر' جو بالکل ہمارے پھاٹک کے سامنے تھا چلا گیا مشیر خاں کی ماں' اپنے پوتے یعنی میرے دوست مختار کو کھانا کھلا رہی تھیں مجھے بھی انہوں نے دستر خوان پر بٹھالیا۔ اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر مجھے بھنڈی کھلائی[1]۔

---

[1] اس بھنڈی کا مزا اب تک زبان پر تازہ اور حافظے میں محفوظ ہے اور اب جب کبھی بھنڈی کھاتا ہوں تو میرے منہ سے نکل جاتا ہے بے ساختہ ''ہائے مشیر خاں کی ماں''۔

www.pdfbooksfree.pk

جب مزے کی جھنڈی کٹلا کر گھر آیا دیکھا کہ میرے باپ باغ سے آ گئے اور آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بڑی خشونت کے ساتھ پوچھا کہاں گئے تھے میں نے کہا مشیر خاں کے گھر انہوں نے پوچھا اور میری اجازت کے بغیر میں نے کہا آپ یہاں تھے کہاں انہوں نے فرمایا میرے آنے کا انتظار کرتے' اور گئے بھی تھے تو سپاہیوں کو ساتھ کیوں نہیں لیا۔ میں نے کہا میاں دو قدم کے لیے سپاہی لے کر جا کر کیا کرتا انہوں نے برافروختہ ہو کر مجھے فرمایا مجھ سے منطق بگھار رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ہروتی کی پتلی سی جریب' اس زور سے میری پیٹ میں ماری کہ میں بلبلا گیا۔ اور انتہائی تپسے کے عالم میں مجھ نالائق کی زبان سے بے ارادہ نکل گیا کہ اللہ کرے مر جائیں میاں۔

یہ سنتے ہی میرے باپ غصے کے مارے دیوانے ہو گئے کھر کھراتے مجھے اندر لے گئے اور جریبوں پر جریبیں مارنے لگے۔ وہ تو کہیے میری دادی جان آ گئیں اور انہوں نے میرے اپ کی پشت پر لکڑی مار کر کہا کیا مار ڈالے گا بچے کو۔ اور میرے باپ نے فوراً ہاتھ روک لیا۔

معلوم نہیں کیوں مگر میاں بسنت میری چڑھ گئی......

ایک روز میرے باپ ے کمرے میں ایک بڑی خوفناک ڈاڑھی والے مولانا اونچا سا عمامہ باندھے اور موٹے تال کی عینک لگائے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی مشیر خاں نے ان مولانا کے کان میں کچھ کہہ کر میری جانب اشارہ کیا مولانا نے جھپٹ کر مجھے گود میں بٹھا لیا۔ اور میرے سر پر بڑی شفقت کے ساتھ یہ بات پھیر کر کہا" کہو میاں بسنت کیا کھاؤ گے" یہ سنتے ہی میں نے ان کی داڑھی پکڑ لی اور اے ماڈالوں گا کا نعرہ لگا کر اس زور سے ان کی داڑھی کو جھٹکا دیا کہ ان کا عمامہ عینک سمیت فرش پر گر پڑا۔ ان کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گ ۓ۔ مشیر خاں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے اور میرے باپ نے زور لگا کر ان کی داڑھی میری

گرفت سے چھڑادی اور میں اوف اوف کرتا باہر نکل گیا۔

ایک روز میں اپنے پھاٹک پر بڑی سی ہوائی بندوق بھر کے کھڑا تھا کہ ایک دائی کا لڑکا میرے سامنے سے گزرا لیکن مجھے سلام نہیں کیا اس کی اس گستاخی پر مجھے تاؤ آگیا۔ میں نے اس پر دن سے فائر کر دیا۔ بڑا سا چھرا اس بیچارے کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ اور وہ گر کر تڑپنے لگا۔ اور مجھ شقی نے اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض اس کی پسلی پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا ابے دو کوری کے نائی اٹھ اور سلام کر اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا اور جھک کر مجھے سلام کیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

ایک روز یاد نہیں کسی خطا پر میں نے اپنے غلام حسین بخشا کو زنانے مکان کے صحن میں کھڑا مار رہا تھا کہ چھڑیوں سے تڑا تڑ تڑا تڑ کہ ڈیوڑھی میں دادا میاں تشریف لے آئے۔ دم نکل گیا ان کو دیکھ کر کہ اب وہ مجھے ماریں گے۔ یا ڈانٹیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دادا میاں مسکراتے آئے اور میرا ہاتھ پکڑا مجھے باپ کے کمرے میں لے گئے اور میرے باپ سے کہا بشیر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہارا یہ منجھلا بیٹا بڑا سورما نکلے گا۔ اور بادشاہوں تک سے ٹکر لے گا۔ اور جب میرے باپ نے پوچھا باوا یہ اندازہ کیسے ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ غلام کو مار رہا تھا۔ اور ایسے تیوروں سے ہو رہا تھا کہ سورماؤں کے سوا ایسے تیور کسی کو میسر ہی نہیں ہو سکتے۔

بشیر ہم پٹھان ہیں سورماؤں اور بزدلوں کے تیوروں کو ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے کہ سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

ار پھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ برب کعبہ میں گوگاؤں اور وہ باغ تیرے نام براہ راست لکھ دوں گا۔ اور لے یہ دو گنیاں اس کی مٹھائی کھانا اور اس میں سے پانچ روپے اس غلام زادے کو دے دینا جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا۔ اب میری مہر و وفا اور جود و سخا کا رخ بھی دیکھ لیجیے۔

www.pdfbooksfree.pk

میرے بچپن تک میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی اور انڈے کھاتے اور شہد آمیز خالص دودھ پیا کرتے تھے اور جاڑوں کے زمانے میں ناشتے کے بعد جب ہماری جیبوں میں چھلے چلغوزے اخروٹ کی گری کشمش بادا موں کا مغز اور صاف کیے ہوئے پستے بھر دیے جاتے تھے تو میں باہر آ کر آواز دیا کرتا تھا کہ رف کے چھڑو یو چلو...... پہلے اس نعرے کو سمجھ لیجیے۔

ا۔ ان کی یہ مخصوص قسم تھی جو موت نے ان کو ایفائے عہد کی فرصت نہیں دی۔

میرے دادا کے برف خانے کی چھت پر مٹی کے کورے ظروف کا مسالا لگا کر رکھ دیے جاتے تھے جن میں پچھلے پہر تک برف جم جاتی تھی اور منہ اندھیرے برف خانے کے آدمی پکارتے تھے مزدوروں کو اے برف کے چھڑو یو چلو (اے برف کے چھڑانے والو آؤ) اور وہ مزدور آ کر برتنوں سے برف کھرچ کھرچ کر چھڑاتے وار کھتوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا کرتے تھے۔ اور ان کھتوں میں جست کی صراحیاں دبا دی جاتی تھیں...... اور یہ سمجھ لینے کے بعد اب یہ سنیے کہ جیسے ہی میں برف کے چھڑو یو چلو کا نعرہ لگاتا تھا لونڈوں اور ماماؤں کے تمام بچے دوڑ دوڑ کر میرے پاس آ جایا کرتے تھے اور میں یہ کہہ کہہ کر اے میرے تلنگھنو چنے چباؤ اپنا سارا میوہ انہیں کھلا دیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی سدا لال تالاب کی جوگی منہ اندھیرے

قفس کاٹا چمن بویا تیری رحمت کا ہوں جویا محمد یا رسول اللہؐ

جوانی میں بہت سویا بڑھاپا دیکھ کر رویا محمد یا رسول اللہؐ

دھواں پایا دیا کھویا...... محمد یا رسول اللہؐ

گاتے ہوئے میرے دروازے پر آتے تھے میں چکارے کے سے تر ارے بھرتا تھا گھر جاتا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہتا کہ اماں ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں۔ انہیں بھیک دے دو۔ میری اماں کو میری اس ادا پر بہت پیار آتا تھا اور وہ بٹوے سے نکال کر دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں ساٹھ پینسٹھ سال کے بوڑھے حیدر خاں ...... ایک روز میں نے دیکھا کہ ان کے چولھے پر دودھ کی پتیلی کڑ کڑا رہی ہے۔ اور وہ کوئی کالی کالی گولی پیالی میں گھول رہے ہیں میں نے پوچھا حیدر خاں یہ کیا چیز ہے انہوں نے کہا افیم گھول رہا ہوں میں نے پوچھا افیم کیا چیز ہوتی ہے انہوں نے کہا یہ دوا ہے۔

---

1 ملیح آباد کا ایک تالاب

مگر منجھلے بھیا یہ چیز امیروں کی ہے یہ روز پاؤ بھر ملائی بالائی مانگتی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں بھلا ملائی کہاں سے لاؤں ...... حیدر خاں کی اس بے کسی پر مجھے بڑا ترس آیا ان سے کچھ نہیں کہا سیدھا گھر کے اندر گیا اور گل زار بوا کی نظر بچا کر پیالہ بھر بالائی چرا کر باہر لے آیا۔ بالائی کا پیالہ بھرا دیکھ کر حیدر خان افسردہ لیکن سرخ وسفید چہرے کی جھریوں کے اندر شگفتگی وتشکر کی جو لہریں دوڑنے لگیں تھیں۔ وہ میرے حافظے کے افق سے آج تک رنگ برسا رہی ہیں۔ اس روز سے یہ میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہر صبح حیدر خاں کو بالائی دے کر گھر پہنچا تو دیکھا گل زار بوا میری ماں سے کہہ رہی ہیں کہ بی بی میں دیکھ رہی ہوں کہ روز ملائی کم ہو جایا کرتی ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ی ظہورن کے سوا اور کسی کی ہمت پھیری نہیں ہو سکتی۔ وہ مردار بڑی چٹوری ہے بی بی کل میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ہے کہ وہ اپنا کھیر کا تھلوا چٹ کر کے صبین کا تھلوا بھی ہبک ہبک کر زہر مار کر رہی تھی ......

میری ماں نے ظہورن کو بلایا وہ دوڑی آئی اور میری ماں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا اماں ظہورن نہیں میں بالائی اڑا کر لے جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا گل زار بوا نے سنا تو بگڑ کر کہا کہ بھاڑ میں جائیں حیدر خاں بچے کو پھسلا کر روز ملائی چاٹتے ہیں۔ خاک کھائیں' انگارے کھائیں حیدر خاں علی کی تیغ ٹوٹے ان پر۔

میری ماں نے فرمایا اے ہے گل زرا تی سی ملائی کے چلتوں اس قدر کٹے کٹے کو سنے دے رہی ہو ایک پیالہ ملائی کی حقیقت ہی کیا ہے تم ی نہیں سوچتیں کہ اتی سی ملائی دے کر ننھے کا دل ہات بھر کا ہوا جاتا ہے۔

ماں کی یہ بات سن کر میں بشاش ہو گیا۔ اور اب کھلے بندوں بالائی لے جانے لگا۔

لیاورچی خانے کی نگراں تھیں۔

حیدر خاں اب تم اس ترسانے والی دنیا میں نہیں ہو مگر تمہاری دعاؤں کی چاندنی آج تک میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے)۔

جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو میں اسے کو دیکھتے ہی میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کا نام للو رکھ دیا تھا......

ایک روز میں بڑے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا آب رسانی کی نالی کی کیچڑ میں ایک جوتہ دھنسا پڑا ہے اسے اپنے مالی براجی سے دھلوا کر میں نے اپنے مخملی کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ براجی نے کہا "ارے بھیا یو کا گرت ہو جیب کھراب ہو جیہے (ارے بھیا یہ کیا کر رہے ہو جیب خراب ہو جائے گی) میں نے کہا میں یہ جوتا اپنے للو کو پہناؤں گا......وہ ہنسنے لگا۔

اور جب میں اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ گیا۔ میں نے وہ جوتا جیب سے نکالا اور چاہا کہ اسے للو کے پاؤں میں پہنا دوں ت و میری پھپّی زاد بہن امی نھے چیخ مار کر کہا اری ممانی غضب خدا کا یہ مخمل کا کوٹ اور اس کی جیب میں یہ چڑ وودھا جوتہ او رپھر اس کو منجھلا بھائی اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے یہ سن کر میری ماں ہنسنے لگیں۔ ساری عورتوں نے مجھ کو گھیر لیا۔ سب ے مجھ پر قہقہے مارے......لیکن کسی نے میرے اس درد دل کی داد نہیں دی جو میں اس جوتے کو للو کے پاؤں میں نہ پہنا سکا۔

میرے دل میں اس قدر گداختگی اور اتنی زود آشنائی تھی کہ جب گھر سے کوئی مہمان رخصت ہونے لگتا تھا میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی تھیں۔

مجھے آج کی تاریخ تک وہ بے انتہا قلق یاد ہے کہ میرے نانا جان جب میری بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے بعد آ گرے جا رہے تھے تو میں ان کے ریزرو کمپارٹمنٹ میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جس وقت' ایک زنبوری ہات نے مجھ کو وہاں سے دیوار میں ٹھنکی ہوئی کیل کے مانند جھٹکا دے کر باہر کھینچا تھا تو مجھ پر غشی طاری ہوگئی تھی۔

ا رئیس احمد

ایک روز ہماری ڈیوڑھی میں ایک بٹیر پالنے پر مامور سپاہی بندہ علی خاں اپنے بٹیرے کے دوسرے سپاہی' سے یہ کہہ رہے تھے بھائی صالح محمد خاں' میری لڑکی کے بیاہ کے واسطے صاحب (یعنی میرے باپ) نے جو چھ سو روپے مجھ کو دیے تھے۔ وہ میں جوئے میں ہار گیا۔ اور اب میرے واسطے سرف یہی ایک بات رہ گئی ہے کہ اس شرمندگی میں کچھ کھا کر سو جاؤں۔

بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سنی تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ ان میں سے ایک حرف بھی نہیں کہا منہ لٹکائے زنان خانے میں چلا گیا۔ اور بستر پر دراز ہو کر سوچنے لگا کہ ان کی جان کیوں کر بچاؤں دیر تک سوچتا رہا کچھ بھی کچھ میں نہیں آیا کہ اتنے میں ایک چھپکلی میری ماں کے تکیے پر سپٹ سے آ گری میں نے اس کو مارنے کے لیے تکیے پر جوتا کھینچ مارا تکیہ نیچے گر گیا۔ چھپکلی بھاگ گئی اور یہ دیکھ کر میری نبضیں تیز ہو گئیں کہ ماں کے سرہانے سونے کی جڑاؤ چمپا کلی جگ مگ جگ مگ ہو رہی ہے۔ میں نے چھپکلی کی دکھائی ہوئی چمپا کلی جھٹ سے اٹھا کر نیفے میں ٹوم لی۔ اور ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے بندے علی خاں کو دے آؤں کہ یکا یک سہ دری سے میری ماں آ گئیں اپنا تکیہ زمین پر اور چمپا کلی غائب دیکھکر انہوں نے مجھ سے پوچھا ننھے تو یہاں کب سے ہے۔ میں نے کہا بڑی دیر سے انہوں نے دریافت فرمایا ادھر کوئی لونڈی تو نہیں آئی تھی۔ میری چمپا کلی غائب ہو گئی ہے میں نے کہا کوئی نہیں وہ سر جھکا کر بیٹھ گئیں ماں کا یوں سر جھکا کر بیٹھ جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنے

نیفے مین سے نکال کر چمپا کلی ان کے حوالے کر دی اور انہوں نے کہا تو نے اچھا کیا جو چمپا کلی اپنے پاس رکھ لی نہیں تو کوئی لونڈی باندی اڑا کر لے جاتی۔

میں نے بندے علی خان کی ساری داستان سنا کر کہا کہ اس لیے اٹھائی تھی کہ بندے علی خاں کو دے دوں گا۔میری ماں نے کہا کہ ان کو تو صرف چھ سو روپے کی ضرورت ہے ارو یہ چمپا کلی تو تین سوا تین ہزار کی ہے..... یہ کہہ کر میری ماں سوچنے لگیں اور پھر بڑے ولولے کے ساتھ سر اٹھا کر کہا کوئی بات نہیں یہ چمپا کلی انہیں کی تقدیر کی تھی جا دے آ۔اور جب میں کوشی سے بھرا ہوا دوڑتا باہر جانے لگا تو میری ماں نے کہا مجھے آدھے راستے سے بلا کر کہا کہ ننھے تو نے میری چمپا کلی مجھ سے مانگے بغیر اپنے پاس رکھ لی اسی کا نام ہے چوری۔شریف بچے کبھی چوری نہیں کرتے۔میرے سر پر ہات رکھ کر قسم کھا کہ اب کبھی ایسی گھٹیا بات نہیں کرے گا۔میں نے ماں کے سر پر ہات رکھکر قس کھالی اور یہ سوچ کر کہ میں چور ہوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب باہر جا کر سب کی نظر بچا کر میں نے وہ چمپا کلی بندے علی خاں کے حوالے کی تو ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور دونوں ہاتھ اتھا کر انہوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں کہ الٰہی منجھلے بھیا کی عمر دراز ہو یہ دردربار میں سرخرو ہوں۔اور ان کے دروازے پر ہاتھی جھومیں۔یہ سچ ہے کہ بندے علی خاں کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔لیکن اگر دل میں یہ کانٹا نہ کھٹکتا کہ میں چور ہوں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

میری انا لکھنو کی سیدانی تھیں اور مجھ کو ان سے بے حد محبت تھی کہ میری دودھ بڑھائی کے بعد جب وہ لکھنو چلی گئی تھیں۔تو میری آنکھوں میں دنیا ویران ہو گئی تھی اور میں مکان کے گوشے پر انا جان انا جان کہتا پھرنے لگا۔اور آخر کار اتنا ہرک گیا کہ مجھے بخار آنے لگا..... میرے باپ نے لکھنو آدمی بھیج کر کئی بار انا کو ڈھنڈوایا لیکن ان کا پتا کہیں چلا ہی نہیں۔

میری پچاسی برس کی کھلائی ہوئی عباسی خانم جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں روئی کی ایک بڑی سی گڑیا بنا کر میرے پہلو میں لٹا دیتی کہ لے بیٹا تیری انا آ گئی اور میں اس گڑیا سے چمٹ کر سو جایا کرتا تھا......

نہ جانے مجھ میں یہ بات کیوں تھی کہ جو لوگ، ریل میں میرے ہم سفر یا گانے بجانے کی محفلوں میں میرے ندیم یا موسلا دھار پانی برسنے کے وقت میرے ہم نشین ہوتے تھے مجھے ان تمام لوگوں سے محبت ہو جایا کرتی تھی۔

چنانچہ ایک روز جب کہ بڑے دھوم دھڑکے سے رگرم جھوم پانی برس رہا تھا اولتیاں ٹپک رہی تھیں۔ پرنالے دھڑا دھڑ چل رہے تھے انگنائی کے بھرے ہوئے پانی میں جا بجا بھنور پڑ رہے تھے شیر خاں سپاہی نے لہک لہک کر ملہار گانا شروع کر دیا۔ مدنا موہن بن کل نا پڑے گا اری او سکھی اری او سکھی"۔

ہائے بھیگے درو دیار مستانہ بوچھاڑ جھڑی کا ستار پی ہو کی پکار برہا کی جھنکار، اور محمد شیر خاں کا ملہار...... خدا ہی جانے کیا چوٹ لگ گئی میرے معصوم دل پر کہ میں رونے لگا زار و قطار۔

ابھی میں برکھا کی جھڑی ارو ملہار کے جھولے میں جھول رہی تھی کہ سارا مزہ خاک میں ملا کر رکھ دیا ظہور علی خاں نے۔ یہ کہہ کہ محمد شیر خاں تم کو خاں صاحب بہادر (میرے باپ) یاد فرما رہے ہیں میں ہائے کر کے رہ گیا۔ کھن سے چکنا چور ہو گیا میرا ساغر سرشار اور چٹ سے ٹوٹ گیا میرا جھما جھم کا تار۔

اور جب میں نے یہ سنا کہ میرے باپ محمد شیر خاں وک زور زور سے ڈانٹ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا ربلا لاؤ اور تم ابھی تک نہیں گئے تو چھتری لگا کر میں اپنے باپ کے کمرے میں جا کر بے اختیار رونے لگا۔ میرے باپ میرے اس گریہ بے اختیار سے بے چین ہو گئے اور بڑی حیرت سے پوچھا بیٹے کس بات پر رو رہے ہو۔ میں نے رک رک کر کہا میاں یہ محمد شیر خاں یہ کہتے ہی میری آواز رندھ گئی میر یباپ نے

چارپائی سے اٹھ کر مجھے زانو پر بٹھا لیا۔ اور بہت چمکار کر پوچھا بیٹا جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔

میں نے روہانسی آواز میں کہا میاں کہ امیاں پیٹے کا پانی برس رہا ہے۔ یہ ابھی مجھ کو ملہار سنا رہے تھے کہ اب ان پر ڈانٹ پھٹکار ہو رہی ہے۔

یہ سنتے ہی میاں نے مجھ کو چھاتی سے لگا لیا اور کہا بیٹا تو آگے چل کر شاعر ہو جائے گا اور ہمارے خاندان کا نام تجھ سے روشن ہو گا...... محمد شیر جاؤ اس کو ملھار سناؤ اور ظہور علی خاں کو بھیج دو کہار بلانے کے لیے۔

ا؎ لن موہن کے بغیر اے سکھی مجھے قرار نہیں ہے۔

آپ نے میرے دل کی سختی اور نرمی یعنی میری حدیدیت اور حریریت اور میری شعلہ افشانی و شبنم چکانی یہ دونوں چیزیں دیکھ لیں...... اب میرے محبت و غضب کے مرکب جذبے کو بھی دیکھ لیجیے۔ جو ایک بڑی انوکھی سی بات ہے۔ آب و آتش ہم آمیختہ از لب لعل۔

میں اپنی پچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم کا ذکر کر چکا ہوں جنکو میں بڑی بی کہا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے مجھ کو برفی بے حد پسند تھی۔ اور کنجا یا اللہ حلوائی کی دکان سے ہر صبح کو برفی کا ایک دونا آجایا کرتا تھا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ میں برفی کھاؤں اور بڑی بی کو نہ کھلاؤں......اور یہی نہیں میری یہ تمنا ہوتی تھی کہ آدھا دونا میں کھاؤں اور آدھا دونا اپنی بڑی بی کو کھلاؤں لیکن میری الٹی کھوپری میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بڑی بی کی سی پھونس بوڑھی عورت آدھا دونا کیوں کر کھا سکتی ہیں اور جب برفی کی دو چار ڈلیاں کھا چکنے کے بعد وہ مزید کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتیں کہ ننھے اب مٹھائی نہیں کھائی جا رہی ہے تو فرط محبت کے باعث مجھ کو ان پر اس قدر غصہ آجاتا کہ ان بے چاری کے روئی کے سے بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیا کرتا تھا۔ اور وہ چیخیں مار مار کر کہتی تھیں کہ ارخدا کا واسطہ کوئی اللہ کا بندہ مجھ کو بچا لے

ارے ننھا مجھ کو مارے ڈال رہا ہے۔اور ماما ئیں اصیلیں دوڑ کر میرے پنجے سے ان کو چھڑا لیتیں......غزارسانی کے سلسلے میں اللہ کے متعلق فقط سنا ہی تھا کہ ورنہ ستانی بسم می دیدا اور ننھے کو اس پر عمل کرتے دیکھ لیا۔واہ رے ننھے اخلاق الٰہی کا پورا اتباع کر کے دکھا دیا۔ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

میرے کھیل

کوئی ایک کھیل بھی جم کر میں نے کبھی نہیں کھیلا یوں تو دوسروں سے چھڑیا دلا کر پتنگ بازی بھی کی۔بھدے طور سے گوئیاں بھی کھیلیں آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا۔فٹ بال اور ٹینس بھی برا بھلا کھیلا اور ست گھڑے کے خانوں میں بھی اچھلا کودا مگر دو چار بار کھیل کر ہر کھیل ترک کر دیا۔اپنا پڑھا ہوا سبق اپنے ہم عمروں کو پڑھانا داغ و امیر کے دیوان پڑھنا اور اپنے کمرے کو سجانا۔

---

۱ بڑی بی تم مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو اور تمہارا ننھا ابھی تک زندگی کو بھوگ رہا ہے زندگی کے بوجھ تمہارے ننھے کے شانے ٹوٹے جا رہے ہیں میری اچھی بڑی بی اپنے بوڑھے ننھے کو بلا لو اب تو بلا لو اپنے پاس۔

یہ تھے میرے محبوب کھیل......پڑھاتا تھا میز کرسی پر بیٹھ کر میز پر بید رکھا۔اور میز کے سامنے دادا میاں کی عدالت ۱ کا کٹھرا لگا رہتا تھا......داغ و امیر کے دیوان لپکا ٹکے ہوئے مخمل کے جزدان میں رکھتا تھا اور میرے کمرے کی سجاوٹ ایسی تھی کہ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے......میرے خاصے چورے لیکن چوڑے سے زیادہ لانبے کمرے مں ایک جانب تو تختوں کا چوکا تھا چوکے پر گدا گدے پر سفید چاندنی چاندنی پر زرین قالین مخمل کے گاؤ تکیے سنگ مرمر کے مری فرش داہنے بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں کرسیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں میزوں پر گل دان ادھر ادھر چاندی کے اگال دان پختہ فرش پر گراموفون دوسرے پر آگے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل ایک ایسی نہایت خوب صورت زریں ومخملی کرسی جس

پر بیٹھے ہی باجہ بجنے لگتا تھا۔ دروازوں پر چقیں سامنے چاندی کے فریم میں جرا قدم آدم آئینہ آئینے کے تختے پر ارگن بجانے والی ٹائم پیس۔ پیتل کا عود دان لکھنے کی میز پر بلوریں دوات قلم ایک بڑا خوبصورت لیمپ جس کے گلوب میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم' دیواروں پر بڑی بھڑکیلی دیوارگیریاں الماری میں شعرا کے دیوان الماری کے دروازے پر گوند سے چپکائی اور کپڑوں کے تھانوں سے چھڑائی ہوئی سنہری ٹکٹ[1] چٹھیاں...... یہ تھی میرے کمرے کی آرائش۔

[1] دادا میاں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ ٹکٹ ایک چٹھی کا آدھا حصہ الماری کے دروازے پر آج تک چسپاں ہے اب اس کمرے میں میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد رہتا ہے جس نے اپنی بے پروائی کے ہاتھوں اسے اجاڑ کر رکھ دیا ہے...... اب جب کبھی ملیح آباد جا کر اس کمرے میں قدم رکھتا ہوں تو اس کے ذرات چیخ اٹھتے ہیں۔ میں ارے ہمارے منجھلے بھیا آگئے۔ اور جب الماری کے پٹ پر چپکی ہوئی دھندلی سی چٹھی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں تو اس چٹھی کے اندر سے بالکل میری صورت کا ایک لڑکا جرنیلی ٹوپی پہنے برآمد ہو جاتا ہے اور اس لڑکے کو دیکھ کر میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ اور اس عالم میں رئیس کا خوب صورت کوکانا درحسین روتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس کے رخسار میرے لبوں نے اس کمرے میں بوسے کا اولین تجربہ حاصل کیا تھا اور کھڑکی سے بڑی بی کی تھرتھراتی آواز آنے لگتی ہے کہ ننھے آؤ اماں دودھ کا پیالہ بھرے بیٹھی ہیں"...... ہائے ہائے ہائے ہائے۔

میرے زمانے کے اوہام

میرے خاندان کی خواتین پر خوف ناک تصورات منڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو ہر محل میں ارواح خبیثہ کی عمل داری تھی۔ لیکن وہ محل جس میں دادا میاں رہتے تھے جس کا نام تھا بڑا محل وہ تو خصوصیت کے ساتھ...... دنیا بھر کے شہید مردوں ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء کے تمام مقتول گوروں...... بھوتوں پریتوں پلیدوں دیوؤں چڑیلوں بھتنیوں چھلاوں

پائیوں بڑسروں خبیثوں اور جنوں کی راج دھانی سمجھا جاتا تھا......ارتمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیارے میں اس محل کے تمام گوشوں کونوں، کھتروں، کوٹھریوں، مچانوں، طاقوں، ٹھچنیوں، سہ دریو، زینوں، کلیوں، نالیوں اور ناغولوں سے نکل نکل کر خبیث روحیں دھما چوکڑی کیا کرتی ہیں مہیب آوازیں نکال نکال کر سونے والیوں کی چارپائیاں الٹتی ہیں ان کے گلے گھونٹتی، دانت کٹکٹاتی اور جبڑے ہلاتی پھرا کرتی ہیں......اور لطف یہ کہ یہ تمام باتیں سنی سنائی اور قیاسی نہیں بلکہ بڑی بوڑھیاں بڑے خوفناک تیوروں سے اس کا دعویٰ کرتی تھیں کہ وہ ان تمام کرشموں کی عینی شاہد بھی ہیں......اور ایک دفعہ ہی نہیں وہ بارہا ان خبیث روحوں سے دوچار اور نگار ہو چکی ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد اکثر بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اور خواتین کے ساتھ ساتھ تمام لونڈیاں باندیاں اور مامائیں اصیلیں بھی، اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن بہت تڑکے جب کہ دادی جان اپنے کھٹے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھوکری ہانپتی کانپتی ان کے پاس آئی اور سہی آواز میں کہنے لگی بری بی بی آدھی رات کو جب گھنٹہ بارہ بجا رہا تھا تو ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدوں ار بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلوٹی پینگن لوٹی دھم دھوسڑ چڑیل انگنائی میں کھڑی اپنے جھونٹے نوچ رہیی ہے چر چر......اروپھر جھونٹے نوچتی ہوئی مرمرے بھرے تھیلے کی طرح ہائے اللہ میری طرف مسمساتی اور منمناتی چلی آرہی ہے اے بڑی بی بی میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی اور جیسے ہی وہ ہتنپیو لے پولے قدم رکھتی ہوئی میرے پلنگ کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے ہو کر رہ گئی جی میں آیا کہ چیخ مار کر گھر بھر کو جگادوں مگر ڈر کے مارے گلے میں گونجے سے اٹک گئے کتا کتا زور لگایا مدا آواز نہیں نکلی۔ دانت بیٹھ گئے گھگھی بندھ گئی۔ اور میرا دم نکل جانے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی کہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جو

جو سہ دری کے سبز عمامے اور لال جریب والے شہید مرد ہیں ۔ وہ سہ دری سے نکل کر کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتے آ گئے اور آتے ہی انہوں نے اس مردار کی کھوپڑی پر ایسی کس کے جریب ماری کہ یہ بھتنی بلبلا اٹھی ۔ اور اچھا آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی ۔ کہتی ہوئی بھاگی اور دھواں بن کر پائے خانے کی نالی کے اندر غائب ہوگئی ۔ ددی جان نے یہ ماجرا سن کر چھوکری سے کہا سہ دری والے شہید مرد اس محل میں بہت سی جانیں بچا چکے ہیں دیکھ آج ان کی نیاز دلا کر ان کا طاق بھر دینا......

اری تو تو کل کی چھوکری ہے میں تو اس محل کے سینکڑوں کرشمے دیکھ چکی ہوں جب میں یہاں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی تو اس محل کے کوٹھے سے کبھی کبھی رات گئے لف رائی لف رائی (لفٹ رائٹ) کی آوازیں بڑے زور سے آتی تھیں اور جب سپاہی بندوق بھر کر ادھر ادھر جاتے تھے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا تھا ۔ وہ ران کے اترتے ہی پھر وہی ادھم ہونے لگتا تھا ۔ ایک عامل کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں جن گوروں کو یہاں مارا گیا تھا کبھی کبھی ان کی روحیں لف رائی لف رائی کیا کرتی ہیں ۔

ایک رات کو جب کہ محرم کی نویں تاریخ کو ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر چیخیں مار مار کر کہنا شروع کر دیا اری تو تو کون ہے اری تو کون ہے اری تو کون ہے؟

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی تمام عورتیں آنگن میں جمع ہو گئیں ۔ اور پوچھنے لگیں اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی تھی اس نے کہا بیبیو میں نے دیکھا ایک بڑے بڑے دانتوں والی بھتنی اوپر کی منڈیر سے جھک جھک کر تعزیہ دیکھ رہی ہے ۔ اور جب میں نے اس سے پوچھا اری تو کون ہے تو اس نے منمنا کر کہا دور ہوا سے شغتل ہم زیارت کرنے آئے ہیں اور یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گئی ۔

یہ سننے کے بعد ہر عورت کے چہرے پر سے خوف ٹپکنے لگا ۔ اور گھر بھر میں سناٹا چھا گیا......

میرا ڈرپوک پن

یہ باتیں سن سن کر میں اس قدر سہم گیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنا تو درکنار جب شام کا وقت' مردانے مکان میں جاتا تھا تو ڈیوڑھی کے اس دروازے سے لے کر اس دروازے تک کوئی نہ کوئی ماما مجھ کو پہنچانے جایا کرتی اور غسل خانے جاتا تھا تو ماما دروازے پر سے بار بار آواز دیا کرتی تھی کہ بھیا ہم دروازے پر کھڑے ہیں ڈرنا مت۔

تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک میری بزدلی کا یہ عالم رہا کہ جب تک بری بی گڑ مڑا کر میری پائنتی لیٹ نہیں جاتی تھیں۔ میں سو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جب کبھی رات کے وقت چڑیل والی کلیا کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی وت میں تھرا جاتا تھا اور کچاچا کر فوراً آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

دادی جان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ وہ ہر رات کو سوتے وقت بلاناغہ کچھ پڑھ کر اور دور دور تک حصار کھینچ کر تین بار تالی بجایا کرتی تھیں۔ اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور آج بھی جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ارواح خبیثہ کو وہم کی خلاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی میرا یہ عالم ہے کہ ابھی سال گزشتہ جب ملیح آباد میں دادا میاں کا محل دیکھنے کو گیا تو ہر چند دن کا وقت تھا لیکن دو چار آدمیوں کو ساتھ لیے بغیر میں اندر قدم ہی نہ رکھ سکا...... اللہ اکبر کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں بچپن[2] کے اثرات۔

---

[1] ہمارے گھر کے ایک گوشے میں ایک کلیا (پتلی سی جگہ) تھی کہا جاتا تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے۔[2] میرے نزدیک یہ بچپن کے کبھی نہ مٹ سکنے والے اثرات ہی ہیں جو نوع انسانی کو ہندو مسلم عیسائی بدھ زرتشتی یہودی جینی اور سکھ بنائے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دادا میاں کے محل سے نکلنا آدمی کا نہیں دیو کا کام ہے۔



www.pdfbooksfree.pk

میری بسم اللہ

ارے میں اپنی بسم اللہ کا حال لکھنا تو بھول ہی گیا' اسے پہلے ہی آنا چاہیے تھا۔ خیر اب سن لیجیے ذرا سی تو بات ہے...... اس موقع پر کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں بالتفصیل یاد نہیں ہیں۔ بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھالی میں سونے کی دوات۔ سونے کے خول کا قلم اور قرآن مجید میرے سامنے رکھا گیا تھا اور میرے اولین معلم مولوی نیاز علی خاں نے مجھ سے کہا تھا میاں صاحب زادے کہیے بسم اللہ کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے۔ اور مٹھائی تقسیم کی گئی تھی...... دادا میاں بھی موجود تھے جنہوں نے با آواز بلند یہ مصرع پڑھا تھا۔ قلم گوید کہ من شاہ جہانم...... اسی رات کو زنانے میں ڈومنیوں کا گنا اور مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوا تھا...... اور میں دولھا بنا کر بیچ میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میرے معلم

میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں اردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلم تھے مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گومتی پرشاد۔

مولوی نیاز علی خاں ایک روکھے سے خشک مزاج آدمی تھے۔ مولانا طاہر بڑے ہی شگفتہ مزاج تھے اور شاعر بھی ان کا ایک شعر اب تک یاد ہے۔

شہرہ جو سنا حسن کا طاہر کی زبانی
نادیدہ میں عاشق ہوا تجھ پر مری جانی

مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ میرے پاس ان کی ایک مثنوی موجود ہے جو غالباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے تمام اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی نقطہ دار موجود نہیں ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بے پایاں ذخیرہ الفاظ اور فرماں روائی لغات کا

www.pdfbooksfree.pk

اب رہے ماسٹر گومتی پرشاد سو وہ بڑے ہی مسکین اور خاموش طبع آدمی تھے۔ لیکن اس اسلوب سے پڑھاتے تھے کہ حرف حرف دل نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بہت دن کے بعد میرے باپ نے حضرت مانی جائیسی کو میرا ٹیوٹر مقرر فرمایا تھا۔

طلوع صبح کا اولین دیدار

ہمارے گھر کے اندر لطیفوں]نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر دن رہتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے تک اور رات رہتی تھی دن کے بارہ بجے تک ایک بجے تک...... اس لیے اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں ہو سکتا ہے صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالا مال ہوا میں اس دولت بیدار سے اور کیوں کر یہ قرآن اترا میری آنکھوں پر اس کی روداد بھی سن لیجیے۔ میرے باپ ربیع و خریف کے زمانے میں دربار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور ان مواقع پر وہ سو رہتے تھے آٹھ نو بجے رات کو اور جاگ اٹھتے تھے صبح تین چار بجے [1]

ایک بار جب وہ دورے پر جانے لگے تو میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میاں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے گا۔ تو انہوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے بو الحاظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو بہت تڑکے جگا دیں۔

---

[1] ایک مدت دراز سے میں سو رہتا ہوں رات کے آٹھ نو بجے اور جاگ اٹھتا ہوں صبح کو تین چار بجے جس کے یہ معنی ہیں کہ میرے گھر میں ربیع و خریف کی فصل ہمیشہ رہتی ہے اور میں ہر روز اپنے علاقے کے دورے پر جاتا رہتا ہوں بات کا علاقہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دریائے سخن سدا ہے جاری۔

اب سنیے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے...... جب لحاظن بوا نے بہت تڑکے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگایا کہ بھیا اٹھ بٹھو میاں کے ساتھ گاؤں میں جانا ہے تو میں اٹھ بیٹھا...... اور آنکھیں مل کر نگاہ اٹھائی تو بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگ مرمر کی تراشیدہ اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ نیم پیدا و نیم پنہاں گنگا جمنی پریاں نقابوں

کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے رسمساتے آسانی سے کسمساتی زمین کی طرف اڑتی چلی آرہی تھیں تو میرے دلے پوچھا ارے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے؟...... دن ہے نہ رات اندھیرا ہے نہ اجالا اندھیرے میں اجالا...... اجالے میں اندھیرا...... صباحت میں ملاحت ملاحت میں صباحت سرمئی نقاب کی کندنی مکھڑا...... سرخی میں گدرائی فضا کی انگڑائیاں آدھے جلوے آدھی چھائیاں...... ظلمات میں آب حیات کا آب ار آبنوس کے شہر میں 'مصر کا بازار...... ایک طرف مخمل کم خواب' سرمہ' کاجل' گیسو' ململ' کریب' اور ریسم اور ایک طرف افشاں] سلما' ستارہ' قشقہ' غازہ' گوٹا' کناری' سونا' چاندی' مرمر' لچکا' پٹھا' ابیر اور گلال فضا پر سنہرے تاروں کا جال اور بڑی آہستگی کے ساتھ ابھرتا ہوا کندن کا تھال۔

شلنگیں بھرتا ہوا نیم کے نیچے گیا۔ شاخ پر چہچہاتی چڑیاں بھرا مار کر اڑ گئیں ہات پھیلا کر نیم کو چھاتی سے لگا لیا۔ ڈالی کو جھکا کر اس کی پتیوں کو چوم لیا۔ مرغان سحری کی بانگ لے خون کو گرما دیا...... دیوانہ وار مردانے میں پہنچا۔ دیکھا کہ میاں صحن میں رکھا ہوا ہے میانہ مخمل نظر آیا کہار چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں ان کی کھانسی بھی اچھی لگی سپاہی لا الہ الا اللہ کہہ کہہ کر منہ دھو رہے ہیں ان کے چھپکوں کی آواز نے دل موہ لی۔ پھاٹک کے قریب گھوڑے دمیں مار رہے ہیں کنویں کے پاس کھڑی ہوئی ہتھنی جھوم رہی ہے۔ الاؤ کے گرد پاسی اینٹھے تاپ رہے ہیں الاؤ کی اچھلتی آنچ میں زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور یہ سارا آسماں اندر کے اکھارے میں تبدیل ہو گیا ہے...... میں وحشی چکاورے کے مانند دوڑ کر سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کی سموئی ہوئی گرمی سردی سے جی خوش ہو گیا۔ میں ذرا سا مڑ کر ایک اور قد آدم آئینے کے سامنے جا کر اپنا منہ دیکھنے لگا۔ گالوں پر سرخی کے ہلکورے آنکھوں میں گلابی ڈورے...... چھریرا بدن پتلی کمر گھنیرے بال' پتلے پتلے ہونٹ لانبی لانبی پلکیں...... بر میں ریشمی کرتہ پر روئی بھری مخملی صدری سر پر آڑی جرنیلی ٹوپی ٹوپی کے گرد آگرے کا

سنہرا افیتہ اور داہنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلا جھل دراف میں کس قدر حسین ہوں زندگی میں پہلی بار اس کا پتا چلا اللہ بھلا کرے طلوع آفتاب کی رنگینی کا جس نے میرا پوشیدہ جمال مجھ پر آشکارا کر دیا۔

---

۱ ایک ادنیٰ قوم جس سے زمیندار پولیس کا کام لیتا ہے۔

وہ جمال جو آگے چل کر زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کو اپنے سروں میں جھکا لینے اور ایک دن پریاں حاضر ناز اٹھانے ہائے جوانی ہائے زمانے'' کا نعرہ لگانے والا تھا اور کو وہ آنی وفانی جمال کہ اب اس ارزل عمر میں جب کبھی وہ یاد آتا ہے تو ہر چند میرے مفکر شبیر حسن خاں پر قطعی ملال طاری نہیں ہوتا۔لیکن میرے شاعر جوش ملیح آبادی کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ:

ہم پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک روز
اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک روز
بے زار نگاہوں کی گزر گاہ ہے اب
وہ چہرہ کہ نظروں کا حرم تھا اک روز

کردگارا پھول سے چہروں کو بتوؤں کی شکل میں تبدیل کر دینے سے آخر تجھے کیا مزا آتا ہے؟

گاؤں کا پہلا نظارہ......

کرن پھوٹتے ہی ہمارا قافلہ چل کھڑا ہوا۔میرے باپ آٹھ کہاروں والے میانے میں ضلع دار اور اقربا گھوروں پر میرے بڑے بھائی مشیر احمد خاں رام پوری' اور میں ہتنی پر اور باقی تمام خدمت گار سپاہی اور گرڑیے پیدل۔

پانچ چھ میل کی مسافت طے کر کے جب ہمارا قافلہ حدود سیدا پور میں داخل ہوا تو چوں کہ اس سے پیش تر میں نے کبھی گاؤں دیکھا ہی نہیں تھا۔میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

www.pdfbooksfree.pk

1۔ زمیندار کا مقرر کردہ تحصیلدار 2۔ وہ پاسی جو گاؤں میں پولیس کے فرائض انجام دیتے تھے 3۔ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا تخت گاؤں جس کا منصب تھا چاندی کا پرخالہ۔

اللہ اللہ تا حد نظر جھومتے لہلہاتے اور گنگناتے کھیت کھیتوں میں دھرتی ماتا۔کی اگی ہوئی تمنائیں اور مستجاب دعائیں بیچ بیچ میں مانند زلف بتاں پیچ وخم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں چلتی پیڑیوں اور پرابیوں کی بدولت گہری گہری نالیوں میں شہر کے چولہوں کو آگ بخشنے والے بہتے پانی کی کڑ بڑ کڑ بر سنہری اور ملائم کرنوں سے جھیل کی موجوں کی جھلمل جھلمل ساحل پر خوب صورت مرغابیوں کی قطاریں فرفشاں اور موجوں میں ان کی رہ رہ کر ڈبکیاں اور ملائم دوش پر کھیتوں کی تراوٹ اور بالیوں کی خوش بو اٹھائے ہوئے ٹھنڈے جھونکوں کی پاکیزگی و لطافت......اور کھیتوں سے دور کچے کچے لپے تپے مکانوں کے چھپر اونچے اونچے کھلیان نکائیکرنے والی جوان جوان عورتیں' اور لدر گدر چھوکریاں ادھر طوفان ادھر اٹھان۔ ان کے لال پیلے لہنگے اودی اودی چندریاں ان کے خالص ہا اور مسلسل محنت کے پروردہ چھلکتے شاداب چہرے اور گٹھے گٹھے چٹکتے بدن ایسے بدن کی پوری کسمسا کر انگڑائی آئے تو جلد مسک کر رہ جائے اور دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھومیں مچائے کہ انہیں چھو کر بھ دیکھا جائے کہ یہ بنی ہیں کن عناصر سے یہ سماں دیکھ کر میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں رگ رگ میں بشاشت کے فوارے چھوٹنے لگے۔ نچلے پپوٹوں کے نیچے خنکی دوڑ گئی آنکھیں جیسے ایک دم سے بری ہو گئیں نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سرخی نظر آ گئی۔ پور پور میں تازگی انگلیاں چٹخانے لگی۔ سانس لینے کا غیر محسوس عمل ایک محسوعیاشی بن گیا۔ اور میرے جسم کے اندر پو پھٹنے لگی سویرا ہو گیا۔

اسی عالم میں ہمارا قافلہ کھیتوں کے پیچ وخم سے گزرتا......صدا ہاز میں بوس سلاموں کا صرف ایک سر کی جنبش سے جواب دیتا......تتنی کی بار بار بڑھتی ہوئی سونڈ

www.pdfbooksfree.pk

میں ٹوٹتے گنوں کی چٹاخ چٹاخ سنتا کورے پنڈوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا......
اور پیتل کی جھلکتی چھلکتی گاگروں کے نیچے صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی کمروں کی لچک
دیکھتا ہوا بالآخر تھانے پہنچ گیا۔

تعلقہ داروں اور زمین داروں کی قیام گاہ

ہمارے تھانے پہنچتے ہی رعایا جوق در جوق آنے اور ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں
چھو چھو کر نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپوں کو سامنے کے کھرے تخت پر بری
بے پروائی کے ساتھ کھنا کھن اور چھنا چھن اچھینکتے جاتے۔......اور تھوڑی دیر میں پیاز
کے قتلاوں کے سے چمتے سکوں کا تخت پر انبار لگ گیا پہاڑی سی بن گئی۔

رعایا جب روپیہ برسا چکی تو سیداپور کے پستہ قد مہاجن بھلو شاہ ہاتوں میں سونے
کی انگوٹھیاں پہنے اور چاندی کی شام اور لوہے کے گولے کی ہروتی باندھے جھکے جھکے
آئے......اپنے خادم کے سر سے روپوں کا بھرا ہوا چوٹی دار تھال اتارا......اسے ہم
دونوں بھائیون کے سر پر تین بار بطور صدقہ گھمایا گیا اور پھر ایک برے کھنا کے سے
تھال کا تمام روپیہ فرش پر گرا دیا خالص چاندی کے کھنکتے روپے فرش پر ادھر ادھر ناچنے
اور دوڑنے لگے......اور ہمارے خدام نے حسب دستور وہ تمام روپے لوٹ لیے۔اس
ہنگامہ رقص طلا کے بعد داب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔......بابا جبر علی فقیر دستر خوان
پر اپنے ہات کا پکایا کھانا چننے لگا۔اور دم بھر میں ہمارے مرادا ہیر اور برہمن کاشت کار
اپنے اپنے سروں پر پکوان اٹھائے ہوئے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے
پوریوں کچوریوں بھانت بھانت ترکاریوں تلی مچھلی کے ٹکروں گلگلوں پھلکیوں دودھ
دہی کی ہانڈیوں مٹھائیوں اور رساول کی بڑی بڑی لٹیوں کا ایک انبار لگ گیا۔

خاصہ تناول فرما کر میرے باپ نے حسب معمول اندر کے کمرے میں جا کر سو
گئے......میں بھی تکان محسوس کرنے کی بنا پر چاہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کے واسطے لیٹ
جاؤں کہ باہر سے علام گیر پھپھا کی گرجتی ااواز سنائی دی۔باہر گیا تو دیکھا کہ ایک سر

سے پاؤں تک جھریوں میں لپٹا ہوا کاشت کار اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے پھپھا سے اپنی زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ خان بہادر صاحب آپ خود میری سامنے کھڑی ہوئی بیوی کو دیکھ لیں اس کو سوکھے کا روگ لگ گیا تھا۔ اس کی دادارو نے مجھ کو کھک کر دیا ہے آدھا لگان اب لے لیجیے آدھا دوسری فصل پر ادا کر دوں گا۔

---

[1] لکشمی دیوی اپنی اس اہانت کا مجھ سے اب انتقام لے رہی ہے۔ لیکن یاد رکھو دیوی جی میری پیشانی تمہاری چوکھٹ پر کبھی جھکی ہے نہ جھک سکے گی۔ [2] وہ ہمارے دس پانچ معلم کاشت کاروں میں سے ایک تھا جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا تھا۔ [3] پھپھا ہمارے پورے علاقے کے صدر ضلع دار بے حد شعلہ خو دشنام کار انسان تھے۔

اس کا یہ عذر سن کر پھپا نے اس کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا اب ایک آنہ بھی کم نہیں لوں گا پورا لگان ادا کرو پورا...... اس بوڑھے پھوس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا بھگوان کی قسم آدھے لگان سے زیادہ میرے پاس ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی پھپا اٹھے اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر اس زناٹے کا مارا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور اس کی مرجھائی ہوئی بیوی کی آنکھوں سے دھل دھل آنسو بہنے لگے۔ اس کے بیٹے نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔ گرے ہوئے بوڑھے نے اپنی روتی ہوئی بیوی اور اپنے جھینپے ہوئے بیٹے کو ایسی نظر سے دیکھا کہ میری سانس میرے گلے میں الجھ گئی اور پھر ایک دردناک چیخ مار کر میں تھانے میں داخل ہو کر اپنے سوتے ہوئے باپ کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا...... میری ہچکیوں سے ان کی آنکھ کھل گئی اور انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ انہوں نے مجھ سے پوچھا ارے کیا ہوا ارے کیا ہوا۔

میں نے اس بوڑھے کسان کی حالت اور پھپا کی شہادت کا سارا ماجرا بیان کر دیا...... میرے باپ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں صالح محمد خاں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کسان کو میرے پاس بلا لاؤ وہ بوڑھا میرے باپ کے قدموں میں گر کر کہنے لگا دہائی

خاں صاحب بہادر کی۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اپنے فرزند کے ساتھ آ گئی۔ اور وہ دونوں بھی زار قطار رونے لگے۔ میرے باپ نے انہیں تسلی دے کر گڑ بیتے کو حکم دیا کہ ماتا دین پٹواری کو بلاؤ پٹواری آ گیا تو انہوں نے فرمایا ماتا دین سیا ہے میں اس مراد کے لگان کی پوری بیباقی درج کرلو اور اسی وقت رسید اس کے حوالے کر دو......

میرے باپ کے ترحم آمیز برتاؤ کو دیکھ کر بوڑھے کسان اس کی لاغر بیوی اور اس کے بیٹے کی آنکھیں شکریے کے آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے زخم پر مرہ رکھا دیا ہے اور جب وہ تینوں آدمی جے کھان صاحب بہادر کی اے بھگوان کھان صاحب بہادر کا راج گنگا دھار تک رہے کہتے چلے گئے میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے مجھے اپنے باپ کی صورت اور بھی اچھی لگنے لگی اور عالم گیر پھپا سے ایسی نفرت ہوئی کہ جب میرا زمانہ آیا تو بڑے لطیف حیلے کے ساتھ میں نے ان سے ضلع داری نکال کر اپنی پھپّی زاد بہن کے فرزند خواجہ احسن خاں کے سپرد کر دی لیکن خواجہ احسن خاں بھی برے ثابت ہوئے پھپا ننگی تلوار تھے تو وہ تیکھی چھری نکلے۔ غرض کہ...... رعایا کو آرام نہیں مل سکا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا...... جب رات کا وقت آیا تو میں کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہو گیا اور کہانیاں سنانے والے کہانیاں سنانے لگے۔

میرزا ایوب بیگ اور بنو خاں کے بعد جب رجب علی ظہور علی خاں کی باری آئی و انہوں نے ایسی دلچسپ کہانی سناء جس کے بعض حصے اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی سن لیں:

''ایک بار اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک خوبصورت گبھرو جوان تاروں کی چھاؤں میں' نوکری کی تلاش کرنے کے واسطے اپنے گاؤں سے ایک شہر کی طرف روانہ ہوا......

لق و دق میدانوں گہری ندیوں اور گھنے جنگلوں کو طے کرتا وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچا جب کی چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے۔ تو دیکھا کہ حاشیہ شہر کے ایک چھوٹے

سے مکان کی دیوار پر ایک کبوتر بیٹھا دم ہلا رہا تھا بھوکا پیاسا تو تھا ہی جی میں آیا کہ کبوتر کو مار کر بھونوں اور کھا جاؤں۔اس تمنا میں دن سے فیر کر دیا......مقدر کی بات ہے کہ گولی کھا کر کبوتر ادھر نہیں ادھر مکان کے اندر گر گیا۔سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوق کا کندہ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا دیوار سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کوئی نظر نہیں آیا دھم سے کود پڑا۔کودتے ہی دیکھا کہ ایک خوب صورت جوان پٹاخا سی عورت' دالان سے نکل کر بال بکھرائے اس کی طرف چلی آرہی ہے سپاہی سٹی بھول گیا۔

ا دراصل وہ تمام نظام ہی اس قدر ظالمانہ تھا کہ اس سے کسی نوع کی شرافت کا تصور ہی وابستہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔خدا بھلا کرے حکومت ہندوکا کہ اس نے ہر پٹی دار ہر نمبر دار اور ہر تعلقہ دار ہر جاگیر دار اور دیسی ریاستوں کے ہر تاج دار کو دار پر چڑھا کر اللہ کے کروروں بندوں کی گلو خلاصی کر دی۔ہر چند تنسیخ جاگیر داری سے تباہی مجھ پر بھی آئی۔لیکن کوئی پروا نہیں ایک میری بربادی سے نئے بے شمار انسانوں کو آباد کیا۔ جی ہاں آنکھ گئی پیر گئی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

زمین نے قدم پکڑ لیے۔ بھاگنے کی طاقت سلب ہوگئی کبوتر کو بھول گیا اور اس مورتی کو دیکھنے لگا......عورت ڈھیٹ تھی ڈری نہیں اور بانکے سپہیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی "پرائے گھر میں کود پڑے دھم سے یہ کون سی بھل منفسی ہے ت کوئی چور ہوا ٹھائی گیرے ہو ہت چھیرے ہو ڈاکو ہو' اچھا چھکا ہوا یا دیوانے؟"...... سپاہی نے سر جھکا کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔اور کہا جو چاہو سزا دے لو۔بھوک میں مجھ سے بڑی بھول ہوگئی......عورت نے کہا میں نے تمہاری سزا سوچ لی ہے ادھر آؤ میرے پیچھے پیچھے دالان میں سپاہی نے دل میں کہا کہ اس کی مار میں بھی مزا آئے گا۔ا سکے پیچھے گردن ڈال کر روانہ ہو گیا...... دالان میں پہنچ کر عورت نے کہا چٹائی پر بیٹھ جاؤ۔سپاہی چٹائی پر بیٹھ گیا تو اس نے یہ کہہ کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیا کہ پہلے کھانا کھلاؤں گی پھر تمہیں اس گھر میں کودنے کا مزا چکھاؤں گی۔جب سپاہی کھانا کھا کر

ہاتھ دھو چکا تو عورت نے کہا اب میں تمہاری ناک چھید وں گی اور اس میں نکیل ڈال دوں گی سپاہی اس کا منہ دیکھنے لگا اس نے گردن جھکا دی ...... پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس عورت نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا تم کون ہو گبھرو کی سانس تیز تیز چلنے لگی اس نے اپنا نام بتایا عورت نے پوچھا کہ کس کام کے لیے یہاں آئے ہو اس نے کہا میں سپاہی ہوں کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں نوکری کروں گا۔ عورت اس سے الگ ہوکر بیٹھ گئی ۔ اس نے منہ سے نکل گیا ارے عورت نے مسکرا کر کہا تمہاری سزا یہ ہے کہ تم آج سے میرے نوکر ہو گئے ہو کھانا پینا کپڑ التا میرے ذمے رہے گا ...... تنخواہ تمہاری ایک روپیہ روز ہو گی تم کو منظور ہے سپاہی نے ریشہ خطمی ہو کر کہا جان و دل سے منظور ...... عورت نے کہا لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میرے میاں کے آنے کا وقت ہو گا اس سے آدھے گھنٹے سے پیش تر ہی تم میری سہیلی کے گھر جا کر ایک کوٹھری میں سو جانا جب وہ چلا جائے گا تو میں تمہیں بلا لیا کروں گی ...... یہ دیکھو کونے میں سہیلی کے گھر کی کھڑکی ہے ...... یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی سہیلی کو بلا لائی اور ساری بات اس کو سمجھا دی ......اور پھر اسنے سپاہی سے کہا کہ شام ہوتے ہی نہا دھو کر میری سہیلی کے ساتھ ایک تنبولی کی دکان پر جانا اور ایک روپے کی گلوری مانگنا ......اور گھوم پھر کر پھر گھر چلے آنا ...... چناں چہ شام ہوتے ہی سپاہی نہایا دھویا عورت نے اس کو ایک ریشمی لنگی اور ململ کا دھلا ہوا ایک کرتا دیا اور ایک حریب اس کے سر میں تیل ڈالا کنگھی کرنے میں عطر ملا اور اپنی سہیلی کے ساتھ بازار روانہ کر دیا۔ سہیلی نے دور اشارہ کر کے تنبولی کی دکان بتا دی سپاہی عطر کی مہک میں ڈوبا گیا اور ایک تو پیہ اس کے تھال میں پھینک کر کہا اے تنبولی ایک روپے کی گلوری۔

اس زمانے میں ایک پیسے کی گلوری ملا کرتی تھی اس لیے تنبولی ایک روپے کی ایک گلوری سن کر بھونچکا رہ گیا دل میں سوچنے لگا ہو نہ ہو یہ کوئی بھولا بھالا رئیس زادہ ہے۔ لیکن اس نے سوچا رئیس زادے بازاروں میں لنگی باندھے کہاں پھرتے ہیں۔ سپاہی

نے تمبولی کو سوچتے دیکھا تو گرج کر کہا اے تمبولی ایک روپے کی ایک گلوری جلدی کر۔۔۔۔۔تمبولی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میاں تم کون ہو اور اس نے کہا ہم سپاہی ہیں سپاہی'تمبولی نے دریافت کیا میاں کس ڈیوڑھی پر نوکر ہو؟سپاہی نے کہا پورب کی طرف سے آتے ہوئے جو سب سے پہلا لال اینٹوں کا مکان ہے اس مکان کی مالکن کا سپاہی ہوں۔۔۔۔۔تمبولی نے گلوری تو اس کو دے دی مگر دل میں سوچنے لگا کہ یہ سپاہی جو مکان بتا رہا ہے وہ تو میرا ہی مکان ہے کیا میری عورت بگڑ گئی ہے لوگوں نے سچ کہا تھا کہ تم ادھیڑ ہو کر جوان عورت سے شادی نہ کرو نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ان تمام باتوں پر غور کر کے تمبولی نے وقت سے پہلے ہی اپنی دکان بند کر دی اور افتاں وخیزاں جا کر اپنا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میاں کے قبل از وقت آنے پر تمبولن گھبرا گئی۔سپاہی نے بندوق اٹھالی تمبولن نے بندوق چھین لی اور کہا جلدی سے بندوق سمیت اس سامنے والی کھٹیا میں جا کر کود پڑو۔۔۔۔۔سپاہی کھٹیا میں کود پڑا۔تمبولن نے سر میں پٹی باندھی اور دروازہ کھول کر کراہنے لگی تمبولی نے پوچھا دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی تمبولن نے کہا ارد یکھ میرے سر کی پٹی درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے۔گڑ مڑائی پڑی تھی کھٹ کھٹ سن کر بڑے جتن کر کے اٹھی ہوں تمبولی چپ منہ گھر میں گھسا اور چراغ ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔تمبولن نے کہا یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے کہ سارے گھر میں چراغ چھوچھو کرتا پھر رہا ہے تمبولی نے بگڑ کر کہا تیرے یار کو ڈھونڈ رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ سنتے ہی تمبولن نے آنکھیں پھاڑ کر اور چھاتی پر گھونسا مار کر کہا یا اللہ یہ بھی سننا تھا مجھ کرموں جلی کو۔ارے میں اور یار اگر میں ایسی ہوں تو بجلی گر پڑے مجھ پر۔علی کی تیغ ٹوٹے مجھ نگوری پر۔۔۔۔۔تمبولی نے کڑک کر کہا اگر تیرا کوعیار نہیں تو پھر میری دکان پر ایک روپے کی گلوری کھانے والا کون آیا تھا۔اور میرے مکان کا پتہ یہ کس نے بتایا تھا؟تمبولن نے سر پیٹ کر کہا ارے مورکھ اب میں بات کی تہہ کو پہنچ گئی تو یہ سارا سوانگ س مورے ابھرا ہوا ہے جو چاہتا

ہے مجھ سے تجھ سے چھٹم چھٹا ہو جائے تو مجھے فارخطی دے دے اور تھوتھو سات سمندر پار پھر وہ مجھ سے بیاہ رچا لے۔ ارے اس موئے کے منہ کو لوکا۔ اگر تو کدا نہ کرے شیطان کے کان بہرے مجھے چھوڑ بھی دے گا تو پھر بھی اس اٹھائی گیر کے منہ پر نہیں تھوکوں گی۔ وہ تو دو کوڑیکا بچوڑا ہے میں تو کان پکڑ کے اور توبہ تو بہ کر کے کہتی ہوں کہ تیرا منہ دیکھ کر اب کسی ہفت اقلیم کے بادشاہ کا منہ بھی نہیں دیکھوں گی۔

تنبولی نے کہا بتاوہ ہے کون بد معاش؟ تنبولی نے منہ پر انگلی مار کر کہا میرے قریب کان لا۔ اور پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سارا بس اسی بد معاش کا بویا ہوا ہے۔ اس کے گھر والی تو جانتا ہے کہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے۔ خود اس نے میرے کان میں کہا تھا کہ میرے خصم کا جھ پر دانت ہے ہشیار رہنا۔ سدا تو ابھی چپ رہنا میں اپنے چاروں بھائیوں کو بلا کر اس کی ایسی مرمت کروادوں گی کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تنبولی کو یقین آ گیا کہ بس یہی بات ہے۔ اور اسی بد ذات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے اس نے پشیمان ہو کر سر جھکا لیا اور جب تنبولن نے دیکھ لیا کہ اس کا جادو چل گیا ہے تو وہ امٹھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اور تنبولی کہنے لگا کہ اری مجھ سے بڑی چوک ہو گئی کہ اول فول بکنے لگا۔ ماف کر دے مجھے تنبولن نے ڈھیلے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا جا برے پیر کی نیاز دلاؤں گی بزاز سے لڈو لے آ...... یہ انہیں کی برکت ہے کہ میری بات تجھ مورکھ کی سمجھ میں آ گئی۔

تنبولی جب باہر چلا گیا تو لڈو لانے تنبولن نے کھٹیا میں منہ ڈال کر کہا تھوڑی دیر سسیتا بیٹھا رہ ابھی تجھے تازے لدو کھلاؤں گی اور جب موا بڈھا چلا جائے گا تو تجھے باہر نکالوں گی۔ اسکے بعد کھڑکی میں منہ ڈال کر اپنی راز دار سہیلی کو بھی اس نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور یہ سارا ماجرا اس کو سنا دیا سب سے پہلے اس کی سہیلی نے اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی پھر تینوں نے مل کر لڈو کھائے۔ اور جب آدھے سے کچھ

www.pdfbooksfree.pk

کم لڈو رہ گئے تو اس نے اپنے میاں سے کہا کہ تو بڑا نشانہ باز بنتا ہے۔تو بھی کھٹیا کے اندر لڈو پھینک' اگر ایک لڈو بھی نیچے گر گیا تو ہار جائے گا۔اور سانولیا اتنے ہی لڈو تو پھر لائے گا۔

تنبولی نے ایک ایک کر کے تمام لڈو کھٹیا کے اندر اتار دیے اور قہقہہ مار کر کہا دیکھا میرا نشانہ تنولن نے اٹھ کر تنبولی کی پیٹھ ٹھونکی اور پڑوسن کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

جب دوسری شام آئی تو سپاہی نہا دھو کر پھر تنبولی کی دکان پر پہنچا سپاہی کو دیکھ کر تنبولی کی آنکھون میں خون اتر آیا مگر وہ غصہ پی گیا......سپاہی نے دو روپے جیب سے نکال کر اس کے تختے پر پھیک دیے اور کہا اے تنبولی دو روپے کی ایک گلوری......تنبولی نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا دو روپے کی ایک گلوری!......سپاہی نے کہا ہاں ہاں دو روپے کی ایک گلوری......تنبولی نے گلوری دے کر کہا میاں سپاہی یہ تم کو یہاں روپے دے کر کون بھیجتا ہے سپاہی نے کہا ارے وہی لال اینٹوں کے مکان والی جس نے ہم کو نوکر رکھا ہے تنبولی نے پوچھا میاں سپاہی کل بھی وہاں گئے تھے؟ اس نے کہا گئے کیوں نہیں تھے ہم تو نوکر ہی اس بات کے ہیں اور یہ کہ کر اس نے گزشتہ رات کا سارا ماجرا اس کو سنایا اور پھر قہقہہ مار کر کہا عورت ہو تو ایسی ہو اس نے اس سالے کے ہاتھوں سے مجھے کھٹیا میں لڈو بھی کھلوا دیے......تنبولی کا خون کھولنے لگا اور سپاہی جانے لگا تو اسنے دانت پیس کر کہا میاں سپاہی آج بھی وہاں جاؤ گے؟ سپاہی نے بگڑ کر کہا یہ بیر بیر (بار بار) کا پوچھنا کیا ابے کہہ تو دیا کہ ہم تو نوکر ہی اسی بات کے ہیں۔

تنبولی کے تن بدن میں آگ لگ گئی جلدی جلدی دوکان بند کی راستے میں مٹی کے تیل کا پھیا لیا۔دیا سلائی جیب میں رکھ لی گھر آتے ہی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تنبولن نے یار کو صندوق میں چھپا کر دروازہ کھول دیا اسنے گھر میں قدم رکھتے ہی تنبولن کو گالیوں پر دھر لیا۔تنبولن نے کہا ارے کیا آج چرس پی کر آیا ہے۔تنبولی نے کہا تیرا خون پینے آیا ہوں۔کل تو نے اپنے دھگڑے کو کھٹیا میں چھپا کر میرے ہات سے اس

حرامی کولڈو کھلوائے۔ لے چھنال آج میں دربار ہی پھونکے دیتا ہوں ی کہہ کر اس نے ہر طرف تیل چھڑک کر مکان کو آگ لگا دی۔اور گھر دھڑ دھڑ جلنے لگا پڑوسن بھی آ گئی دو ایک پڑوسی بھی دوڑ کر آ گئے تنبولن نے ان سب سے کہا کہ ارے لوگو یہ تو دوانا ہو گیا ہے ارے جس صندوق میں اس موئے کے باپ دادا کے کاغذات گھر کا سارا زیور اور مال تال رکھا ہوا ہے اس تو ہاتھ لگا کر نکال لاؤ ابھی ادھر آگ نہیں گئی اگر وہ صندوق بھی جل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پڑوسیوں نے مل کر وہ صندوق باہر نکال کر انگنائی میں رکھ دیا۔اور جب صندوق باہر آ گیا تو بی تنبولن نے اپنے بال نوچ نوچ کر اپنی چھاتی کوٹ کوٹ کہنے لگی ارے خدائی خوار تیرے پورے ہو گئے اس بدمعاش کے ارے میری سہیلی سے پوچھ کر اس کی تہہ میں کیا بات تھی تنبولی دوڑا ہوا سہیلی کے پاس گیا۔اس نے اس کے کان میں کہا کہ جب تو کھٹیا میں لڈو پھینک رہا تھا تو میرا پاپی خصم موکھے سے جھانک رہا تھا۔اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھا۔اور اپنے گھر گے کو تیرے پاس بھیج دیا کہ وہ تیر سامنے رات کی ساری بات دہرا دے اور تجھ کو یقین آ جائے کہ تیری بیوی بگڑ چکی ہے اور ڈھگرا پالے ہوئے ہے اور آخر کو تو اس کو فارخطی دے دے اور وہ گل چھڑے اڑانے لگے۔وہ جو کہتے ہیں کہ بات پاچھ پتا مار کے تو نے ٹھنڈے دل سے بات نہیں سنی' اور تیسے میں آ کر لاکھ کا گھر' خاک میں ملا دیا......تنبولی سر پکڑ کر خاک پر بیٹھ گیا۔اور ندامت کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔اتنے میں تنبولن آئی اور کہا اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت دیکھ یا تو نے اگر میرا ڈھگرا یہاں ہوتا تو اس کی جلی ہوئی لاش تو تیرے سامنے آ جاتی۔

سہیلی نے آ کر کہا کہ ارے دیر نہ کر یہ سامنے موڑ پر ٹیٹوں اور ٹھاٹھروں کی دکان ہے جا کر کچھ ٹٹیاں اور ٹھاٹھر لے آ جسے مکان کے چاروں طرف لگا دیں اور جو ایک کوٹھری جلنے سے رہ گئی ہے اس کو بھی رہنے کے لیے اچھی طرح گھیر لیں......نہیں تو رہے گا کہاں۔

www.pdfbooksfree.pk

تنبولی ٹٹیاں اور ٹھاٹھر لینے کے لیے جب چلا تنبولن نے جھٹ صندوق کھول کر پسینے سے تر بتر سپاہی کو باہر نکالا اور گوپھے میں لے کر سہیلی کے گھر پہنچا دیا

بھیا ایسی ہوتی ہیں چلتر باز عورتیں یہ کہہ کر ظہور علی خاں نے کہانی ختم کر دی۔

چوتھی کی دلہن یعنی طلوعِ سحر کا دوسرا دیدار

چوکی دار کی آواز سے جب منہ اندھیرے آنکھ کھلی تو دیر تک یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آئی کہ آ کر میں ہوں کہاں...... آنکھیں مل مل کر بڑی حیرانی کے ساتھ بدلے ہوئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ کی حیرت کے بعد حافظے کا مطلع صاف ہو گیا تو یاد آ گیا کہ میاں کے ساتھ سیداپور آیا ہوں...... طلوعِ سحر کا مزا تو منہ کو لگ ہی چکا تھا۔ میں بستر سے اٹھا اور تھانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ تھانہ سطحِ مرتفع پر بنا ہوا تھا جس کی چھت سے تمام گاؤں نظر آ رہا تھا......

چھت پر گیا تو نسیمِ صبح میری رضائی میں آ کر مچلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی زیادہ تھی نہ کم ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچۂ خاطر چٹک گیا...... دل میں وہ راگنی چھڑ گئی جس کو انسانوں کے گلے یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے۔ دھندلکے نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیے۔ آسمان نے زمین پر موتی رول دیے...... ولولۂ نشاط نے مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا...... آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا کہ فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں۔ لیلائے شبِ مستی کی دھڑی اور افشاں چھڑا کر اور رنگین آنچل سے کاجل پونچھ کر سرخ شلوکا پہن رہی ہے۔ سرمئی وادیوں میں منقش کے خیمے نصب ہو رہے ہیں۔ تارے کانپ کانپ کر کجلائے جا رہے ہیں۔ افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن نور کا دائرہ گھوم رہا ہے۔ اور اس کے گرد ایک سنہرا حالہ بنتا چلا جا رہا ہے۔ اور چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گریبان مسکنے لگا ہے۔ اور مسکتے مسکتے چر سے پھٹ گیا...... پھر وہ دائرہ نور سونے کا تھال بننے لگا۔ تھال کا ایک سرا کسی غرفے سے جھانکنے والی پیشانی کے مانند

دور سے دمکنے لگا۔ پھر اس کو ایک سیاہ جوتا صاف کرنے لگا......پھر وہ جاتا غائب ہو گیا......آدھا تھال سامنے آ گیا......اور ایسا نظر آیا کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنویں سے نکل کر جگمگا رہا ہے پھر کیا تھا چڑیاں چہکنے ڈالیاں کھلنے اور مرغان سحر بانگ دینے لگے۔ کعبہ نور میں اذاں ہونے لگی آسمان دائرہ بجانے لگا۔ زمین چوڑیاں کھنکانے لگی۔ جھیل نے انگڑائی لی پانی میں سونا پہنے لگا دولھا گھوڑے پر سوار ہو گیا براتی دھومیں مچانے لگے اور کڑم دھم کڑم دھم کی زمین پر شہنابوں کی پھوار پڑنے لگی......اری آج آئے سیاں......مرے آج آئے سیاں سکھی سوئے بھاگ جاگے......مرے تن میں راگ جاگے......مری تھامنے کو بہیاں مرے آج آئے سیاں مرے آج اائے سیاں!!

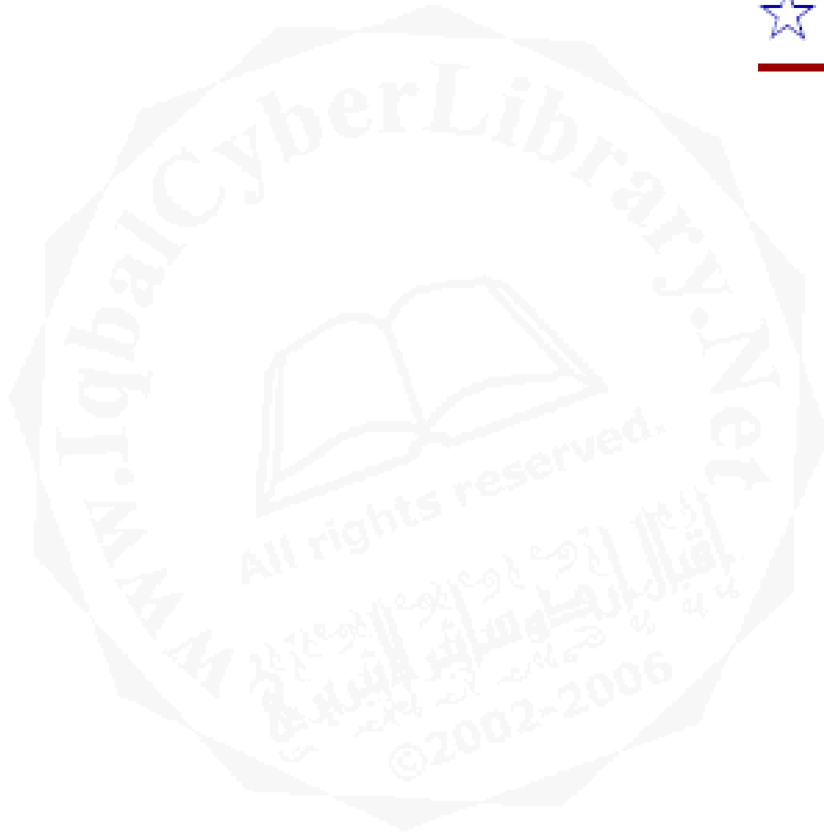
میرا ختنہ

لیجیے اپنی بسم اللہ کی طرح اپنے ختنے کا ذکر کرنا بھی بھول گیا۔ آگے بہت آگے نکل گیا کیا کروں اب سنائے دیتا ہوں کوئی پچواڑ تو ہے نہیں......میرا ختنہ کم سنی میں ہوا تھا۔ اور خوب یاد ہے کہ دادا میاں نے فرمایا تھا کہ دیکھ بیٹا رونے کی آواز منہ سے نہ نکلنے پائے......لیکن لال داڑھی کے جاں علی حجام نے گھوڑی چڑھا کر جب گھٹ سے میرا ختنہ کر دیا......میری چیخ نکل گئی۔ دادا میاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے......اور میں فرط شرمندگی سے گڑ کر رہ گیا......اور آج بھی دادا میاں کی پیشانی کے بل جب یاد آتے ہیں تو دل پر کٹاریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ہر چند میرے ختنے کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی......دیگیں چڑھی تھیں طوائفوں کے مجرے ہوئے تھے کشمیریوں نے نقلیں کی تھیں مگر میرے دل کی کلی مرجھائی سی رہی تھی۔ اسی مرجھاؤ کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو وہی میری ختنے کے وقت کی چیخ تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ختنے کی خوشی میں جس بوقت ملیح آباد کے ایک لہار نے ایک بڑی خوبصورت اور جھلجھلاتی کرچ بطور نذر پیش کی تھی تو اس کرچ کو ہاتھ میں لیتے ہی مجھ پر ایسا جنون طاری ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے غلام

زادے حسین بخش کے ننگے سر پر وہ کرچ کھچ سے ماردی تھی اور اس بے چارے کے سر سے دھل دھل خون بہنے لگا تھا خیر اس کی تو فوراً مرہم پٹی اور اس کے باپ کی منہ بھرائی کردی گئی تھی۔ لیکن میرے دل کا زخم بھر نہیں سکا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کاشمیریوں کی ہنسانے والی نقلیں بھی مجھ کو ہنسا نہ سکیں تھیں۔ دل ہی تو ہے۔





موسموں کے تاثرات اور میرے زمانے کے تہوار

موسم گرما

ارے پھٹے سے منہ کا موسم گرما...... دھوپیا دند کیا' دہکاریا...... پسینیا نچوڑیا' بھاڑیا' بھنبھوڑیا' تنوریا' چنگیزیا' چنگاریا...... اکل کھرا جل ککڑا گھنا...... دورھا' بردتا' ہبرا' ہبڑا' بھینگا' بڑدتا' شیاطین کی آنکھ کا تارا لوکا راج دلارا الاؤ کا گہوارہ' اور شعلوں کا فوارہ ...... خونی ریچھ' لاگو بھیڑیا اور بندیل سور۔

نفرت ہے مجھ کو اس محرور المزاج مغضوب' معتوب اور مردود شہدے سے...... اس کی صبحیں بھی چنگاریاں اس کی شامیں بھی کٹاریاں...... اس کے شعلہ خو آفتاب دریچہ افق سے ایک بدتمیز گنور کے مانند بھق سے نکلتا ہے اور نکل کر فوراً آگ برسانے لگتا ہے...... اس کی بے مہر کرنیں عیاذ اللہ...... گویا جلمی پاپی اور بوڑھے سود خوار لالہ رام لال کی نگاہ۔

اس کٹخنے چمار موسم میں جس حرام زادی لو کے جھکڑ غاؤں غاؤں' اور ہو ہو ہو ہو کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتویں جہنم کے گنڈے فرشتے آتشیں گرز مار مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔

جب یہ خبیث موسم آجاتا ہے تو دوپہر سے تپش تر ہی ہم سب بچوں کو مرغیوں کی طرح کڑی کڑی کر کے خس خانے میں بند کر دیا جاتا تھا......

سقفی پنکھے کی سریلی چوچوں کا رٹیٹوں پر پانی چھڑکے جانے کی جھنکار ننھی ننھی بوندیوں کی پڑکار...... خس کی سوندھی سوندھی' اور عطر خس کی بھینی بھینی مہکار...... ان سحر کاریوں کے آغوش میں ایسی ٹھنڈی میٹھی مہکتی اور گہری نیند آجاتی تھی کہ شام سے پہلے ہم میں سے کسی کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔

اور جب شام کو ہم خس خانے سے نکلتے تھے تو انگنائی کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوش بو ہمارا استقبال کرتی تھی۔ ہم سب بھائی بہن تختوں کے چوکوں اور آرام کرسیوں

پر آکر بیٹھ جاتے اور تاڑ کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے......تربوزوں اور خربزوں کی قاشوں بالائی کی قفلیوں اور آب خوروں کشمش کے تھلوں اور فالودے کے برف میں جھلے گلاسوں سے ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی۔ اور رات کو بڑے سے آنگن میں ہم سب کے پلنگ اونچے اونچے کھمبوں پر لٹکے ہوئے جھالردار پنکھوں کے نیچے بچھا دیے جاتے اور علاقے سے باری باری آنے والی عورتیں ا صبح تک پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔

موسم سرما

آیا میرا کنوارا جاڑے کا دوار!

آہا......جاڑا......چمپئی شربتی گلابی جاڑا......کندن سی دہکتی انگیٹھیوں کا گل زار

ا یہ بات مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پچھلے پہر دھماکوں سے میری آنکھ کھل گی تھی اور یہ دیکھ کر میرے دل پر سانپ لوٹ گیا تھا کہ ہمارے گھر کی مغلانی حیدری خانم نوخیز پنکھا جھلنے والی کی پیٹ پر یہ کہہ کر گھونسے مار رہی ہے کہ مردار پسنیا پنکھا جھلکے آئی ہے کہ پاؤں پسار کے خراٹے لینے کے لیے بوڑھی حیدری خانم کی بےمہری اور نوخیز پاسن کی بے کسی دیکھکر میرے دل پر اسی چوٹ لگی تھی کہ پھر میں سو ہی نہیں سکا تھا۔ اس واقعے کے بہت دن بعد ہمارے گھر کی کسی تقریب میں جب ایک طوائف نے یہ ٹھمری شروع کی تاری جیہوڈلاے جا گہ بنیا ڈلائے جاؤ بنیا ماری جمبوڈلائے جاؤ بنیا (پنکھا جھلتی رہو ورنہ ماری جاؤ گی) تو اس گدبدی نوخیز پاسن کی پیٹ پر حیدری خانم کے دھمادھم گھونسوں کی یاد نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہائے پرانی یادیں ہائے پرانی چوٹیں۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا!

لچکے پٹھے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دل دار ......دل کا سرور آنکھوں کا

نور......دھند لکے کا راگ......جھٹپٹے کا سہاگ......زلیخا کا خواب یوسف کا شباب ......خدیو بربط و چنگ شاہ زادہ رامش و رنگ روئی دوئی کا سیتا۔ مسلم کا قرآن ہندو کی گیتا......اور صبح کو سونے کا جال۔ رات کو چاندی کا تھال......

قصیر النہار طویل الیل......تنگ آستین دراز گیسو......موتی کی آب موتیے کی اوس ......رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی چہروں پر انگڑائیاں لیتی سرخی......مہکتے لحافوں کی نیند چٹکتے انگاروں کا ناچ......شمس درآستیں قمر جبیں......ٹھنڈی تارا ماتھے چاند...... ماہ روسوسن خو نکھرو لچکیلا چھوہرا چٹکتا' مدھ بھرا' بانکا ترچھا' نکیلا' لپیٹا' رسیلا' چھبیلا' سجیلا' سانولا' سلونا' اور سہانا جاڑا۔

ہائے وہ ماہ پوس کی کالی کالی زلفوں والی یخ میں جلی انگیٹھیوں کی سموئی ہوئی جادو بھری خاموش لمبی لمبی راتیں......وہ اونچے اونچے دروں کے بھاری بھاری پردے مسہریوں کے سامنے وہ تختوں کے چوکیچوکوں پر وہ مخمل کے گدے اور گاؤ تکیے اور تکیوں پر ٹیک لگائے اور پاؤں پر دوشالے ڈالے وہ گھر کی بڑی بوڑھیاں......دائیں بائیں چاندی کے اونچے اونچے اگال دان۔ رہ رہ کر کھلتے اور بند ہوتے پاندان اور وہ ڈلی کے کٹنے کی کٹا کٹ آوازیں دوسرے تخت پر وہ رضائیاں اوڑھے ہوئے کہانی کہنے والیاں۔ ان کے پیچھے اونچے اونچے موبافوں کی مامائیں اصیلیں' اور لونڈیاں باندیاں پشت پر اگردان بیچوں بیچ انگیٹھی انگیٹھی میں چٹکتے کوئلوں کی چٹکار اور سنہری آنچ کا ناچ۔

اور ہائے مواقع و مناظر کا بیان کرتے وقت کہانیاں کہنے والیوں کے وہ بار بار' نئے نئے روپوں میں ڈھلتے چہرے' آنکھوں کے بار بار بدلتے اشاروں' اور حسب حال بڑھتے گھٹتے ابھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ کہانیوں کا ان الفاظ میں آغاز۔

''کہانی سی جھوتی کوئی بات نہیں کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں۔ جھوٹ سچ کہانی

بنانے والے کی گردن پر کہانی بنانے والے پر عذاب سننے والوں کو ثواب...... آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار...... ایک تھا بادشاہ...... ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس بادشاہ کی ایک چاندسی بیٹی۔ سو اللہ کا کیا کرنا ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی ایک دن سہیلیوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ......"۔

ہر چند اب وہ دن ہیں نہ وہ راتیں لد چکے ہیں وہ زمانے بیت چکی ہیں وہ گھڑیاں' اور موت کی نیند سو چکی ہیں وہ کہانی کہنے والیاں۔ اور قبر کی جانب مڑ چکی ہیں میری عمر لیکن ان کہانیوں کے بھوتوں کے غل غپارے۔ ان کے اندر کے اکھاڑے۔ ان کی پریوں کے غول' ان کے گل فاموں کی ڈھول اان کے آگیا بیتا لوں کے اشارے' ان کی راگنیوں کے مڑتے دھارے۔ ان کے طوفان میں پھنسے بیڑے ان کی برساتوں کے دریڑے ان کے موتی برساتے سویرے ان کے ہونکتے جنگلوں کے اندھیرے۔ ان کے شاہوں کا جلال' ان کی شاہ زادیوں کا جمال ان کا فراق و وصال ان کی آہیں اور کراہیں' ان کے گانے اور شادیانے۔ میرے دل میں ٹوٹتے ہوئے شیشوں کے نکیلے ٹکڑوں کے مانند آج بھی چبھتے اور کھٹکتے رہتے ہیں۔ یا اللہ کیا کروں اے میرے بچپن کی اداس انگیٹھی!!

جن کو بھلا چکی ہیں ہماری جوانیاں
اب ان میں تجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

موسم برشگال

روم جھوم بدرو ابر سے پی درشن کو جی ترسے

رو م جھوم' بدرو ابر سے

ا میری نظم انگیٹھی ملاحظہ فرمایئے ۔ جو میرے کسی مجموعے میں چھپ چکی ہے ۔

او ہو جھومتی جمکتی' جھولتی' جھر جھراتی' جھم جھماتی' جھم جھم برستی' جوبن والی' جونتی برسات ۔ گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی گھومتی گھمرتی گنگناتی گمکتی' گاتی' گونجتی' گھڑ گھڑاتی' گھونگروالی برکھا۔

آسمان کو گھماتی زمین کو نچاتی' فضا کو چلاتی' شمس وقمر کو گہناتی' چوپای کو تھپتھپاتی' طوفان پر طوفان اٹھاتی زلفیں چھٹکاتی' کجریاں سناتی' کھیتیاں لہلہاتی' زمین کی پوریں چٹخاتی' اور چھڑے کو کڑے سے لجاتی برکھا۔ ابر سیاہ بیاباں دربیاباں گلستاں در گلستاں' گل چکاں' گوہر فشاں' رقصاں' پراں' غلطاں' رواں' رواں دواں' آسماں پا بجولاں' زمین کشاں کشاں لکے بال کشاد نعرہ زناں' اور سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں ۔

اف وہ بجلیوں کی کڑک وہ بدلیوں کی لٹک اور وہ بانکی دھنک ۔ وہ مینڈکوں کا شور اور وہ پروا کا زور اور وہ گھٹائیں گھنگھور...... وہ جھینگروں کی جھنکار' وہ موروں کی پکار' اور نہروں پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار...... وہ شاخ شاروں کی گلخپ وہ انبیوں کی ٹپاٹپ ...... وہ امیروں کے جھومتے جھولے' وہ الھڑوں کے گھومتے کولے...... وہ برستے گیت پر گیت' وہ مچلتی پیت کی ریت ۔ وہ یاروں کے چہچہے وہ نگاروں کے قہقہے...... وہ آڑی ترچھی پھواریں وہ ستاروں کی آریں آریں...... وہ ہوا کی گھوم وہ بوچھاڑ کی جھوم ...... وہ متوالی پی ہو...... وہ نشیلی کوکو...... وہ جگنوؤں کے غول وہ بارہ ماسوں کے بول...... وہ دوب کا مخمل وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل...... وہ جل تھل میدان وہ پرنالوں کا ہیجان ۔ وہ موجوں کی روانی وہ دھرتی بورانی...... وہ ماچھا جوں پانی وہ چھوکریوں سے چھیڑ خانی اور وہ ہاء زمانے ہائے جوانی ۔

اللہ اللہ وہ مچلتی گھٹائیں وہ چڑھتے دریا وہ گرجتے نالے وہ تھرکتے ولولے وہ کوکتی ترنگیں، وہ ابلتی امنگیں، وہ چہکتے رنگ......اور وہ زبردست و پرشور دونگڑے، اور ایسی گرجتی پروائی کی دھرتی بولے رام دھائی! جب موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا میں رسیاں تڑا کر انگنائی میں آ جاتا تھا عورتیں چیختی تھیں کہ ارے نہ بھیگ بخار آ جائے گا۔ میں کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ صحن کے گوشے گوشے میں قلقاریاں مارتا، دھومیں مچاتا اچھلتا کودتا، دندناتا تالیاں بجا بجا کر برسو رام دھڑاکے سے اور کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں کے نعرے لگاتا پھرتا تھا۔

جب پانی برس کر کھل جاتا تو، باورچی خانے سے برآمدے میں کڑھائیاں چڑھ جاتیں اور برساتی پکوان یعنی پوریاں کچوریاں، اردیاں، پھلکیاں وہی بڑے برہیاں چنے کا بھرتا، اندر سے گلگلے چیل دندان مصری اور مولی کے پتے پکنے لگتے تھے۔ اور انگنائی کی نہاء ہوئی کڑوی کڑوی خوشبو والی نیم کی بھیگی شاخوں میں جھولے دال دیے جاتے تھے۔ اور ہم سب لودیتی شوخیوں کے ساتھ جھولنے لگتے تھے۔ جن میں کچھ منہ بند کلیوں کے مانند کچی کچھ گدر اور کچھ ایسی جو الاکھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھرپور انگڑائی لے لیں تو انگیا کے بند ٹوٹ جائیں اور وہ مسک کر پارہ پارہ ہو جائے۔

ہائے وہ پاپی برکھا کے نکیلے کافر گیت...... جو ٹھنڈی ہوا اور رنگین فضا سے تیرتے میرے کانوں تک آتے اور میرے ملائم سینے میں کچھ سے چبھ جایا کرتے تھے۔ اور جب ان بولوں کے کٹاؤ ان دیکھے منظروں اور اجنبی مکھڑوں میں تبدیل ہو کر میری نظروں کے سامنے بڑی تیزی کے ساتھ، گزرنے لگتے تھے تو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ ان دیکھے پربت، یہ کھیت، یہ جل تھل میدان اور یہ اجنبی جگر جگر مکھڑے کس دیس کے ہیں۔ اور آخر اس وقت مجھ کو یہ رونا کیوں آ رہا ہے۔

ایسی برکھا رت میں ہماری انگنائی کے بیچوں بیچ ایک روز آنسوؤں اور ہچکیوں کا ایسا

موسلا دھار پانی برستا تھا کہ ہمارا گھر اس میں ڈوب گیا تھا۔

سنئیے اس کی داستان۔

ایک دن جس وقت کہ ہم لوگ جھول جھول کر کجریاں سن رہے تھے اور باورچی خانے کے برساتی پکوانوں کا نمکین دھواں نیم کی شاخوں کے نیچے مچل رہا تھا کہ میری کھلائی ہانپتی کانپتی لکڑی ٹیکتی آئیں گانے والیوں سے کہا بچیو ذرا ٹھہر جاؤ آج یہ پھوس بڑھیا گائے گی۔وہ سب کی سب پیچھے سرک سرک کر بیٹھ گئیں۔بڑی بی نے اپنے سر کی چادر پھینک دی اور ان کے سفید بال اڑنے لگے۔اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دردناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔گانا نہیں یہ نوحہ شروع کر دیا ہائے تمرے بنا برکھا ما سہائے ارے مورے کلکتے کے جویا اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے۔

اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھ کر میں جھولے سے کود پڑا ان کے سینے سے جا کر لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔میرے روتے ہی تمام گانے والی چھوکریاں بھی منہ پر پلو رکھ رکھ کر رونے لگیں۔گھر کی تمام خواتین انتہائی سراسیمگی کے ساتھ دوڑ پڑیں اور پوچھنے لگیں۔ارے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہو گیا ہے بڑی بی کوئی جواب بھی نہیں دے سکی تھیں کہ رونے کا شور سن کر میری انتہائی مغلوب الغضب پھپی نواب بیگم بھی دوڑی ہوئی وہاں آ گئیں۔اور بے حد غصے کے عالم میں کہنے لگیں بھاڑ میں جائے موا ایسا گیت ارے بڑی بی یہ نہیں دیکھتیں کہ منجھلا کس قدر پھکوں پھکوں رو رہا ہے۔اے آگ لگے ایسے گیت کو۔

بڑی بی جب یہ ڈانٹ پڑی تو ان کا لنا پتا دل جو پچاسی برس سے مسلسل دھڑک رہا تھا۔بری طرح زخمی ہو گیا۔انہوں نے اپنی بیٹھے ہوئے کنوؤں کی سی خوں بار آنکھیں

ا ہائے تمہارے بغیر برکھا اچھی نہیں لگتی اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں لائے۔یہ گیت حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں کہا گیا تھا۔اور میرے بچپن

www.pdfbooksfree.pk

میں جب برسات آتی تھی تو اودھ کی گلی گلی میں یہ گیت گایا اور دھوم سے ماتم کیا جاتا تھا۔ کیا انسانی تاریخ پیش کرسکتی ہے۔ حضرت جان عالم کا سا کوئی محبوب بادشاہ جس پر پون صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے ہوں اے جان عالم فرنگی نے آپ کو بھی تباہ کیا۔ اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے اتنے ہی برے بنا دیے گئے۔

آسماں را حق بود' گرخوں ببارد ' بر زمیں

اے میرے فرض شناس جفاکوش عدالت پناہ فقیر منش بادشاہ اے میرے شرافت سنج ہنرور نکتہ رس علم نواز ادب پرست شاعر۔ اور اے میرے صبح کے سپاہی وشہریار اور اے میرے شام کے موسیقار فن کار مالک! آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں گویا کا یہ پرپوتا جوش ملیح آبادی آپ کے آستان عالی پر سر رکھ رہا ہے اس بندہ درگاہ کا ناچیز سلام قبول فرمائیے اے فرشتہ خصلت و مظلوم آقا شاہاں چہ عجب گر بنوازگدا را!!

[1]ہائے بڑی بی کی آواز کا درد جب وہ اللہ کہیں تو اللہ کے لام کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتیں اور ایسے دبے اور دردناک کھٹکے کے ساتھ اللہ کہتی تھیں کہ گویا وہ اپنے کلیجے سے چبھا ہوا نیزہ نکال رہی ہیں۔

[2]ان کو ہم لوگ آپا اور مامائیں وغیرہ بنّن بی بی کہتی تھی۔ بڑی بی کے اس درد دل نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا' سب کی آنکھوں میں بیر ان جاری ہو گئے میری ماں نے چیخ ماری میری غضب ناک پھپی کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں دادی جان بھی منہ پر آنچل لے کر رونے لگیں اور گانے والی چھوکریوں کا تو برا حال ہو گیا' اور گھر کا ذرہ ذرہ چیخنے لگا۔ ''اللہ تمہیں لائے ہائے اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے' اللہ تمہیں لائے......''

اٹھا میں اور تھراتی آواز میں کہا بن بی بی میں سر جھکائے دیتی ہوں چاہو تو مجھ کو آج نہیں تو کل مری بڑھیا کو جی بھر کے مارلو۔ میں تو آدھی سے زیادہ قبر میں اتر چکی ہوں۔ لیکن بنّن بی بی ہات جوڑ کر کہتی ہوں ذرا انصاف سے کام لو اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر سوچو کہ برکھا رت مینہ برسائے ار جان عالم پیا کی یاد نہ آئے۔ ہائے قیصر باغ

میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھے ہوئے ہوں میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ بہاریں...... ہائے میرے جان عالم پیا موئے فرنگیوں نے گلا گھونٹ کر تم کو مار ڈالا...... ہائے لکھنو کا سہاگ اجڑ گیا ہائے قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب گئی ہائے شاہ زادیاں ٹھوکریں کھاتی پھرنے لگیں...... اتنا کہہ کر بری بی نے اپنی آنکھوں پر دوبارہ پلو رکھ لیا۔ اور رو رو کر گانے لگیں ہائے تمرے بنا ہائے تمرے بنا برکھا نا سہائے نا سہائے ارے مورے کلکتے کے جویا اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے''۔



ہولی!۱

یاد ش بخیر ایک زمانہ تھا کہ ہولی دوالی فقط ہندوؤں ہی کے نہیں ہمارے بھی تہوار تھے۔ ہولی کھیلنے کا بہت پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہر سال نئی پچکاریاں بنوائی جاتی تھیں بڑی بڑی دیگوں میں رنگ بھرا جاتا تھا۔ اور ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شور بور اور گھر کے تمام در و بام رنگین ہو جایا کرتے تھے۔

ہولی کھیلنے کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ ہماری رعایا میں سے دس بیس اونچے طبقے کی ہنو عورتیں صبح نو دس بجے ابیر گلال کے جھل جھل تھل تھال سروں پر اٹھائے ہمارے گھر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ میری دادی اور میری ماں کے ماتھوں پر رنگین ٹیکا لگا کر ان دوپٹوں کے پلوؤں پر رنگ چھڑک کر ہماری انگنائی میں حلقہ باندھ کر ہوری آج جلے چاہے کال جلے مورا کنور کنھا ءمو سے آن ملے!ہوری آج جل چاہے کال جلے۔ گانا شروع کر دیا کرتی تھیں۔ اور اس گانے کی گونج میں ایسی دھوم سے پچکاریاں چلنے لگتی تھیں کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور چراغ بتی پڑتے ہی ملیح آباد کے تمام ہلیارے پوریاں کچوریاں اور مٹھائیاں سروں پر اٹھائے گانے بجانے ناچنے اور ہڑک بجاتے ہمارے مردانے احاطے میں نذر کے واسطے آیا کرتے تھے۔ اور بڑی دیر تک بڑا چہلکس رہا کرتا تھا۔

۱؎ ایک دور وہ بھی تھا کہ ہندو مسلم شیر و شکر تھے رام رام اور السلام علیکم نے آداب عرض کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ کعبہ و کاشی نے ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ کوثر و گنگا کو ملا کر ایک گنگا جمنی عظیم لسانی تہذیبی اور ثقافتی سنگم تعمیر کر دیا گیا تھا مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہوار (صفحہ ۷۰ پر)

عام ہلیاروں کے بعد قرب و جوار کے ہندو زمین دار جن میں لالہ صاحب مادھو پور کی شخصیت بہت نمایاں تھی اپنی اپنی رعایا کے ساتھ آتے ان کا گانا سنوارتے اور مٹھائیوں کے تھال پیش کیا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد ہمارے وہاں ان کی دعوت

ہوتی تھی جس میں ایک دو بجے رات تک طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا رہتا تھا۔

دوالی

دوالی میں ہولی سے زیادہ دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا......آنگن کے ایک گوشے میں بڑے بڑے رنگین گھروندے بنائے جاتے تھے۔ان بلند و خوبصورت گھروندوں کو شیشوں اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا۔جن میں مرمرے چڑوے کھٹیاں گٹے اور مٹھائی۔کے حسین اور باریک کھلونے بڑے سلیقے کے ساتھ ہر طرف چن دیے جاتے تھے۔شام ہوتے ہی پہلے ان گھروندوں اور پھر پورے مکان میں چراغاں کیا جاتا تھا اور ہر گوشہ جگر جگر کرنے لگتا......اور عین اس وقت جب کہ چراغاں کی پلکیں جھپکاتی روشنی میں خالص گھی کے چراغوں کے رقصاں دھوئیں کی خوش بو ہوا میں تیرنے لگتی۔ عین اس وقت ہمارے بڑے دالان میں ڈھولک پر تھاپ پڑتی تھی اور ڈومنیاں اور مراثنیں گانا شروع کر دیا کرتی تھیں......آئی دوالی آئی دوالی مدھ ماتی جوبن والی آئی دوالی۔آئی دوالی۔آیا سر پر تھالی منہ پر لالی آئی دوالی آئی دوالی جگمگ جگمگ ملمگ کرتی دیپک والی آئی دوالی آئی دوالی آہاہا۔آئی دوالی اوہو ہو ہو آئی دوالی' ڈھولک دھم دھم پایل چھم چھم بھولی بھالی آئی دوالی آہاہا۔آئی دوالی اوہوہو ہو' آئی دوالی''۔

مناتے تھے اور دونوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ اپنی اپنی زبانوں میں خترپیونت کر کے ایک ہندوستان گیر زبان یعنی اردو کی طرح ڈال دی تھی اور آج یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔صد حیف کہ خبیث فرنگی نے جو ہندو مسلم نفرت کا پودا بویا تھا ہم آج اس کے پھل کھا کھا کر پاگل ہو چکے ہیں اور اس قدر پاگل کہ اب ہم ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں رہے ہیں کہ:

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ادھر ڈومنیوں کا تال سم ادھر مٹھائیوں کی چرندم خورندم......منہ میں مٹھائی

کانوں میں گیت زبان و گوش دونوں شیرینی میں غرق ......

ایک بار جب ادھر ڈومنیاں گا رہی تھیں اور ادھر میرے دانتوں کے نیچے مٹھائی کے کھلونے ٹوٹ ٹوٹ کر کرم کرم کی آواز پیدا کر رہے تھے تو ایک بات یاد آ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ ایک روز جب بڑی دھوم دھام کے ساتھ پانی برس رہا اور بڑے انداز بے پروائی سنک رہی تھی تو میرے ایک ملازم سالک رام حضرت امیر مینائی کا یہ شعر لہک لہک کر گا رہے تھے۔

سب کرشمے تھے جوانی کے کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ بلبلا ہے جاتا رہا

ا ہولی آج جلے یا کل جلے پروا نہیں مگر میرا کنور کنھائی مجھ سے ان ملے ہے گھر وروں کی تعمیر کا کام ایک ہفتے پیش تر شروع ہو جایا کرتا تھا۔

اس پر میں نے پوچھا تھا کہ سالک رام یہ بلبلا جاتا رہا۔ کیا کہہ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تھا بھیا جب ہم بلبلا کہتے ہیں) کہتے ہیں)تو منہ کے اندر بڑا مجا آوت ہے (مزا آتا ہے)۔

سو میرا ابھی اس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ ساتھ میں جب مٹھائی کے کھلونے میرے منہ میں ٹوٹ ٹوٹ کر گھل رہے تھے تو مجھے اپنے منہ کے اندر بڑا مجا آ رہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

شب برات

شب برات س ایک مہنہ پیش تر ہی ملیح آباد کا سب سے بڑا آتش باز جس کو بارود سے ایک ہاتھ اڑ جانے کی بنا پر ٹنڈا آتش باز کہا جاتا تھا۔ ہمارے واا سطے آتش بازی تیار کرنا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اور شب برات سے دو روز قبل ہی تمام آتش بازی ہمارے گھر میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اس کے سارھ ساتھ مروانے احاطے کے ایک گوشے میں ایک لمبی چوڑی اور گہری سرنگ کھود کر وہ اس میں بارود بھر دیتا تھا۔ اور سرنگ پر ایک قلعہ تعمیر کر دیتا تھا۔ اور شب رات کے دن غروب کے بعد جب تاریکیوں کا دامن ذرا بوجھل ہو جاتا تھا تو نوکروں چاکروں کی کڑی نگرانی میں کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے...... پھلجھڑیوں گھن چکروں] گولوں' اناروں' پٹاخوں' ہوائیوں ٹونٹوں اور اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ شائیں شائیں غائیں غائیں غوں غوں سرسراہٹ دھم دھم دھماک' تڑ تڑ تڑاق' اور شر شر شراق سے دور دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا......

شروع شروع میں آتش بازی کی روشنی پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی۔ لیکن جب اندھیر بہت زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا تو آتش بازی کا رنگ نکھر اور ابھر جایا کرتا تھا۔

[1] امیر نے تو یوں کہا تھا وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا۔ کوسا لک رام بلبلا جاتا رہا کہہ رہے تھے [1] آتش بازی اور عقائد میں بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح آتش بازی اور روشنی میں زرد اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے۔ اور تاریکی بڑھ جانے تو اس کا جوبن ابھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقائد علم وفکر کی روشنی میں جھینپے جھینپے اور مدھم مدھم نظر آتے ہیں اور جہل کی تیرگی میں جگمگانے اور مونچھوں پر تاؤ دینے لگتے ہیں۔

اس کے بعد کھانا چن دیا جاتا تھا۔ کھانا وانا کون کھاتا تھا بس ذرا سا منہ جھٹال کر ہم لوگ نیاز کے حلوے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

رمضان

جہاں تک کہ روزہ رکھنے کا تعلق ہے۔ رمضان ہمارے گھر آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جہاں تک کہ افطار کا تعلق ہے رمضان ہمارے گھر میں دھوم دھام سے آتا تھا کہ اور کہیں آتا ہی نہ ہوگا۔ عقائد کے اعتبار سے میرے آباؤاجداد اس قدر پکے مسلمان تھے کہ تمام دینی انجمنوں کو جی کھول کر ہر ماہ چندے دیا کرتے تھے اور قاسلام کے نام پر تن من دھن قربان کر دینے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ لیکن اعمال کے اعتبار سے رئیس زیادہ اور مسلمان بہت ہی کم تھے...... اور اسی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے باوجود ہمارے گھر میں دس بارہ قسم کی افطاری پکارئی جاتی تھی۔ اور از ان سے پیش تر مردانے صحن کے تختوں کے چوکوں پر چن دی جایا کرتی تھی اور کم وبیش سو ڈیڑھ سو اقرباواحباب اور ملازمین ہمارے یہاں روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ اقرباءواحباب میں اکثریت ہوتی تھی روزہ خوروں کی البتہ نوے فی صد ملازم روہ رکھتے تھے۔ اور افطار کے بعد شاعری کی محفل گرم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے سپاہیوں اور خدمت گاروں کے افطار کا انداز ساری دنیا سے نرالا تھا......
ایک بڑی سی چٹائی پر ان کی افطاری چن دی جاتی تھی۔ اور ان کے سامنے بچھوا تنبا کو کے چالیس پچاس ڈیڑھ خمے حقے رکھ دیے جاتے تھے۔ اور ان کی پشت پر چھ سات بھشتی بھری ہوئی مشکوں کے ساتھ کھڑے کر دیے جاتے تھے...... اور جب اذان ہوتی تھی تو وہ افطاری کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور حقوں پر ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور اس قدر کھینچ کھینچ کر وہ کڑ کڑ کڑ کڑ اک کڑ کڑ کڑ کر اک حقے پیتے تھے کہ بوڑھے تو بوڑھے جوانوں تک کے گالوں میں گڑھے پڑ جایا کرتے تھے۔ چلموں سے بالشت بالشت بھر کی لویں نکلنے لگتیں تھیں بسا اوقات چلمیں پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھیں ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے اور آخر کار وہ بے ہوش ہو کر گر جایا کرتے تھے اور اس عالم میں بھشتی اپنی اپنی مشکوں کے دہانے کھول کر ان کے منہ پر پانی چھڑکنے لگتے تھے

میرے باپ رمضان بھر میں کبھی پہلا اور کبھی منجھلا روزہ رکھتے تھے۔

میرے لڑکپن میں رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا اور روزے کے دن میرے باپ سہ پہر تک خس خانے میں سوتے رہتے تھے۔ جس دن ان کا روزہ ہوتا تھا خدا جانے گھر والوں کو کیا کیا تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ کہ اس دن صبح شام تک تمام گھر پر ایک دہشت ناک سناٹا چھایا رہتا تھا...... کسی کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی اشاروں اشاروں میں باتیں ہوا کرتی تھیں...... اور لونڈیاں باندیاں نیم کے نیچے لگھے لیے کھڑی رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیا اس کی شاخوں پر بیٹھ کر آواز نکالنے لگے۔

---

[1] صرف رمضان کے مہینے میں ان کو میرے باپ کے سامنے حقہ پینے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔

عید

آیا عید...... اللہ اللہ رمضان کی انتیسویں تا تیسویں شام...... صبح عید کا پیغام اور رویت ہلال کا اہتمام۔ایک بلند چبوترے پر گھر کی تمام بیبیاں چاند دیکھنے کی تمنا میں جمع ہو جاتی تھیں اور چاند نظر آتے ہی سب کی سب جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں اور درود پڑھتیں ہات اٹھا اٹھا کر زیر لب دعائیں مانگتیں اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرتیں اور پھر ایکدوسرے کے منہ پر چاند دیکھا کرتی تھیں!؎

؎اس رسم کی پشت پر یہ واہمہ تھا کہ چاند دیکھنے کے فوراً بعد جس کے چہرے پر نگاہ پڑ جائے وہ عورت بھاگوان ہو جاتی ہے اور پورا سال خوشی سے گزرے اور اس وقت اگر کوئی بھاگوان عورت موجود نہیں ہوتی تھی تو پھر کسی ہرے بھرے درخت یا پھول پر نگاہ جمالی جاتی تھی یا آرسی میں خود اپنے ہی منہ پر چاند دیکھ لیا جاتا تھا منحوس عورتوں کی طرح بچوں کے منہ پر بھی اس واہمے کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ سال بھر تک ٹھوکریں کھاتے اور گرتے رہیں گے۔اگر انتیس کا چاند نظر نہ آتا تو اس خیال سے عورتیں افسردہ پڑ جاتیں کہ ہو نہ ہو چاند کسی بلا میں پھنس گیا ہے۔اور جب تیسویں کو نظر آتا تھا تو سب کی سب بڑی سریلی آواز میں یہ کہنے لگتی تھیں کہ آج کی رات کا چاند صاحب کے گریبان میں چھپا آستین سے نکلا' آستین میں چھپا' گریبان سے نکلا۔ جیسے چاند کی بلا ٹلی ویسی ہی سب کی بلا ٹلے آمین'' (چاند دیکھنے کے فوراً بعد کسی رفیق کے چہرے کی طرف نظر اٹھانے کو (کسی کے) منہ پر چاند دیکھنا کہتے ہیں)؎حضرت اکبرالہ آبادی کے اس شعر سے دائن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ''عید مبارک عید مبارک'' نے نعروں سے درودیوار گونجتے چوڑیاں کھنکنے اور چہروں کے رنگ چہکنے لگتے تھے۔اور مردانے میں گولے چھوٹنے اور بندوقیں دغنے لگتی تھیں اور مرد تلواروں میں اپنا منہ دیکھنے لگتے تھے۔اور دروازے پر نوبت بجنے اور شہنائی کی آوازیں ہوا پر مچلنے لگتی تھیں۔

چاند دیکھ چکنے کے بعد میرے سرہانے کے اسٹول پر سنہری جرنیلی ٹوپی جھمکتا ریشمی جوڑا اور پائنتی کے ستول پر روئی کا ساڈاسن کا چمکیلا جوتہ رکھ دیا جاتا تھا۔

عید کی خوشی میں نیند کسے آتی ہے۔بس ایک ذراسی جھپکی سی آتی اور بار بار آنکھ کھل جایا کرتی تھی...... بار بار اپنی سنہری ٹوپی کے ایک ایک پھول کو دیکھتا جی میں آتا کہ ابھی ٹوپی پہن لوں خیال آتا کہ جھوٹی ہو جائے گی۔پھر تہ کیے جوڑے پر بری آہستگی سے بار بار ہاتھ پھیرتا اس کی نرمی کا لمس تمام بدن میں جھرجھری بن کر دوڑ جاتا پھر جوتے کی نظر کو پھسلا دینے والی چکنائی پر انگلیاں دوڑاتا۔اوراس کو سونگھ بھی لیا کرتا تھا۔

اور جب دھند لکے کا چمپئی رنگ فضا پر کروٹیں لے لے کر میرے خون گردش میں شریک ہو جاتا تھا۔تو سینے میں نشاط کی گھنٹیاں اِٹن ٹن ٹن ٹن بجنے لگتی تھیں۔اور میں بستر سے جست کر کے انگنائی میں اس طرح آجاتا تھا کہ جیسے اسپرنگ دار گڈا ڈبیا کا ڈھکن کھلتے ہی ٹن سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

بوٹ ڈاسن نے بتایا ہم نے ایک مضمون لکھا

ملک میں مضموں نہ چھپا اور جوتہ چل گیا

۱؎ آپ نے کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ بچوں کو عید کی خوشی کیوں ہوتی ہے۔مریا تو ناچیز خیال ہے کہ چوں کہ بچے ماں باپ کی زبان سے تواتر کے ساتھ یہ سنتے رہتے ہیں کہ عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے (صفحہ پر)

ہائے دل میں وہ صبح عید کی دھومیں انگنائی میں وہ رنگوں کی گھومیں۔وہ سقف و بام کے قہقہے، وہ زمین و آسمان کے چہچہے...... وہ رگ و پے میں خوشی کی سرسراہٹیں وہ سینے میں کسی کی الھڑ سی آہٹیں وہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹیں...... وہ فواروں کی سی اچھلتی امنگیں، وہ ترنگوں کی غزالان رمیدہ کی سی شلنگیں...... سانس اندر کھینچتا تو جگر تک ٹھنڈک جاتی اور سانس باہر لاتا تو کڑم دم کڑم دھم کی صدا آتی۔

حمام سے بالیدہ روح اور بےوزن جسم کے ساتھ جب نکلتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا

www.pdfbooksfree.pk

تھا کہ میں کسی مثنوی کا شاہ زادہ گل فام ہوں جس کو پریاں اڑا کر پرستان لے آئی ہیں اورتتلیوں کے پروں کی کشتی میں بٹھا کر پنکھڑیوں کے دریا کی سیر کرا رہی ہیں۔

عید گاہ جاتا تو خوشی اس حیرت ناک منزل تک پہنچ جاتی کہ عید گاہ کے ملاؤں کے ترشے لب اور جلاہوں کی کچی ڈاڑھیاں تک اچھی لگتی تھیں عید گاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھتا کہ بڑی سریلی آواز میں میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔میرے باپ کا دربار جماہوا ہے۔احاطے میں وہ ہجوم ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔صحن کے ایک گوشے میں گوتے پٹھے کے انگرکھے پہنے اور سروں پر گول گول قندیلیں رکھے ہوئے چھلب داردف بجا بجا کر

برتو ایں محفل شاہانہ مبارک باشد

گارہے ہیں۔اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے سوئیوں اور شیر خرمے کے تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں۔اور خاص دان وعطر دان گردش کررہے ہیں چوسرے کی تمباکو کے ہاروں میں لپٹے ہوئے حقوں اور عطر خس کی لپٹوں سے تمام احاطہ بھرا ہوا ہے.....اور سپاہی برہنہ تلواریں ہاتھ میں لیے اسلامیاں دے کر انعام لے رہے ہیں۔

تو اسی حدیث متواتر سے متاثر ہو کر کہ وہ بے سمجھے بوجھے عید کے دن خوشیاں منانے لگتے ہیں۔اور یہ بات صرف عید ہی تک محدود نہیں ہے۔بلکہ دنیا کی بے شمار باتیں جن کو ہم حقیقت کبریٰ سمجھے بیٹھے ہیں وہ اسی اجائی پروپیگنڈے کے بطن سے پیدا ہوتیں اور ہمارا ایمان بن جایا کرتی تھیں۔جس کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت کثیر ایمان لے آئے ہوئے ہو ان باتوں پر جو کھوپڑی یعنی فکر پر نہیں فقط کانوں یعنی اقوال پر مبنی ہوتی ہے۔اے بھولے جذباتی انسان تیرے یہ کان تیری کھوپڑی پر کب تک حکومت کرتے رہیں گے۔

بقرعید

اللہ اکبر چلتی چھریوں تڑپتے جان داروں اور بہتے خون میں ڈوبا ہوا یہ تہوار ...... جب موت کے کوف سے لرزتے اور چیختے بیکس و معصوم بکروں میمنوں' دنبوں اور بچھڑوں کو کان پکڑ پکڑ کر ایک دوسرے کے سامنے ہی بڑی سختی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے اور پھر انہیں چت لٹا کر ان کی گردنوں پر انتہائی صالح شقاوت کے ساتھ اللہ کا نام لے لے کر چھری چلائی جاتی ہے خون کا فواہ ان کی گردنوں سے پھوٹ نکلتا کے ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اپنے ہی خون میں تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگتے ہیں۔ میں لڑکپن میں سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دے رہے ہیں ...... ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں بقرعید کے دن یہ کیا ہونے لگتا ہے؟ ...... میاں نے آنکھیں نکال کر ارشاد فرمایا تھا کہ خاموش رہو یہ اللہ کا حکم ہے ...... اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے۔

ہرچند جہاں تک کہ زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے یہ تہوار بڑا ہی لذیز ہوتا ہ اور ہم کو ان کی ماؤں کے سامنے ذبح ہونے والے حلوانوں کی چوکور بوٹیوں کا پلاؤ خوب گلے ہوئے گوشت سفوف کی حد تک پسے ہوئے بوتیوں کے تیخ کباب اور انگروں پر بھنی ہوئی رانیں کھلانا ہے ...... مگر کیا کروں جب یہ ساری چیزیں دستر خوان پر آتی تھیں تو زبان کے مزوں کے تصور پر آنکھوں دیکھی لاشوں کا منظر غالب آ جاتا تھا اور میری آنکھیں نم ناک ہو کر رہ جاتی تھیں۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا!

محرم

اس کو تہوار نہیں مارہ عزا کہنا چاہیے.....میرا پورا خاندان سنی ہے..... ہر چند میرے پرداداہی کے زمانے سے ہم لوگوں میں شدید قسم کی فضیلیت راہ پا چکی تھی لیکن میری دادی کے آنے سے پیش تر ہمارے گھر میں عزاداری کا مطلق رواج نہیں تھا۔اور یہ میری شیعہ دادی تھیں جنہوں نے امام باڑہ تعمیر کرا کے ہمارے گھر میں عزاداری کی طرح ڈالی تھی۔

ہر چند وہ اپنے بچوں کو شیعہ نہیں بنا سکی تھیں پھر بھی انہوں نے ان کو اور ان کے ساتھ گھر کے تمام عورتوں کو حسینؑ کا سوگ وارضرور بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ خود دادا میاں بھی امام باڑے میں آن ار نوحے سن سن کر آنسو بہانے لگے..... اور انہوں نے پورے گھر کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام بہو بیٹیاں اور مامائیں اصیلیں تک زیور بڑھا دیتیں پان[1] کھانا ترک کر دیتیں اور سیاہ لباس پہن لیا کرتی تھیں۔

ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا۔جس میں میری ماں بہنیں وغیرہ کے علاوہ ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں[2] اور مغلانیاں بھی شریک ہوا کرتی تھیں۔

پہلی محرم کا ماتم اس نوحے سے شروع ہوتا تھا ''پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے سر پیٹو محبو''۔

اور نویں محرم کے ماتم کا آغاز اس نوحے سے ہوتا تھا '' آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے''اور محرم کی گیارھویں تاریخ کو ہماری ضریح تین بجے سہ پہر کو اٹھتی تھیں اور اس آخری نوحے پر بری پٹس کا ماتم ہوا کرتا تھا'' اے مومنو اٹھاؤ جنازہ حسینؑ کا''۔

---

[1] الائچی لانگ کتھا چونا اور زردہ ملا کر کھایا جاتا تھا [2] ملیح آباد میں انے گنے چنے چند شیعہ خاندان بھی تھے۔ [3] لکھنو کے مرثیہ خواں جوں کہ عشرے کے دن ملیح آباد نہیں آ

سکتے تھے اس لیے ہماری ضرح گیارھویں تاریخ کو اٹھائی جاتی تھی۔

اور جب ماتم وشیون کی گونج میں ہم لوگ ضریح کو باہر نکالتے اور زنانے کے آخری پھاٹک کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر لا کر رکھ دیتے تھے تو لکھنو کے ایک مانے ہوئے مرثیہ خواں ضریح کے سامنے سر کھول کر ''جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا'' پڑھتے تو ڈیوڑھی میں خاک نشیں و برہنہ سر خواتین پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ درو دیوار سے رونے کی صدا آتی تھی۔

اس کے بعد کوئی چار بجے ضریح اٹھتی۔ اور بازار سے گزرتی ہوئی رات کے دو یا تین بجے ڈاک بنگلے کے بالمقابل میدان میں ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔

ضریح کے ٹھنڈے کرتے وقت ظہور علی خاں سپاہی کی سرکردگی میں بڑے زور و شور سے حسینؑ حسینؑ حسینؑ کے دردناک نعروں کے ساتھ سینہ زنی ہوا کرتی تھی جس میں مقامی و بیرونی سینکڑوں شیعہ سنی اور ہندو شریک ہوا کرتے تھے۔

اس گیارھویں محرم کے جلوس میں ایک بار جو ایک انقلاب انگیز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا وہ بھی سن لیجیے۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضریح جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے ضریح کے سامنے جھنڈا[1] پڑھنا چاہتے ہیں۔ ارو ہمارے خاندان کے کچھ افراد بھی ان کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں میں بھی لونڈا تھا یہ سن کر میرا خون کھول گیا۔ اور میں نے بڑے طنطنے سے پکار کر کہا کس کے منہ کے اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضری کے سامنے جھنڈا پڑھے۔ اگر ایسا کوئی سورما ہے تو سامنے آئے' اور اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لائے۔

---

[1] اس فعل کو اس بنا پر بھی جھنڈا کہا جاتا تھا کہ چار سو جھنڈا گڑا ہے چار یار پاک کا اس کا آغاز ہوتا تھا اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے تا کہ شیعہ سنی لڑتے رہیں حکومت نے ایک طرف تو دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول احمد کو تیرہ بازی اور دوسری طرف لکھنو

www.pdfbooksfree.pk

کے ایک سنی مولوعبدالشکور کوجھنڈ ابازی پر مامور کر دیا تھا۔وہ شیعوں کوتبرے پر اکساتے یہ سینوں کوجھنڈے پر ابھارتے اوراس غداری کے صلے میں دونوں گھر بیٹھے وظیفے کھاتے تھے۔فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا تھا بلکہ ہندوؤں اورمسلمانوں کومسلمانوں سے بھی ٹکراتا تھا۔ادھر آریہ ساجیوں اورسناتن دھرمیوں ادھر سینیوں اورشیعوں کوایک دوسرے کی خوں ریزی پر للکارا کرتا تھا۔ارے فرنگی کا رونا کیوں روئیں اپنے ہی دام کھوٹے ہوں تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔یہ مان لیا کہ وہ لڑواتا تھا۔لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے۔

میری اس للکار سے چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہوگئی۔اور غضب کی شکنیں ماتھوں پر ابھر آئیں اورایک کم رو سا آدمی ایک صاحب کا اشارہ پا کر جھنڈا پڑھنے کوضریح کے سامنے آ گیا۔میں نے ابرار کواشارہ کیا۔انہوں نے جھپٹ کراس کی بوکڑ کی سی داڑھی پکڑ لی اوراس کے کالے سے منہ پر تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

اس کے حمایتیوں میں کھلبلی مچ گئی اورشور بر پا ہوگیا کہ ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔کہ اتنے میں عالم گیر پھپا جن کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔مجمع کو چیرتے ہوئے ضریح کے سامنے آ گئے انہوں نے اپنے ڈنڈے کوزمین پر کھٹکھٹا کر کہا۔ آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں بشیر احمد خاں (میرے باپ) کے پاس جایئے ضریح ان کی ہے وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا پڑھیے۔لوگوں نے پھپا کی بات مان لی۔اورسیدھے میرے باپ کے پاس چلے گئے۔

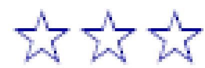
تھوڑی دیر میرے باپ نے سپاہی بھیج کر جب مجھے طلب فرمایا تو میں نے ضریح کے اردگرد سپاہیوں کوحکم دے دیا کہ جب تک میں نہ آ جاؤں ضریح یہاں سے جنبش نہ کرے اورکسی کوجھنڈا پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے۔اپنے باپ کی جناب میں سر جھکائے پہنچ گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم نے جھنڈا روک دیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں میاں! انہوں نے فرمایا کیوں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے حسین آباد سکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آرہے ہیں اگر ان کے منہ پر جھنڈا پڑھا گیا تو ان مہمانوں کی دل شکنی ہو گی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے تو ان کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ امام حسینؓ کی شہادت سے جھنڈے کا کیا تعلق ہے۔ جنازے کے ساتھ رونا پیٹنا ہوتا ہے یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے پڑھے جاتے ہیں؟

میاں نے سیدھے ہو کر ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اٹھائی جو میری شکایت لے کر آئے تھے۔ اور مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا شبیر تم معقول بات کہہ رہے ہو۔ یہ فرما کر میاں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اٹھتے ہی تمام حاضرین اور سپاہی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون ساونت ہے جو ضریح کے سامنے کھڑا ہو کر جھنڈا پڑھنے کی جسارت کر سکے۔

اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا پڑھتا...... جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو نہیں پڑھا جا سکا لیکن میری رافضیت جھنڈے پر چڑھ گئی...... اور پیش خیمہ بن گئی میرے تنسیخ نکاح کے مقدمے کا جس کا ذکر آگے آئے گا۔



لکھنو کا پہلا سفر

لکھنو جانے کے واسطے جب ہم سب[1] ملیح آباد اسٹیشن پر پہنچے۔ ریلوے کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر دوڑا آیا میرے باپ کو جھک کر سلام کیا اور ویٹنگ روم نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر کرسیاں بنچیں اور سٹول رکھ دیے گئے اور ہم سب حسب مرتبہ ان پر بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگے[1]۔

گاڑی کا انتظار الامان و الحفیظ ایک ایک دقیقے میں لاکھوں صدیوں کا فشار اعصاب میں رہ رہ کر اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ کوئی متھے ڈال رہا تھا کلیجے کو۔ جدھر سے گاری آنے والی تھی ادھر گھبرا گھبرا کر دیکھتا۔ بار بار مشیر احمد خاں سے پوچھتا اب گاڑی کب آئے گی اور وہ مسکرا ہر بار جواب دیتے کہ بس آ ہی رہی ہے۔ میں بھی اوبھ رہا تھا کہ ریلوے سٹیشن کے ایک بنگالی ملازم نے ٹن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بجا کر نعرہ مارا کہ رحیم[2] آباد سے گاری چھوڑا...... میں نے مشیر خان سے پوچھا یہ گاڑی چھوڑا کیا کہہ رہا ہے۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ یہ آدمی بنگالی ہے۔ بنگالی اسی طرح بولتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اب گاڑی میں کتنی دیر ہے انہوں نے کہا کہ بس پانچ منٹ کی دیر ہے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

---

[1] میرے باپ کے ہمسفر تھے مشیر احمد خاں رام پوری عبدالغفور خاں صفدر حسین خاں بنی احمد خاں، محمد مقیم خان داروغہ شیخ امید علی، سپاہیوں میں محمد شیر خاں، صالح محمد خاں میرزا ایوب بیگ ابو خاں، نجو خاں دو تین خدمت گار اور ایک باورچی[2] پرانے لوگ ریل کے وقت سے آدھ گھنٹہ بیشتر ہی سٹیشن پر آجایا کرتے تھے[3] ملیح آباد اور سندیلے کے درمیان کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک سٹیشن ہے۔

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گاڑی کمر پچکاتی اور دھواں اڑاتی گھر گھر گھر گھر چلی آ رہی ہے مجھے اس کے دھوئیں میں گلستاں سے ناچتے نظر آنے لگیاور جب وہ عین پلیٹ فارم سے دھن دھن دھڑ ادھڑ دھرا دھڑ کرتی گزرنے لگی تو پلیٹ فارم تھرانے لگا

پلیٹ فارم کی تھرتھراہٹ میرے خون میں دوڑنے لگی۔ اردگرد کے ذرے اچھلنے کودنے لگے۔اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم سب اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے گارڈ نے جھنڈی ہلائی اس کی جھنڈی کو دیکھ کر میری امنگیں کروانا چنے لگیں۔جھنڈی ہلا کر گارڈ نے سیٹی بجائی ہائے کیا سریلی سیٹی تھی۔ اس کے جواب میں انجن نے سیٹی دی۔ چوں چوں کے ساتھ پہیوں میں حرکت ہوئی اور گاڑی بڑے جھٹکے کے ساتھ چلنے لگی۔ چھک چھک چھک چھک...... اور دل سے آواز آنے لگی کہ بھک بھک بھک بھک......اور جب گاری کی رفتار میں تیزی آ گئی تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے چہرے سے یوں ٹکرانے گے کہ میرے دل میں ایک انوکھا سرورسرسرانے لگا۔اور جب رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔تو پٹری کے کھمبے اور آموں کے باگ گھومنے جھومنے اور ناچنے لگے۔اور پٹری کے نیچے کی نالی اس قدر تیزی سے دوڑنے لگی کہ گویا ریل سے ریس کر رہی ہے۔ یہ سماں دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی میں زیرلب گنگنانے لگا چھک چھک چھک چھک گانے دو گانے د۔ چھک چھک چھک چھک جانے دو‘ جانے دو‘ بھئی جانے دو۔آہاہاہا گانے دو اوہواوہو جانے دو‘‘۔[1]

اور جب گاڑی کاکوری کے پل سے گڑم گرم گڑم کرتی گزرنے لگی تو میرے دانتوں کے نیچے دوالی کی مٹھائی کے کھلونے ٹوٹنے لگے کرم کرم کرم...... ملیح آباد اور لکھنو کے مابین فاصلہ ہی کیا ہے لے دے کر صرف تیرہ میل اور اس قرب کی بنا پر ہماری گاڑی سینکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار کے درمیان گھڑم گھڑم شائیں شائیں کرتی اور صد ہا لائن بدلنے والی اتصالی پٹریوں کو تچ تچ تچاک کھچ کھچ کھچاک اور کٹ کٹ کٹاک کاٹتی اور تراشتی ہوئی کوئی تیس منٹ کے اندر ہی چار باغ لکھنو جنکشن پہنچ گئی......

---

[1] وہ میرے آغاز شاعری کا اولین لمحہ تھا۔

الاماں الحفیظ! چار باگ کی طوفان بدوش قیامت در آغوش ہاچل گہما گہمی دھکا پیل افراتفری نفسی نفسی چیخ پکار گاؤں گہار' الو ہٹیں] گھبراہٹیں' ریل پیل' شائیں شائیں غائیں غائیں دھڑام دھڑام اور ڈھوم ڈھوم ڈھائیں ڈھائیں...... پھراس پر دوڑتے ٹھیلوں کی جگر فراش گھر گھڑاہٹیں قلیوں کی قلی قلی کے نعروں کے ساتھ لنگوری جستیں بدحواس مسافروں کے اراٹے خوانچے والوں کا شوروغوغا ٹکٹ چکروں پولیس والوں' ریلوے افسروں بوجھ اٹھائے قلیوں' اور بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے بدحواس مسافروں کے مابین دھکم دھکا شنٹنگ کے دھماکے ہزاروں سیٹیوں کی آوازیں دھویں کے لچھے لچھوں میں گھسے ہوئے تر بتر پرزوں اور جلے ہوئے تیل کی بدبو فرنگیوں کے چھچھورے غرور میں ڈھلے ہوئے روکھے پھیکے چنگیزی چہرے اور میموں کی سایہ شاخ گل میں پلی ہوئی چھلاسی کمریں...... میں تو دیوانہ ہو گیا پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی فرنگیوں کی اکڑ فوں دیکھتا تھا تو میری پٹھنولی کی زبان پر موٹی سی گالی آ جاتی تھی اور میموں کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو میرے ننھے سے شاعر کے منہ سے ''ہائے جانی'' نکل جاتا تھا[1]۔

اور جب سٹیشن کا شوروغل حواس پر دباؤ ڈالتا تھا تو میموں کی کمریں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور دہشت تیرا احاطہ کر لیتی تھی۔ اور میرا عالم کہ یاراں فراموش کردند عشق کا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں ابھی اس شیر افگن شوروغوغا اور اس حرارت شکن بھیڑ بھاڑ میں گھرا ہوا کھڑا تھا کہ مشیر احمد خاں نے دوڑ کر میری انگلی پکڑ لی۔ اور ہمارا قافلہ اپنے سپاہیوں کے سنگین حلقے میں باہر جانے کے واسطے رینگنے لگا۔ ہم بھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ حامد علی خاں بیرسٹر دوڑ کر میرے باپ سے ہم آغوش ہو گئے[2]......

[1] تعجب نہ فرمائیں قاری صاحب یہ سنِ اور ہائے جانی کا ولولہ جی ہاں خاکسار مادرزاد عاشق تھا۔

[2] امروہے کے باشندے ہونے کے باوجود ایک مخلص انسان تھے۔

اتنے میں ایک نہایت چمکیلے سائن بورڈ نے میری آنکھوں میں زنجیر ڈال دی۔

میں نظر جما کر اسے دیکھنے لگا۔ باپ سے کہا میاں ہم کو یہ بوتل لے دیجیے..... میاں انگریزی نہیں جانتے تھے انہوں نے حامد علی خاں سے پوچھا یہ کس چیز کا اشتہار ہے انہوں نے زور دار قہقہہ مار کر کہا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ مبارک ہو خاں صاحب کہ صاحب زادے بفضل خدا ابھی سے شراب کی بوتل مانگ رہے ہیں۔[1]

الغرض بصد ہزار دشواری ہم باہر آئے۔ ہم لوگ متعدد گھوڑا گاڑیوں اور رملا زمین اکوں میں اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے..... میاں کی گاڑی میں مشیر احمد خاں تھے اور میں میاں سمنے کی سیٹ پر اور ہم دونوں کوچ وان کی طرف کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چلم کی آگ سے مجھے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ مگر لکھنو آنے کی خوشی میں اس قدر فراوانی تھی کہ مجھ کو اس تکلیف میں بھی مزا آ رہا تھا۔ اور جب سڑک کے نشیب و فراز سے لوٹے پر ڈھکا ہوا کٹورا کھن کھنا اٹھتا تھا تو میرے دل میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے۔

جب ہماری گاڑی عیش باغ کے موڑ سے گزرنے لگی تو سامنے کو ایک بہت بڑے تالاب کو دیکھ کر میں نے پوچھا میاں اگر ہم اس میں کود پڑیں تو کیا ڈوب جائیں گے؟ یہ سنتا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا۔ اور فرمایا بیٹا بدشگونی کی بات کبھی زبان پر نہ لانا چاہیے۔ اللہ تمہاری عمر درازؔ کرے۔ اب ہماری گاری اکبری دروازے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور ہمارا سامان بانس والی سرائے[1] میں جانے لگا۔ اور باپ لکھنو ہمارے افغانی خط و خال ہمارے قد و قامت ہمارے سپاہیوں کی سج دھج ان کے بڑے بڑے پگڑ ان کے موٹ موٹے لٹھ دیکھنے کے لیے ٹھٹ لگا کر ہمارے گرد و پیش جمع ہو گئے۔

---

[1] اور کیوں نہ مانگتا مجھے دیکھ کر کہتی تھی میری دایا یہ لڑکا طرح دار پیدا ہوا ہے۔ ہائے کم بخت حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ملایک در مے خانہ زدند

۳۲ اس بدشگونی کے باعث میرے صدقہ اتارا گیا ۳۳ میاں کاش آپ کی دعا قبول نہ ہوتی اور میں جوانی ہی میں رخصت ہو جاتا۔ آپ خوش سمت تھے کہ آپ کو جوانی ہی میں موت آ گئی میں بدنصیب ہوں کہ بوڑھا ہو کر بے شمار روح فرسا یادوں کا گاڈ سا اوہ زندگی کے تپتے ریگستان میں پڑا۔ ایک مدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ناقدر شناح سوم میرے احاطہ وجود کے گرد اسحاف فیل کے مانند گھیرا ڈالے پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اے قوت وحیات کے مالک میرے اصحاب فیل کو حملہ ابابیل سے محفوظ رکھنا کہ یہ سراسر نادان ہیں ۳۴ چوک کے ایک دروازے کا نام۔

میں نے اکبری دروازے میں جیسے ہی قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ اس چوڑے چکلے دراوزے کے دائیں بائیں لکڑی کے تختوں پر مٹی کے اس قدر سجل حسین سبک اور نازک کھلونے اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں کہ بایدوشاید...... انہیں دیکھکر یہ خیال ہونے لگا کہ قریب جاؤں گا تو ہر کھلونا پلکیں جھپکانے اور باتیں کرنے لگے گا۔ اور گجریا بھاؤ بتانے لگے گی۔ اور سقوں کو اگر ذرا سا بھی چھولیا تو ان کی بھری مشکوں سے دھل دھل پانی ۳۵ بہے جائے گا۔

کھلونے خرید کر جب میں نے چوک میں قدم رکھا تو عود اگر اور لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کٹنے کی نپی تلی کھٹا کھٹ نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ مرتب و منظم کھٹا کھٹ ایسی معلوم ہوئی کہ گویا طبلے پر بول کٹ رہے ہیں۔ پھر ہار والے کی سریلی آواز آئی ''ہار...... بیلے کے پھول چمپا کے'' وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبولیوں کی وہ جھلجھلاتی ترچھی کلاہیں وہ دپلی ٹوپیاں وہ شربتی انگرکھے وہ گھنے گھنے پٹے...... وہ چوڑی دار پائجامے شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال آڑھی ترچھی مانگیں۔ کلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ خوشبو دار تنبا کو کے حق حقوں

پ

لے وہ سرائے جواب ڈھا دی جا چکی ہے لکھنؤ کی درجہ اول کی پختہ اور صاف ستھری سرائے تھی۔ جس کے تین بالائی کمروں کو میرے باپ نے مستقل کرایہ پر لے کر ریزرو کر لیا اور وہاں ایک چوکیدار کو مامور فرما دیا تھا۔ اس وقت تک لکھنؤ میں برلنگٹن اور امپیریل ہوٹل کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں۔ اور چوں کہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی ہے اور سور کی چربی کا کھانا کھایا جاتا ہے اس بنا پر قرب جوار کی تمام شرفا کی طرح میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

اب رہا احباب کے وہاں قیام کا مسئلہ سو میرے باپ کے ساتھ چوں کہ ایک لاؤ لشکر لکھنؤ آیا کرتا تھا۔ اس لیے وہ کسی دوست پر اس قدر بار ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

لے اب نہ وہ قدر دان ہیں نہ وہ کاری گر اور نہ وہ کھلونے لٹ گئی ساری بہار۔

وہ لپٹے ہار ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح وہ بجتے کٹورے وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہواؤں میں ہلکورے وہ گمکتے ہوئے طبلے بالا خانوں کے چھجوں سے وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی۔ اور زلفوں کے گرتے ہوئے سیاہ آبشار کوٹھے والیوں میں کوئی گوری کوئی چمپئی اور کوئی سانولی سلونی...... خدوخال اس قدر باریک گویا کہ ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے کوئی کڑیل جوان کوئی نوجوان اور کوئی ان دونوں کے درمیان، گویا ہمکتی ہوئی اٹھان کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان...... کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا...... تماشائیوں کا ہجوم شانے سے شانے چھلتے رہے۔ اور کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ عذر خواہیاں میں ابھی اس دریائے طلسم میں غوطے کھا رہا تھا کہ مشیر خاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں ساحل پر آ گیا...... سارا طلسم

ٹوٹ گیا۔ اور میں سب کے ساتھ میاں کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر سرائے پر آ گیا۔ سرائے میں قدم رکھتے ہی دم سا گھٹنے لگا۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میاں ہم سپاہیوں......کو ساتھ لے کر نیچے گھوم آئیں؟ مشیر خاں مسکرائے اور میاں نے بڑی خوف آمیز سنجیدگی سے کہا چوک بچوں کے ٹہلنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

اتنے میں صالح محمد خاں ڈھورے[1] ساتھ لیے آ گئے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی قفلیوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آب خوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے چمچے بھی سامنے رکھ دیے......کیا بتاؤں ان قفلیوں اور ان آب خوروں کی لذت و ملائمیت زبان نے اس سے پیش تر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے مزے کو بیان کروں تو کیونکر اور تشبیہہ دوں تو کس سے......اور ملائمیت کا تو یہ عالم تھا کہ ان کو صرف ہونٹوں اور تالو سے کھایا اور نظر کی حرارت سے پگھلایا جا سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ۔

---

[1] لکھنو کا سب سے بہتر قفلی والا جو لیفٹیننٹ گورنر تک کی پارٹیوں میں بلایا جاتا تھا۔

عبداللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں احمد کی باقر خوانیاں سعادت کی شیر مالیں شبراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے جھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرگ شاہد کابٹیروں کا پلاؤ حیدر حسین خاں کے پھاٹک کی گلی کا اناس کا مزعفر' غلام حسین خاں کے پل کے کباب' کپتان کے کنویں کے پستے بادام کی مٹھائی' اور حسین آباد کی بالائی اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہمارے دستر خوان پر چن دی گئیں......اور میں کھا پی کر سو رہا۔

بھور درشن کی چاٹ تو پڑ ہی چکی تھی۔ میں سب سے پہلے بیدار ہو کر بالا خانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ صبح کا استقبال کرنے کو جب آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو شہر کی

اونچی اونچی عمارتوں کے باعث طلوع کی رنگینی دور دور بھی نظر نہیں آئی۔ آنکھیں مرجھا گئیں میں نے دیکھا تو پو ضرور پھٹ رہی ہے۔ ورمرغ بھی بانگ دے دہے ہیں لیکن پو پھٹنے میں سہاناپن ہے اور نہ مرغوں کی بانگ میں توانائی......زمین سے آسمان تک ایک پھیکا پن چھایا ہوا ہے۔ سانس لیتا ہوں تو دھانس بھری موٹی موٹی ہوا' سینے کو کھرچ اور دل رپ بوجھ ڈال رہی ہے۔ نسیم صبح چل رہی ہے مگر اس کے جھونکوں میں بالکل دھار ہی نہیں ہے۔ عروس قدرت کے پاؤں میں نہ چاندی کے گھنگھرو ہیں نہ سر پر چھپکا۔ میرے ولولے ایسی ملگجی ملگجی کھوئی کھوئی پھیکی پھیکی' ابلی ابلی' سیٹھی سیٹھی' روڑھی روڑھی' اوندھی اوندھی' گونگی گونگی جھنجی جھنجی چپچی اور بجھی بجھی سی صبح کو دیکھ کر گل ہو گئے اور دھوال دینے لگے۔ اور میں اس نامراد عاشق کی طرح جس کا معشوق اس کو دغا دے کر غائب ہو گیا ہو بھاری دل کے ساتھ نیچے آیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا......منہ پر بار بار چھپکے مارے دل کی کلی نہیں کھلی۔

اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ روغنی روٹی انڈوں کے ستارے بالائی شیر مال اور نمش کا ناشتہ کر کے فارغ ہوا تو میرے باپ نے دو سپاہیوں اور مشیر خاں کو ساتھ کر کے مجھے لکھنو کی سیر کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

میں نے لکھنو کے ہفتے عشرے کے قیام میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی' اس کا کلاک تاور' حسین آباد کا امام باڑہ' اس کی بھول بھلیاں' آصف الدولہ کا امام باڑہ' رومی دروازہ' حضرت عباس کی درگاہ' نجف اشرف' تال کٹورے اور بھول کٹورے کی کربلائیں بیلی گارد' عجائب خانہ شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد' شاہ مینا کا مزار' اور موتی محل' حضرت گنج' چینا بازار' امین آباد' گومتی ٹھنڈی سڑک لوہے کا پل' لال باغ' سکندر باغ' بندریا باغ' وکٹوریہ باغ اور بنارس باغ' اور چھتر منزل کا فقط وہ حصہ جو سڑکوں سے نظر آتا ہے۔ ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے......لیکن ان تمام عجیب مقامات سے بمراحل عجیب تر

نظر آئے لکھنو کے وہ روسا علماء ادباء اور شرفا اور شعراء جو میرے باپ کے پاس آتے جاتے تھے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ وہ ان کے چکیلے سلام وہ انکی نشست و برخواست کے پاکیزہ انداز وہ انکی تہذیب میں ڈوبی وضع و قطع وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام ان کے الفاظ کا ٹھہراؤ وہ ان کے لہجوں کے کٹاؤ اثنائے غزل خوانی میں وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ اور ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ۔ وہ قہقہوں سے دامن کش ان کا ہلکا ہلکا تبسم وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بدیوار ہو کر رہ گیا......
وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرہ خاک کے نہیں کسی کرہ نور کے باشندے ہیں۔

انہیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر کے میں نے شائستگی سیکھی ادب اور زبان میں نظر پیدا کی اور یہ ذرا سی شد بد جو آج مجھے ادب و زبان پر حاصل ہے یہ انہیں کی صحبت کا اثر ہے۔

اب وہ لکھنو ہے نہ لکھنو والے۔ ایک ایک کر کے چلے گئے سب خاک کے نیچے کھا گئی مٹی ان کے جوہروں کو۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک رباعی کہی تھی۔

جلتی ہوئی شمعوں کے بجھانے والے
جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاش دہلی پہ لکھنو نے یہ کہا
اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

---

[1] وہ عمارت جس میں نیلی صاحب نے پناہ لی تھی اور ۱۸۵۷ء کی سپاہ نے اس کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

[2] اس وقت امین آباد کا پارک معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

سے ہندوستانیوں کو وہاں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

سو جو میں نے کہا تھا وہی ہو گیا۔ گزشتہ سال جب میں لکھنو گیا تو لکھنو کی اداسی دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں ائی۔ اور ان کی جگہ ی دیکھا کہ ناتراشیدہ کندوں کے سے کھردرے اور تکونے چہروں کے وحشی افراد بار بار اپنے الجھے ہوئے بال کھجاتے اور دائیں بائیں گھومتے چلے آرہے ہیں...... نہ وہ شان دار فٹنیں ہیں نہ عمدہ قدم کی بند گھوڑا گاڑیاں نہ اعلیٰ درجے کے تانگے...... لے دے کر چند گھٹیا قسم کے اکے اور بے رنگ و روغن کے چوں چوں کرتے تانگے ہیں جن میں گھوڑوں کے عوض چوہے جتے ہوئے ہیں اور چند کھڑ کھڑ کرتی رکشائیں ہیں۔ جن کو نہ جانے کس سرزمین کے ہوش لونڈے چلا رہے ہیں۔ اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم کو بٹھا دیا جائے تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کا بھڑوا نظر آنے لگے۔

سہ پہر کے وقت نخاس آ گیا۔ نخاس کی وہ سڑک جو لکھنوی تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اداس اداس نظر آئی۔ حکیم صاحب عالم کے مطب کے بالا خانے کی طرف نگاہ اٹھائی جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا ایک ایک کر کے وہ تمام یاران جشن آنکھوں سے گزرنے لگے...... جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھومیں مچائی تھیں...... اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحب عالم، مجاز، حکیم مخمور، اور عطا حسین قزلباش کفن اوڑھے زینے سے اترے چلے آرہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے آنسو پونچھتا بانس والی سرائے کی جانب مڑا...... پرانی یادیں سر پیٹنے لگیں۔ اور جب اس نئی سڑک سے گزر کر جو سرائے کو شہید کر کے اس کی قبر پر بنائی گئی تھی چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

کوتاہ اندیش معلمان اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھے سلام کیا۔ ہائے وہ چوک جو شبستان رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا

ہے۔جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں کالے دیوؤں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے۔جو فضا سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی۔اب اس پر ''اے پائی (اے بھائی) جلندھر سنگھا''اور اے ہاپج (حافظ) کھدائی بکس (خدا بخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ہائے جن پچھوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں وہاں داڑھے پھٹکارے جا رہے ہیں۔جہاں طبلے گمکتے ہیں وہاں خارشیے کتے بھونک رہے ہیں۔اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسا دی گئی ہے۔

---

۱ حقیقی لکھنو نخاس تک ہے۔امین آباد اور حضرت گنج والوں کو بیرونی سمجھا جاتا ہے۔

ایک جملہ معترضہ

اس کج اندیش دور میں ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ نکال دو،شہر سے طوائفوں کو' مسمار کر ڈالو مے خانوں کو اور اجاڑ کر رکھ دو شبستانوں کو......اور یہ فتنہ اٹھایا ہوا ہے مہاتما گاندھی کا بے شک گاندھی جی میں تمام خوبیاں تھیں۔وہ ہندوستان کے عظیم محسن اور سب سے بڑے دوست تھے......لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔

انہوں نے جب بازار حسن و خرابات مغاں کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی اور انسانی مسرتوں کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی تو لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر دوڑ پڑے۔ان کی آواز پر وہ تمام گریدگان اخلاق تخشین کرام جو قطعی طور پر توفیق گناہ سے یکسر محروم تھے اور جن کے دلوں میں اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ وہ صالحین کا روپ بھر بھر کر گاندھی جی کو رجھائیں۔جاہل عوام کے ووٹ اڑائیں اقتدار کی گدیوں پر براجمان ہو جائیں اور دولت کے دریا میں غوطے لگائیں۔

نیک نفس مہاتما اور ان کے ہوس پرور چیلوں کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آئی کہ مسرت کی تمنا اور حسن کی آرزو' نوع انسانی کی جبلت میں داخل ہے۔اور فطرت نے

www.pdfbooksfree.pk

تولید و تناسل کا سلسلہ قائم رکھنے کے واسطے انسانی جوانی کو مست و سرشار رہنے اور بوس و کنار کی موجوں میں بہنے پر اس استحکام کے ساتھ ماموروں مجبور کر دیا ہے کہ اگر تمام قوائے کائنات خم ٹھونک کر اس کے سامنے آ جائیں تو وہ لنگڑی مار کر انہیں چاروں شانے چت گرتا ہوا آگے بڑھ جائے۔

نوع انسانی کے اس جبلی میلان مسکرات و مستورات کے ہو نکلتے ہوئے طوفانی دریا پر بندھ باندھنے کے ارادے سے اس دنیا میں کتنے اولیا اور اوصیاء اقطاب' ابدال' امام' اوتاد اور انبیاء...... کتنے معلم' مجدد' مفسر' مجتہد' متقن' مبلغ' محتسب مصلح اور ملا اور کتنے پادری پاپا' پوپ' پروہت پنڈت' پانڈے' یوگی' پیر اور پیغام بر...... ازل سے لے کر آج تک آ چکے ہیں۔ لیکن تاریخ انسانی شہادت دے رہی ہے کہ جس نے بھی انسان کے اس بے پایاں تند و شدید ولولے سے ٹکر لی ہے خود اس کا ماتھا لہولہان ہو کر رہ گیا ہے۔ آسمان کی ڈاٹ کے نیچے یہ آواز بڑے طنطنے کے ساتھ آج بھی گونج رہی ہے کہ

ہاں سلسلہ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی شغل ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ادیان کے ماتھے سے لہو جاری ہے

اور تمام مصلحین کرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان آج بھی یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ

مرا مہر سیہ چشماں ز سر بیروں نہ خواہد شد
قضائے آسمان است این و دیگر گوں نہ خواہد شد

اور جب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ اس جذبہ قوی کا فنا کر دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اور کیوں نہ باہر ہو جب کہ حامیان ادیان سے لے کر مسجد کے نابینا حافظ جی تک بفضلہٖ اس چوں بخلوت می روند کے کاروبار میں ازل کے دن سے آج تک

مشغول ہیں۔تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے یا اس پر چند قیود عائد کر دیے جائیں؟ چوں کہ آدمی ابھی تک حیوانی سطح سے فقط ایک بالشت بلند ہوا ہے اس لیے ہم اپنے کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ جب تک نوع انسانی بالغ نہ ہو جائے۔ اس جذبے پر چند قیود ضرور عائد کر دی جائیں لیکن وہ اس قدر سخت نہ ہو کہ آدمی بلبلا اٹھے۔[1]

---

[1] ہر چند اسلام نے زانی کے واسطے سنگ ساری کی سی انتہائی سزا مقرر کر دی ہے۔ لیکن اس ناقابل برداشت جنسی ہیجان کے ساتھ بڑی حکیمانہ اور بڑی شریفانہ مروت سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی دیگر جرائم کا انحصار صرف دو گواہوں پر کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاملے میں چار گواہوں کی شرط لگا دی گئی ہے۔ پچاس فیصد رعایت تو پہلے ہی قدم پر کر دی گئی ہے اور مجرم کو اشتباہ کا فائدہ پہنانے کی خاطر اس پچاس فی صد رعایت کے حدود کو وسیع کر کے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ کہیں انہوں نے مرد کو اوپر اور عورت کو نیچے دیکھا تھا تو اس شہادت سے زنا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اگر وہ یہ شہادت بھی دیں گے کہ ہم نے مرد کی کمر کے متواتر حرکات کو بھی دیکھا تھا پھر بھی زنا ثابت نہیں ہو گا البتہ اگر وہ یہ شہادت دیں گے ہم نے دیکھا تھا کہ مرد و زن کے مابین سلائی اور سرمے دانی کا سا معاملہ ہو رہا تھا۔ تب جا کر زنا ثابت ہو گا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں گے کہ ایک ایسے مزاج کا زانی جو ایک کو نہیں چار چار آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھے اور اس کے باوجود وہ عورت سے فوراً جدا ہو جانے کے بدلے' اس سے چمٹا رہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے جسمانی حرکات کی وساطت سے اس کا بھی موقع دے کہ چاروں گواہ فریقین کی برہنگی کا تفصیلی مطالعہ کر کے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیں کہ ایک سلائی دوسرے کی سرمہ دانی میں آ جا رہی ہے۔

وہ قیود داوران کے حدود درست کیا ہوں اور آگے چل کر ان کو کس رفتار کے ساتھ ختم کیا جائے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی حقائق زبان پر لے آؤں تو ہر طرف تھپڑی

بجنے لگے اور میں دیکھتے ہی دیکھتے نکو بن کر رہ جاؤں۔

میں جس ماحول میں زندہ رہنے کا ارتکاب کر رہا ہوں وہاں حقائق سے دامن بچانے اور حقائق سے آنکھیں چرانے ہی میں ایمان کی خیر سمجھی جاتی ہے اور نجات کے خواب دیکھے جاتے ہیں۔میرے معاشرے کو آج تک یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے عقائد و مسلمات ہمارے آبائی اقوال و روایات ہمارے خیر و ر کے تصورات' ہمارے مرغوبات و مکروہات اور ہمارے ذہنی تعصبات فکری ہیں کہ ساعی نیز جس ماحول کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ پاکی و ناپاکی گناہ گاری و اطاعت شعاری جواز و عدم جواز اور حرام و حلال کی وقت توزایدی' اسطلاحین' معقولات نے وضع کی ہیں یا منقولات نے؟ یا مردوں کی پاکیزگی و پارسائی کے ضوابط' عورتوں کی عصمت و عفت کے قواعد' جنسی تعلقات کی حد بندی اور ازدواج کا رواج قدرت کا عطیہ ہے یا پنچوں کی ایجاد ہے؟ ایسے ماحول میں چہرہ حقائق سے پردہ اٹھانے والے کو نکو بن کر رہ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔اس لیے اب میرے واسطے صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ امور گفتنی کو ناگفتنی کے زمرے میں لے آؤں اور

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

پر نگاہ کر کے میں نے اپنے دور کی ذہنی سطح پر آ جاؤں سب کی ہاں میں ہاں ملاوں اور کوچہ بتاں و کوئے مغاں دونوں کو بد اخلاقی کا مرکز ٹھہراؤں۔

بہت اچھا تسلیم کر لیا میں نے ان دونوں اداروں کا بد اخلاقی کا مرکز لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ ادارے جو اتنے ہی قدیم ہیں جتنی انسانی تمدن کی تاریخ......معرض وجود میں آئے ہیں'

آسودگی تمنا کی بازی گاہ دنیا میں ان اداروں کو جنہیں یخ بستہ پیران فرتوت مادر زاد پر شکستہ جوانان صالح اور گرگان باراں دیدہ سیاسی افراد بد اخلاقی کے اڈے کہہ کر

www.pdfbooksfree.pk

اپنا جی خوش کرتے ہیں) معرض وجود میں لایا جائے نوع انسانی کا پیدائشی ذوق مسکرات[1] و مستورات کیوں کر؟ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس مطالبہ در رسد اور تمنا اور یہ ہیجانی ذوق برانگیختہ ہوا ہے۔ اس ناقابل مقابلہ تند اور شدید حیوانی جبلت کا جو انسان کو اکسا کر وجد میں لاتی ہے اور اس کی نسل بڑھاتی ہے۔ اور جس کی ناقابل فتح شدت کا یہ عالم ہے کہ تاریخ تمدن سے لے کر آج تک ہزاروں ارضی و سماوی طاقتوں کے دانت کھٹے کر کے اور کسی مادی یا روحانی طاقت کو اپنی پشت پر کاٹھی رکھنے کی اجازت نہ دے کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔

اور جب نگاہ کرتا ہوں اس جذبہ گرم کی صلاحیت و حرارت پر تو یہ دیکھ کر ہنسی آتی ہے کہ آج کل کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے ان ووٹوں کی بھیک پر جینے والے بونے اور اوچھے ارکان پر جو اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وہ ان بداخلاقی کے اداروں کو بند فرما دیں گے۔ نیولے ڈھال تلوار باندھ کر نام خدا شیر کا شکار کرنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

پرانے زمانے کو چھوڑیے اس دور میں بھی پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں میں طوائفوں کے اڈوں کو ڈھایا اور مے خانوں کے دروازوں کو قفل لگایا جا چکا ہے پھر بھی طوائفیں معدوم اور مے خوار مفقود نہیں ہو سکے ہیں کوچہ خوباں و کوئے مغاں کو ایک محلے سے نکال کر دوسرے محلے میں آباد کرنا بالکل اسی نوعیت کی حماقت ہے کہ کہنی کے پھوڑے کو گھٹنے پر منتقل فرما کر اس بات کا یقین کر لیا جائے کہ پھوڑا باقی نہیں رہا۔

---

[1] لوگ مسکرات کو شراب وغیرہ سے مختص کرتے ہیں حالانکہ سکر کے دائرے میں دنیا کی ہر چیز داخل ہے جو خون میں ہیجان اور دل میں نشاط کا طوفان برپا کرتی ہے۔ بچے کو پیار کرنا' چاندنی سے لطف اٹھانا پھول سونگھنا' پیٹ بھر کر کھانا کھانا حسینوں کو آغوش میں لینا یاروں کی صحبت میں بیٹھنا مختلف کھیل کھیلنا عبادت کرنا وظیفہ پڑھنا گانا سننا' تماشے دیکھنا' صحائف پڑھ کر جھومنا' اور رو دینا۔ یہ بھی سکر ہی کی شاخیں

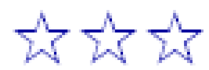
ہیں۔اس کے معنی ہی ہیں کہ ذوق سکر ہمارے وجود کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سکر کے بغیر دردو دسیدہ انسان کا زندہ رہنا امکان سے باہر ہے۔

اس لیے دانش مندی اور انسانی فلاح اسی میں نظر آتی ہے کہ جہاں تک بازارحسن کا تعلق ہے۔ماہر دسن رسیدہ ڈاکٹروں کے ہفتہ وار معائنے کی وساطت سے اس ادارے کی تہذیب و تطہیر کا سائنٹفک بندوبست کیا جائے۔اور ایسے ضابطے وضع کیے جائیں کہ امن عامہ اور صحت جسمانی میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔

اب رہا مسکرات کا مسئلہ سو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی اور پختہ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم اور ایسے افراد کے نام اجازت نامے جاری کر دے جو صحت جسمانی سلامتی عقل اور شرافت نفس کی بنا پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اگر اس برسوں کے سوچے سمجھے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تو یاد رکھیے اور کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھے گی۔گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جائیں گی اور اناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر اتر آئیں گے اور دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے۔

اور دوسری طرف جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیے جائیں گے تو ان کے پاؤں کی زنجیر کھل جائے گی اور وہ اڈے شہر کا رخ کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے۔شہر کا ہر مکان بازار حسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔اور شہر کی ہر شریف زادی خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی اور عصمت فروشی کا پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گا کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائے گا۔



www.pdfbooksfree.pk

فرنگی سے نفرت

ایک روز میں لکھنو کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتہً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا تو زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی...... انہوں نے روتے ہوئے کہا بیٹا موا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق...... ہائے ہمارے جان علم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا۔ ان کو دودھ جلیبی اور مٹھائی کھلائی جاتی تھی۔ جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے ان غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے۔ بیٹا یہ غازی مرد کس قطار میں شمار ہیں ان بندروں کا جب سے دور دورا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ کہتے کہتے اپنے بے بوٹی کے کھل سینے پر ہات مار کر کہا ''ہائے ہمارے جان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے'' بڑی بی کی یہ بات سن کر میں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہو گئی۔ اور وہی لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاہی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔

میری موچھوں کے کونڈے! الحفیظ و الامان...... ہائے جوانی کا وہ عاصیانہ ریعان...... پیرانہ سر خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان...... وہ ہر طرف سے آئے میں صدقے میں قربان...... وہ رنگوں کے پیہم کھلتے سینکڑوں نشان...... وہ کل یوم ہوا فی الشان وہ جھمکتی زمین جھلجھل تا آسمان وہ مشک وہ زعفران...... وہ عود وہ لوبان وہ ریحان وہ رمان وہ عطر پھول اور پان...... وہ امنگوں کی پور پور کی کمکتی چٹخان...... وہ ترنگوں کے رگ رگ میں کٹتے دھان...... وہ جھولتی گلیاں وہ جھومتے میدان...... وہ امریوں کی کجریاں وہ برکھا کے پکوان...... وہ پی ہو کو کو دے سلوں کے شیشوں کی درکان...... وہ گھپ راتیں وہ گل اوسان وہ گوکل بن کے جھٹپٹے وہ بانسری

کے سریلے بان...... وہ رادھا جی کی مسکان...... وہ ہلالوں کا بازار وہ خنجروں کی دکان...... گاہے گل پوش گاہے لہولہان...... وہ کاہ پر قدم کا ہکشاں پر گریبان...... وہ عشووں کے گرداب وہ عربدوں کے طوفان...... وہ نرالے بانکے انوکھے مچان...... وہ جھوٹے وعدے سچے پیان...... وہ پہاڑوں کی تول پلکوں کی میزان...... وہ کانٹوں کے حصار پھولوں کے ایوان...... وہ شیشوں کے در وہ پتھر کے دربان...... وہ ادھر سے سوال ہے کوئی امکان...... وہ ادھر سے جواب الا بالسلطان...... وہ تو اتر خطا و نسیان...... وہ تسلسل عدوان...... وہ سلسلہ انتقام بالاحسان...... وہ قلزم حسن و عشق کا طغیان وہ بینھما برزخ لا یبغیان...... وہ بیاہیاں طرار وہ کنواریاں نادان...... وہ لچھوں کی مرکیاں وہ بولوں کیلچکان...... وہ انکھڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان...... وہ حورانی مقصورات فی الخیام کی شرمیلی آن بان...... وہ صراحی دار گردنوں کے ڈوروں کی لچک میں ارجن کمان...... وہ بوجھل پپوٹے وہ نیندوں کے جھپان...... وہ یخرج منھما الولووالمرجان...... وہ چاہوں بانہوں کا مرج البحرین یلتقیان...... وہ رامش و رنگ کے بوستان وہ فیھا عینان تجریان وہ ہر الھڑ حور وہ ہر امرو غلمان...... کافر زلفوں کی چھاؤں میں وہ مکھڑوں کے قرآن...... اور دھانوں میں رہ رہ کر وہ نعرہ فبای آلاء ربکما تکذبان!!

---

[1] میرے اودھ میں یہ رسم جاری تھی کہ جب لڑکوں کی مسیں بھیگنے لگتیں تھیں تو مٹی کے کورے کونڈوں میں چوٹی دار جلیبیاں بھر کر حضرت یوسفؑ کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

اب ذرا میری مونچھوں کے کونڈوں کا دھوم دھڑ کا بھی دیکھ لیجیے...... ادھر زنانے مکان کے چورے چوڑے دروں اور اونچی اونچی محرابوں کے طویل و عریض دالان میں چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دیوار گیریاں اکے اور گیس کے ہنڈے جل رہے ہیں...... خواتین گاؤتکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ ادھر ادھر فرشی اگال دان اور بڑے بڑے چاندی کے پان دان رکھے ہوئے ہیں اور ان کے مقابل ڈومنیاں ڈھارتیں

سرو رنیاں اور میراثنیں نقلیں کر رہی ہیں۔ اور نقلوں کے بعد ڈھولک پر گانا ہو رہا ہے۔ اور گانے والیوں کو بیل[1] دی جا رہی ہے۔

ادھر مردانے صحن میں دل بادل شامیانہ لگا ہوا ہے۔ شامیانے کے گرد نوکر چاکر وغیرہ پرے جمائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے بڑے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ مشعلچی مشعلیں اٹھائے ہوئے ہمہ تن انتظار بنے بیچ میں کھڑے ہوئے ہیں......شامیانے کے نیچے شرکائے جشن اونچے اونچے گاؤ تکیوں پر کہنیاں ٹیکے بڑے وقار کے ساتھ قالینوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھیے اپنے کاشمیریوں کے طائفے کے ساتھ پندرہ سولہ برس کا خوبرو اور شیریں حرکات علی جان[2] جس کے حسین چہرے پر شکر پر ہلکا سا نمک چھڑکا ہوا ہے۔ چلا آ رہا ہے۔ بڑی لٹک کے ساتھ چھم چھم کرتا ہوا۔ شامیانے میں قدم رکھتے ہی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ فرشی سلام کیا ارباب محفل کو......سلام کرنے میں اس کی کلائی اس قدر لچکی کہ ڈر لگنے لگا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے اور مظہر کا مصرعہ

آہ مظہر خم سلام کیسے

---

[1] اس انعام کو بیل کہتے ہیں جو شادی میں خصوصاً اور دیگر تقریبات میں بالعموم گانے والیوں کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی خاتون ان کو انعام دیتی تھی تو ڈھولک بجانے والی اس کے عطا کردہ روپوں کو ڈھولک کے حاشیے پر تین بار کھٹکھٹاتی تھی۔ اور اس خاتون کے شوہر کا نام لے کر با آواز کہتی تھی کہ فلاں خاں صاحب کی بیل یعنی اگر انعام دینے والی کے شوہر کا نام نواب احمد خاں ہوتا تو ڈومنی پکار کر کہتی تھی نواب احمد خاں کی بیل)۔

---

[2] یہ عجیب اتفاق ہے کہ جان علی حجام نے میرا ختنہ اور علی جان کاشمیری نے میرے ختنے کے جشن پر مجرا کیا۔ خان علی نے خون بہایا اور علی جان نے رنگینیوں کے دریا بہا دیے۔

---

www.pdfbooksfree.pk

یاد آ گیا...... سلام کر کے وہ اپنے سازندوں کے آگے ایسے دل فریب گھماؤ سے بیٹھ گیا کہ جیسے اڑتا ہوا کبوتر اپنی چھتری پر آ کر بیٹھ جاتا ہے...... اس کے بیٹھتے ہی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا

کی طرح سازندے اپنے اپنے ساز ملانے لگے۔ سازوں کا ملایا جانا ایک صبر آزما عمل ہوتا ہے یعنی

ہرچند سریلے نغموں کے جذبات جگائے جاتے ہیں
اس وقت کی تلخی یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں

لیکن کاشمیریوں (بھانڈوں) نے اپنی اچھل کود اپنے تو اوا وا و کے نعروں اور اپنی پیٹ میں بل ڈال دینے والی نقلوں سے اس تلخی کو ڈھانپ لیا اور اس قدر ہنسایا کہ لوگ لوٹنے لگے...... اور جب ساز مل گئے اور ہنسی کے دونگرے رک گئے...... تو علی جان پھر ہری لے کر یوں کھڑا ہو گیا کہ بھاؤ بتانے جیسے پہلی کرن پھوٹتے ہی دریا سانس لے کر مچلنے لگتا ہے۔ پل بھر میں اچھی طرح ملے ہوئے ساز بجنے لگے۔ سارنگی کی روں روں...... جوڑی کی دوں دوں اور مجیرے کی کھن کھن کی نپی تلی اور گھلی ملی آوازوں پر فسوں دائرے میں علی جان نے بھاؤ بتانے کے واسطے جب اپنے لچکیلے ہات یعنی چپو اٹھائے اپنے چھرہرے جسم کی کشتی کھینے کے لیے تو کاشمیریوں نے اسے حلقے میں لے لیا۔ اور بڑی سریلی آواز میں کہنے لگے ادھر دیکھو خوش وقتی ادھر دیکھو خوش وقتی۔ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ خاں صاحب بہادر کی ڈیوڑھی پر علی جان کا طائفہ آیا...... وہ محفل ویران جہاں بھانڈ نہ باشد اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔

اس کے بعد سازوں کی منظم گونج میں علی جان کاشمیریوں کا حلقہ توڑ کر یوں اپنا چہرہ سامنے لایا گویا کالی بدلی سے چاند نکل آیا...... سامنے آتے ہی اس نے چھلاوے نے فرش پر یوں چھم سے پاؤں مارا کہ ابل پڑا زمین سے رقص کا فوارہ...... اور دا ہنے بائیں کھڑے ہوئے کاشمیریوں نے اس رقص کے ہرسم پر تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع

کر دیا۔ تا تا تا تا تھئی تھئی تھئی تھئی ۔ اے تا تا تا تا تھئی اور جب اس کے ناچ میں تیزی آئی تو کاشمیریوں نے آہاہاہاہا۔ ابڑھ کے اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ ہاں بڑھ کے بیٹا بڑھ کے۔ تھئی تھئی تھئی تا تا تا تا۔ کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور بھاؤ بتانے اور ناچنے کے بعد جب اس نے بن پانی کا چلا جارے بجرا گانا شروع کر دیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بجرا ہے اور فرش پر ہچکولے کھا کھا کر بہتا چہا جارہا ہے۔ اور ساز اس کے بولوں سے اس قدر دست وگریباں اور ہم آہنگ ہیں گویا سونے کی اڑتی ہوئی سوئیوں میں جھلجھلاتے منقیش کے ڈورے پروئے جارہے ہیں۔

علی جان کے دل نشین مجرے کے بعد شامیانے پر ایک سناٹا چھا گیا ایک کھنکھناتا سناٹا چھا گیا...... اس کے بعد چار طوائفیں تابڑتوڑ آئیں لیکن ان کے مجرے کا رنگ جما ہی نہیں...... اور ایسا لگا کہ جیسے حافظ شیرازی کے کلام کے بعد ذوق کی غزل پڑھی جا رہی ہو۔ یا شراب کے بغیر خالی سوڈا پیا جا رہا ہو۔ یا لیلیٰ کی محمل کے بغیر بلبلاتا اونٹ شتر غمزے کرتا پھر رہا ہے نجد کے میدان میں۔

خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف آئی مجرے کے واسطے العظمتہ اللہ اس کا چمپئی مکھڑا گویا سرکوہ سار آغار بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے...... اور اس کے شربتی رخساروں کی سرخ و کاغذی جلد کے نیچے سے یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویا غرفے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آرہی ہے...... جب اس قتالہ عالم نے رقص کرنے کے لیے اپنے ترشے ہوئے کولھے کے دل فریب کٹاؤ پر بایاں ہاتھ رکھ کر چھلا سی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا کہ گویا رقص کی دیوی سنہری رتھ کا دھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے...... اور کرہ ارض کی گردش اس کا طواف کر رہی ہے۔ یا مصر کے بازار میں یوسف کا بانکپن دیکھ کر زلیخا کے غرور کی کمان ٹوٹی جا رہی ہے۔

اور ہنگام رقص جب اس کافر نے ایک قیامت انگیز جھانولی کے ساتھ اپنی آنکھوں کے پٹ ادھے بھیڑ لیے تو ایسا معلوم ہوا گویا خرابات کی انگنائی میں دفعتہً جھٹپٹا ہو گیا

www.pdfbooksfree.pk

ہے اور رطل گراں پر ہلکا سا دھواں مچلنے لگا ہے..... اور جب اس ظالم نے اپنی گردن کے باریک ڈورے کو راگنی کے بہاؤ کی طرف موڑ کر ذرا سی جنبش دی تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا نسیم سحر کی مضراب خیط ابیض بجا رہی ہے۔

۱۔ اے بے پانی کے بجرے چلا جا (چاتارہ)

اس کی جوانی کا سیب ہنوز پال سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ اس کے مکھڑے پر جوانی اور بانک پن گلے مل رہے تھے۔ اس کا وجود ایک ایسا جھٹپٹا تھا جس کی چھاؤں میں دھندلکا ہمک رہا تھا..... اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا پنڈا ابھی تک کورا ہے۔ اور سینے پر اس کے آبی آنچل کے نیچے گویا ایک بلوا سا ہو رہا ہے۔

وہ بہت کم سن تھی اور موسیقی میں خام ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں پتی لگتی تھی۔ لیکن اس کی نیم پختہ جوانی کی وحشی آنکھوں کے شربتی ڈوروں اور وہ انوکھی راگنی چھڑی ہوئی تھی جس کو دنیا کے کسی ساز پر نہیں بجایا جا سکتا اور جو کو کانوں سے نہیں آنکھوں سے سنا جا سکتا ہے۔

اور آخر کار ڈوبتے ستاروں کی چھاؤں میں اس دختر قمر نے جب یہ غزل بھیرویں میں چھیڑی۔

نسیم ' جاگو ' کمر باندھو' اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

تو راگنی کی چلت پھرت اس کے نیم رواں اور کچے گلے میں یوں گھومنے لگی گویا پروا کے ملائم جھونکوں میں پڑے اسے کٹا ہوا چاند تارا ۱۲ فضا میں پتا رہا ہے۔

اور جب ناچتے ناچتے انعام کی خاطر وہ ہچکولے کھاتی کشتی کی مانند آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی تو میرا گلا رندھنے لگا۔ میری گردن کے ہاروں کی خوش بو تیز ہو گئی اور جب وہ ایک گھٹنا ٹیک کر چھم سے میرے سامنے بیٹھ گئی تو اس کے کم سنی کے انفاس کی خوش بو کھچ سے میرے سینے میں چبھ گئی۔ اور اس کی پیشواز کا سرا جب میرے ہات کی پشت سے مس ہو گیا تو میرے بدن میں پوسی چھٹنے لگی۔

www.pdfbooksfree.pk

میری زندگی کے اٹھارہ معاشقوں میں وہ میرا مبہم سا معاشقہ اولیں تھا...... جو عالم خواب میں شبنم کی مانند مجھ پر گرا اور میرے تن بدن میں جذب ہو کر گم ہو گیا۔

ا پتنگ بازی کے ایک پیچ کا نام ۲ ایک قسم کا پتنگ

اب اگر وہ زندہ بھی ہو گی تو میری طرح بوڑھی ہو چکی ہو گی۔ اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے۔...... ہائے ظالم وقت کا دھارا کتنے چاندوں کو غرق کر چکا ہے۔

لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب اس مجرے کی یاد آتی ہے تو میرے جھریوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پشواز کا دامن سرسرانے اور کروٹیں سی لینے لگتا ہے۔ ہائے کیا کروں میرے اللہ!

کانوں سے سنا تھا کہ پشت رسالت پر مہر نبوت ثبت ہوا کرتی ہے اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشت دست پر اس پشواز کی مہر لمس آج تک دمک رہی ہے۔

میرا آگرے کا پہلا سفر

آگرے سے نانا جان کا دعوت نامہ آیا' میری ماں کی باچھیں کھل گئیں...... سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور پورے ایک ہفتے کے بعد جب رخت سفر تیار ہو گیا تو لکھنو ا ادمی بھیج کر دین کمپارٹ منت یعنی ایک فرسٹ کلاس ایک سیکنڈ اور ملازموں کے واسطے ایک تھرڈ کلاس بوگی ریزرو ہو کر چوبیس گھنٹے سے پیش تر ملیح آباد اسٹیشن پہنچ گئی۔ اور وہ تینوں ڈبے مال گودام کے پلیٹ فارم پر لگا دیے گئے۔

پردے کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ زنانے کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی سے بند کر دی گئیں اور صرف یہی نہیں ان پر کو کا کیلوں سے ٹھونک ٹھونک کر اندر سے چادریں بھی جڑ دی گئیں۔ دن بھر ان میں سامان لادا جاتا رہا۔ اور رات کو پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ہماری گاڑی صبح نو بجے جانے والی تھی۔ گھر بھر میں تڑکے سے ایک ہنگامہ برپا ہو

گیا۔اور باقی سامان بھی سٹیشن پر پہنچا دیا گیا.....گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے حیدری خانم قرآن کو ہاتھوں میں بلند کر کے' انگنائی کے کنوئیں کی چھت پر جا کھڑی ہو گئیں۔جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے ماماؤں اصیلوں نے دہی مچھلی[1] کی آوازیں بلند کیں اور ہم سب سٹیشن کی جانب' تاج محل کو جب قریب سے دیکھا تو یہ کلیہ ٹوٹ گیا اور قریب سے وہ اس قدر حسین نظر آیا کہ جی چاہا اس دوالی کے سفید کھلونے کو دانتوں کے نیچے کرم کرم چبا کر کھا جاؤں۔

---

[1] اس کو آغاز سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔یعنی جس طرح دہی اور مچھلی میں ساز گاری ہوتی ہے وہی سفر میں شامل حال رہے۔

اللہ اکبر تاج محل کا پھاٹک.....آسمان سے باتیں کرتا پھاٹک..... جب خدام تاج میں سے کسی نے اس کی محراب کے نیچے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تو محراب میں سے ایسی عظیم گونج پیدا ہو گئی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اور وہ گونج دیر تک باقی رہی۔اور ایسا معلوم ہوا کہ گوش رسالت میں وحی کی جھنکار گونج رہی ہے۔

اس الوہی جھنکار میں ڈوبا ہوا جب اندر گیا تو تاج پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خواب میں جنت دیکھ رہا ہوں.....فواروں کی کھنک سبزے کی لہک اور تاج کی چمک دمک نے دیوانہ کر دیا.....میں یہ سوچنے لگا کہ وہ کیسے جنچے تلے چوم لینے کے قابل ہاتھ ہوں گے جن کی فن کاری نے خیط ابیض خواب زلیخا تاب مرمر' سپیدہ سحری' اور جلوہ کنعان کو چاندی کی دیگ میں ڈال کر ستاروں کے انگاروں پر پگھلایا۔موسم بہار کے سرشار جھونکوں میں سکھایا اور ہیرے کی نازک نازک چھینیوں سے تراش تراش کر در و بام کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

خدا کی قسم' بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاڑ ڈالوں گریبان چر سے۔اور ناچنے لگوں تھرک تھرک.....لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا ڈر کے مارے کلیجہ

محسوس کر رہ گیا کہ ناچوں گا تو باپ اس طرح عاق کر دیں گے جیسے میرے پردادا نے اپنے ایک لڑکے کو جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا یہ سن کر عاق کر دیا تھا کہ وہ گاتا اور بھاؤ بتاتا ہے۔

اپنے ولولہ رقص کا گلا گھونٹ کر جب میں نے تاج محل کے دوسرے تماشائیوں کی طرف نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھ کر حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ ثبات عقل و ہوش تاج کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ نہیں رہا ہے۔ تو میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب کیا پتھر کے بنے ہوئے ہیں یا یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

گاڑیوں اور فینسوں میں روانہ ہو گئے...... زنانے ڈبے کے تینوں طرف قناتیں کھڑی کر دی گئیں خواتین اپنے اپنے درجے میں اور ہم سب اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

لکھنو اور کان پور ہوتی ہوئی جب ہماری گاڑی ٹونڈلا جنکشن پہنچی تو دودھ گرام...... دودھ گرام...... پوری کاچوڑی (دودھ گرم پوری کچوری) کے نعروں نے بوکھلا دیا۔ اور کانوں کو ان بگڑے ہوئے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اودھ سے بہت دور آ چکا ہے۔

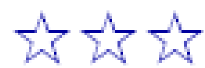
وہاں ہمارے ڈبے کاٹ کر آگرے جانے والی گاڑی کے بریک کے پیچھے جوڑ دیے گئے۔ گاڑی آگے بڑھ کر جب آگرے کی طرف مڑنے لگی تو میرے باپ نے اشارہ کر کے بتایا دیکھو یہ تاج محل ہے میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو حیران ہو گیا۔ جلال و جمال کی ایسی متناسب ہم آہنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا...... یہاں تک کہ گاڑی ایک طرف مڑ گئی۔ تاج اوجھل ہو گیا۔ اور گویا دودھ سا گیس کا ہنڈا اچٹ سے ٹوٹ گیا۔ آگرہ فورٹ سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ ماموں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔ زنانے ڈبے کے گرد قناتیں

کھینچ دی گئیں اور ہم سب گزری منصور خان کی طرف جہاں نانا رہتے تھے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے نانا جان کے محل کو جسے کسی فرانسیسی رئیس نے بنوایا تھا اپنے آبائی محلوں سے مختلف پایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے محل دومنزلہ ہیں یہ سہ منزل ہے۔ ان میں برے بڑے در اور دالان ہیں یہ ایک دوسرے سے پیوستہ کمروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں فقط روشن دان ہیں۔ اس میں جا بجا کھڑکیاں ہیں۔ ان کے صحن کشادہ ہیں۔ اس کا صحن نسبتہ چھوٹا ہے۔ ان میں سوڈیڑھ سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ اس میں چھ سات سو آدمیوں کی گنجائش ہے اور ہر چند یہ گزری منصور خاں کی ڈھال پر واقع ہے مگر اس قدر بلند ہے کہ گردوپیش کے تمام مکان اس کے آگے پست دکھائی دیتے ہیں اور اس کی مہ تابی سے تاج محل نظر آتا ہے۔

تاج محل کا قریب سے دیدار

ہر مادی و ذہنی چیز میں بعد اضافہ اور قرب خفت پیدا کرتا ہے......بعد اجمال ہوتا ہے اور قرب تفصیل اور اجمال تفصیل سے زیادہ حسین ہوتی ہے......لیکن خدا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت میں اپنے باپ کے ساتھ نہ ہوتا تو گریبان کے پرزے اڑا کر ایسا ایسا اچھلتا کودتا ' ناچتا ' قلابازیاں لگاتا شلنگیں بھرتا اور ایسے ایسے شدے اور دیوانے چارے کرتا کہ فوراً آگرے کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔ اور وہاں جب کوئی پوچھتا کہ یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ تو اچک کر کسی درخت پر چڑھ جاتا اور اس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر یہ نعرہ لگاتا۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو ' بینی ...... تحمل است
ناصح ' ملامتے مکن ' ایں نا شکیب را !!



ولولہ تعلیم

میرے ولولہ تعلیم کے ساتھ میرے باپ نے وہ سلوک کیا جو بجلی خرمن سے کرتی ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ کو جاہل رکھنا چاہتے تھے۔ مگر سارا کھیل بگاڑے ہوئے تھی۔ ان کی غیر معمولی محبت بے حد وحساب محبت وہ دل سے چاہتے تھے...... کہ میں پڑھوں تو ضرور مگر ان کی آنکھوں سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہ ہونے پاؤں......اور اس بے کراں محبت کی بنا پر جب میں دانت نکال نکال کر ان کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ میاں مجھ کو پڑھنے کے لیے کہیں باہر بھیج دیجیے میں گھر پر نہیں پڑھ سکوں گا مولوی الٹے مجھ سے ڈرتے ہیں...... ڈرنے والے مولوی پڑھا نہیں سکتے۔ تو ان کے چہرے پر ایک شدید قسم کا کرب کا رنگ دوڑ جایا کرتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھر کی تمام دیواریں کوئلے سے تعلیم کا بھوکا شیر لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالیں۔ میاں نوکروں سے ان تحریروں کو مٹوا دیتے تھے۔ اور میں پھر لکھ دیتا تھا۔

آخر کار میں نے اپنی پھپھی زاد بھائی اور تعلیم کے شیدائی صفدر حسین خاں کو پکڑا کہ آپ میاں سے میری سفارش کر دیں...... صفدر بھائی مسدس حالی کی نسل میں سے تھے انہوں نے میری امداد کا وعدہ کیا۔ ان کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے میری تعلیم کے بارے میں میرے باپ سے بار بار کہا اور بڑے اصرار کے ساتھ کہا لیکن میاں نے اس کان سے سنا اور اس کان سے اڑا دیا۔

لیکن صفدر بھائی دھن کے پکے تھے۔ ہمت نہیں ہارے۔ ایک روز شام کے وقت میاں کو بڑے اچھے موڈ میں پا کر انہوں نے بڑی جسارت کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ ماموں اب زمانہ بدل چکا ہے...... جو بچہ گھر کے رئیسانہ ماحول سے باہر نکل کر نہیں پڑھے گا وہ شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے۔ کے زمرے میں آ کر تباہ ہو جائے گا۔ ماموں آپ خاندان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور عقل مند آدمی ہیں۔ اور پھر بھی تعلیم سے اس قدر غفلت برت رہے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

یہ سن کر میاں بگڑ گئے اور ارشاد فرمایا صفدر...... ایک چھوڑ چار چار معلم اس کو پڑھا رہے ہیں یہ اس عمر میں گلستان اور بوستان' سکندر نامہ اور دیوان حافظ چاٹ چکا ہے اور گومتی پرشاد سے انگریزی بھی پڑھ رہا ہے کیا اسی کا نام ہے تعلیم سے غفلت......!
صفدر بھائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا میں سر جھکائے لیتا ہوں آپ چاہیں تو مجھ کو مار لیں مگر اس قدر ضرور عرض کروں گا چار کیا دس استاد بھی ایسے ماحول میں بے کار ہیں ماموں رئیسوں کے بچے مولویوں سے نہیں ڈر سکتے۔ بلکہ الٹے مولوی ان سے خوف کھاتے ہیں۔ ماموں...... یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے کہ نسیم نانان کے ایک بچے کو باہر سے آئے ہوئے ایک استاد نے ہلکا سا تھپڑ مار دیا تھا تو انہوں نے اس کا ہاتھ فوراً تڑوا دیا تھا۔...... اس دن سے یہاں کے تمام استاد اور بھی ڈر گئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو گھرکی تک دینے کی جرات نہیں کرتے"۔ یہ سن کر میاں کچھ سوچنے لگے۔ صفدر بھائی نے اشارے سے بتایا کہ آثار اچھے ہیں۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میاں نے کہا کہ صفدر یہ تو بتاؤ شبیر کو بھیجوں تو بھیجوں کہاں لکھنو ہر چند قریب ہے مگر وہاں کے رنگین ماحول میں یہ

---

[1] اے میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں وہ بگڑے ہوئے بغیر مانے گا نہیں۔ اور اس کا اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اس کے پاؤں میں اخلاقی جلالی کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی پھر بھی یہ شبیر اس گنبد اور ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں و بارگاہ مغاں میں پہنچ جائے گا۔ کاش میاں ہی کو نہیں دنیا کے تمام باپوں کو یہ معولم ہوتا کہ اپنے بیٹے اور اس کے فطری میلان کے بیچ میں آ کر کوئی باپ تا دیر ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام نیچا نہیں دکھا سکتے۔ اگر کروروں انبیاء پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی طرف بہنے لگے پانی ان کا حکم نہیں مانے گا اور نشیب کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سن کر کوئی انسان کے ذی شعور اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات

www.pdfbooksfree.pk

کرے گا تو غور کرنے کے بعد اس کو پتا چل جائے گا کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جبلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

بگڑ جائے گا۔صفدر بھائی نے کہا ماموں یہ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ان کی تعلیم لکھنو میں ہو میں اپنے بیٹے اسرار حسن کو سیتا پور میں پڑھا رہا ہوں آپ شبیر میاں کو سیتا پور بھیج دیں وہاں ملیح آباد کے بہت سے لڑکے یعنی عبدالباری عبدالعزیز فخر الحسن پڑھ رہے ہیں اور شبیر میاں کا لنگوٹیا یار ابرار بھی وہیں تعلیم پا رہا ہے۔

میاں نے یہ سن کر ارشاد فرمایا اچھا صفدر.....ایک مہینے کے بعد شبیر کو سیتا پور لے جانا میں اس ایک مہینے میں اپنے دل کو بھی سمجھا لوں گا...... یہ سنتے ہی میرا دل قلقاریاں مارنے لگا۔

لیکن جب پورا مہینہ گزر جانے کے باوجود میاں کا وعدہ ایفا نہیں ہوا تو میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اسی اثناء میں جب لفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لیے میاں لکھنو جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔اور جب وہ لاٹ صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔لاٹ صاحب نے میرے باپ سے پوچھا آپ کا یہ لڑکا رو کیوں رہا ہے؟تو میں نے ان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔لاٹ صاحب نے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔اور میرے باپ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ خاں صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں ایسے علم کے شوقین لڑکے کو تو ولایت میں بھی نہیں ہیں۔آپ اس کو ایک مہینے کے اندر اندر کسی سکول میں داخل کر کے مجھے مطلع کریں۔اتنا کہہ کر اس نے بڑے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور کہا اگر خاں صاحب نے میری بات نہیں مانی تو میں سرکاری وظیفہ دلا کر تم کو تعلیم کے واسطے لندن بھیج دوں گا"۔

گورنمنٹ ہاؤس سے نکل کر جب میاں گاڑی میں بیٹھے تو مجھ پر برس پڑے۔

فرمایا

مردود تو نے لفٹیننٹ سے میری شکایت کیوں کی اور وہ بھی میرے منہ پر۔۔۔۔۔۔کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اس لال منہ والے بندر سے ڈر جاؤں گا؟ خوب کان کھول کر سن لو کہ اگر لفٹیننٹ گورنر کے باپ بھی کہیں گے پھر بھی میں تجھ کو گھر سے باہر بھیج کر نہیں پڑھانے کا۔۔۔۔۔۔ایسی تیسی لاٹ صاحب کی۔۔۔۔۔۔یہ سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ہچکیاں بندھ گئیں روتے روتے۔۔۔۔۔۔اور دوران گریہ فرط قلق سے میری سانس میرے گلے میں گھوم پھر کر کچھ ایسے زبردست جھٹکے سے نکلی کہ میرے عاشق باپ کا منہ فق ہوگیا فرط محبت سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔انہوں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔اور انتہائی عجلت کے ساتھ کہا تیرے سر کی قسم ایک مہینے کے اندر میں تجھ کو سیتاپور بھیج دوں گا۔۔۔۔۔۔میری سانس ٹھہر گئی ہچکیاں رک گئیں۔آنسو تھم گئے۔میرے باپ نے مجھ کو بہت غور سے دیکھ کر پوچھا بیٹا اب طبیعت کیسی ہے۔میں نے مسکرا کر کہا اچھا ہوں میاں۔ان کے چہرے پر بحالی آ گئی۔اور میں دل ہی دل میں سیتاپور جانے کے دن گننے لگا۔

ملیح آباد آتے ہی میاں نے صفدر بھائی کو بلا بھیجا اور کہا صفدر تم شبیر کو جمعہ کے دن سیتاپور لے جاؤ میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔

دو دن کے اندر اندر میرے ساتھ جانے والی باورچی کا جس کو سید کے نام سے پکارا جاتا تھا تقرر کر دیا گیا اور صفدر بھائی نے چار پانچ دن کے اندر اندر میرے تمام زریں اور بھڑکیلے کپڑے نظری کر کے سادہ جوڑے سلوا دیے۔

خدا خدا کر کے جمعہ آیا۔میرا تمام سامان گاڑی میں رکھوا دیا گیا۔لیکن بڑی بی دادی ماں اور سب سے زیادہ میرے باپ کی رخصتی آنسوؤں میں گاڑی کا وقت بہہ گیا اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

دوسرا جمعہ آیا۔۔۔۔۔۔میں گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے پیشتر ہی تیار ہوگیا۔۔۔۔۔۔دادی

اور ماں نے میرے بازو پر امام ضامن باندھے سب نے یکے بعد دیگرے مجھے گلے سے لگایا۔ بڑی بی نے بھی مجھ کو سینے سے چمٹالیا۔ میاں نے اس قدر بھینچ کر مجھے سینے سے لگایا کہ میری پسلیاں لچک گئیں۔ اور میرے سینے پر ان کے دھڑکتے دل کی ضربیں پڑنے لگیں......آنگن میں پہنچ کر جب حسب دستور قرآن کے نیچے سے نکلے تو میاں نے بھرائی ہوء آواز میں حکم دیا کہ ادھر آؤ بیٹا میں ان کے پاس پہنچا انہوں نے ارشاد فرمایا تھوری دیر کے واسطے بیٹھ جاؤ۔ اور دو چار منٹ کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر جمائی اور فرط اضطراب سے کسمسانے لگا تو میاں نے بری درد بھری آواز میں فرمایا

می روی دگریہ می آید مرا
ساعتے منشیں کہ باراں بگزرد

اتنے میں صفدر بھائی آ گئے اور ہات جوڑ کر کہا ماموں گاری چھوٹ جاۓ گی۔ میاں نے میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ اور پھر اشارے سے مجھ کو رخصت کی اجازت دے کر سر جھکا لیا۔ میاں کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو جھک جھک کر سلام کیا۔ اور جب باہر جانے کے واسطے ڈیوڑھی سے گزرنے لگا تو ہچکیاں میرا تعاقب کرنے لگیں......اور میاں کی آواز سنائی دی۔

سرو سیمینا بصحرا می روی
سخت بے مہری کہ بے ما می روی

الغرض گھر سے باہر اس طرح آیا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

تھرڈ کلاس اور اکے کا پہلا تجربہ

صفدر بھائی نے سٹیشن جاتے ہوئے مجھ کو ایک لمبا لیکچر پلایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب زمانہ تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے امیری کی بو اپنے سر سے نکال دوں ماموں نے مجھ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا ہے مگر میں تم کو لے جاؤں گا تھرڈ کلاس میں......منظور

ہے تمہیں ۔ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ تھرڈ کے مسافروں کو کن کن بلاؤں سے دوچار رہونا پڑتا ہے میں نے ان کی تجویز منظور کر لی ۔

لیکن تھرڈ کلاس میں قدم رکھا تو جی سن سے ہو کے رہ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سب سے پہلے اس ڈبے کی اس بدبو نے میرے دل پر گھونسا مارا جس سے میں کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ڈبہ اوندھا اوندھا سا ہے......اور بے گدوں کی کھردری ذلیل بنچیں میرا منہ چڑھا رہی ہیں......اور ایک بنچ پر چند گنوار، بچھو مار کہ تنبا کو کی چلمیں پی پی کر بری طرح ......کھانس رہے ہیں۔ ناک میں ڈنگ مارنے لگی گڑ کی بدبو......مرتا کیا نہ کرتا سر جھکا کر کھری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ چبھنے لگی......سانس میرے سینے میں الجھ گئی اور امام ضامن گرم ہو کر میرے بازو پر چرکے لگانے لگے اور میں کھڑکی سے منہ نکال کر بیٹھ گیا......اور چار باغ سے نکل کر صفدر بھائی نے دو خبیث اکے والوں کو اشارے سے بلایا۔ اور دو دو کوڑی کے ذلیل اکے اپنے گدھوں کے سے افیونی گھوڑوں کے ساتھ چوں چوں کرتے جب میری طرف رینگنے لگے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے منہ کالا کر کے مجھے گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے۔ صفدر بھاءنے میری حالت کا اندازہ لگا کر قہقہہ مارا اور ان کا وہ قہقہہ اضافہ اہانت بر جراحت کی طرح مجھے بہت ہی برا لگا۔ انہوں نے مجھ کو جز بز دیکھ کر کہا شبیر میاں یہ آپریشن نہایت مفید ہے اس سے تمہارے دل میں جو غرور کا مادہ فاسد ہے وہ خارج ہو جائے گا۔ میں چپ ہو گیا۔

اکا میرے قریب آیا تو میں نے کہا صفدر بھائی اس پر بیٹھوں کیوں کر ......انہوں نے میری بغلوں میں ہات دے کر مجھے بہزار دقت بٹھا دیا اور دوسرے اکے پر سید باورچی سامان سمیت سوار ہو گیا۔

اکے کے چکنے گدے کی بو سے مجھے متلی ہونے لگی۔ اور یاد آ گیا حافظ کا یہ مصرع ۔

صد منزل است و منزل اول قیامت است

اب چار رباغ سے ہمارے ذلیل اکے اا غا میر کی ڈیوڑھی ا کی طرف رسان رسان رینگنے لگے۔

جب ہمارا اکا جھاؤلال کے پل پر سے گزرنے لگا تو میری نظروں کے سامنے سے اپنے پردادا کا محلّہ گزرنے لگا۔ جس کے نکڑ کے پتھر پر احاطہ فقیر محمد خاں جلی حروف میں کندہ تھا۔ اس بورڈ کو دیکھ کر میرے تمام رونگٹے جھن سے ہو گئے۔ خیال آیا کہ ادھر سے دادا جان ہاتھی پر گزرتے اور ان کی سواری کے آگے نقیب بولا کرتے تھے۔ آج اسی طرف سے ان کا پوتا ایک حقیر طوطہ بنا ہوا اکے میں بیٹھا ٹرخ ٹوں ٹرخ ٹوں گزر رہا ہے شرم کے مارے میں نے اپنا منہ چھپالیا۔

ا اس زمانے میں سیتا پور جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے واسطے سٹی اسٹیشن جانا پڑتا تھا۔ جو آغا میر کی ڈیوڑھی میں واقع تھا۔

الغرض بہزار کوفت و ذلت سیتا پور پہنچ گیا۔ ملیح آباد کے تمام لڑکے نہال ہو گئے۔ اور ابرار نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دوسرے ہی دن میرا نام برانچ کے سکول میں لکھا دیا گیا۔ صفدر بھائی نے ہائی سکول کے فرشتہ سیرت ہیڈ ماسٹر بابو گھمنڈی لال اور بورڈنگ کے ہنس مکھ انچارج گھوش بابو سے بھی مجھے ملا دیا اور میں ہزاروں ولولوں کے ساتھ باقاعدہ سکول آنے جانے اور جی لگا کے لکھنے پڑھنے میں سرگرم ہو گیا۔

ابھی سیتا پور آئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے ہوں گے ایک روز شام کو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے داروغہ شیخ امید علی چلے آتے ہیں شیخ صاحب کو دیکھ کر میں سمجھا کہ میاں سیتا پور تشریف لائے ہیں لیکن جب داروغہ صاحب نے میاں کا خط دکھایا تو معلوم ہوا کہ میاں نے فقط دو روز کے لیے ملیح آباد بلایا ہے...... دو دن کی چھٹی لے کر جب رات کی گیارہ بجے والی گاڑی سے ملیح آباد آیا اور اپنے مکان کی گلی میں پہنچا تو یہ دیکھا کہ میاں ڈاکٹر عبدالکریم اور چند سپاہیوں کو لیے خلاف معمول اچکن اور

ٹوپی کے بغیر پھاٹک سے برآمد ہو رہ ہیں...... اور جیسے ہی مجھ پر ان کی نظر پڑی ہائے میرا بیٹا کہہ کر وہ جھپٹ پڑے۔ اور مجھ کو سینے سے لگا کر رونے لگے۔ ڈاکٹر عبدالکریم نے فرمایا خان صاحب آپ خوش ہونے کے عوض رو رہے ہیں۔ میرے باپ نے ارشاد فرمایا ڈاکٹر صاحب کاکوری کے پل سے گزرتے ہی یہ ایک سنت جاریہ ہے کہ ریل ہمیشہ سیٹی دیتی ہیل لیکن آج اسنے سیٹی نہیں دی۔ اور میں یہ خیال کر کے دیوانہ ہو گیا کہ کہیں خدانخواستہ پل تو نہیں ٹوٹ گیا ہے ڈاکٹر صاحب جس کا بیٹا ریل سے آرہا ہو اس کے جی سے پوچھیے کہ وقت مقرر پر ریل کا سیٹی نہ دینا کتنے واہموں کو برانگیختہ کر سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا خاں صاحب سچ کہا ہے کسی نے

عشق است و ہزار بدگمانی

سیتاپور میں میری تعلیم کا سلسلہ ڈیڑھ سال سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اور میری مفارقت کی تاب نہ لا کر غالباً سنہ ۱۹۰۸ء میں میرے باپ نے مجھ کو لکھنو طلب فرما کر حسین آباد کے ہائی سکول ا؎ میں داخل کرا دیا اور میرے قیام کے واسطے نخاس (چڑیا بازار) میں سید اعجاز حسین صاحب کے مکان کا بالائی اور کشادہ حصہ کرائے پر لے لیا گیا۔ میرے مکان کے نیچے ایک منشی واحد علی نوادر کی دکان تھی اس کی دکان کے سامنے کسی بزرگ کا مزار تھا جس پر ہر جمعہ رات کو چراغاں ہوا کرتا تھا اور اس کے اطراف میں ہر اتوار کو چڑیوں کا بازار لگا کرتا تھا اور میرے مکان ۲؎ کے عین سامنے حضرت ریاض خیرآبادی رہتے تھے۔

میں اس واقعے کو آج تک نہیں بھولا۔ کہ جس روز میں نے اس مکان کے چوڑے چکلے سینے میں جس کے دونوں طرف نیچے سے اوپر تک بڑے شاداب گملے رکھے ہوئے تھے پہلا قدم رکھا تھا تو ہوائے سرد کے ایک تیز اور معطر جھونکے نے میرا اس دل نوازی سے استقبال کیا تھا کہ میرے سینے کی تمام کھڑکیاں تڑاتڑ کھل گئی تھیں اور جگر میں ایک ایسی نشہ آور خنکی محسوس ہوئی تھی کہ میں جھومنے لگا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

خدا گواہ ہوا رے سرد و شکریں کا وہ پھولوں میں بسا باریک دھار والا جھونکا میرے سال خوردہ ارگرم و سرد کشیدہ سینے میں آج کی تاریخ تک محفوظ ہے اور رسا بسا ہا ہے اور میرے تھکے ہوئے پھیپھڑے اس کی تازگی کو اس تحریر کے وقت تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔

۱؎ اس سکول میں آغا نی صاحب کے پوتے اور میرے ساتھ میرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کے حکم سے یہ امتیازی برتاؤ کیا گیا تھا کہ تمام لڑکے تو بنچوں پر بٹھائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو کلاس ٹیچر کی میز کے داہنے بائیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور وہیں میں چھٹے اور ساتویں درجے کا امتحان پاس کرکے آٹھویں درجے میں آ گیا تھا سید محمد جواد صاحب جو ہمارے دینیات کے معلم تھے۔ ہر چند مجھے دینیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر سید صاحب کے کلاس میں بڑے شوق سے جاتا تھا اور ان کی عربی و فارسی کی غیر معمولی قابلیت سے فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ میرزا حبیب حسین صاحب اور سید محمد جواد صاحب کی شخصیتوں اور شفقتوں کو میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔ اور اللہ جنت نصیب کرے مجھ میں اگر معصومیت ہوتی تو میں ان دونوں بزرگوں کے واسطے تمام عمر یہی دعا کرتا رہتا۔

۲؎ وہ مکان شہید کر ڈالا گیا ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک نیا مکان تعمیر کرا کے اب وہاں ایک مطربہ رہتے رہے آکے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد۔

اب کبھی جب کبھی پاکستان سے لکھنو جاتا ہوں اور اپنے وطن میں ایک پردیسی کے مانند گھومتا ہوں جب نخاس کی طرف نکل جاتا ہوں وہ وہ سب سے پہلا جھونکا چڑیا گھر کے درختوں سے اتر کر نیچے آتا ہے اور ہائے میرے شبیر کا دردناک نعرہ لگا کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیتا ہے اور ہچکیوں پر ہچکیاں لینے لگتا ہے۔ جرنیلی ٹوپی اور سونے کے درکا وہ لڑکا جو وہاں سے حسین آباد سکول جایا کرتا تھا۔ میرے وجود کے احاطے سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور بڑی رقت کے ساتھ پوچھتا ہے

کہ میں اب یہ ہو کر رہ گیا ہوں ۔اور اسی لمحے کے اندر میرا محبوب عطا حسین قزلباش جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ سیاہ شیروانی پہنے اور آنکھوں میں آنسو بھرے اس دردانگیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھا کر اپنا سر جھکا لیتا ہے جس مسکراہٹ کی دھاریوں میں کروڑوں نوحے کروٹیں لیتے رہتے ہیں ہائے کھائے جارہی ہیں مجھ کو پرانی یادیں دل پھٹا جا رہا ہے میرا اے میرے اللہ!

اس زمانے میں میرے مکان کے سامنے اور حضرت ریاض خیرآبادی کے مکان کی دیوار کے نیچے دور تک گھوڑا گاڑیوں کا اڈہ تھا۔ جہاں پچیس تیس گاڑی والے رہتے تھے۔اور ہر روز بلاناغہ صبح سے چار پانچ بجے۔ایک صاحب وکٹوریہ روڈ کی طرف سے مولی اعلیٰ امام علی مرتضیٰ علی گاتے ہوئے جیسے ہی میرے مکان کے سامنے سے گزرتے تھے تو گاڑی والے ٹھمکی دار آواز میں نعرہ لگایا کرتے تھے۔نواب صاحب بکرا حاضر ہے۔اور وہ نواب صاحب ان کو گالیوں پر دھر لیا کرتے تھے۔لیکن کیا مجال کہ کوئی فحش لفظ زبان پر آجائے۔

جیسے ہی گاڑی والوں کی آواز بلند ہوتی تھی کہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے ویسے ہی وہ بڑی سریلی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہتے تھے اے آل رسول کے دشمنو اے معاویہ کے دنبو اے ابن زیاد کے اونٹو تم پر لعنت تم پر آخ تھو اے یزید کے پلو اے ابن ملجم کے بوکڑو۔اے ہند جگر خوار کے پڑدو۔تم پر لعنت ہزار بار لعنت اے کنواریوں کے جنو لعنت لعنت ہزار بار لعنت آخ تھو آخ تھو آخ تھو اور ان گالیوں پر گاڑی والوں کے قہقہے بلند ہو جاتے تھے اور جب وہ گالیاں دیتے ہوئے گڑھے والی سرائے کی طرف مڑنے لگتے تھے تو گاڑی والوں کی آواز پھر بلند ہو جاتی تھی نواب صاحب بکرا حاضر ہے......نواب صاحب بکرا حاضر ہے اور وہ اسی نوع کی گالیاں دیتے ہوئے مڑ جایا کرتے تھے اور اس طرف میرے گونڈے کے باشندے میاں نوروز باورچی کا بھی یہ معمول تھا کہ جب وہ نواب صاحب بکرا حاضر ہے کی آوازیں سنتے تھے......تو

www.pdfbooksfree.pk

چارپائی پر اٹھ بیٹھ جاتے اور بڑبڑا نے لگتے تھے کہ ان سالے گاڑے والوں پر نالت (لعنت) روج روج (روز روز) بکرا حاجر بکرا حاجر (بکرا حاضر) بیکھا کرت ہیں (چیخا کرتے ہیں) یو (یہ) کا (کیا) وارے بات (واہیات) پنا (پن) ہے سالے سویرے سویرے اللہ رسول کا نام تو لیت (لیتے) نا ہیں (نہیں) بکرا حاجر بکرا حاجر کا گل (غل) مچائے رہت (رہتے) ہیں تھوک ہے ان کی اوقات پر۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ اس نواب صاحب بکرا حاضر ہے کے ہنگامے میں کوئی گھنٹے دو گھنٹے بیشتر میں اپنا سبوق یاد کرنے کے بعد دیوان حافظ کے مطالعے میں غرق تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی تارے جھلملا رہے تھے۔ کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے سے بھیروں میں ڈھلی ایک تان لرزتی آئی۔

سحر بابادی گفتم حدیث آرزو مندی

خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بت تھی کہ میں بھی اس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا صبح کا سہانا وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے...... دھندلکے میں طلسمی شان اور اس پر یہ درد بھری تان...... میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی۔

ابھی میر اتمام بدن گنگنا رہا تھا کہ اسی لوچ کے ساتھ دوسری تان سنی۔

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است

بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی

---

[1] دراصل وہ سرائے نہیں تھی بلکہ ٹکھائیوں کا چھوٹا اس محلّہ تھا جو اب سڑک میں آ چکا ہے۔

اب مجھ سے رہا نہیں گیا ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین تین سیڑھیاں طے کرتا سڑک پر آ گیا۔ اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے سفید داڑھی کے دراز قامت بزرگ میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف منہ کیے دھیمے سروں میں گا رہے ہیں۔

بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی

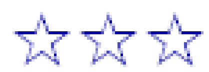
نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ان بزرگ نے بڑی حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا۔ اور زیر لب کہا اللہ اللہ یہ عمر اور اس قدر دردمندی......میاں صاحب زادے تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں طالب علم ہوں۔ وہ میرے قریب آ گئے اور کہا ''صاحب زادے ذرا ادھر سڑک کی روشنی کے نیچے تو آ جاؤ'' میں روشنی کے کھمبے کے نیچے آ گیا۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا بار بار دیکھا......اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز ان کی جاتی ہے......اور پھر کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا۔ صاحب زادے تم کون ہو؟......میں نے پھر وہی کہا طالب علم ہوں۔ انہوں نے یہ سن کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بڑی آہستگی سے کہا صاحب زادے تم طالب علم نہیں مطلوب علم ہو۔ مطلوب علم ہو۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور

در خرابات مغاں نور خدا می بینم

دیں عجب کہ چہ نورے زکجا می بینم

کہتے ہوئے کڑہ ابوتراب خاں کی ڈھال کی جانب مڑ گئے......اور میں تا دیر اس طرح مبہوت کھڑا رہا گویا میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔ اور اس وقت بھی جب کہ میں اس واقعے کو قلم بند کر رہا ہوں میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں اور وہ چاندنی رات مجھ پر چھائی ہوئی ہے۔ اور ان بزرگ کی آواز کڑہ نواب ابوتراب خاں کے موڑ سے اس وقت بھی میرے کانوں میں آ رہی ہے۔

دیں عجب بیں کہ چہ نورے نہ کجا می بنیم!!



میرا نکاح

میرا نکاح ایسا ویسا نہیں بڑی ضدم ضدا اور بڑی چوٹم چاٹا کا نکاح تھا۔ اس صورت حال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجیے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے مختلف البطن بھائی تھے نواب محمد نسیم خاں...... ان دونوں بھائیوں کے مابین حسب دستور خاندان بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مانند، بڑی ان بن اور بڑی تن پھن رہا کرتی تھی۔ میرے خسر نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے تھے اور میں نواب محمد احمد خاں کا پوتا تھا اس لیے میرے خسر کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرا نکاح ہو، لیکن چوں کہ میرے خسر اور میرے باپ کے درمیان دستور خاندان کے خلاف بڑی گہری محبت تھی اس لیے میرے باپ نے جب میرا پیام دیا تو انہوں نے منظور فرما لیا۔ اور ان کی منظوری سے میرے خسر کا تمام قبیلہ بگڑ گیا اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ملال ہوا...... اور اس بنا پر میرے نکاح کے موقع پر میرے نکاح کو خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑ کا...... بڑی دھوم سے مجرے ہوئے دعوتیں ہوئیں، اور عین نکاح کے دن دشمنوں کو جلانے کے لیے اس قدر زور زور سے ڈھول پیٹے گئے اور اس قدر شدت سے تاشے بجائے گئے اور اتنے بڑے بڑے ہو دز رگولے چھوڑے گئے کہ ان کی دوں دوں دناؤن دناؤن سے دور دور تک زمین ہلنے لگی۔ ہائے پٹھانوں کا مزاج!

---

[1] اس وقت میری عمر ہو گی مشکل سے گیارہ بارہ برس کی۔

لیکن یہ نکاح آگے چل کر کیا رنگ لایا کتنا بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد۔ اور میرے سہرے کے پھولوں نے کتنے کانٹے بو دیے میرے باپ کی رہ گزار حیات میں اس کا ذکر آگے آئے گا۔

یوں تو نو برس کی عمر سے ہی شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر مجھ سے شعر

کھلانا شروع کر دیا تھا۔لیکن آگے چل کر جب شاعری سے میرا انہاک بڑھنے لگا تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی میرے باپ کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ خبردار اب اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔[1] اور اس کے ساتھ انہوں نے زنانے میں بوا گلزار اور مردانے میں داروغہ امید علی کو مامور فرمایا کہ وہ جب مجھے شعر کہتے دیکھیں تو ان کی جناب میں رپورٹ پیش کریں[2]۔باپ کے اس حکم امتناعی اور زنانہ و مردانہ خفیہ پولیس کے تقرر نے مجھ کو بوکھلا دیا۔

---

[1] میری تو نو برس کی جان اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمایئے۔ذرا سوچیے کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو دادا بھی شاعر ہو دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں بڑی پھپّی بڑی بہن اور بڑا بھائی بھی شاعر ہو جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو۔جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو جس کی دادی میرزا غالب کی قرابت دار ہو اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی ہو جس کی انا خالص لکھنوی ہو اور رات کے وقت کھلی ہے کنج قفس میں مری زبان صیاد کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو جس کے گھر میں آئے دن لکھنو کے شاعر آتے جاتے اور تیسرے چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعراء کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا؟......[2] بوا گلزار اور داروغہ امید علی جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر استدعا کرتا تھا کہ خدا کے لیے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت اور بے درد تھے کہ میری رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔بوا گلزار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا تھا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور داروغہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔شاعری نے مجھ کو تو برباد کر ڈالا تھا مگر میرے مخبروں کے گھر بھر دیے

آپ	کو	سوخت	غیر	کو	لذت
یہ	مزا	ہم	کباب	میں	دیکھا

مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر' شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب بھی نہ پھٹک۔ اس میں کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں اور کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں۔

سوچنے لگا' میں اپنی ذات سے جدا کیوں کر ہو جاؤں۔ شعر کہتا ہوں تو باپ بگڑتے ہیں میں نہیں کہتا تو دل پر بگاڑ آتے ہیں۔ ادھر باپ کا حق واجب الاذعان ہے ادھر فطرت کا ناقابل تسخیر میلان...... ادھر منشائے پدر ادھر تقاضائے قضاوقدر۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ شعر کہوں تو باپ ڈانٹ پلائیں اپنے دستر خوان پر کھانا نہ کھلائیں اور شعر نہ کہوں تو دماغ کے پرخچے اڑ جائیں۔

میری حالت آدم و ابلیس کی سی ہوگئی...... آدم کو ممانعت ی گ ءتھی کہ خبردار شجر ممنوعہ کے قریب بھی نہ پھٹکنا لیکن مشیت الٰہی کا تقاضا تھا کہ آدم لوٹ جی بھر کے مزے لوت شجر ممنوع کے اور ابلیس کو حک دیا گیا تھا کہ جھک جا سجدے میں آدم کے روبرو۔ لیکن مشیت نے آنکھ دکھادی تھی کہ اگر بے اگر سجدی کردیا تو ناک کاٹ ڈالی جائے گی جڑ سے۔

سو جس طرح آدم و ابلیس ممانعت و حکم سے روگردانی کر کے مشیت کے سامنے جھک گئے اور مجال نہین تھی کہ منہ جھکتے اسی طرح میں حکم پدر سے روگردانی کر کے فرمان قضاوقدر کے آستاں پر سربسجود ہوگیا۔

اس لیے میں شاعری ترک نہیں کر سکا۔ لیکن چوری چھپے شعر کہتا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا کسی گوشے میں جا کر ان کو لکھتا اور پرچے اپنے صندوقچے کے اندر مقفل کر دیتا۔ اور قاچاقیوں (سمگلروں) کی طرح اس صندوقچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا کہ وہ اس کو چھپا کر رکھ دیں میری ماں کو میری اس حالت پر بڑا ترس آتا تھا مگر وہ اداس ہو جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھیں۔

www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس قدر مجرموں کی سی احتیاط کے باوجود میں ادھر اور باہر کئی بار عین موقع پر شعر کہتا پکڑا گیا۔ میرا جیب خرچ بند ہوا' باپ نے اپنے ساتھ کھانا کھلانا ترک کر دیا' اور اکثر تھپڑ بھی مارے اپنی ہر ذلت کے بعد میں نے بارہا اپنے کان پکڑ کر قسمیں کھائیں کہ اب کبھی شعر نہیں کہوں گا۔ اب کھائی سو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی۔ لیکن جیسے ہی میرے دل میں شاعری کی رگ رگاہٹ ہونے لگتی تھی میری تمام قسمیں چور چور ہو کر رہ جایا کرتی تھیں اور حضرت وحشت کا یہ شعر مجھ پر صادق آ جایا کرتا تھا۔

مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی
خیال ترک محبت تو بار بار آیا

شعر گوئی کی اجازت

ایک بار میں اپنی صندوقچے میں جیب سے پرزے نکال نکال کر رکھ رہا تھا کہ بوا گلزار نے دیکھ لیا اور وہ بھانپ گئیں...... میاں کو خبر کر دی۔ میاں آئے دن میری ماں سے کہا شبیر کا صندوقچہ کہاں ہے؟ میری ماں کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا۔ میاں کا خوف اس قدر تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکیں اور میرا صندوقچہ ان کے سامنے رکھ دیا میاں نے مجھ سے کنجی مانگی کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے کنجی دے دی انہوں نے صندوقچہ کھولا میرے پرزے ایک ایک کر کے نکالے...... میں اپنے گاپ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے گائے اپنے بچھڑے کو چھری کے نیچے دیکھ کر کانپنے لگتی ہے۔ اور جب انہوں نے میرے تمام پرزے چر چر پھاڑ کر پھینک دیے تو میرے منہ سے ایک بڑی دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا میری ماں دیوانہ وار مجھ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ میاں کے حواس اڑ گئے دادی جان نے آ کر میرے باپ کو ڈانٹا کہ کیا بچے کو مار ڈالے گا۔

ڈاکٹر عبدالکریم کو میرے بے ہوش ہو جانے کی خبر کی گئی۔ انہوں نے میری نبض دیکھی اور کہا خان صاحب گھبرایئے نہیں میں دوا ساتھ لایا ہوں۔ انہوں نے میرا منہ چیر کر دوا پلائی رئیس کی انا نے منہ پر چھینٹے مارے اور دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہوش

آ گیا...... مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھ کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی...... میں تجھے خود اصلاح دیا کروں گا۔ ادھر آ کر دھم بھر کے لیے اس پلنگڑی پر لیٹ جا میں لیٹ گیا تو میرا جی بہلانے کے لیے انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا اس شعر کے معنی بیان کر۔

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں شب وعدہ

میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

اب شعر کی اجازت مل جانے کے بعد میری طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ میں نے ذرا اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا۔ اب شاعر اس شش و پنج میں ہے کہ میں گل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کھلے ہوئے پھول اور اگر وہ دیر سے آنے والا ہے تو میں بے کھلی کلیاں بچھا دوں؟

میاں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب معنی صحیح بیان کیے ہیں شبیر نے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس سے زیادہ صحیح معنی بیان ہی نہیں کیے جا سکتے۔ میاں نے کہا مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن طرز بیان میں اس نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ صاحب زادے پھر تشریح کر دیجیے۔ میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرا دیا...... ڈاکٹر نے کہا۔ میرے نزدیک تو آپ کے صاحب زادے نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے میاں نے ہنس کر کہا۔ آپ لاکھ سخن سنج اور حالی کے ہم وطن سہی پھر بھی جائے استاد خالیست سنیے اس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس نے کھلے ہوئے پھول کہا ہے کلی جب چٹک کر کھل جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے۔ کھلاوٹ تو پھول کی عین ذات ہے اس لیے کھلے ہوئے پھول کہنا حشو و زوائد میں داخل ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے کلی کے متعلق بے کھلی کلیاں کہا ہے حالانکہ کلی کو تو اسی لیے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہے اور بے کھلا پن اس کی عین ذات ہے۔ اس لیے بے کھلی کلیاں کہنا صرف اسراف الفاظ ہی نہیں ایک مہمل سی بات بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

www.pdfbooksfree.pk

کہا بے شک آپ کا خیال درست ہے۔ پھول اور کلی کے ساتھ ان توصیفی سابقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد میاں نے ارشاد فرمایا اچھا ایک اور شعر کے معنی بھی بتاؤ تو میں تمہاری شعر فہمی کو مان جاؤں گا۔

آ رہے ہیں لاش کے وہ ساتھ ساتھ
اب ہماری قبر کتنی دور ہے

یہ شعر سن کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آیا اور سوچنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ سوچنے کے بعد میں خوشی سے اچھل گیا بستر سے اٹھ بیٹھا میں نے کہا شاعر کے جنازے کے جلوس میں اس کا دوست شریک ہے۔ شاعر کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اس کے دوست کو پیدل چلتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہو گی اس لیے وہ سا غور کر کے عرض کیا میاں یہ شعر تو بہت آسان ہے...... اکتا کر پوچھ رہا ہے کہ اب ہمارے قبر کس قدر فاصلے پر رہ گئی ہے میاں نے جھک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو بہت داد دی اور اس امر کا اعتراف کر لیا کہ ان کو یہ شعر مہمل معلوم ہو رہا تھا میاں نے مجھ سے کہا تمہیں اس شعر میں فن کے نقطۂ نظر سے کوئی عیب تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں بے چارہ فن سے واقف ہی کہاں تھا۔ میں نے کہا کوئی عیب نہیں ہے۔ میاں نے فرمایا اس کے پہلے مصرع میں تعقید ہے اور پھر مثالیں دے کر سمجھایا کہ تعقید کیا چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا خان صاحب آپ صاحب زادے کو شاعری سے باز تو نہیں رکھ سکتے۔ لیکن یہ بات ضرور سمجھا دیجیے کہ تکمیل تعلیم سے بیش تر اس مشغلے پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔

میاں نے فرمایا ڈاکٹر صاحب میں تعلیم سے بھی آگے کی بات سوچ رہا ہوں......

یعنی شاعری وہ چیز ہے جو شارع کو اس امر کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ شعر کہنے اور شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ دنیا کا کوئی اور کام بھی کر سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ بد بلا ہے کہ شاعر کے دل میں دولت کو اس قدر حقیر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مفلسی کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے.....ڈاکٹر صاحب جی باوا[1] کے پاس جس قدر جائے داد اور دولت تھی وہ میرے پاس نہیں ہے۔اور میرے پاس جو جائے داد اور دولت ہے وہ میرے بعد اس کے سات بھائی بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔اور اس کے پاس جائے داد کا جو حصہ آئے گا وہ اس قدر بڑا نہیں ہوگا کہ شاعر کی بے نیازی کو تا دیر برداشت کر سکے۔اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کے دعا کے لیے ہاتھ بلند فرما دیے کہ اے اللہ میرے شبیر کو تباہی[2] سے بچانا اور اس پر ایسی کرم کی نگاہ رکھنا کہ معاش کی خاطر اس کو دوسروں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

---

[1] میرے باپ کے دادا یعنی حضرت گویا کو جی باوا کہتے تھے..... [2] میاں آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی آپ نے دعا مانگی تھی اس بارگاہ میں جہاں عمر خضر کی درازی کے علاوہ کوئی دعا قبول ہی نہیں فرمائی جاتی..... آپکو خبر نہیں کہ آپ کی آنکھوں کا تارا شبیر ایک کثیر العیال وفقید المعاش بوڑھے کی صورت میں وادی غربت میں ٹھوکریں کھا رہا ہے وہ پاکستان آ کر ایک معمولی سی تنخواہ پر زندگی بسر کر رہا ہے۔لیکن اس جرم پر ملازمت اور دیگر وسائل معاش سے محروم کر دیا گیا ہے کہ وہ عزت نفس کے مرض میں مبتلا ہے (۲) کسی کے اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکاتا (۳) وہ اپنے ضمیر اور قلم کو فروخت نہیں کرتا (۴) اسے اپنے آبائی وطن سے نفرت نہیں ہے (۵) اور اس کا سب سے بڑا قصور جس سے بغاوت کی بو آتی ہے یہ ہے کہ وہ وقظ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو ہی نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو وحدت کی زنجیر میں جکڑ کر ایک مستحکم اکائی اور ایک آفاقی ریاست بنانے کے شیطانی خواب دیکھتا رہتا ہے۔

میاں کاش میں آپ کی زندگی ہی میں مر جاتا اور آپ میرا جنازہ اٹھاتے اور مجھ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔مگر کیا کیا جئے قضاوقدر کی ستم ظریفی کو

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشہ خلیل

آرد بزبر تیغ و شیشہ نہ می کند

پہلا مشاعرہ

یہ غالباً سنہ ۱۹۱۰ء یا سنہ ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں حضرت مولانا رضا فرنگی کے محلی کے مشاعرے میں پہلی بار شریک ہوا اور دنگ ہو کر رہ گیا۔

آیئے آپ کو اس مشاعرے میں لے چلوں تا کہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے چاندنی پر قالین ہیں گاؤ تکیے دیواروں سے لگے ہوئے...... ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان نیچوں میں ہار لپٹے حقے شال باف سے منڈھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوری ہانڈیاں ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور الا پچی دانے تنبا کو اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں شعراء زیادہ تر انگرکھے اور کم تر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں گلوریاں کھائی جا رہی ہیں اور حقے پیے جا رہے ہیں...... اور جو شاعر مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے۔ وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کر رہا ہے حاضرین اس کے حسب مرتبہ نیم قد یا سرو قد جوابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں...... لیجیے اب میر مشاعرہ کے سامنے شمع آ گئی ہے اور مولانا رضا کی غزل سے حسب دستور مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور داد سے چھت گونجنے لگی ہے کس کی یہ مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرع نہ اٹھائے حقہ پی لے پان کھالے' آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

میر مشاعرہ کے بعد اب شمع گردش کر رہی ہے۔ نو مشق نوجوانوں کی صفوں میں اور کمی بیشی کے ساتھ سب کو داد مل رہی ہے۔ اور معمولی اشعار کے سروں پر بھی ماشاءاللہ کے سہرے باندھے جا رہے ہیں۔ لیجیے نو مشقوں میں میری باری بھی آ گئی۔ ارے غضب ہو گیا شمع سامنے رکھی ہوئی ہے رعب محفل سے میں کانپ رہا ہوں شعرا کی صفوں سے آوازیں آ رہی ہیں بسم اللہ صاحب زادے بسم اللہ لیکن صاحب زادے کا

دم نکلا ہوا ہے کیا مجال کہ منہ سے ایک حرف بھی نکل سکے......اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں پڑھتے کیوں نہیں پٹھان کا بیٹا تو بارہ برس کی عمر سے ہی رن میں تلوار چلانے لگتا ہے......اور ایک تم ہو کہ تم سے ایک غزل بھی نہیں پڑھی جا رہی۔ اب میرزا محمد ہادی صاحب رسوا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آ گئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں۔ صاحب زادے آپ تو شاعر شاعر کے بیٹے شاعر کے پوتے اور شاعر کے پڑپوتے ہیں۔ پڑھیے اور گرج کر پڑھیے......اب بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں مطلع پر داد مل رہی ہے اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں۔

اے نسیم صبح کے جھونکو، یہ تم نے کیا کیا
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پا رہا ہوں......اور ولولے کے ساتھ دوسرا شعر سنا رہا ہوں۔

میری آنکھیں جانتی ہیں کب افراط خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں

اب داد کا غلغلہ زیادہ بلند ہو رہا ہے۔ اور سبحان اللہ ماشاءاللہ سے مشاعرہ گونج رہا ہے۔ اور میرزا محمد ہادی رسوا حضرت صفی سے کہہ رہے ہیں مولانا دیکھیے آپ نے اس شعر کے تیور یہ عمر اور اتنی گہری بات......اور اب میں آخری شعر پڑھ رہا ہوں۔

ہائے میری مشکلو ' تم نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دل چسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں

دیکھیے چھتیں اڑ رہی ہیں اور دھویں پا رہو رہے ہیں اس شعر کی داد سے......اور فرما رہے ہیں اللہ نظر بد سے بچائے۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا گھر آیا خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی......اور سو گیا تو خواب میں رات کو یہ دیکھتا رہا کہ پریاں

بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

غسل مجھ پر واجب ہو گیا......صبح اٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر جب اپنے باپ کی خواب گاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا تو باپ کی آواز آئی ادھر آیئے جناب! دم نکل گیا اس آواز غضب سے......اور جب لرزتا ہوا......ان کی خواب گاہ میں گیا تو انہوں نے بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا دیکھیے صاحب! یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں پھولیں عمر مسیح و خضر پائیں آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے آپ زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے......مگر کان کھول کر سن لیجے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری[1] میں بھی بڑھ جائیں۔ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی اب آپ کا میرے ساتھ مشاعرے جانا بند......قطعی بند......غضب خدا کا باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے میں یہ الٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے کا......سنا خاں صاحب آپ نے؟؟

میرے باپ میر کو غالب پر ترجیح دیتے ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے اور داغ کے اس شعر پر عامل تھے۔

کہتے ہیں اسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں اپنی ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی جس میں جابجا فارسی کی ترکیبیں تھیں۔اور ایک مصرع تھا۔

ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے

---

[1] غصے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جایا کرتا تھا۔ غالباً سچ کہا گیا ہے کہ Art is selfish

---

انہوں نے تیوریوں پر ڈال کر ارشاد فرمایا سبحان اللہ یعنی وفائے رازداں تک اس

لیعنی کی داد نہیں دی جاسکتی ...... مجھے اس بات کا شدید خوف ہے کہ آٹھ دن میں ......
شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تک آ جاؤ گے۔ نا صاحب میں تمہیں اصلاح نہیں
دوں گا۔اور تمہیں عزیز صاحب کے سپرد کر دوں گا۔وہ بھی یعنی وفائے راز داں اور شمار
سبحہ کے برتن والوں میں سے ہیں دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا...... یہ فرما کر
انہوں نے عزیز صاحب کو بلا کر مجھے ان کا شاگرد بنا دیا......اور یہ سلسلہ تلمذ پانچ چھ
برس کے اندر ہی منقطع ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ
تھے......اور جہاں تک کہ زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے ان کی ذات
سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ
میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت پر سفر نہیں کر رہی
ہے اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور ابھر آتا ہے لیکن
معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا۔

لیکن اسے سے میرے اور ان کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پا سکی۔ میں
ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکاتا اور وہ ہمیشہ میرے سر پر ہات پھیرتے رہے۔

ایک دن جب کہ میں بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔میری ماں نے بڑے
درد بھرے لہجے میں مجھ سے ارشاد فرمایا ننھے تمہارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا
چاہتے ہیں میں سوتیا ڈاہ سہ نہیں سکوں گی۔ مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو۔ورنہ میں
سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی۔ ماں کی یہ بات سن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا
اماں آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو چھ سات دن کے اندر ہی نانا جان کے وہاں پہنچا
دوں گا

اس کے بعد میں نے بڑے بھائی شفیع احمد خاں اور ابرار حسن سے مشورہ کیا اور
بات بتانے کو کہا......وہ دونوں آمادہ ہو گئے......لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے اور وہ

بھی ریزروکمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ہم دو روز تک یہی سوچتے رہے کہ روپیہ کیونکر فراہم کیا جائے لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی۔تیسرے دن ابرار آئے اور کہنے لگے کیا کہیں گے آپ بھی روپے کی ایسی تدبیر سوچ کر آیا ہوں کہ پٹ ہ نہیں سکتی۔آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں (میرے باپ) اور محمد علی چچا کے درمیان آج کل ان بن ہے آپ اسی وقت ان کے پاس چلے جائیں اور ساری داستان سنائیں۔اور مجھ کو یقین ہے کہ بشیر ماموں کی دل آزاری کے واسطے وہ کھٹ دے ڈیڑھ دو ہزار روپے دے دیں گے۔

مجھے ابرار کی یہ تدبیر پسند آئی اور جی کڑا کر کے محمد علی چچا کی طرف روانہ ہو گیا اور جب ان کی کوٹھی کے لکڑی کے زینے پر پہنچا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک جڑواں صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔اور ان کے پہلو میں ایک بلا کی نوخیز طوائف بیٹھی گنگنا رہی ہے۔اور سامنے صوفے پر چچا کے مصاحب سکندر میرزا صاحب اس کے گلے کی داد دینے میں سرگرم ہیں۔

یہ سوچ کر کہ میں بے موقع آ گیا ہوں میرا دل چاہا کہ الٹے پاؤں چلا جاؤں لیکن اس نوخیز طوائف کی صورت اور اس کی آواز نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔اور میں نظر جمائے اور طاقت سماعت کو حاضر کیے اس کی صورت دیکھنے اور اس کا ترنم سننے لگا کہ اتنے میں چچا نے حقے کا یک لمبا سا کش لے کر دروازے کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھا میں کھڑا ہوا ہوں اور حیرت وشرم کے ساتھ ان کے منہ سے نکل گیا......ارے غلام شبیر !میں نے سلام کیا۔

وہ طوائف اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میرے دل پر شہاب ثاقب کی سی لکیر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور سکندر مرزا صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے گئے۔

چچا سے میں نے تمام ماجرا بیان کر کے دو ہزار طلب کیے۔انہوں نے زبان سے

ایک حرف بھی نہیں کہا اٹھے اور الماری سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میرے حوالے کر دیے میں نے چچا کو جھک کر سلام کیا۔ اور اس طوائف کو پھر ایک نظر دیکھنے کی تمنا لیے ہوئے گھر آ گیا۔

---

[1] میرا پہلا نام غلام شبیر تھا پھر شبیر احمد ہو گیا اور بعد میں میں نے اس کو شبیر حسن سے تبدیل کر دیا لیکن چچا مجھ کو ہمیشہ میرے پہلے نام سے ہی پکارتے رہے۔

روپیہ آ گیا تو ابرار کو لکھنو روانہ کر کے ایک سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کو ریزرو کرا کے ملیح آباد منگا لیا۔ اور شام ہوتے ہی مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم سب اپنے کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر کے روشنی گل کر دی۔

تھوڑی دیر میں لکھنو جانے والی گاڑی آ گئی۔ اور ہمارا درجہ بریک کے پیچھے لگا دیا گیا۔

ابھی گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ پلیٹ فارم پر میرے باپ کی آواز گونج اٹھی "اسٹیشن ماسٹر صاحب کیا اس گاڑی میں لڑکے سفر کر رہے ہیں؟!"

اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دے کر ہم اپنا چکے تھے۔ اس نے کہا "خاں صاحب آپ کے صاحب زادوں میں سے اس گاڑی میں کوئی سفر نہیں کر رہا ہے"۔

میرے باپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر سے فرمایا دو چار منٹ گاڑی رکوا لیجیے تا کہ میرے آدمی ایک ایک درجے کو دیکھ لیں ممکن ہے آپ کی نظر نہ پڑی ہو" گاڑی رکوا دی گئی ...... اور نوکر چاکر اور اقرا نے پوری گاڑی کھنگال ڈالی ہم نہیں ملے ہم تو اندھیرے درجے میں بریک کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کسی ڈھونڈنے والے اور خود میاں نے بھی ہمارے ڈبے کی طرف اس خیال سے نظر بھی نہیں اٹھائی کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔

گاڑی تقریباً پانچ چھ منٹ تک ملیح آباد سٹیشن پر کھڑی رہی اور ان چند لمحوں کے اندر ہزاروں صدیوں کا مجموعی خوف ہمارا احاطہ کیے رہا...... ہم سب اتنی دیر تک سولی پر

لٹکے رہے میاں کی آواز بجلی کی طرح ہمارے دلوں پر گر رہی تھی۔اور میں اندر سے چٹخنی لگی کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب ٹوٹیں اور اب ٹوٹیں۔مجھ کو اپنے انفاس کی آمدوشد سے ڈر لگ رہا ہے۔پسینے پر پسینے آرہے تھے تمام جسم برابر بھیگتا چلا جارہا تھا۔اور دل یوں کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ دھڑک رہا تھا کہ ہر بار یہ گمان ہوتا تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ا خدا جانے کس نے مخبری کردی تھی یہ بات آج تک معلوم نہیں ہوسکی۔

خدا کی قسم اس وقت اگر ڈائن موت جبڑا کھول کر سامنے آجاتی کہ میرے جبڑوں میں آؤگے یا باپ کے قبضے میں جاؤگے۔تو میں فوراً اس کے جبڑوں میں گھس جاتا کہ اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی سیٹی کی آواز سے میں دہل گیا پہیوں میں چوں چوں شروع ہوئی گاڑی رینگنے لگی۔اوپر کی سانس نیچے آئی کھڑے رونگٹے بیٹھنے لگے۔سانس کا نظام درست ہونے لگا اور جب کاکوری کے پل پر گاڑی پہنچ گئی تو میں نے جیسے ہی درجے کی روشنی کھولی تو یہ دیکھا کہ میری ماں سجدے میں ہیں۔عباسی خانم مغلانی فرش پر اوندھی پڑی ہوئی آہستہ آہستہ ناد علی پڑھ رہی ہیں۔اور ابرار اور بڑے بھائی سیٹوں کے نیچے سے برآمد ہورہے ہیں۔یہ سماں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی ابرار نے قہقہہ لگایا اور بھائی صاحب کے تیوروں پر بل پڑ گئے......اماں میری بلائیں لینے لگیں......لیکن عباسی خانم بدستور اوندھی پڑی رہیں......یہاں تک کہ چار باغ آ گیا۔

ٹونڈلہ جنکشن پر گاڑی رکی تو ایک لمبے تڑنگے بڑی بڑی گپھے دار مونچھوں کے تھانہ دار صاحب آٹھ پولیس والوں کے ساتھ آئے اور بڑے تحکمانہ انداز میں پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟......میں نے بگڑ کر کہا رستم دوراں شبیر حسن خاں' سر سے لے کر پاؤں تک اس نے مجھ کو دیکھا اور کہا ''میں آپ سب کو یہاں اتار لینے کے واسطے آیا ہوں''میں نے بھنا کر جواب دیا ''کس کی مجال ہے جو ہم کو اتار لے؟''اس نے حکم دیا سپاہیوں کو

www.pdfbooksfree.pk

کہ ان کا سامان اتار لو۔ میں میرے بھائی اور ابرار ڈنڈے لے لے کر پلیٹ فارم پر کود پڑے۔ اور میں نے پولیس والوں کو ڈانٹ کر کہا۔ خبر دار ہمارے درجے میں قدم نہ رکھنا۔ نہ اتنے میں ہمارے درجے کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے تھانہ دار نے انگلی بلند کر کے کہا میں اسباب اتروائے بغیر نہیں مانوں گا۔ میں نے ڈنڈا زمین پر مار کر کہا اگر ہمت ہے تو سامان اتار کر دیکھو تو تھانہ دار نہیں کہا آپ نہیں مانیں گے میں نے کہا جب تک زندہ ہوں میں نہیں مانوں گا۔ لوگوں کا ہجوم اور ہماری آوازوں کا شور سن کر سٹیشن کے انگریز سپر نٹنڈنٹ کو ہمارے درجے کی طرف کھینچ لایا آتے ہی اس نے تھانہ دار سے انگریزی میں پوچھا ''معاملہ کیا ہے......؟'' تھانہ دار نے بڑی نرم آواز میں جوابدیا کہ ''میں ان لڑکوں کے باپ اور نانا کا ملنے والا ہوں ان کے باپ نے مجھے تار دیا ہیکہ وہ دوسری گاڑی سے یہاں آرہے ہیں میں ان کے خاندان کو یہاں اتار لوں'' ریلوے سپر نٹنڈنٹ نے پوچھا ''گرفتاری کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟' تھانہ دار نے جھینپ کر اور ڈر کر کہا کہ یہ باپ اور بیٹوں کا پرائیویٹ معاملہ ہے اس میں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ سپر نٹنڈنٹ کے بگڑ کر کہا آپ قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ پولیس افسر ہو کر آپ ایسی خلاف قانون باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے سے پبلک مقام پر...... آیئے میرے دفتر میں۔

اس کے بعد ہمارا درجہ آگرے جانے والی گاڑی سے جوڑ دیا گیا۔ اور ہم آگے اور آگرے سے دھول پور پہنچ گئے۔ اور نانا جان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ ہماری داستان سن کر میری سوتیلی نانی جنے نانا جان سے کہا تم بشیر احمد کے غصے کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا غضب ناک پٹھان ہے۔ اسی وقت مہاراجہ کے پاس جاؤ اور ان سے پورا حال کہہ کے حویلی کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ بٹھا دو۔ نانا جان اسی وقت مہاراجہ کے پاس گئے اور حویلی کے گرد پولیس کا پہرا بٹھا دیا گیا۔

دوسری گاڑی سے میرے باپ دھول پور آ گئے لیکن انتہائی دانش مندی کی بناء پر

www.pdfbooksfree.pk

ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے اور اپنے بہنوئی نواب احمد خان کو جو میرے بڑے بھائی کے خسر تھے نانا جان کی حویلی سن گن لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

نواب پھپا نے آ کر جب پہرے دار چوکی کا حال بتایا تو میرے باپ نے نواب پھپا سے کہا میں آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں گاڑی کو باہر روک دوں گا آپ نواب صاحب کے پاس چلے جائیں میرا سلام کہیں اگر وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ میرے بلانے سے اباء کریں تو آپ حویلی سے نکل کر ڈیوڑھی کے چبوترے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی نوکر سے کہیں کہ نواب صاحب نے اپنے داماد کو بلایا ہے وہ پھاٹک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں انہیں بلا لاؤ...... یہ جادو چل گیا میرے باپ نانا کی حویلی میں پہرے داروں کا سلام لیتے ہوئے داخل ہو گئے۔

نانا جان سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کہ کھلے ہوئے زینے پر میرے باپ کی پیشانی نمودار ہوئی۔ نانی نے چیخ مار کر کہا ارے بشیر احمد نانا نانی کی چیخ سن کر گھبرا گئے۔ بات لگا تو حقا گر گیا اور چلم ٹوٹ گئی۔ ہم سب لوگ گدا گدا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور سامنے کے سنگین کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈیاں لگا لیں۔ حواس غائب ہو گئے۔ اور عباسی خانم کے پاس سے کھراہند کے جھکے آنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر کہ میاں نے نانا جان کو جھک کر سلام کیا۔ اور ان کا ہات اپنے سینے سے لگا کر روتے ہوئے کہا کہ بابا آپ کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے عقد ثانی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس نے ان کے کان بھر دیے ہیں کہ یہ لوگ مجھ سے بگڑ کر یہاں آ گئے۔ میں اپنے والد مرحوم کی روح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر عقد ثانی نہیں کروں گا۔ اور سچے دل سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کی صاحب زادی اور اپنے بچوں سے مجھے یہ شکایت مطلق نہیں ہے کہ وہ سب یہاں کیوں چلے آئے ہیں۔ اگر ایسی افواہ سن کر وہ اپنی ماں کی مدد نہ کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ

پہنچا دیتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا ۔اور یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے ساتھ وفا نہیں وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں ۔

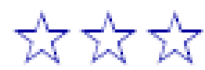
یہ سن کر نانا کا چہرہ بحال ہو گیا ۔میری ماں کو آواز دی کہ اپنے بچوں کو لے کر یہاں آ جا ۔ہم آئے تو میاں نے ہم سب کو گلے سے لگا لیا ۔اور فرمایا میرے گھر کے ڈوبے آفتاب یہاں مل گئے خدا کی قسم میں تم سے ناخوش نہیں ہوں ۔اور تم نے اپنی ماں کو ریز رو گاڑی میں لا کر میری لاج رکھ لی ہے...... اگر خدا نہ خواستہ تم عام درجے میں لاتے تو میں زندگی بھر کسی کو منہ نہ دکھا سکتا ۔

جب ہم سب ملیح آباد آ گئے تو میرے باپ نے میری ماں سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے یہ بڑے صاحب زادے یہاں کس شرط پر تشریف لائے ہیں میری ماں نے پوچھا کس شرط پر میرے باپ نے فرمایا اس شرط پر کہ میں امانی گنج کا پورا باغ ان کے نام لکھ دوں ۔میری ماں نے چھاتی پیٹ کر کہا ہے ہے شفیع احمد شریف بیٹے باپ سے یہی برتاؤ کرتے ہیں؟؟

میرے باپ قول کے دھنی تھے دوسرے ہی روز امانی گنج کا باغ بھائی صاحب کے نام لکھ دیا ‘اور فرمایا شبیر کل اس کے جواب میں بڑا باغ ‘جو اس سے آٹھ گنا بڑا ہے تیرے نام لکھ دوں گا‘‘ میں نے کہا ’’ ’’میاں آپ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام نہیں اماں کے نام لکھ دیجیے ۔‘‘میاں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا ’’شاباش شاباش تو بڑے دل کا آدمی ہے ۔اور دوسرے دن بڑا باغ میری ماں کے نام لکھ دیا[1]۔

---

[1] میاں کے انتقال کے بعد جب میری ماں بڑا باغ میرے نام منتقل کرنے لگیں تو میں نے کہا اماں رئیس احمد کو بھی شریک کر لیجیے میری ماں نے ہم دونوں کے نام باغ لکھ دیا ۔اور ہم کو ہماری نیت کا پھل مل گیا ۔



علی گڑھ میں

ایم اے او[2] کالج میں میرا داخلہ

میرا غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں وہاں کے سکول میں داخلہ ہوا تھا' اور مجھے ممتاز ہاؤس کے نمبر ۴۲ کمرے میں جگہ دی گئی تھی اس کمرے میں کاکوری کے دو سگے بھائی ثابت علی اور ثامن علی پہلے سے موجود تھے۔ اور میرے قیام سے تثلیث پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد رام پور کے دو سگے بھائی برکت اللہ خاں اور محسن اللہ خان میرے کمرے میں آ گئے...... ہمارا وہ دو سگے بھائیوں اور ایک دوسرے خاندان کے طالب علم والا کمرہ بورڈنگ ہاؤس کے سب پراکٹر مظہر علیم صاحب فرید آبادی کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ہر چند مظہر علیم صاحب مہربان استاد تھے مگر ایک ناگفتنی علت کی بنا پر ہمارے مابین رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ محسن اللہ خاں عبدالجلیل خان اور مجھ سے ناخوش رہا کرتے تھے۔

میرے زمانے میں قدیم وضع داری کے مکمل علم بردار نواب وقار الملک سیکرٹری سید احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے میر ولایت حسین صاحب پراکٹر جن کا تمام کالج احترام کرتا تھا اور جن کی شفقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا سب کے دلوں پر

---

[2] یعنی محمڈن اینگلو اورنٹل کالج یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ انگریزی نام اس کالج کے بانی ان سید احمد نے (جن کے کاسہ سر میں سر کے خطاب کا ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس تیشہ زبوں سے تراشا تھا۔ جس سے حب وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے تھے اور عشرت کدہ پرویز کی جانب جوئے شیر لائی جاتی ہے۔ اور یہ خدا بخشے انہیں خویش دشمن و بیگانہ دوست بزرگ کا موروثی اثر یہ کہ جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو پی آئی ڈی سی رائٹرز گلڈ اور پی ای سی ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر

فخر محسوس کر رہے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی پی عبداللہ......اے ڈی اظہر......وائی ایف مجیب......اور ڈبلو ڈبلو رحمٰن کے گندے توکرے لادلاد کر اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم غلاموں کو فرنگی یا کم سے کم کرسٹان ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹویت پر انگلستان کا گورا پن چھا جائے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بےتعلق ثابت کرکے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی جائے کہ مسلمان کا دل محبّ وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے۔ (۲) مسلمان کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو یا ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے (۳) اپنی زبان کو فراموش کرکے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی میں خواب دیکھے (۴) وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ اپنی معاشرت اپنی زبان اپنے ادب اپنے روایات اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے لگے (۵) اور اس کا نتیجہ ہو کہ حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاج روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد میزان کل کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہ کم اور گھاٹا بہت زیادہ ہوا......اور قلیل سود کا کثیر زیاں احاطہ کیے ہوئے ہے۔

ہمارے دور کالج کے ڈاکٹر تھے شفاعت اللہ صاحب جن کو ہماری شریر پارٹی نے یہ دھمکی دے کر ہموار کرلای تھا کہ اگر آپ ہم لوگوں کو ہمارے مطالبے پر فرضی بیماری کی چھٹیاں نہیں دلائیں گے اور ہماری فرضی بیماری کے موقع پر ہمارے پرہیزی کھانوں میں کباب پراٹھے اور مرغ مسلم تجویز نہیں کریں گے تو ہم آپ کا نام ہلاکت اللہ رکھ کر اس نام کو اس قدر شہرت دیں گے کہ معائنے کے ہنگام آپ جس بورڈنگ

ہاؤس میں بھی داخل ہوں گے وہاں کے در و دیوار ہلاکت اللہ ہلاکت اللہ کے نعروں سے گونجنے لگیں گے۔

اسی طرح ہماری پارٹی نے ڈاک خانے والوں کو بھی اس قدر ڈرا دیا تھا کہ جب ہم علی گڑھ سے باہر سیر کرنا چاہتے تھے تو وہ ہمارے گھروں سے بلاوے کے فرضی تار ہمارے نام بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبدالجلیل صاحب مراد آبادی واجد علی صاحب بڑے بڑے مزے کے آدمی تھے وہ جب کسی حسین طالب علم کو ڈھیلے سے تھپڑ مارتے تو اس یک گالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھسلا کر دونوں آنکھیں میچ لیا کرتے تھے انہیں کی فرمائش پر میں نے ایک انگریزی فلم لارڈ یولنس ڈائر کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ میری غالباً پہلی یا دوسری نظم تھی جو تلف ہو چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے معلم قاضی صاحب بلا کے ظریف انسان تھے اور ان کا یہ مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان اردو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے......اور ابتدا میں ایک بوڑھا انگریز تھا جو اردو بولنے والوں کے الفاظ اپنے لہجے میں لکھ لیا کرتا تھا اور اس کی وہی بیاض انگریزی زبان کا سرمایہ بن گئی۔

وہ کہتے تھے کہ یہ ڈاٹر فادر مدر سسٹر برادر اور ڈیکوریشن کے الفاظ دراصل دختر 'پدر' مادر' سر اندر اور دیکھورے شان سے بنائے گئے ہیں جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور انگریزی میں طوائف کے لیے جو پراسٹی چیوٹ کا لفظ ہے وہ ہماری اردو پرائے واسطے کی کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔

میرے دور کا علی گڑھ ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کا علی گڑھ ہے۔ اس زمانے کے طالب علموں میں کوئی اودھی تھا۔ نہ پنجابی نہ بنگالی تھا نہ بہاری۔ صوبوں کے تعصبات کی کسی کو خبر ہی نہ تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم اے او کالج کے بچے اور آپس میں شیر و شکر تھے اور ان کے مابین اس قدر مضبوط اتحاد تھا کہ سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہوء

ی تھی ہماری۔اور یہاں کی پولیس بھی لرزہ براندام رہتی تھی۔ہم سے اوراگر کسی لڑکے پر کوئی آنچ آجاتی تھی تو سارا کالج دوڑ پڑتا تھا اس کی امداد کے واسطے۔

اپنی پارٹی کے تمام ارکان کے نام مجھ کو یاد نہیں رہے ہیں۔ پٹنے کے سید عباس علی سید مبارک علی رام پور کے محسن اللہ خان جوار علی گڑھ کے عبدالجلیل خاں کے نام فراموش نہیں ہوئے۔اور یہ بھی حافظے میں محفوظ ہے کہ اس پندرہ بیس لڑکوں کی ٹولی کے سردار تھے عبدالجلیل خاں اوران کے نائب تھے محسن اللہ خاں۔

ایک بار جب ہم پانچوں لڑکے یعنی عباس علی مبارک علی محسن اللہ عبدالجلیل،اور میں سالانہ امتحان میں پاس ہو گئے تو ہم لوگوں میں اہ مسکوٹ ہوئی کہ پاس ہونے کی خوشی میں آگرے جا کر دوالی دیکھیں۔

لیکن اس عیاشی کے واسطے روپیہ کہاں سے آئے اور چھٹی کیونکر ملے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔عباس علی نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب اپنے اپنے باپوں کو خط لکھ کر اپنے اپنے پاس ہونے کی خوشخبری سنائیں اور نئے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست بھیج بھیج کر اپنے اپنے گھروں سے پان پان سو روپے منگائیں۔یہ تجویز پنچوں نے بہت ہی پسند کی۔سب نے اپنے باپوں کو اسی مضمون سے خط بھیجے۔میں نے بھی اپنے باپ کی خدمت میں خط روانہ کر دیا۔

مجھے خط لکھے چھ سات روز ہو چکے تھے تو ایک دن دیکھا کہ داروغہ امید علی خاں چلے آرہے ہیں انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو دال میں ضرو کچھ کالا ہے داروغہ صاحب کمرے میں آئے میں نے سلام کیا۔سب کی خیریت پوچھی اوران کے آنے کا سبب بھی دریافت کیا۔انہوں نے کہا خان صاحب منی آرڈر کر رہے تھے مگر بڑ ابھیا (میرے برادر بزرگ) نے کہا رقم کسی کے ہاتھ براہ راست ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیج دی جائے مین سن سے ہو کر رہ گیا۔لیکن چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔اور محسن اللہ کے پاس جا کر جو اس وقت جلیل کے کمرے میں گئے ہوئے تھے سارا

www.pdfbooksfree.pk

ماجرا بیان کر دیا محسن تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد آئینہ دیکھنے لگے میں نے کہا ماشاء اللہ مصیبت میں گھرا ہوا ہوں اور تم آئینہ دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا تمہاری مشکل حل کرنے کے لیے ہی آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ ......انہوں نے کہا یہ تم تو چغد ہو میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ میں آئینے میں دیکھ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کی طرح خوب گورا چٹا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری آنکھیں بھی انگریزوں کی طرح کرنجی ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا گھانس کھا چکے ہو؟ انہوں نے کہا تم بھی کتنی موٹی عقل کے آدمی ہو...... جاؤ کمرے میں سے میرا کالا سوٹ میرا بوٹ' ٹائی اور ہیٹ لے آؤ مگر اس طرح کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ میں نے ان سے پوچھا کیوں؟ انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا خاموش وقت ضائع نہ کرو اور جو چیزیں میں نے کہی ہیں جلدی سے لادو میں ان کا سب سامان لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سوٹ پہنا۔ سر پر ہیٹ لگا کر کہا آؤ میرے ساتھ۔ میں سٹپٹا گیا۔ اور ان کے ساتھ ہو لیا...... وہ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برآمدے میں داخل ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر کے چپراسی سے کہا ہم اس وقت ایک مذاق کرنے آئے ہیں ابھی ہیڈ ماسٹر کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے تم مجھ کو اجازت دے دو کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ اور جب شبیر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر یہاں آئے تو اس کے دروازے پر روک کر میرے پاس لاؤ اور پھر کمرے کے باہر نکل کر اس آدمی سے کہو چلیے صاحب بہادر کے پاس یہ کہہ کر محسن نے چپراسی کے ہاتھ پر پانچ روپے رکھ دیے چپراسی نے بات مان لی اور محسن ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور میں دوڑتا ہوا ممتاز ہاؤس چلا گیا اور داروغہ صاحب کو لے کر آ گیا۔ چپراسی نے حسب ہدایت اندر جا کر اطلاع کی اور باہر نکل کر داروغہ صاحب سے کہا چلیے صاحب بہادر کے پاس۔

داروغہ نے ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا۔ اور جیب سے میری فرستادہ فہرست کتب اور پان

www.pdfbooksfree.pk

سو کے نات نکال کر ہیڈ ماسٹر کی میز پر رکھ دیے اور پوچھا حضور اس رقم میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہو گی ؟...... ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا دل یہ رقم ایک دم (بالکل) برابر (صحیح) ہے ۔اچھا کھان صاحب سے ہمارا سلام بولنا......اب آپ جایئے۔

داروغہ امید علی سلام کر کے میرے ساتھ باہر نکل آئے اور جیسے ہی میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترنے لگا تو یہ دیکھا کہ بیچ مچ ہیڈ ماسٹر صاحب تیز تیز قدم رکھتا چلا آ رہا ہے۔اور چھوٹا ہیڈ ماسٹر غسل خانے کے دروازے سے نکل کر منہ پر رومال سے ڈھانکے انتہائی بزدلی سے دوستی طرف بھاگتا چلا جا رہا ہے تڑاتڑ تڑاتڑ۔

ہماری چند گفتنی شرارتیں بھی سن لیجے۔ناگفتنی شرارتیں لکھ دوں تو کتاب ہی ضبط ہو جائے گی۔

(۱) ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوجھی کہ چھت کے روشن دان سے مظہر علیم صاحب پر پیشاب کیا جائے چنانچہ رات کے بارہ بجے ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے ا نکے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا ہم نے جب دیکھا کہ عین روشندان کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے تو ہم دونوں نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے اپنے پائے جامے کھولے اور نشانہ باندھ کر شرشر ان کے منہ پر دھاریں مارنے لگے۔سویت میں ان کے منہ پر جب گرما گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں تو وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے اور روشن دان سے سر اٹھا کر چیخنے لگے۔ارے یہ کون بدمعاش ہے ارے یہ کون بدمعاش ہے......چوکی دار چوکی دار وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئے اور پھر اسی طرح چیخنے لگے چوکی دار چوکی دار چوکی دار دوڑا آیا تو انہوں نے کہا یہ کون بدمعاش چھت پر چڑھا ہوا ہے...... جاؤ اوپر جا کر دیکھو۔یہ شور سن کر ہم دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گئے اور اپنے صید زبوں سے بڑی معصومیت کے ساتھ ہم نے پوچھا کیا ہوا ماسٹر صاحب؟ انہوں نے دانت پیس کر کہا اس کیا ہوا صبح کو مزا چکھا دوں گا۔

صبح سید ولایت حسین صاحب پرا کٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی پرا کٹر صاحب

نے بڑی خشونت کے ساتھ بید اٹھا کر پوچھا صاف صاف بتادو یہ حرکت تم نے کی تھی؟ یا کسی اور نے اگر جھوٹ بولے تو خدا کی قسم کھال کھینچ لوں گا نہ محسن نے کہا خدا کی قسم ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرارت تھی کس کی ہم دونوں بے خبر پڑے سو رہے تھے کہ شور ہوا اور ہماری آنکھ کھل گئی باہر آ کر ماسٹر صاحب سے پوچھا کیا ہوا؟ تو وہ الٹا ہم پر برس پڑے۔ آپ ہم کو چاہیں تو مار لیں۔ آپ ہمارے باپ کے برابر ہیں۔ مگر قصور ہمارا کچھ بھی نہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ سب پراکٹر صاحب ہم پر مفت کا الزام لگا کر ہم کو پٹوانا چاہ رہے ہیں''۔

میر صاحب بڑی کشمکش میں پڑ گئے سر جھکا کر سوچنے لگے اور کہا اچھا تم دونوں جاؤ میں پوری تحقیقات کروں گا۔ اور اگر تمہاری خطا ثابت ہو جائے گی تو اس قدر ماروں گا کہ تم دونوں عمر بھر یاد رکھو گے۔ اور ہم دونوں دل ہی دل میں رسیدہ بود بلائے سے بخیر گزشت کہتے اپنے کمرے میں آ رہے اور ایک دوسرے کے گلے مل کر خوب ہنسے...... یہ خبر سن کر شام کو جلیل ہمارے کمرے میں آئے ہم دونوں کو مبارک باد دی...... ہم سے کہا تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انہوں نے ہماری کرسیوں کے عین نیچے لوبان سلگا کر ہماری گردنوں میں ہار ڈال دیے اور ہپ ہپ ہرا کہنے لگے۔

(۲) ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کے وقت ہم لوگوں کو بلانے کے واسطے ڈائنگ ہال کے دروازے پر گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔ ایک روز جب رات کے آٹھ بج گئے اور ڈائننگ ہال کا گھنٹہ نہیں بجا تو تمام لڑکے پریشان ہو گئے۔ اور ڈائننگ ہال کے برآمدے اور صحن میں جمع ہو کر شور مچانے لگے اور عرب لڑکے روتی روتی روتی (روٹی روٹی روٹی) کے نعرے لگانے لگے۔

اس ہنگامے کو سن کر ہمارے اور درمیانی گوشے کے دونوں سب پراکٹر مظہر علیم صاحب اور فصیح الدین صاحب بھی وہاں آ گئے اور چوکی دار سے پوچھنے لگے گھنٹہ کہاں ہے؟ چوکی دار

www.pdfbooksfree.pk

نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے کہا صاحب گھنٹہ یہاں لٹکا رہتا تھا نہ جانے کون اڑا لے گیا۔اس پر فصیح الدین نے مظہر علیم صاحب سے کہا یا مظہر العجائب گھنٹہ غائب''

مظہر علیم صاحب نے چونک کر کہا جلیل کہاں ہے؟ ہر طرف جلیل جلیل جلیل کی آوازیں بلند ہوگئیں۔جلیل ہوتے تو بولتے۔مظہر علیم صاحب نے چوکی دور کو کہا جلیل کو ڈھونڈ کر لاؤ۔

چوکی دار نے آ کر کہا ''وہ تو نماز کے ہال میں بیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں'مظہر علیم اور فصیح الدین وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جلیل سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔اور اسی عالم میں کوئی چیز اپنے کمبل میں لپیٹ رہے ہیں۔مظہر علیم نے کمبل کا سرا پکڑا کر زور سے جھٹکا دیا اور گھنٹہ بڑی جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا۔یہ دیکھتے ہی مظہر علیم نے سر بجود جلیل کے سر پر تڑاق سے ایک ٹیپ مار کر کہا اٹھ کھڑا ہو مردود......جلیل نے دفعۃً کھڑے ہو کر چیخ ماری کہ یہ یہ اسلامی سکول جہاں عین سجدے کے وقت نمازی لڑکوں کے سروں پر ٹیپیں ماری جاتی ہیں۔یہ سنتے ہی مظہر علیم چانٹا تان کر جلیل کی طرف لپکے اور عرب لڑکے بھی آ گئے مارنے کے واسطے جلیل نے یہ رنگ دیکھا تو الا اللہ کہہ کر ایک لانبی جست لگائی اور چکارے کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہال سے اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکا۔

(۳)علی گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ایک رات کو جب ہم پیشاوری پراٹھے کباب اور خوربے کی چٹنی کھا رہے تھے تو ہماری جنڈال چوکڑی ایک چاقو چھری بیچنے والے کی دکان پر جا کھڑی ہوئی۔نمائش کی تیز روشنی میں چھریاں اور چاقو ایسے جگمگ جگمگ ہو رہے تھے کہ میرا جی چاہا میں انہیں بڑھ کر سینے سے لگا لوں۔میں نے پٹھان دکان دار سے پوچھا تو اس نے کہا ایک رپیا چار آنہ محسن نے کہا نہیں دس آنا پٹھان نے کہا نائیں ایک روپیا چار آنا خوشی چاہے ٹیک (Take) خوشی چاہے تو نہ ٹیک (Take)۔

ان آوازاوں کو سن کر کالج کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرف آ گئے ۔ اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے دکان کے سامنے...... محسن نے پھر کہا دس آنا دس آنا پٹھان نے پھر وہی جواب دیا نائیں نائیں ایک روپیہ چار آنا ایک روپیہ چار آنا خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک ۔ یہ سن کر محسن برافروختہ ہو گئے ۔ تمام لڑکوں سے اشارہ کر کے کہا غازیو بڑھو اور ٹوٹ پڑو اور لوٹ لو مال غنیمت کو یہ دعوت عام سن کر ٹوٹ پڑے تمام لڑکے چھریوں چاقوؤں پر پٹھان جھپٹا لڑکوں نے اسے دبوچ لیا ۔ اور لٹنے لگی دکان دھڑا دھڑ ۔ پٹھان نے پولیس پولیس پولیس کے نعرے لگانے شروع کر دیے...... پولیس والے جھپٹ پڑے ۔ ہم نے چھریاں تان لیں وہ ٹھٹک گئے اتنے میں ایک شامت کا مارا انگریز پولیس افسر موٹر سائیکل پر بیٹھا ادھر آ نکلا......اور جب اس نے موٹر سائیکل سے ایک پاؤں اتار کر ہمیں ڈانٹنا شروع کیا تو ٹوٹ پڑے ہم سب اس پر اور اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا اور ہم سب کے سب مال غنیمت لیے اور خوشی چاہے ٹیک خوشی چاہے نہ ٹیک کے نعرے لگاتے وہاں سے کالج بھاگ آئے ۔

(۴) ایک روز میرے ایک لکھنوی دوست اور میرے دوست پرنس میرزا عالم گیر قدر کا بھائی جہاں گیر قدر ہمارے پاس آیا فریادی بن کر' اور کہنے لگا شبیر ایک فرسٹ ائیر فول لڑکا فضل الٰہی ہے وہ سالا اپنے حسن پر اس قدر مغرور ہے کہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا پٹے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا ۔ تمہاری پارٹی ماشاءاللہ بڑی تگڑی ہے اس کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارا غلام ہو جاؤں ۔

ہماری پارٹی لنگر لنگوٹ کس کر جہاں گیر قدر کی مدد کے واسطے آمادہ وہ گئی ۔ اتوار کے دن جہاں گیر قدر کو دولہا بنا کر اور ہار پھول ڈوپٹہ مصنوعی داڑھی اور ڈھولک لے کر ہم دس پندرہ لڑکے براتیوں کی طرح کچی بارک پہنچ کر فضل الٰہی کے کمرے میں مبارک باد مبارک باد کے نعروں کے ساتھ درانہ گھس پڑے ۔ فضل الٰہی نے جس کے متعلق ساری دنیا میں ایک طرف فضل الٰہی کا غلغلہ ایک طرف بلند تھا تیوریوں پر بل

ڈال کر کہا۔ میں نے تو آپ لوگوں کو نہیں بلایا تھا؟..... جلیل نے کہا دلھنیں کسی کو بلایا نہیں کرتیں جنیا ہم جہاں گیر قدر سے تمہارا نکاح پڑھانے آئے ہیں۔

اس لڑکے نے کوشش کی بھاگ نکلنے کی ہمارے ساتھیوں نے پکڑ لیا ڈوپٹہ اس کے سر پر ڈال دیا۔ جہاں گیر قدر کو ہار پھول پہنائے جلیل نے جیب سے مصنوعی داڑھی نکال کر منہ پر لگائی اور قاضی بن کر اس لونڈے کا جہاں گیر قدر سے نکاح پڑھوا دیا۔ اور نکاح پڑھا دینے کے بعد ساتھیوں نے ڈھولک بجا بجا کر نیچے سروں میں شادیانے گانا شروع کر دیے۔ برآمدے میں لڑکوں کا میلا لگ گیا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔

اتنے میں کسی نے یہ دیکھ کر کہ ہیڈ ماسٹر راؤنڈ لگاتا چلا آ رہا ہے۔ ہم کو آگاہ کر دیا ہم سب خوف زدہ ہرنوں کے مانند بھاگ کھڑے ہوئے ..... اور دولھا میاں بھی اٹھ ہی رہے تھے کہ ماسٹر سر پر آن پہنچا..... فضل الٰہی نے اس سے فریاد کی۔ اسنے جہاں گیر قدر سے پوچھا تم کون ہو؟..... جہاں گیر قدر کی زبان سے گھبراہٹ میں نکل گیا Sir I am Bride Groom (جناب میں دولھا میاں ہوں) ..... ہیڈ ماسٹر نے ول مسٹر برائڈ گروم ول مسٹر برائڈ گروم کہہ کہہ کر بیدوں پر دھر لیا۔

براتی تو صاف بچ کر نکل گئے۔ اور بے چارے برائڈ گروم[1] صاحب پٹ گئے۔

اور اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر ہم تینوں لڑکوں یعنی محسن اللہ خان عبدالجلیل خاں اور آگے چل کر حضرت جوش ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خاں کو بھی سکول سے نکال دیا گیا۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

---

[1] میرزا جہاں گیر قدر کراچی میں رہتے تھے صد حیف کہ دو مہینے ہوئے پچاسی چھیاسی برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کم بخت دنیا میں دولھا بھی مر جاتے ہیں اور دلھنیں بھی سدھار جایا کرتی ہیں۔



لکھنو میں دوبارہ آمد

علی گڑھ سے نکالا تو پھر لکھنو آ گیا۔ بانھ ٹوٹتی ہے تو گلے پی آتی ہے۔ لکھنو آ کر ابرار اور رئیس کی معیت حاصل ہو گئی جوبلی ہائی سکول میں داخلہ ہو گیا۔ وہاں سے چرچ مشن سکول ور چرچ مشن سکول سے نکل کر ریڈ کرسچین کالجیئیٹ سکول میں داخلہ لے لیا۔

کچھ روز تک تو ہم لوگ لاٹوش روڈ کے اس دومنزلہ مکان میں رہے جس کو بڑھیا والا مکان کہا جاتا تھا۔ پھر چلے گئے راجہ ابوجعفر صاحب کی کوئینس روڈ والی کوٹھی میں اور وہاں سے منتقل ہو کر پھر پہنچ گئے جھوے لے کے باغ کی کوٹھی میں۔

جھوے کے قیام سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ایک طرف تو نارنگی کے باغ میں دوڑ لگاتے رہنے سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی دوسری طرف مولانا سید ناصر حسین قبلہ اور سکول آتے جاتے حضرت پیارے رشید صاحب کی صحبت سے نہایت علمی و ادبی فائدہ پہنچا اور تیسری طرف میرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی (صاحب امراؤ جان ادا) سے میں نے باقاعدہ فارسی و عربی پڑھنا شروع کر دی۔ عربی تو آ نہ سکی لیکن فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میری اردو بھی خوب منجھ گئی۔

لے جھوے میں آغائی صاحب کا ایک بہت بڑا نارنگیوں کا باغ تھا۔ اس میں قدیم وضع کی دو کوٹھیاں تھیں ایک کوٹھی میں ہم لوگ رہتے تھے۔ دوسری کوٹھی میں ناصر حسین صاحب قبلہ کا وسیع کتب خانہ تھا اور ہماری کوٹھی کے نیچے والے حصے میں آغائی صاحب کی لاش رکھی ہوئی تھی جو ایک متعین مدت کے بعد کربلا بھیجی جانے والی تھی۔

اور لکھنو آ کر میرا بچھڑا محبوب عطا حسین قزلباش بھی مجھ کو دوبارہ مل گیا۔ عطا حسین کی صحبت می میری دادی نے جو شیعت کے نقوش میرے بل پر بنائے تھے وہ اور بھی ابھر گئے اور جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے میری شیعت میں پختگی پیدا کر دی۔

اب میں برابر مجلسوں میں جانے اور ماتم کرنے لگا...... اور میرے خاندان کی اصطلاح میں میری رافضیت مسلم ہو گئی پھر بھی میرے باپ نے مجھ سے ناخوشی کا مطلق اظہار نہیں فرمایا تھا۔

میرے تبرائی شیعہ ہونے کا تیقن

لیکن جب میرے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی کہ میں مقبرہ جناب عالیہ[1] کے جشن تبرا میں بھی شریک ہوا تھا تو یہ بات ان کو نہایت ناگوار گزری۔ انہوں نے میرے چچی زاد بھائی امیر حسن خاں کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ میں تبرا ترک کر دوں انہوں نے کہا ماموں نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں تک حب آل رسول کا تعلق ہے۔ میں اس کو جزو ایمان ہی نہیں اصل ایمان سمجھتا اور رسول اللہ کے بعد حضرت علیؑ کو سب سے افضل مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اصحاب ثلاثہ پر سب وشتم کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس فعل بد سے فقط خلفاء ہی کی توہین نہیں ہوتی بلکہ رسالت مآب کے فیضان صحبت پر بھی آنچ آتی ہے۔ اور جب میں تبرے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا تو میرے باپ نے وصیت نامے کی رو سے مجھ کو جائیداد سے محروم فرما کر فقط سو روپے ماہانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔

اتنی بڑی جائیداد سے محروم ہو جانے کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور اس کے برعکس میں نے یہ سوچا کہ ناخوش ہو جانے کے بعد بھی میرے باپ نے میرے نام سو روپے ماہانہ لکھ دیے۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ میں کس قدر شفقت کا جوہر ہے۔

---

[1] یہ مقبرہ گولا گنج میں ہے جہاں تبرہ بازی کا ایک سالانہ جشن کیا جاتا ہے۔ اور اکابر لکھنو شریک ہوتے ہیں۔

سچا خواب میرے تحت شعور کا فعال اضطراب::

اس محروم الارث ہو جانے کے کوئی چھ سات مہینے کے بعد ایک روز دوپہر کے

وقت جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ اور میں کٹرہ ابوتر اب خاں (لکھنو) کے مکان کے ایک ٹھنڈے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے کہا سنتا ہوں اے اللہ میاں جب کوئی تمہاری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو تم اس کی جانب سو قدم اٹھاتے ہو۔لیکن میرے ساتھ تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے ہو تمہیں خوش کرنے کے لیے میں نے اپنے باپ کو ناخوش کیا ہے۔ جائیداد سے محروم ہو گیا اب تم مجھ سے یہ بتاتے ہی نہیں کہ میں راہ راست پر ہوں یا گم راہ ہو گیا ہوں ارے اللہ میاں کچھ تو منہ سے ولو سر سے کھیلو......'' دل ہی دل میں یہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

سوتے ہی خواب دیکھا کہ صبح کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ آسمان سے سونا برس رہا ہے۔اور میں کسی سواری پر بیٹھا ایسی راہ سے گزر رہا ہوں جس کے دونوں طرف بڑے گھنے اور شاداب درخت نسیم سحر سے جھوم رہے ہیں اور ہزاروں چڑیاں ان کی شاخوں پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں۔ کہ مشرق کی سمت سے ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نمودار ہوا......میر انظریں اس جلوس پر جم کر رہ گئیں......اور جب وہ قریب آ گیا تو رئیس جلوس کے چہرے کی تاب نا کی دیکھ کر میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں اپنی سواری سے ایک دم کود پڑا اور جھک کر سلام کیا......رئیس جلوس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں ان کی آنکھوں سے کرنیں قطار در قطار نکلیں جو میرے دل میں پیوست ہو گئیں اور وہ مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک سمت مڑ گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیسی غیر معمولی مقناطیسی شخصیت تھی کہ بے جانے پہچانے مجھ کو اس نے اس قدر متاثر کر دیا......کہ اتنے میں ایک دوسرا جلوس نمودار ہوا اور اس عجیب صاحب جلوس کا بھی مجھ پر ویسا ہی اثر پڑا اور وہ بھی میرے سلام کا جواب دیتا ہوا اسی طرف روانہ ہو گا جس طرف پہلا جلوس مڑ گیا تھا۔

جب دونوں جلوس نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں یہ بات سوچنے لگا کہ میں ان

سے متعارف کیسے ہوسکتا ہوں؟ اور کیوں نہ ادھر مڑ جاؤں جدھر یہ دونوں جلوس مڑ گئے ہیں۔ کہ دفعتہً میری پشت پر کسی نے ہاتھ مارا میں اچھل را۔ اور مڑ کر دیکھا و ایک نورانی چہرہ کے بزرگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کون ہیں ...... انہوں نے کہا ابوذر غفاری۔ میں نے سلام کر کے ان کے ہاتھ چوم لیے اور ان کے سامنے سر جھکا لیا۔ انہوں نے کہا سر اٹھاؤ یہ سر جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم کو سرورکونین محمد رسول اللہؐ اور ان کے جانشین مشکل کشا علی ابن ابو طالب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔

یہ سن کر میرے دل میں فخر کے فوارے چھوٹنے لگے۔ اور آنکھوں میں مسرت کے آنسو برسنے لگے۔ اور میں نے پوچھا۔ "میں اپنے رسول اور امام کو ڈھونڈنے کدھر جاؤں؟ انہوں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا دیکھو وہ جو مسجد کا منارہ نظر آ رہا ہے اسی طرف چلے جاؤ اللہ کا جواب تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے۔ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر روانہ ہو گیا۔ اور جب مسجد کے دروازے کی پہلی سیڑھی میں قدم رکھا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے کے کنارے آستینیں چڑھائے بیٹھے ہیں۔ اور علی مرتضیٰ پانی کا ظرف ان کے پاس رکھ رہے ہیں۔ میری آہٹ سن کر رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ سے کچھ اشارہ فرمایا۔ (جسے میں سن نہیں سکا) رسالت مآب کا ارشاد سن کر وہ میری طرف اس طرح چلے جیسے کوئی مژدہ سنانے والا آتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ میرے پاس تشریف لائے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر ارشاد فرمایا جو ہم سے محبت کرتا ہے نہ تو اس کی دنیا خراب ہوتی ہے اور نہ ہی عقبیٰ۔ جاؤ بلندیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ یہ خواب سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کہ بوا الحاظن نے آ کر کہا منجھلے بھیا میاں بلا رہے ہیں۔ میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اٹھا۔ جلدی جلدی منہ دھویا اور اپنے باپ کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ

کچھ لکھنے میں مشغول تھے۔ قلم روک کر انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی ان کی بڑی بڑی گلابی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھ سے ارشاد فرمایا بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا اور وہ پھر کہنے لگے میں حیران ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ ان کا قلم بڑی تیزی اور انتہائی ولولے کے ساتھ دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا اور جب عبارت مکمل ہو گئی تو انہوں نے کہا بیٹا یہ جائیداد کمبخت ایسی چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بھائی بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ میں نے تجھ کو جائیداد سے محروم کر دیا اور دیکھا کہ تیرے ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور تیری اطاعت شعاری میں بھی یک سر مو فرق نہیں آیا۔ لے یہ دوسرا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے میری جائیداد میں سے تجھ کو تیرا پورا حق مل جائے گا۔ تو بڑے کردار کا آدمی ہے۔ اس کردار کا آدمی اگر یہودی یا مجوسی بھی ہو جائے تو بھی وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے۔ یہ کہہ کر میرے باپ پر رقت طاری ہو گئی اور رندھی ہوئی آواز میں فرمایا بیٹا میں تیرے کردار کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ یہ کہتے ہی میرے انسان باپ نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔...... میرے منہ سے دفعتہً چیخ نکل گئی۔ ارے میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے اور جھپٹ کر میں نے ان کے دونوں جوتے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیے سر سے اتار کر سینے سے لگا لیے۔ پھر باپ کے قدموں سے منہ رگڑنے لگا اور میرے باپ نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگے۔

میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ

جب میری شیعیت یا یوں کہیے کہ میری رافضیت کا غلغلہ بلند ہو گیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے خسر کو طلب فرما کر کہا۔

غلام شبیر پکا رافضی بن چکا ہے۔ تم نکاح کی تنسیخ کا دعویٰ دائر کر دو میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا...... اور میرے حقیقی چچا نواب محمد اسحٰق خان نے بھی میرے خسر سے

کہا۔ دیکھو مقیم اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ جب شبیر نے ضریح کے سامنے جھنڈا پڑھنا رکوا دیا تھا تو اسی دن میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ ضرور رافضی ہو جائے گا۔ اور اب تو وہ کھلم کھلا رافضی ہو چکا ہے تم تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میرے خسر بھولے بھالے پٹھان تھے۔ آ گئے بھڑی میں اور دائر کر دیا مقدمہ دن سے...... مقدمہ دائر ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اور ملیح آباد سے لے کر لکھنو تک گونجنے لگا۔ اس کے چرچوں سے۔ میرے باپ نے اپنی سنت جاریہ پر عمل کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجہ اول کے وکلا یعنی شیخ علی عباس ظہور احمد میرزا سمیع اللہ بیگ سر وزیر حسن اور الہ آباد کے سر تیج بہادر سپرو۔ اور سر جان جیکسن کو پہلے ہی سے اپنا لیا تا کہ فریق ثانی کو درجہ اول کا کوئی وکیل میسر نہ آ سکے۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک مسٹر شرغا منصب شالی کے اجلاس پر بڑے زور و شور سے چلتا رہا۔ میرے خسر کی جانب سے علمائے اہل سنت کے فتوے پیش کیے گئے تھے کہ رافضی کافر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی مسلمان لڑکی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلاف شریعت۔

ہماری طرف سے اس کی نظریں بھی پیش کی گئیں تھیں کہ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک سینکڑوں شیعہ لڑکوں نے سنی لڑکیوں کے ساتھ نکاح ہو چکے ہیں۔ اور انکی اولادیں ورثہ پا چکی ہیں۔ اور کیا ان تمام شیعہ لڑکوں اور سنی لڑکیوں کے سابق نکاحوں کا ناجائز قرار دے کر آج یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس نوعیت کے نکاحوں سے جو بچے پیدا ہو کر اپنے اپنے باپوں سے وراثت پا چکے ہیں ان کو اولاد ناجائز ٹھہرا کر وراثت سے محروم کر دیا جائے؟ اور ان سابق نکاحوں کے مواقع پر علمائے اہل سنت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت بالکل خاموش رہے اور اس نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ دائر ہوتے ہی وہ اسلامی شریعت میں کیا بنیادی انقلاب آ گیا ہے کہ آج اس کے خلاف فتوے جاری

کیے جا رہے ہیں؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالشکور صاحب نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو منافرت پیدا کرنے کی تحریک چلائی ہے یہ تمام غلط فتوے اسی تحریک کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟؟

---

[1] چچا مجھے شبیر حسن کی بجائے ہمیشہ غلام شبیر کہا کرتے تھے اس لیے کہ وہی میرا پہلا نام تھا۔

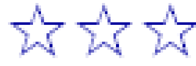
حیرت کی بات یہ ہے کہ تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل نے بھی ان فتوؤں کی تصدیق فرما دی تھی...... لیکن میں آج تک شکر گزار ہوں کہ مولانا عبدالباری صاحب کے چچا شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب اور نامی پریس لکھنو کے مالک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے میری موافقت میں گواہی دی تھی۔

جس روز میرے مقدمے کی پیشی ہوئی تھی تمام لکھنو ٹوٹ پڑتا تھا سننے کے واسطے...... اور میرے باپ اور میرے خسر کے ہمراہ جو تین تین چار چار سو جاں نثاروں حامیوں اور گواہوں کا لشکر آتا تھا۔ اس سے عدالت کے برآمدے اور صحن میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا چاروں طرف سے خوانچے اور قفلی والے ٹوٹ پڑا کرتے تھے اور ہر پیشی پر تقریباً دو تین سو روپے چرندم خورندم پر اٹھ جایا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ج س روز میرے باپ عدالت میں بیان دینے کے واسطے اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے تھے مخالف فریق کے وکیل شیشیر ناتھ صاحب نے عدالت سے کہا تھا کہ خاں صاحب کے بیان سے بیشتر میں یہ بات عدالت کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان کا قدیم نیازمند ہوں اس لیے مجھ کو معلوم ہے کہ وہ کس قدر شیریں بیان آدمی ہیں کہ سننے والوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ عدالت ان کی جادو بیانی سے متاثر نہ ہو۔ اور وہ تاثر قانون پر حاوی نہ ہونے پائے۔ یہ سن کر شرغا صاحب ہنس پڑے تھے اور یہ کہا تھا کہ اب ت میں

بڑے شوق سے خاں صاحب کا بیان سنوں گا۔ اور میرے باپ کے بیان کے اختتام کے بعد شر غا صاحب کے چہرے پر جو تاثرات نمودار ہوئے تھے' ان کو دیکھ کر شیشر ناتھ نے میرے خسر کے کان میں کہا تھا کہ خاں صاحب اب آپ مقدمہ ہار جائیں گے بہتر ہے کہ صلح کر لیجیے۔

مجھے پتا نہیں ہے کہ میرے خسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپے صرف ہو گئے تھے۔



IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

سینٹ پیٹرز کالج آگرہ

ابھی وہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میرے ریڈ کرسچن کالج کے ہیڈ ماسٹر نے یہ مشورہ دیا کہ میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج یں داخل ہو جاؤں اور وہاں سے سینئر کیمبرج پاس کروں اور سیدھا لندن چلا جاؤں۔

یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں حساب اور جغرافیہ میں کمزور ہوں یہاں پنپ نہیں پاؤں گا۔ اس لیے سینئر کیمبرج کا پاس کر لینا میرے لیے آسان ہوگا اور ولایت جانے کا راستہ نکل آئے گا۔

رئیس اور ابرار نے بھی اس مشورے کو پسند کیا۔ اور کہا ہم بھی آپ کے ساتھ آگرے چلیں گے۔ جب یہ بات طے ہوگئی تو ابرار نے کہا بشیر ماموں کے پاس چلنے سے پیشتر آیئے اس سامنے والی جنات کی کوٹھری میں چل کر دعا مانگیں کہ بشیر ماموں ہم کو آگرے بھیجنے پر تیار ہو جائیں۔

جوتے اتار اتار کر آگے آگے ابرار اور پیچھے پیچھے میں اور رئیس اس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔ ابرار نے کہا میں دعا مانگوں گا آپ لوگ آمین کہیں گے اس کے بعد ابرار نے دونوں ہات اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ ہم سب کے اچھے اللہ میں اور شبیر خاں اب تک جو گناہ کر چکے ہیں ان سب کو معاف کر ہم تیرے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ ابرار نے یہ کہہ کر اپنے منہ پر اور ان کو دیکھ کر ہم دونوں بھی اپنے منہ پر تڑا تڑ تڑ تڑا تڑ تھپڑ مارنے لگے۔ اور تھپڑ مار چکنے کے بعد ابرار نے بڑی لجاجت سے کہا اے میرے معاف کر دینے والے اللہ بشیر ماموں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ ہم تینوں کو آگرے بھیج دے ہم دونوں نے آمین آمین کے نعرے لگائے اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرے اور پہنچ گئے۔ میاں کے کمرے میں میاں علیل تھے بستر پر لیتے لیٹے انہوں نے ابرار کی طرف آنکھیں اٹھا کر فرمایا گرو گھنٹال کیا کرنے آئے ہو؟......ابرار نے ہات جوڑ کر سینٹ پیٹرز کالج کے تمام محاسن اور وہاں کا آخری امتحان پاس کرنے

کے بعد تمام مفید نتائج اور پھر ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آنے کے درخشاں امکانات پر دل نشیں تقریر کر کے کہا۔ یہ ہماری آخری درخواست ہے اسے مان لیجیے اور ہم کو آگرے بھیج دیجیے.....قوان مجید[1] کی قسم ہم بیرسٹر بن کر آئیں گے آپ کا دل باگ باغ ہو جائے گا۔

ہماری خوش قسمتی کہ میاں نے یہ درخواست قبول کر لی اور ہماری آگرے کی تیاریاں ہونے لگیں۔لیکن دو چار دن بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ خالصتہً فرنگی کالج ہے جہاں ہندوستانیوں کو داخلہ نہیں ملتا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب حامد علی خاں بیرسٹر کے پاس پہنچے کہ وہ شاید کوئی تدبیر نکال دیں۔حامد علی خاں نے کہا اگر ہمارا لیفٹیننٹ گورنر سفارش کر دے تو وہاں داخلہ ہو جائے گا۔

میاں نے لیفٹیننٹ گورنر سے سفارشی خط لے کر ہم تینوں کو آگرے بھیج دیا اور ہمارے ساتھ انہیں گونڈے والے نوروز باورچی اور علی شیر خاں کو سپاہی کے طور پر ہمارے ساتھ کر دیا۔

---

[1] ابرار کی زبان سے قرآن مجید کے عوض ہمیشہ قوان مجید نکلا کرتا تھا۔

آگرے پہنچتے ہی کالج میں ہمارا داخلہ ہو گیا.....نانا کا محل چوں کہ کالج سے بہت دور تھا اس لیے محلّہ گھیا اعظم خاں میں ہم نے ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔اور جی لگا کے پڑھنے لگے۔ہمارے کورس میں شیکسپیر کا ڈرامہ جولیس سیزر داخل تھا۔اور میں اس ڈرامے پر اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ میرا پروفیسر یورپین طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ یہ لڑکا ہندوستانی ہو کر جولیس سیزر کے مطالب تم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے۔اور جب اس کے متعلق اس سے کوئی سوال کرتا ہوں تو یہ اس کی ایسی اچھی شرح پیش کرتا ہے کہ گویا اس کے سینے میں شیکسپیر کا دل دھڑک رہا ہے۔اس کالج کے ایک بوڑھے انگریز پروفیسر مسٹر گرین وڈ کو میں نے پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر رکھ لیا تھا جو ہر شا کو بیر پی[1] کرا اتے تھے اور دو گھنٹے تک اس خوبی اور ایسی دلچسپی سے پڑھایا کرتے

تھے کہ ان کا ایک ایک حرف میرے دماغ کا جزو بن جایا کرتا تھا۔

اس دور کی ایک بات مجھ کو آج تک یاد ہے کہ وہ عجیب بات یہ ہ کہ مجھ پر اس زمانے میں وہ چیز طاری ہو گئی تھی جس کو دینی اصطلاح میں نیک چلنی اور شاعرانہ اصطلاح میں بدچلنی کہا جاتا ہے اور تو اور میں سینما تک سے مجتنب ہو گیا تھا۔

میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ صبح سے پیش تر اپنے پڑوس کے ایڈورڈ پارک میں جاتا موذن کے حجرے سے اپنا مگدر نکالتا دیر تک انہیں ہلاتا اور دیر تک دوڑ لگاتا رہتا۔

اس پارک میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی چھریری انگریز لڑکی بھی آیا کرتی تھی اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی اور اکثر پگڈنڈی کے موڑوں پر اس طرح ادبدا کر دوڑ لگاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن میں اس قدر پارسا ہو چکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی......تو وہ زاہد خبیث جس نے میرے دل پر قبضہ کر کے میرے شاعرانہ جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا......میری پیٹھ ٹھونکنے لگتا تھا۔

۱؎ ان کے منہ سے پڑھاتے وقت جب ہلکی شراب کی خوشبو آتی تھی میری طبیعت بگڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بادہ خواری کے وقت جب کوئی بے توفیق میرے پاس آتا ہے تو منہ اس سے دور رہتا اور منہ قریب لا کر بات نہیں کرتا......

۲؎ میرا یہ بدچلنی کا دور جب ڈیڑھ برس کے بعد ختم ہو گیا تو میرے شاعر نے واپس آ کر اور میرے منہ پر طمانچے مار کر یہ کہا تھا کہ اے مردود تو نے جس لڑکی کا دل توڑا تھا حشر کے دن اس کا ہات ہو گا اور تیرا گریبان۔

ایک خوف ناک پیش بینی

اس اثناء میں میرے باپ جب ہم لوگوں کو دیکھنے آگرے تشریف لائے اور تین چار دن قیام فرما کر لکھنو جانے لگے تو ہم لوگ ااگرہ سٹی تک انہیں رخصت کرنے گئے

www.pdfbooksfree.pk

اور جب وہ گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی رینگنے لگی تو دفعتہً میرے دل سے یہ صدا آئی کہ میاں کو جی بھر کے دیکھ لو کہ اب انہیں کبھی نہ دیکھ سکو گے...... یہ خیال آتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ اور دل تھام کر ایک قریب کی بنچ پر بیٹھ گیا...... رئیس و ابرار گھبرا گئے نوروز دوڑتا گیا اور پانی لے آیا۔ میں نے پانی کے دو گھونٹ پیے اچھو لگ گیا اور ابرار نے میری پیٹھ پر گھونسے مارے اور رئیس میرا سینہ سہلانے لگا اچھو سے تو نجات مل گئی لیکن اس خیال نے جو کانٹا چبھو دیا تھا دل سے نہیں نکلا۔ رئیس و ابرار نے پوچھا کیا ماجرا ہے میں نے اصلی بات نہیں بتائی ٹال دیا۔

اس واقعے کے بعد میں اداس اداس رہنے لگا...... اور اس کے چھ سات دن کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے باپ[1] کی لاش محمد علی چچا کی موٹر میں لکھنو سے ملیح آباد جا رہی ہے۔

میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ آنکھ کھل گئی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے میں نے گھڑی دیکھی صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نیچے آیا ابرار اور رئیس کو جگایا ابرار سے کہا تم پہلی ہی گاری سے لکھنو چلے جاؤ اور میاں کی خیریت بذریعہ تار مطلع کرو۔

میرے باپ کا انتقال[2]

دوسرے دن تار آ گیا میرے باپ کے انتقال کا...... تار بجلی کی طرح مجھ پر گرا...... چیخیں مار مار کر میں رونے لگا۔ رئیس نیچے سے دوڑا آیا پوچھا کیا ہوا؟ میں نے تار کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے فرش سے تار اٹھایا ہم دونوں بھائی لپٹ کر دیوانہ وار رونے لگے۔ اور پہلی گاری سے ملیح آباد روانہ ہو گئے...... راستے میں ہمارا کیا عالم رہا کس کی مجال ہے کہ اسے بیان کر سکے۔ کان پور اسٹیشن پر جب ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ مانگا اس وقت پتا چلا کہ فرطِ سراسیمگی میں ہم نے ٹکٹ ہی نہیں لیا۔

---

[1] اس کے بعد پتا چلا کہ بالکل یہی صورت حال پیش آئی تھی...... [2] میرے باپ کا انتقال بیالیس سال کی عمر میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔

اور پاؤں کی طرف نظر جھکی تو معلوم ہوا کہ پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے۔ ٹکٹ چیکر نے ہم کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور کہا صورتوں سے تو آپ لوگ شریف معلوم ہو رہے ہیں لیکن...... میں نے اس کی بات کاٹ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ کسے اچھے خاندان کا آدمی تھا اس نے کہا کوئی بات نہیں آپ لکھنو چل کر کیا ٹکٹ کے دام دے دیں گے؟ میں نے کہا یقیناً...... لکھنو پہنچ کر ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہو لیا...... میں سیدھا اپنے مقدمے کے وکیل ظہور احمد کے پاس پہنچا انہوں نے ٹکٹ کے دام دے دیے۔ ٹکٹ چیکر نے رسید دیے بغیر دام اپنی جیب میں رکھ لیے اور ظہور احمد صاحب سے مزید دس روپے کے قرض لے کر ہم رات کی گاری سے ملیح آباد روانہ ہو گئے۔



www.pdfbooksfree.pk

برہنہ پا یتیموں کی طرح

اللہ اکبر وہ رات وہ نالوں سے گونجتی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات...... وہ صاحب خانہ کے سدھار جانے کے بعد کی سر پیٹتی رات ۔ وہ ایک لٹے ہوئے قافلے کی بے قافلہ سالار رات!

جب اپنے گھر کے اداس پھاٹک پر نظر پڑی اور ہر آن شادیانوں سے گونجتے ہوئے صحن سے جب نالہ وشیون کی ملی جلی آوازیں سنیں دل پر گھن چلنے لگے...... اور جب اس صحن میں کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ قدم رکھا جہاں شفقت پدری کی گھنیری چھاؤں میں میرا بچپن کھیلا کرتا تھا ۔ تو ایک بہت بڑے کہرام نے میری پیشوائی کی...... داروغہ امید علی دوڑتے اور چیختے آئے اور مجھ سے چمٹ کر رونے لگے...... اور ہماری چیخوں نے بام و در میں زلزلہ پیدا کر دیا مکان کے اندر سے بھی ہائے ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں...... دادی جان کی آواز آئی بشیر جاگ اٹھ تیرے بچے آ گرے سے آئے ہیں سلام کرنے کو ۔ دادی کی یہ آواز سن کر ایسا محسوس ہوا کہ گویا ذروں سے لے کر تاروں تک ایک عظیم ماتم بر پا ہے ۔ اور اس کرہ ارض کے تمام پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیے گئے ہیں ۔ اور اس آسمان کی ڈاٹ کے نیچے تمام دنیا کے رونے والوں کے آنسو میری آنکھوں میں بھر دیے ہیں ۔ اتنے میں رئیس کی انا دوڑی آئیں ہم دونوں کو سہارا دے کر گھر لے گئیں ۔ دادی اور ماں سوگ واری دیکھ کر دل پر ایسا ناقابل برداشت وزن پڑا کہ میں زمین پر گر پڑا ۔ ایڑیاں رگڑنے لگا ۔ گریبان پھاڑ دیا...... اور چیخ چیخ کر ہائے میاں ہائے میاں ہائے میاں ارے میں کیا کروں کدھر چلا جاؤں؟ ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھ پر ترس کھائے اور مجھ کو میرے میاں کی قبر میں لے جا کر دفن کر دے ایہ کہتے کہتے میں بے ہوش ہو گیا۔

میرے مقدمہ تنسیخ نکاح کا فیصلہ

میرے باپ کی موت کو غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا اور

میرے نکاح کو جائز قرار دیتے ہوئے عدالت نے مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ میں چاہوں تو اپنے خسر اور ان کے گواہوں پر حلف دروغی کا مقدمہ بھی چلا سکتا ہوں۔

لے کہتے ہیں وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے لیکن میرے باپ کی رحلت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن میرا زخم دل مندمل نہیں ہو سکا ہے شمر مزاج زندگی کے شدائد و مکروہات کی یورش پیہم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس غم کو بھول چکا ہوں۔ لیکن جب کبھی عمیق تنہائیاں میرے سینے پر زور سے ہات رکھ دیتی ہیں تو میں درد سے تڑپ جاتا ہوں اور سینے کے زخ کی موجودگی کا پتا چل جاتا ہے۔

کئی مہینے کی بات ہے کہ اخبار نے بتایا تھا کہ ایک مقام پر ایک سو ساٹھ برس کا کوئی آدمی موجود ہے اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا کاش میاں کو بھی اتنی ہی طویل زندگی ملتی اور وہ اپنے گودوں کے پالے ہوئے اس بچے کو بھی بوڑھا دیکھ لیتے اگر مسیح مل جائیں تو میں بچوں کی طرح بلک بلک کر ان سے کہوں اے میرے اچھے حضرت مسیح میرے باپ کو زندہ کر دیجیے:

اگر آں طائر قدسی زدرم باز آید
عمر بگذشتہ بپیرا نہ سرم باز آید

ارے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے جو محبت کے جکڑے ہوئے بے چارے انسانوں پر موت کو مسلط فرما کر اور ہمارے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح پرو پرو کر اپنی گردن میں ہار ڈال رہا ہے۔ لاکھوں گھروں کے چراغ بجھا کر جشن چراغاں منا رہا ہے...... اور ہماری آہوں کو مضراب بنا کر اپنا ستار بجا رہا ہے؟

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

فیصلہ سنانے کے وقت عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یہی نہیں کہ ہم لوگ ہی آب دیدہ تھے میرے مخالفین اور خود میرے خسر بھی بے حد مغموم و پریشان نظر آ رہے

تھے۔

مسٹر شرغا حکم سنا نے بیٹھے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے خاں صاحب کو اس مقدمے کے جیتنے کی بڑی تمنا تھی کاش میں ان کی زندگی میں ہی فیصلہ سنا دیتا...... یہ سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے......اور مجھ نامراد کو اپن یہ فتح مندی لاکھوں شکستوں کے پہاڑوں کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہونے لگی...... میں نے لاکھ لاکھ ضبط کرنا چاہا مگر ایک دردناک چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ ......میرے خسر نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگالیا اور عدالت کا کمرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

میری شادی بعد از خانہ بربادی

اس فیصلے کے دوسرے دن حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ فرنگی محلی میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھ کو اپ کے والد گرامی کی ناوقت موت کا بے حد افسوس ہے اور اس بات کا بھی ملال ہے کہ میں نے مقدمے میں آپ کی مخالفت کی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فرنگی محل پر اپ کے جد امجد نواب فقیر محمد خاں بہادر کے جو احسانات ہیں میں انہیں بھول گیا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ محمد مقیم خاں (میرے خسر) اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلائیں گے یا نہیں...... میں نے کہا مولانا اس دن کے لیے مجھے خدا نہ رکھے کہ میں مقیم چچا اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلا کر انہیں جیل بھیجنے کی سعی کروں۔ مولانا میری یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگالیا اور کہا آپ کی شرافت سے مجھے اسی جواب کی امید تھی...... اس کے بعد بڑی بزرگانہ ملائمیت کے ساتھ مسکرا کر انہوں نے یہ فرمایا کہ آپ کیا یہ وعدہ بھی کریں گے کہ اپنی بیوی کو شیعہ نہیں بنائیں گے۔ میں نے کہا مولانا دین میں اکراہ کو دخل نہیں ہے۔ میں کبھی ان کو شیعہ ہو جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ باپ کی موت پر میں کم سے کم پانچ برس تک سوگ مناتا لیکن حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور اس قدر عجلت طلب تھی کہ مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ جلد سے جلد رخصت کی رسم ادا کر دی جائے۔ اس لیے دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

میرا سا بد بخت و بدنصیب دولہا اور کون ہو گا شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں...... میرے پھاٹک کی شہنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے...... میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا خون ابل رہا تھا...... تاشوں کی جھنکار کف افسوس مل رہی تھی۔ اور مجھ نامراد کی شادی کے دوش پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

میں جب ہاتی پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اپنی سسرال کی جانب روانہ ہوا تو یہ دیکھا کہ میرے باپ سامنے کھڑے ہوئے کہہ رہے ہیں بیٹا شادی مبارک ہو میں نے جان دے کر تیرا سہرا دیکھا ہے اس وقت میں نے اس طرح ہچکیاں روکیں کہ میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اور دل سے آواز آنے لگی ہائے میرے باپ ہائے میرے باپ اور میرے سہرے کی مہکیں میرے سینے پر ڈنک مارنے لگیں۔

اے	متاع	درد	در	بازار	جاں	انداختہ
گوہر	ہر	سوؤ	در	جیب	زیاں	انداختہ

---

[1] میری بیوی آج تک سنی ہیں اور میں نہ شیعہ رہا نہ سنی اور اب مسلمان بھی ہوں کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے!!

تقسیم جائیداد

میری اس تجویز سے میرے بڑے اور چھوٹے بھائی نے اتفاق کیا کہ سرکاری طور پر نہیں نجی طور پر جائیداد تقسیم کی جائے۔ اور ماتا دین پٹواری کو حکم دیا گیا کہ وہ مساوی

قسم کی تین چٹھیاں بنا دے ۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پٹواری وہ چٹھیاں لے کر آیا' اور ان کو تہ کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا ۔ اور ہم تینوں بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایک چٹھی اٹھالی ۔

میں نے اپنی چٹھی کھولی تو سمجھ میں نہیں آئی ابرار کے حوالے کر دی اور جب انہوں نے وہ چٹھی پڑھی تو خوشی سے اچھل کر کہنے لگے مبارک ہو شبیر حسن خاں آپ کی چٹھی سب سے بڑھیا ہے ۔ میں نے پوچھا کس اعتبار سے انہوں نے کہا آپ کے حصے میں قلمی باغ آیا ہے ۔ میں نے پوچھا میری چٹھی میں تھانہ بھی ہے؟ ابرا نے کہا ارے یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اس باغ کی ایک ایک پتی پر ہزاروں تھانے قربان کیے جا سکتے ہیں ۔ آپ کو معلوم نہیں باغ کی فصیل دس دس بیس بیس ہزار روپے کی ہر سال فروخت ہوتی ہے ۔ تھانے میں رکھا ہی کیا ہے ۔ اس کی سالانہ مرمت میں الٹے آپ کی جب سے ہر سال پان چھ سو روپے جایا کریں گے ۔ میں نے کہا ارے تھانے کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس کی چھت سے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی وجد کرنے لگے یہ سن کر بڑے بھائی صاحب نے کہا میں تم کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں اپنا دل میلا نہ کرو تھانہ میری چٹھی میں آیا ہے لو بدل لو یہ سن کر ابرار نے چیخ مار کر کہا شبیر حسن خان ارے ایسا غضب نہ کر بیٹھیے گا قرآن مجید کی قسم بڑا غضب ناک قسم کا دھوکا کھا جائے گا ۔ اس بات پر بڑے بھائی صاحب نے ابرار سے ڈانت کر کہا کہ تم کون ہوتے ہو ہم بھائیوں کے درمیان ٹانگ ارانے والے یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنی چٹھی میری چٹھی سے بدل لی اور ابرار غصے کے مارے وہاں سے اتھ کر چلے گئے ۔

تھڑی بج گئی ملیح آباد میں میری اس حماقت کی ۔ لوگوں نے آ کر کہا ارے ہزاروں کی سالانہ آمدنی پر لات مار کے سالے تھانے کو ترجیح دی ۔ تم کیسے آدمی ہو میں نے کہا بھائی صاحب باغ لے کر نہال ہو گئے ار میں تھانے کے مناظر پا کر باغ باغ ہو گیا ۔ ان کو باغ کی چاندی ملی اور مناظر کا سونا میرے ہاتھ لگا ۔ جب میری یہ بات سنی

تو میرے ایک قرابت دار محمد غنی خاں نے جل کر جواب دیا کہ بھائی شبیر حسن خاں شعر ویرامیں تو خیر باقی تمام باتوں میں تم مہاتم کے چوتیے ہو۔

سرکاری ملازمت کی پیش کش

یوپی کے گورنر سر ہارکوٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے۔ انہوں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو تار بھیج کر مجھ کو نینی تال اپلا بھیجا۔ اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا کہ میں آپ کو بی اے سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا سپیشل میجر کورٹ وارڈ میں نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش ہو گیا۔ بٹلر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا وقت کم ہے آپ جلدی انتخاب کریں میں نے کہا آپ میرے باپ کے دوست ہیں اس لیے میرے چچا ہیں میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ کو نوکری دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں کوئی سرکاری نوکری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ بٹلر صاحب نے کہا آپ سینئر کیمبرج تک پڑھے ہوئے ہیں انگریزی بھی اچھی بولتے اور جانتے ہیں آپ اس کی پروا نہ کریں کہ آپ بخوبی کام چلا سکتے ہیں جلدی بتائیے آپ ان دو پیش کشوں میں کس کو ترجیح دیتے ہیں میں نے کہا جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں میں آپ کی پیش کش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا ہوں مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے۔ اس لیے آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں۔ میرا یہ فقرہ سن کر بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تنتنا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا باہر آیئے۔ میں سمجھا کہ باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے اور حملہ کیا تو میں پٹھان ہوں ڈروں گا نہیں۔ ترکی بترکی جواب دوں گا۔

کمرے سے نکل کر وہ مجھے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا۔ دیکھیے یہ یونین جیک جو اس چھت پر لہرا رہا ہے جب اس پھریرے کے اوپر سے خون کا دھارا گزر جائے گا اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا۔ میں نے کہا جناب والا کو میں اپنا چچا سمجھتا ہوں اگر گستاخی نہ سمجھے تو جواب دوں بٹلر نے کہا دیجیے جواب میں نے کہا ہندوستان کی

رگوں میں اس قدر خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں فقط ایک ضلع کا خون اس پھریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔

۱؎ اس شعر و یر میں تو خیر کی داد نہیں دی جا سکتی خدا بخشے محمد غنی خاں نے کتنی سچی بات کہی تھی۔ ۲؎ یو پی کے موسم گرما کا پایۂ تخت۔

یہ سن کر وہ اور بھی سرخ ہو گئے۔ اور کہا آپ میرے دوست کے لڑکے ہیں اور نوجوان آدمی ہیں۔ اس لیے میں آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں برت سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی قوم کو ہر فرد ایک جنس فروختنی ہے۔ وہ جس کو چاہتے ہیں پل بھر میں خرید لیتے ہیں۔ میں نے کہا میں اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں انہوں نے غصے میں آ کر میرے صوبے کے تین نہایت مقتدر آدمیوں کے نام لے کر مجھ سے کہا ہم آپ کی قوم کے ان تین بڑے آدمیوں کو خرید چکے ہیں۔ آپ ہیں کس خیال میں؟

ان تین اکابر کے نام سن کر مجھ کو پسینہ آ گیا میں گھبرا گیا کہ اب کیا کہوں لیکن پھر سنبھل کر جواب دیا کہ کم سے کم مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔ بٹلر یہ سن کر غصے میں بھرے اور مجھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے اور میں ان سے رخصت ہوئے بغیر گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

گم نام خطوں کی بھرمار

نینی تال سے میں سیدھا ملیح آباد گیا۔ اپنی اور رئیس احمد کی جائے داد...... بھائی صاحب کی سپردگی میں دے کر رئیس و ابرار سمیت پھر آگرے چلا گیا کہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد گم نام خطوں کا تانتا بندھ گیا۔ کہ آپ اپنی جائیداد اپنے بھائی کے سپرد کر کے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔ وہ آپ کی جائیداد کو خرد برد کر رہے ہیں آپ کے حصے کے درخت کٹوا کر اپنے کام میں لا رہے ہیں اور آپ کے اچھے

اچھے کاشت کاروں کے اپنے محال میں بسا رہے ہیں۔اور آپ کی آمدنی جو ان کے پاس بطور امانت جمع ہو رہی ہے اس سے ہات اٹھا لیجیے وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔اول اول تو میں نے ان خطوط کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھتا رہا کہ جیسی ملیح آباد کے پٹھانوں کی عادت ہے وہ ہم بھائیوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہ رہے ہیں۔

لیکن مقیم چچا نے بھی جب اسی نوعیت کا خط لکھا ان گم نام خطوں کی تصدیق کر دی تو مجھے بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔اور مقیم چچا کے خط کے ساتھ تمام گم نام خط بھی ابرار کو دکھا دیے۔

خطوں کو پڑھ کر ابرار نے کہا قرآن مجید کی قسم ان خطوں کا ایک ایک حرف صحیح ہے اتنا کہہ کر ابرار اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا اپنے پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ جب آپ شفیع احمد خاں کے سپرد اپنی جائیداد کر رہے تھے تو اس وقت میں نہ جانے میرا جی کس کوٹھے میں تھا۔اور میری عقل کس پھٹکی میں بند ہو گئی تھی کہ میں اس وقت آپ کو اس فعل سے نہیں روکا اپنی اس کوتاہی پر مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ سنتے ہیں کوئی طوائف کسی شادی کی محفل میں گا رہی تھی کہ:

مجھ کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر
قافلہ مضطر روانہ ہو گیا

تو یہ شعر سن کر ایک ہینگ بیچنے والا کابلی پٹھان دھاڑیں مار مار کر رونے اور رو رو کر یہ کہنے لگا کہ جب یہ عورت اتنا زیور پہنے جنگل میں اکیلا رہ گیا تھا اس درخت ہم کہا جا کر مر گیا تھا اس عورت کو نہیں لوٹ سکا۔

ملیح آباد کا قیام اور جائیداد کا انتظام

اس کے بعد میں رئیس و ابرار سمیت ملیح آباد پہنچ گیا۔رئیس و ابرار نے پڑھنے لکھنے کی طرف کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھا۔رئیس موسیقی میں غرق ہو گئے۔ابرار کورٹ آف وارڈ

www.pdfbooksfree.pk

کے مینجر ہو گئے۔ میں نے ابرار کے بڑے بھائی خواجہ احسن خان کو ضلع دار بنا کر اپنی جائیداد ان کی نگرانی میں دے دی۔ مولانا قدرت اللہ بیگ سے دوبارہ فارسی پڑھنا شروع کر دی۔ اور شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بطور خود مطالعہ کرنے لگا اسی اثنا میں ایک روز میرے برادر بزرگ تشریف لائے اور تین دستاویزوں پر مجھ سے دستخط کر دینے کی فرمائش کی۔ میں نے ان پر پڑے بغیر دستخط کر دیے تا کہ بھائی صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز یہ معلوم کر کے حیرت وعبرت نے میرا احاطہ کر لیا کہ ان دستاویزوں میں دو رسیدیں تھیں اور ایک ہبہ نامہ۔ پہلی رسید تھی میری جائے داد کے ان باون ہزار روپوں کی جو ان کے پاس جمع اور ان کے ذمے واجب الادا تھے۔ دوسری رسید تھی ان بہتر ہزار روپوں کی جو میرے باپ نے لالہ مادھو پور کو بطور قرض دیے اور لالہ صاحب اب ان کو ادا کر کے بھائی صاحب سے رسید لے چکے تھے۔ اور تیسری چیز وہ ہبہ نامہ تھا جس کی رو سے میں نے تقریباً آدھی جائے داد بھائی صاحب کے نام لکھ دی تھی۔

متقیم چچا اور ابرار نے جب یہ ہول ناک خبر سنی تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ لکھنو چلے گئے اور جب وکیلوں سے مشورہ کر کے آئے تو انہوں نے کہا کہ تم یہ حلف نامہ لگا کر کہ بڑے بھائی کی مروت کے دباؤ میں آ کر تم نے ان رسیدوں اور اس ہبہ نامے پر دستخط انہیں پڑھے بغیر کر دیے تھے مقدمہ دائر کر دو اور مادھو پور کو بھی نوٹس بھیج دو کہ انہوں نے کل روپیہ بھائی صاحب کے حوالے کیوں کیا جب کہ وہ صرف ایک تہائی کے حق دار تھے...... میں نے متقیم چچا اور ابرار کو ہر چند ٹکا سا جواب تو نہیں دیا۔ لیکن اس قدر ٹال مٹول کی کہ آخر کار وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں اس اقدام پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

قصر سحر کی تعمیر۲

اپنے سوتیلے چچا آصف خاں سے میں نے امانی گنج کے میدان میں غالباً دو بیگھے

زمین خرید کر ایک نہایت خوبصورت دومنزلہ کوٹھی بنوائی چوں کہ یہ کوٹھی صرف اس لیے بنوائی گ ءتھی کہ اس سے طلوع سحر کا جمال دیکھوں اس لیے اس کا نام قصر سحر رکھ دیا۔

وہ کوٹھی ملیح آباد اسٹیشن کے قریب تھی۔ اس کے دائیں بائیں طرف ایک بڑا خوب صورت تالاب تھا اور داہنے طرف ذرا ساہٹ کر ریلوے لائن تھی۔

ا بھائی صاحب میری فطرت سے واقف تھے کہ میں فرط سعادت مندی سے اور اظہار عقیدت میں آنکھیں بند کر کے دست خط کر دوں گا...... ۲ صد حیف کہ میری نادان بیٹی نے اس کوٹھی کو شہید کرا کے میرے دل کے ایوان کو ڈھا دیا۔ میری ایک بہت بڑی یادگار مٹوا ڈالی اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں اور اپنے عنفوان شباب کی وارداتوں کو کس جتن سے جگاؤں۔ اے میری بیٹی سعیدہ تو نے میرے دل کو تباہ کر ڈالا

کرم کردی الہٰی زندہ باشی!!

میرے تقشّف کا آغاز

یہ دنیا ہفت عجائب سے زیادہ حیرت ناک اور اس کم بخت کے امکانات کا دائرہ کائنات کے دائرے سے بھی وسیع تر ہے۔

ارے ذرا خیال تو کیجیے کہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں قصر سحر آتے ہی خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سے مادر زاد معصیت کار پر دورہ پڑ گیا اور اس چیز کو جس کو نادان تقویٰ اور دانا بزدلی کا نام سے پکارتے ہیں۔

اس تقوے کا ہلکا سا دورہ سینٹ پیٹرز کالج میں بھی پڑا تھا۔ لیکن اس مرتبہ تو اس میں اس قدر شدت آ گئی تھی کہ میں بڑی سختی کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا۔

نمازوں کے وقت میں کمرہ بند کر کے عود اور اگر سلگاتا اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا کہ قرون اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے

لگتی تھی۔ اور پرہیز گاری کی یہ لے یہاں تک بڑھ گئی کہ قیمتی لباس ترک کر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہننے لگا۔ گوشت کھانا اور چارپائی پر سونا ترک کر دیا۔ اور مجھ پر اس حد تک خدا کا قہر نازل ہوا کہ میں نے ڈاڑھی کی سی چیز بھی رکھ لی۔ اور بالکل مولوی خدا بخش نظر آنے لگا۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
کہا حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

ارے کس بے پایاں حیرت کی بات تھی کہ میرا سا دیوانہ کاکل و رخسار اور سبحہ و سجادہ میں گرفتار۔ میرا سا فریفتہ چنگ و عود اور مشق رکوع و سجود...... مجھ سا مرد خواہش اوقات اور گرفتار صوم و صلوٰۃ...... میرا سا امیر کاخ و کو اور اسیر مسواک و وضو! تفو برتو اے چرخ گرداں تفو۔

کس قدر سچ کہا ہے میر تقی میر نے

دیر سے اٹھ کے کعبے آیا میر
جس کو چاہے خدا خراب کرے

میں اس زمانے میں پو پھٹنے سے بہت پہلے بیدار ہوا کرتا تھا۔ حافظ کا دیوان گنگنا گنگنا کر پڑھتا پھر نماز فجر ادا کرتا اور تاروں کی سہانی چھاؤں میں نکل جاتا امانی گنج کے لق و دق میدان میں وہاں پہنچ کر چکاروں کی طرح چھپتا چھلانگیں مارتا' صدر پور کے پودوں کو گلے لگاتا۔ حافظ کے اشعار گنگناتا۔ درختوں پر چڑھ جاتا۔ اور پھر ان سے یہ کہہ کر اتر آتا کہ معاف کرنا میں نے بڑی تکلیف پہنچائی تم کو۔ اور اسی عالم میں گل رنگ آسمان کی جانب جب نظر اٹھاتا تو کیا دیکھتا کہ بڑی لانبی لانبی داڑھیوں کے فرشتے میرے سر پر منڈلا منڈلا کر اسلام علیکم یا لسان الصباح سلام علیکم یا لسان الصباح کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اور فرشتے جب سلام کر کر کے بلندیوں کی طرف اڑنے لگتے تھے تو عجیب قسم کی

گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چاروں طرف' اور فضا میں تیرنے لگتی تھیں یہ آواز۔

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است
بایں راہ و روش می رو کہ بادل دار پیوندی!

بیعت

اسی زمانے میں کاکوری کے فرشتہ صورت سجادہ نشین حضرت حبیب[3] حیدر شاہ کے ہاتھ پر میں نے بیعت بھی کر لی تھی...... سالانہ عرس کے زمانے میں وہاں بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی۔ دور دور سے مرید اور قوام آتے تھے۔ اور کنھیا قوال جب

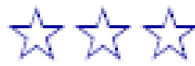
[1] اور یہ رسم اب بھی جاری [2] ایک مولہ جو میرے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔ [3] شاہ صاحب آل رسول کے علاوہ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

گاتا تھا تو در و دیوار جھومنے لگتے تھے۔ اور تاروں کی ہلکی روشنی اور رات کی چھٹتی ہوئی تاریکی میں جس وقت آزادوں[1] کی ٹولی اونچی اونچی ٹوپیاں اور لانبی عبائیں پہنے' حضرت تراب علی شاہ کے مزار پر روبرو صفیں باندھ کر حضرت علی کی منقبت میں

اے بادشاہ اولیاء مستاں سلامت می کنند

گانا شروع کر دیتے تھے تو ایسا نظر آتا تھا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسالت مآب حضرت علی کی مولائی کا اعلان فرما رہے ہیں۔

[1] فقراء کا ایک گروہ جو تمام قیود سے آزاد رہ کر مستانہ زندگی بسر کرتا ہے۔



www.pdfbooksfree.pk

اسی دور میں تصوف وتقشّف میں میری سب سے پلی سترہ تصویروں والی مصور تصنیف روح ادب[1] غالباً میتھیوڈسٹ پریس لکھنو سے رفیع احمد خاں کے مقدمے اور حضرت اکبر کی رائے کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء یا سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہوگئی۔

روح ادب پر سب سے پہلے تعریفی تبصرہ کیا تھا میرے اس دور کے اجنبی اور اس دور کے دوست اسرائیل احمد خاں اور میرے اس دور کے مداح اوراس دور کے معترض حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے...... اور سب سے پہلے اعتراض کیا تھا سجاد انصاری مرحوم نے اس وقت مسٹر عبدالماجد مولانا عبدالماجد کی جانب سفر کر رہے تھے۔ اور کفر سے منہ موڑ کر اسلام کی جانب آ چکے تھے۔ اور سجاد انصاری[2] حلقہ اسلام سے بھاگ کر کفر کی جانب افتاں وخیزاں چلے جا رہے تھے اور فریقین کے مابین یہ غیر تحریری وغیر ملفوظی معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف لکھیں اور ایک دوسرے کے ممدوح پر سب وشتم کریں گے۔

اور چوں کہ مولانا عبدالماجد نے اپنی محبت کی بنا پر مجھ کو غالب وٹیگور کی صف

---

[1] اس کتاب پر لاگت آئی تھی چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی تھی تین روپے فی جلد میں نئی قسم کا تھا بیوپاری۔

[2] میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اور زندہ رہتے تو اردو کے فکری ادب میں بہت اچھا اضافہ ہو جاتا۔

میں بٹھا دیا تھا۔ اس لیے سجاد انصاری پر یہ فرض ہوگیا کہ وہ مجھے شیاطین کے

زمرے میں شامل کر دیں۔

اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی کی تھی و ردل کھول کر داد دی تھی۔اور پنجاب یونیورسٹی سے روح ادب کے تین سونسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا......اوراسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہےلیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی اس لیے مجھ کو چاہیے کہ حافظ اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آ جاؤں اور حافظ اورخیام کی طرح تھپک تھپک کرسلانے کےعوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہوجاؤں۔

لیکن اس وقت میری تخیل کا دھارابڑے زوروشور سےتصوف کی پراسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا۔ان کی نصیحت پرعمل پیرا نہیں ہو سکا تھا۔لیکن شنیدہ اترے دارد کےطور پران کی نصیحت غیرمحسوس طریقے سے مجھ پراثر کرتی رہی اور جب چند ماہ و سال کے بعد میری طبیعت روح ادب کے مزاج سےمختلف ہونے لگی تو تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا۔اورسیاست سے مڑکر جس وقت میری شاعری تجسس وتشکک کی جانب گام زن ہوگئی تو میرے ناصح حضرت اقبال کی شاعری اقوال روایات اورعقائد کی طرف چل پڑی......اور یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعیات سےانہوں نے مجھے روکا تھا۔اس پرحرکی کالیبل لگا کروہ خود ہی اس کی طرف چلے گئے۔اورعقل کو بولہب اورعشق کومصطفےٰ کا خطاب دینے لگےاور

السلام اے عشق خوش سودائے ما

کےنعرے لگانے لگے۔

چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے تھے۔اور بلا کے ذہین انسان تھے۔اس لیےشروع شروع میں انہوں نےمغرب کے الحاد اورمشرق کے مابین مصالحت کی

www.pdfbooksfree.pk

بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تھی تو انہوں نے نیٹشے کے مافوق البشر کو شرف باسلام کر کے شاہین بچہ بنا دیا قرآن کے مردو ولفظ عشق کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف ومجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظ عقل کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا۔ اور میں چیخ اٹھا

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

میرے تقشّف کا انجام

میں نے تقشّف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ ملا کی طرح سنیں گے تو مجھ پر ہزار صلوتیں بھیجنے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست آدمی کی طرح سنیں گے تو مجھے امید ہے کہ کم از کم میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر ضرور مجبور ہو جائیں گے۔

وہ ماجرا سن کر آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اور مصلحت خداوندی پر نگاہ نہ کر کے میں نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ پرائے شگون پر خاک کٹائی اور اپنی عاقبت خراب کر لی ہے، لیکن اگر آپ کے سینے میں دل ہے۔ اور دل میں دردمند انسانوں کی محبت ہے تو آپ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکیں گے کہ ترک عبادت میں میری نیت کا فتور یا میرے عدوان کا مادہ کارفرما تھا۔ اب وہ ماجرا سنیے۔

میں ایک روز حسب معمول امانی گنج کے میدان میں ٹہل رہا تھا...... دسمبر کی برفانی ہوائیں اونی واسکٹ کو توڑ کر سینے میں چبھ رہی تھیں۔ فضا اپنی کالی کملی کو اوڑھ لینے کے واسطے جھٹک رہی تھی۔ تھکی ماندی چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں دور دور تک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اور آفتاب کے ڈوب جانے کی کراہ فضا پر تھرتھرا رہی تھی۔ کہ میں نے دیکھا کہ ایک کوزہ پشت بڑی بی، لکڑی ٹیکتی اور ریلوے لائن عبور کرتی ہوئی انتہائی دردمندی کے ساتھ میری طرف رینگتی چلی آ رہی ہے۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے...... سوچنے لگا کہ یہ چلے کے

جاڑے یہ برف میں جھلا جھپٹا یہ ہڈیوں کو تراشنے والی ٹھنڈی ہوا یہ اونگھتا چٹیل میدان اور یہ ضعیفہ؟ ...... آخر کیا بپتا پڑی ہے ان پر کہ یہ اس وقت گرم سفر ہیں ...... اس وقت تو کتے بھی گھر سے باہر نکلنے کی جرات نہیں کرتے۔ تیز تیز قدم رکھتا میں ان کے قریب گیا تو دیکھا کہ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہی ہیں اس پر ان کا ہات کانپ رہا ہے اور ان کے ہاتھ کی لٹکتی ہوئی کھال چلنے میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا بڑی بی سلام انہوں نے میرا اسلام سن کر جھکے جھکے جیتے رہو بیٹا کہا اور بڑی دشواری کے ساتھ کمر سیدھی کر کے پوچھا بیٹا تم کون ہو؟ میں نے اپنا نام بتایا انہوں نے میرے نام کو اپنے حافظے میں ٹٹول کر پوچھا بیٹا اپنے باپ کا نام بتاؤ؟ اور جیسے ہی میں نے اپنے باپ کا نام بتایا ان کی بے نور وخشک آنکھوں سے دفعتہً نمی آ گئی۔ انہوں نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹخا کر دور سے میری بلائیں لیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر اائے اور میں نے دردناک آواز میں پوچھا آپ رونے کیوں لگیں؟ انہوں نے کہا بیٹا کیسے نہ روؤں اللہ بخشے میرے خاوند تمہاری دیوڑھی کے سپاہی تھے ...... اللہ کرے خاں بہادر (میرے باپ) کی کروٹ کروٹ حوریں ہوں' ان کی سرکار سے عید بقرعید اور شبرات کے انعام واکرام کے ساتھ ساتھ جڑواں کے نام سے اتنا مل جاتا تھا کہ ہم سب چین سے رہتے تھے۔ ہائے خاں بہادر صاحب کے چھ مہینے کے بعد میرے سرتاج بھی سدھار گئے اور لے دے کے ایک جوان جہان بیٹا تھا وہ بھی خالی کے مہینے میں دغا دے گیا ...... بڑی بی سینے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں اور ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

میں نے کہا بڑی بی آپ میرے گھر چلیں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا آپ کی خدمت کروں گا۔ اور ہر مہینے خدمت کرتا رہوں گا۔ انہوں نے کہا نہیں بیٹا بختیار نگر میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے۔ وہ ہر مہینے مجھے سات روپے دیتی ہے۔ ان روپوں سے

www.pdfbooksfree.pk

میرا

ا۔ ملیح آباد کے ایک محلے کا نام

خرچ پانی چل جاتا ہے۔ایک بوڑھی جان کا پالنا ہی کیا وہ غیور بڑی بی جب کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر چلی گئیں تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور یہ سوچ کر کہ یہ ہڈیوں کی مالا بڑھیا فقط سات پلیوں کی خاطر مہینے ڈگ ڈگ کرتی بختیار نگر جاتی ہے میری سانس گلے میں الجھنے لگی۔اور اس دردانگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اس طرف اللہ کے کروڑوں بندے دردر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے یتیم بچے ایک ایک کا منہ دیکھتے رہتے' بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازوں اٹھاتے کم سن بیواؤں کو رنڈ سالے پہنائے جاتے۔بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان اور کماؤ بچے ان کی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے سانپ انسانوں کو ڈستے درندے ان کی ہڈیاں بھنبھوڑتے سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے' قحط کی شدت سے مائیں جا پنے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں وبائیں سینکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں' زلزلوں کی کروٹوں میں ہزاروں شہر دب دب کر رہ جاتے۔اور آتش فشاں پہاڑ بے شمار آبادیوں کو راکھ میں تبدیل کر کے رکھ دیا کرتے ہیں۔اور پھر یہ خیال اا کر میرا سر چکرانے لگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا کا یہ عالم ہے کہ یہاں قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ ناطاقتی کو کچل ڈالے۔ میری چشم تصور نے یکایک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید' شمر' نادر' نیرو' چنگیز' ہلاکو' مسولینی' اور ہٹلر خون انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں۔ جواں مرد احتیاط سے تنگ آ کر بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں۔اور بڑے بڑے

اکاطرکو دن سلاطین کے درباروں میں پیٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جاہلوں کے دروازوں پر بڑے بڑے علماء بھیک مانگ رہے ہیں......سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جارہا ہے مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے.....محمدؐ کے دانت شہید ہوجانے کے بعد خون بہہ رہا ہے اور محمدؐ کے نواسے حسینؓ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں سمیت تپتی زمین پر لٹا لٹا کر پیاسا ذبح کیا جارہا ہے.....اور یہ سارے تماشے ہو رہے ہیں اس خدائے بزرگ و برتر کی اانکھوں کے سامنے.....جو عادل ہے حکیم ہے' رحیم ہے' رؤف ہے رب ہے اور رزاق ہے۔ اور جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے.....اور اس کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتا' اور ٹک ٹک دیدم دم نکشیدم کے فشار میں گرفتار ہے.....؟؟ اور ان تمام باتوں پر ایک سانس میں غور کرنے کے بعد زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزاق و ہنے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہوگئی۔ اور جھوٹ کیوں بولوں مجھ کو خدا پر اس قدر گسہ بھی آ گیا کہ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ اگر آس پاس کوئی مسجد ہو تو اسے آگ لگا دوں.....مسجد وہاں تھی ہی نہیں ریلوے لائن کے شوالے پر نظر پڑ گئی۔ میں غصے سے بھرا ادھر گیا اور شوالے کے دروازے پر کھڑے ہوکر اول فول بکنے لگا۔

اسی عالم میں گھر آیا نماز مغرب کا وقت قضا ہو چکا تھا۔ نماز کی عادت نے دل میں انگڑائی لی میں نے کہنی مار کر اس کی انگڑائی توڑ دی۔ اتنے میں باپ کا ایمان لاٹھی چارج کرنے لگا۔ برے جی سے وضو کیا' مصلے پر نظر ڈالی دل نے کہا اٹھا کر پھینک دے اس کو اب باپ اور دادا دونوں مل کر مجھ پر لاٹھی چارج کرنے لگے.....مین ں ے بادل ناخواستہ نماز شروع کر دی۔ رکوع میں خم ہوا تو وہ کوزہ پشت بڑھیا سامنے آ کر کھری ہوگئی۔ اب خوب خدا نے دانٹ پلائی کہ جھک جا مردود میں جھک گیا اور جوں توں کر کے بوجھل دل کے ساتھ آسمان کو دیکھنے لگا۔

کیا میرا دماگ کفر کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا پھر میں نے

اپنے دل سے پوچھا کیا میں نعوذ باللہ خدا کے وجود سے انکار کرسکتا ہوں؟ دل نے کہا نہیں ہرگز نہیں۔

اسی کشمکش کے عالم میں کئی مہینے تک اپنے دل و دماغ کو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ڈنڈے مار مار کر نمازیں پڑھتا لیکن ع حالتے رقت کہ محراب بفریاد آمد کی سی کیفیت مفقود ہوگئی۔

بندوں کی دردمندی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قومی سے قوی ہوتا چلا گیا۔ اور اسی تناسب سے میری نمازیں بے لطف بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں...... اور میرے ایمان میں اس طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیرگی منہ اندھیرے کی روشنی میں آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس عالم میں جب نماز پڑھتا تو بے شمار انسانوں کی آہیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آوازیں آنے لگتی تھیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

☆☆☆

یا خداوند کارے افتادست

کہ سر بندہ پروریدن نیست

☆☆☆

زندگی اپنی جو اس طور سے گزرے غالب

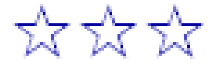
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

☆☆☆

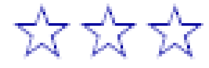
اس میر سید کہ بر غالب ناکام چہ رفت؟

می تو آں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

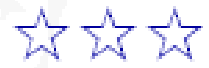
www.pdfbooksfree.pk



کفن بیاور و تابوت و جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار
مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ
زند بفرق و ...... گوید کہ ہاں سرے می خوار



رونا تو اپنی آنکھوں کا دستور ہو گیا
حق نے تو دی تھی آنکھ پہ ناسور ہو گیا



زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے



چنداں کہ خدا غنیمت ماتحاجیم

اور ہر بار میرا جی چاہتا تھا کہ احتجاج کے طور پر نماز توڑ دوں ...... مگر ہمت نہیں پڑتی تھی آخر کار کہاں تک اپنے سے لڑتا ...... ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا ...... ایسی نمازیں جن میں لب پر آئتیں ہوں اور دل میں شکائتیں کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل پر دھائیں سے۔ میری کھوپڑی میں ایک چٹاخا پیدا ہوا۔ میری عقل میرے سر سے نکل کر پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو چونچ دکھانے لگی ...... اور میں نے چٹ سے نماز توڑ ڈالی۔ حجرہ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا۔ حجام کو فوراً بلایا داڑھی منڈوا دی۔ موٹے جھوٹے کپڑے اتار کر پھینک دیے اچھا لباس پہن لیا ٹمٹم منگائی اور آدھ گھنٹے میں لکھنو پہنچ گیا لکھنو پہنچتے ہی دن دہاڑے ایک

نازنین کے کمرے میں چلا گیا اور گانا سننے لگا۔ گانا سن کر کھانا کھایا...... ٹنڈے کبابی کے کباب نوش فرمائے وہیں پڑ کر سو گیا...... شام کے قریب حمام کیا گویا عقل کا غسل صحت ہوگیا...... اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

لو بندگی' کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچھو داڑھی کا کہیں تر شا ملا جو میرے حجلہ دل میں آ کر بس گیا تھا اپنا مصلے اور اپنے وضو کو بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے تجھ پر خدا کی مار اے مردود کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اس ملا کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر

پس از مدت گزر افتاد برما کاروانے را

کے مانند ہنستا ہوا آیا اور آتے ہی اس نے دور کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور گانے لگا

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید
کہ ز انفاس خوشش بوے کسے می آید

آغاز بادہ خواری

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں کہ لڑکپن ہی سے مجھ کو ان سے شدید نفرت تھی۔ ایک تو ان میں سے تھی بادہ خواری دوسری تھی دروغ گفتاری...... دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا ہوں۔

اس سے پیش تر کہ میں اپنے آغاز بادہ خواری کا ماجرا بیان کروں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادہ خواری اور دروغ گفتاری کے باب میں چند نکات پیش کر دوں تا کہ آپ کو میرے نظریات کا علم ہو جائے۔

جہاں تک کہ بادہ خواری کا تعلق ہے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر چند بادہ

خواری اب میری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔لیکن اگر بدقسمتی سے میں کسی ریاست کا آمر ہو جاؤں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کا شراب کا سا جو ہر ناب عوام کے لیے زہر اور خواص اور وہ بھی دیوتا قسم کے خواص کے واسطے آب حیات ہے' میں اس پر اسلحہ کے لائسنس کے مانند یہ کڑی شرط عاید کر دوں کہ جب تک درخواست گزار......

(ا) اس نوعیت کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش نہ کر دے کہ اس کی صحت میں اس قدر دم خم ہے کہ وہ شراب کی ایک مقدار معین کا بار کا متحمل ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر نفسیات کا اس مضمون کا صداقت نامہ بھی حاصل نہ کر لے درخواست گزار کے مزاج میں ہو گا ارحد سے متضاوز ہو جانے کا میلان نہیں ہے۔اور وہ اس قدر دانا پاکیزہ نفس اور شریف انسان ہے کہ پینے کے بعد وہ سحت کی پارے داری اپنی اخلاقی و معاشی حالت کی استواری' اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری' اپنے ذہن کی سلایت کی بیداری' اپنے حقوق نفس (مع حقوق عباد) کی آب یاری' اور اپنے معاشرے کی پرسکون ہمواری کو باحسن الوجوہ قائم رکھنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔اس وقت تک اس کے نام بادہ خواری کا لائسنس منظور نہ کیا جائے۔

اب رہی دروغ گفتاری سو اس کے باب میں بڑی جسارت سے کام لے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جو لوگ حقیقت کذب سے واقف نہیں۔وہ ہر خلاف واقعہ بیان پر کذب کا لیبل لگا دیا کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانا انسان کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو گا کہ ہر خلاف واقعہ بیان کو جھوٹ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور کلمات حکمت آمیز کو حرف دروغ کا خطاب دینا انسانیت پر بڑا ظلم دھانا ہے میرے نزدیک جھوٹ فقط اسے کہا جائے گا جو سامعین کو دھوکا دے کر کسی شخصیت یا جماعت کو بے جا نقصان یا اپنے ناروا فائدہ پہنچانے یا زیٹ کا مزا اڑانے کے واسطے بولا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایسے خلاف واقعہ بیانات پر ہم دروغ گفتاری کا لیبل چسپاں کر دیں

www.pdfbooksfree.pk

گے تو بڑی احتیاط آمیز نیک نیتی اور انتہائی جذبہ حب انسانی کے ساتھ اس غرض سے زبان پر لائے جاتے ہیں کہ (۱) نادان اور ضدی کی بیماروں کو موت کے چنگل سے بچا لیں ...... (۲) فتنوں کا سد باب کر دیں ...... (۳) گم راہ یا معاشرے کو صراط مستقیم پر لے آئیں۔ اور (۴) کسی معصوم کے دل کو ٹوٹنے سے بچالیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم تمام محسنان انسانیت اور تمام مصلحین عالم کے تمام عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیں گے اور یہ ایک ایسی خطا ہو گی کہ جس کو خیر کی تاریخ اور مصلحین و مبلغین کی روح کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

سو اگر میری جھوٹ کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایک بار بھی دروغ بافی کا ارتکاب نہیں کیا

اور اگر غیر مفکر عوام میں جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ اس کو مان لے تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے اٹھارہ معاشقوں کے دور متلاطم میں اپنی بیوی کے دل کو ٹوٹ جانے سے بچا لینے کی خاطر میں نے اپنے سر پر قرآن رکھ رکھ کر ایک بار نہیں اٹھارہ ہزار بار جھوٹ بولا اور بڑے دھڑلے کے ساتھ بولا۔

اور لوگوں کے معمولی اشعار پر سبحان اللہ ماشاءاللہ کیا خوب فرمایا ہے آپ نے کے نعرے لگا لگا کر اور احباب کی مروت کے دباؤ میں ان کے کلام پر مبالغہ آمیز تبصرے لکھ لکھ کر بڑے زناٹے کے ساتھ آج بھی جھوٹ بولتا رہتا ہوں۔

ہاں تو میں اس توضیحی عبارت آیا اس جملہ معترضہ کے بعد اب سنیے کہ میری بادہ خواری کا آغاز کیوں کر ہوا...... یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء یا سنہ ۱۹۱۹ء کا ہے کہ میں اپنی ننہال دھول پور گیا ہوا تھا او رو ہاں میرے ایک دوست سردار مہابیر سنگھ نے میری دعوت کی تھی اور کہا تھا کہ میں چراغ میں بتی پڑتے ہی وہاں پہنچ جاؤں۔

وقت مقررہ پر میں وہاں پہنچ گیا۔ اپنے دوست سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن کو وہاں موجود پایا۔ میرے آتے ہی بوتل کھول دی گئی۔ اور پیا نے بھر بھر کے سب

کے سامنے رکھ دیے گئے۔

چوں کہ مجھ نافہم کو شراب سے سخت نفرت تھی میں پیا نے کی میز سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سب نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور صوفے پر جا کر بیٹھ جانے کی علت دریافت کی۔ میں نے کہا میں شراب نہیں پیتا۔ تینوں دوستوں کے منہ سے بیک وقت ایک طویل ارے کی آواز نکل گئی۔ رن بیر نے کہا ''ارے شاعر ہو کر تم شراب نہیں پیتے'' می نے کہا شاعر کے واسطے شراب پینا کوئی لازمی امر نہیں میرے اس جواب سے سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

روپ سنگھ نے اپنی ناک میں انگلی رکھ کر کہا۔ جمیری جان تم کو یہ بھی آج تک خبر نہیں کہ دیوتاؤں نے سمندروں کو متھ کر یہ سوم رس نکالا تھا۔ فقط کویوں شاعروں کے لیے۔ ارے کوئی ہو کر شراب نہ پینا پاپ بلکہ مہاپاپ ہے۔ تم کو پینا پڑے گی۔ میں انکار اور وہ تینوں اصرار کرنے لگے۔ بڑی دیر تک جھک جھک ہوتی رہی۔ شور رہا منتیں رہیں ہاتھ جوڑے گئے لیکن جب میں پینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو میرے میز بان مہابیر سنگھ نے جلدی جلدی بڑے بڑے چار پانچ گھونٹ پی کر سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن سے کہا تم لوگ شبیر کی چوتیا پنتھی میں وقت برباد نہ کرو اٹھاؤ اپنے جام اور میں ابھی ان کو مہاراج کا تیا پانچا کیے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دھمکی دے کر پوچھا کیوں جھوٹے کوی صاحب نہیں پیو گے۔ میں نے کہا مہابیر تیرے سر کی قسم مر جاؤں گا پیوں گا نہیں۔ انہوں نے بڑے زعم کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دے کر کہا اچھا بچا جی ابھی مزا چکھاءیدیتا ہوں تم کو...... یہ کہا اور کسی بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ وہ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے سامنے کے کمرے میں داخل ہو گئے...... ان کے جانے کے بعد روپ سنگھ نے میری طرف اشارہ کر کے تارا چرن سے کہا پارٹنر! دیکھ لوگاؤدی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے ان کو گالی دی وہ ہنسنے لگے۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد مہابیر کمرے سے نکلے انہوں نے لپک کر دو جام بنائے ایک جام آدھا ختم کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے اور جب چھم کی آواز سنی تو انہوں نے پردہ اٹھایا اور ایک سیکنڈ کے اندر پردے کے تانے بانے سے ایک روشنی سی پھوٹنے لگی اور دوسرے سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ پیکر انسانی میں ڈھلی ہوئی ایک کڑکتی ہزاروں انوٹوں کے ساتھ چم چھم کرتی اور پتلی کمریا لچکاتی چلی آ رہی ہے......اور میرے دل میں فسبح الرعدو بحمدہ کی صدا گونج رہی ہے۔

اف......وہ سولہ سترہ برس کا سن۔وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن۔وہ چھلا سی کمر وہ صراحی دار گردن' وہ کسمساتا بدن' وہ کھدبداتا جوبن......وہ سینے کا ہاپی ابھار وہ ریشمی پلو کی سطح ناہموار......گالوں کی وہ کندنی کاغذی جلد' جلد کے نیچے چھنتا اور چھکتا ہوا گلابی رنگ وہ ستواں ناک سجل نقشہ......دمکتی پیشانی دمکتی پیشانی پر وہ بولتا قشقہ......نکلتا قد چیختا پنڈا......سرخ انگھڑیوں سے وہ اٹھتی رنگین گھٹائیں۔لانبی نکیلی پلکوں کی جھپک میں وہ کجری کے کٹتے بول......سرمے کے دنبالے میں وہ کجلائی ہوئی دھنک......سانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی......بکھری زلفوں میں وہ جھولتی ہوئی' بندرابن کی برکھا راتیں......ہیرے کے باریک قلم سے ترشے ہوئے لب لبوں میں وہ چوم لیے جانے کی تمنا کا ابھار......اور جھل جھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیر تعمیر تاج محل کی ہمکار......ارے دہائی گنبد گردوں کے پروردگار......اس کو دیکھ کر زلزلہ آ گیا میرے دیار وجود میں......خون کی گردش میں ایسا جوار بھاٹا آیا کہ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں۔بھاپ سی اٹھنے لگی میرے مسامات سے اور

لے تاش کے رفیق

سر پر آواز منڈلانے لگی اڑبھنیری ساون آیا اڑبھنیری ساون آیا۔

www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی پتلی پتلی اور لانبی لانبی سرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قمقمہ روشن ہو گیا۔ ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے۔

پیانے سے منہ لگا کر اسنے دو چار گھونٹ پیے اور اس کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اس کی مدبھری انکھڑیاں میرے سینے کو توڑ کر میرے دل میں تیر گئیں۔ اور ایسا لگا کہ کوئی چیز میرے گلے سے اتر رہی ہے پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں میرے دل مین دونوں وقت گلے ملنے لگے۔ اس نے اپنا ساغر خالی کر کے دوسرا ساغر لب ریز کر لیا۔ اس لب ریز ساغر سے چند قطرے پیے۔ کن انکھیوں سے مجھ کو اانکا آ نک کر شکاری نظر سے دیکھا اور پیانہ ہاتھ میں اٹھا کر بڑھنے لگی اس کے قدم میرے سینے مین بجنے لگے ...... میرے دل میں ٹن ٹن خطرے کی گھنٹی بجی اور آواز آئی ارے بڑا زبردست طوفان اا رہا ہے ...... خاں صاحب ہوشیار سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے گانا بھی شروع کر دیا۔

اری میں تو لٹ گئی بیچ بجار ...... ترکوا نے لوٹ لیا۔ اس کے گاتے ہی تارا چرن نے ستار چھیڑ دیا۔ جھنن جھنن جھن جھان عود کی لپٹوں ستار کے جھالوں اور اس فتنہ دوراں کی تانوں سے درو دیوار جھومنے لگے۔ اور وہ ظالم مجھ سے قریب سے قریب تر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جھالوں اور تانوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اس قدر قریب آ گئی کہ اس کی ابلتی ہوئی جوانی کی آنچ مجھ کو چھونے لگی اور اس کی کچی عمر کی مہکتی سانس میرے سینے میں چبھنے لگی ...... میرے دل سے پھر آواز آئی خاں صاحب ...... ہوشیار ہوشیار دشمن سر پر آ پہنچا بغلی ڈوب جاؤ۔ میرے ہاتھ پیر سنسنانے لگے چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں کہ یکا یک وہ ظالم چھپ سے میرے زانو پر آ کر بیٹھ گئی ...... ستار پر اور بھی تیزی کے ساتھ جھالا بجنے لگا۔ اور اس

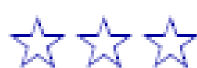
نے جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر کے پھر گانا شروع کر دیا
ارے پی لے ترکوا شراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب میری جھوٹی شراب
۔اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ الا اللہ کا نعرہ مار کر پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا
میرے ہاتھ سے گلاس لے کر چوما اور پھر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
اور اپنے لب میرے لب سے چسپاں کر کے اس طرح الٹی سانسیں لینے لگی گویا وہ
میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

جھر جھر جھر تالیاں بجانے لگے تارا چرن، روپ سنگھ، اور مہابیر سنگھ...... ہپ ہپ ہرا
کرتے سب میری طرف دوڑ پڑے۔ رن بیر نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب بہادر
آداب بس رہ گئی ساری شیخی اور پھر دور شروع ہو گیا ستار کے جھالوں میں۔

بالا	بلند،	سرو	قدے،	سرو	نازمن
کوتاہ	کرد،	قصہ	زہد	دراز	من!

---

[1] ارے میں تو بازار کے بیچوں بیچ لٹ گئی۔ ترک نے لوٹ لیا مسلمان کو ترک کہا جاتا پھر لفظ معشوق کے معنی میں مستقل ہو گیا۔



میرے عنفوان شباب تک کا ہندوستان

میرے حالات کے ساتھ ساتھ میرے اس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سن لیجیے جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان کے دوراہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت خالص مشرقی نیم مشرقی اور مغربی ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کی اکثریت تھی نیم مشرقی گروہ کی تعداد کم تھی اور مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانبی یا خشخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے پٹوں پر عمامے دستاریں شملے یا دوپلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھتلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پائنچوں کے پائے جامے یا اوریبی گھٹنے۔ عبائیں قبائیں انگرکھے دگلے شانوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال چکن کے کرتے روئی کی صدریاں اور ہاتوں میں خاک شفا کی تسبیحیں' انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں ہولا اور شام لگی جریبیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا شیروانیاں چست پائے جامے پمپ جوتے استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان میں لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سرسید احمد خان اپنے اپنے چیلی چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کے لیے سعی کر رہے تھے۔ لیکن اس وقت ت مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار

رہی تھی۔ مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔ اور سوٹ پہنے جوانوں کو پہلی صاحب کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل یعنی گلی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچلی کبڈی، آنکھ مچولی، ست گھڑا، گپل، گولیاں، اندھا مرغا، للّی گھوڑی، شطرنج اور چوسر...... تیراکی، بانک بنوٹ، پٹا کشتی ڈنڈ، اور مگدر...... مرگ بازی اور بٹیر بازی اور تیتر بازی کا عام رواج تھا۔ اور فٹ بال ہاکی ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیوں پالکیوں، نالکیوں، فنسوں، میانوں، ہواداروں، گھوڑوں بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتھیوں کی سواریوں کے آگے لینڈوئیں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں وغیرہ غیر ثقہ سواریاں سمجھی جاتی تھیں مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں...... ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس شمعیں اور راکے روشن کر دیے جاتے تھے۔ عود سلگتا عطر دان کھلتے خاص دانوں میں گلوریاں آتیں چاندی سونے کی چمٹیوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے جاتے معطر حقے اور سٹکیں گڑگڑاتیں...... علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی پیانو بجتا گراموفون کھڑکھڑاتا۔ سگرٹوں کی بو اڑتی...... کالی پیلی مِس سکورا یا مسز لیچر مغربی دھنوں میں شور و غوغا کیا کرتی تھیں۔ اور جب پیڑوں سے پیڑ ورگڑ واتا ڈانس شروع ہوتا تو بینڈ چیخنے لگتا تھا اور رعمدہ بجانے والوں کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی۔

اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے لونڈے گھیرے بن جایا کرتے تھے ادھر فرش یا چوکیوں پر دستر خوان بچھا کر ہاتھوں سے اور ادھر میزوں پر کانٹے اور چھری رکھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا تھا۔ چوں کہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پسندوں کو ہضم نہیں کر سکی تھی۔ اس لیے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں

www.pdfbooksfree.pk

آتی رہتی تھیں گاہ گاہ وہ آلات خوراک تڑ سے فرش پر بھی گر جایا کرتے تھے۔ یا بے گلی مرغ کی ٹانگ اڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا ادھر کے کھانے تھے (۱) قورمہ' قلیا' کوفتے' شامی کباب' سیخ کباب' بوٹی کباب' لگن کباب' آنت کباب' مچھلی کباب' دم پخت کباب' نرگسی کباب' ران کباب مرغ تیتر' کبوتر' بٹیر' شب دیگ' کلے پارے' کھیری سری' بھیجا' کلیجی' گردے دم پخت بکرے' قیمہ' قیمہ بھرے کریلے' دھوئی ماش کی دال کھڑے مسور کی دال' خاگینہ چلے ستارے' بھنی رانیں' بریانی' پلاؤ' مرغ پلاؤ' تیتر پلاؤ' بٹیر پلاؤ' بوٹ پلاؤ' اور چکیتی پلاؤ وغیرہ۔

ا انگریز ہندوستانیوں کے کلبوں میں آنا توہین سمجھتے تھے اور اپنے کلبوں میں ہندوستانیوں کے داخلے کو خلاف شان خیال کرتے تھے۔ اس لیے دیسی انگریزی کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں۔

---

(۲) مٹھائیوں میں حبشی حلوا سوہن پپڑی حلوہ سوہن' زردہ' انار کا زردہ' پستے بادام کا زردہ' مزعفر' کھیر' شیر خرما' بھجے' بالائی' میٹھے سموسے' قفلیاں' بالائی کے آب خورے' نمش' پینیڈیاں' رساول' گڑمبا' پوپی' برفی جلیبیاں' امرتیاں' لڈو' باجرے کا ملیدہ' قلاقند' گلاب جامن' پیڑے' پیٹھا' اندرسے' دندان مصری' شکر پارے' لوز' چٹنیاں اور مربے (۳) دہی رائیتا' پھلکیاں' دھی دہی بڑے' تلی دالیں...... چلے' تکونے' سموسے' سہال' پاپڑ' نمک پارے' کھچڑیاں' دال موٹ' سیوتلی' اروی' بھرتے' ساگ' تہری' تبولی' خشکہ' گوجھے' منگچیاں اور کھوٹے' چپاتی ورقی چپاتی' دہری چپاتی' پھلکے گردے' خمیری' شیرمال' دو سے لے کر اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے' روغنی روٹی بیسنی روٹی باقرخوانی۔

اور ادھر کا کھانا تھا سوپ' چاپ' کٹلٹ' ابلی مچھلی' ابلا مرغ' ابلے آلو ابلا مٹر' ابلی ترکاریاں' ڈبل روٹی' مکھن پڈنگ' پیسٹری' آئیس کریم' جیلی' ساس' اور کیک بس اللہ

www.pdfbooksfree.pk

اللہ خیر سلا۔

ہر چند سر سید گریزہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کی نقالی اور پرستاری کا ذوق رو بترقی تھا۔مگر ان کی عورتیں ٹھیٹ ہندوستانی تھیں اور مورے کالا پانی پینے والوں[1] سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔وہی پرانے زمانے کی مسہریاں وہی چھپرکٹ وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے چوکوں پر مسندیں' قالین' چاندنیاں' گاؤ تکیے میر فرش اگالدان' الا یچی دان' پان دان' اور خاص دان' لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی۔وہ پائچوں کے کلی دار پاجامے جن کے گوشے چلتے وقت خادمائیں اٹھالیتی تھیں۔وہی انگیا وہی کرتی وہی انگیاؤں کی چڑیاں وہی شلوکے وہی دوپٹے وہی دلائیاں اور وہی رضائیاں وہی پرانا تیل پھلیل تھا' وہی کاجل وہی مسی' وہی سرمہ' وہی مہندی' اور وہی افشاں دچلی آرہی تھی...... صابون کا رواج بہت کم تھا کھلی بیسن اور ابٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنواریوں کو بےکلیوں کے سیدھے پاجامے پہنچائے جاتے تھے۔ان کی ناک میں ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی یا نیم کا تنکا۔اور ان کو پان کھانے مسی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی اجازت نہیں تھی۔اور مانگ نکالنے کے بدلے' ان کے سروں پر مینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں۔جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔اس دور کے زیوروں کے نام بھی سن لیجیے۔

---

[1] شراب کو عورتیں کالا پانی کہتی تھیں۔

---

(۱) سر پر چھپکا (۲) ماتھے پر سراسری ٹیکا سمیت (۳) کانوں میں پتے بالیاں' جھمکے' بالے' بجلی' مگر' بندے' جھالے' انتیاں اور کرن پھول (۴) ناک میں نتھنی بلاق اور کیل (۵) گلے میں طوق گلوبند بدھی زنجیر چنن ہار' دھکدکی' چمپا کلی اور ہیکل (۶) بانہوں میں جوشن نونگے' بازو بند' اکا' اور چھوٹا سا عطر دان (۷) کلائیوں میں کڑے'

چوہے' دتیاں' بانکیں' چوریاں' کریلیاں' پہنچیاں' سمرنیں' کنگن' اور جہاں گیریاں (۸) انگلیون میں چھلے انگوٹھیاں آرسی اور علی بند (جس میں سونے چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں) (۹) پاؤں میں چھاگل' جھانجیں' رام جھول' بچھوے' کڑے' چھلے' لچھے اور پازیب (۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)۔

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (Better Half) دونوں بڑی سختی سے پردے کی پابند تھیں۔ ڈولی اور پالکی کے سوا کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اور تو اور عورتوں کی آوازیں اور انکا وزن بھی پردہ نشین تھا۔ یعنی کوئی بی بی اس قدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جا سکے۔ اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سل' پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا صحیح انداز ہو سکے اور بیبیاں تو بیبیاں مامائیں اور اصیلیں اور لونڈیاں باندیاں تک پردے کی پابند تھیں۔

زنانے میں آنے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب کہ وہ دس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے پردہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اور مشکوک چال چلن کی عورتوں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ اور تو اور باپ دادا نانا چچا اور پھپا کے سامنے بھی عورتیں سروں پر پلو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

زنانے مکان کی فضا کو مقدس رکھنے کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ کسی ترکاری والی عورت کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ لانبی لانبی ترکاریوں مثلاً لوکی' ترئی' کریلے' چچینڈے وغیرہ کو ٹکڑے ٹکرے کیے بغیر سالم حالت میں اندر لے جائے اس لیے کہ صورت کے لحاظ سے ان ترکاریوں کو فحش ترکاری خیال کیا جاتا تھا۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ملیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی

شادی پر ناچ ہو رہا تھا کہ بالا خانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبان محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق مار دی۔ صاحب خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دوڑے ہوئے محفل میں آئے۔ گولی مارنے والے خاں صاحب نے ان سے کہا ''بھائی آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی۔ مجھ سے یہ بے حیائی برداشت نہیں ہوئی میں نے گولی مار دی'' صاحب خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا بہت اچھا کیا آپ نے۔ اور فوراً اندر چلے گئے تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا بھائیوں دیکھ لیجے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان دونوں چیزیں بچا لیں۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی رات کے دو یا تین بجے کا وقت تھا لوگوں کی اکثریت خراٹے لے رہی تھ کچھ بستروں پر پڑے کروٹیں لے اور کنمنا رہے تھے اور بہت تھوڑے لوگ تلک اور گوکھلے کے گجر سن کر بیدار ہو گئے اور دھیمے سروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے اور بھارت ماتا چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھ کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ

از کجامی آید ایں آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ اس کا غرور کہہ رہا تھا کہ

یہ ہوا میرے چراغوں کو بجھا نہیں سکتی

لیکن مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پو پھٹ گئی۔ اور ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ تخت یا تختہ...... آزادی یا موت...... یا ایوان فرنگی مسمار یا تختہ دار۔

گاندھی کی آندھی نے حکومت کے اوسان اڑا دیے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے

www.pdfbooksfree.pk

سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا وہ بے کار گیا' اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آ گئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے کیا تدارک کی اجائے اس فتنہ عظیم کا؟

آخر کا حکومت نے ایک منصوبہ تیار کرلیا...... پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے لاٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں۔ اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں یعنی مہامہو پدھیاؤں اور شمس العلماؤں کو جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کرا دینے کے لیے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مل رہے تھے۔ اور بری طرح پھٹکارا گیا ان کو کہ انہوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ پکارا گیا ان تمام نوابوں رائٹ آنر ریبلوں خان بہادروں' رائے بہادروں' رئیسوں تاجروں سیٹھوں' سود خواروں' زمین داروں' جاگیرداروں' تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہریاروں کو' جن کو حکومت سانڈوں کی طرح پالے تھی...... کہ اے پٹھوؤ کانگریس کی طرف اپنی توپوں کے منہ موڑ دو' اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جیلیں بھری جانے لگیں' سولیاں کھڑی کر دی گئیں اور ہر جانب سے غلغلے بلند ہونے لگے۔ کہ خاک میں ملا کر رکھ دو انگریز بہادر کے غداروں کو یہاں تک کہ آگے چل کر جلیاں والے باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی۔ اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبان وطن کی اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق راؤ باز کشی

☆☆☆

قومی تحریک سے وابستگی

یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۱۸ء کا ہے کہ سب سے پہلے محمد مستقیم[1] نے مجھ کو گاندھی جی کی شخصیت اور تحریک آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے واسطے احمد آباد بھیجا تھا۔ شام کے وقت احمد آباد[2] پہنچا۔ ایک خیمے میں جا کر ٹھہر گیا۔ تھکا ماندہ تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ پچھلے پہر یہ خواب دیکھ ہی رہا تھا کہ میں تخت سلیماں پر بیٹھا اُڑ رہا ہوں کہ میرا خیمہ ترانوں سے گونجنے لگا آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی۔ سوا چار کا وقت تھا خیمے کا پردہ الٹ کر باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی دیکھا کہ میرے خیموں کے شہر پر' سلونی سی گلابی روشنی برس رہی ہے اور سینکڑوں زہرہ جمال گجراتی لڑکیاں پتلی پتلی کمروں میں سرخ سرخ پٹیاں باندھے اور ہاتھوں میں شمعیں اٹھائے قومی ترانے گا رہی ہیں' اور پوری دنیا چھما چھم ناچ رہی ہے

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے

میں صبح ہوتے ہی مولانا ابو الکلام آزاد کے پاس پہنچا ان کے ساتھ چائے پی انہوں نے ہنس کر کہا ملیح آباد میں آپ نے جو لطیفہ[3] آپ نے سنایا تھا آج تک اس کا مزا لے رہا ہوں۔

---

[1] وہ نسلی اعتبار سے انگریز دینی اعتبار سے مسلمان آگرے میں میرے سوتیلے ماموں کے ٹیوٹر' اور بعد کو میرے بھائی محمد یوسف خاں کے سیکرٹری کی حیثیت سے ملیح آباد گئے تھے۔ [2] اس سفر میں مشیر احمد خاں رام پوری چھوٹے دادا' اور جگنو خدمت گار میرے ساتھ تھا۔ [3] وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ایرانی ہندوستان کے آم کھا کر جب شیراز پہنچا تو اس نے وہاں جا کر آموں کی تعریف کے پل باندھ دیے تو اہل شیراز نے پوچھا کیا وہ پھل انگور سیب سے بھی اچھا ہے؟ اور اس ایرانی نے کہا کہ برادر حل بہتر تو لوگ اس

کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا مزا بتاؤ۔مزا بتانے کی چیز ہی کب ہے کہ وہ بتاتا تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے کہا آم اس قدر لذیذ تھے کہ کھانے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا علی مرتضٰی ہیں کہ زبان سے گلے میں اترتے چلے جا رہے ہیں"نعرہ صلوۃ بر محمد و آل محمد۔

مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات

مولانا آزاد کے ساتھ گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے میرے ذوق جمالیات کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مار دیا......اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے......ہندوستان کی آزادی اور گاندھی؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟ مایوسی نے مجھ کو ڈھانک لیا۔

لیکن جب مختلف مسائل پر انہوں نے زبان کھولی تو ان کی رائے کی صحت و اصابت اور ان کے لہجے کی پختگی و صلابت نے یقین دلایا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔اب ہمارے دن بھر جائیں گے۔گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحب زادی وجے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں...... اس وقت تک میں نے حسن مغموم دیکھا نہیں تھا۔میرا دل کانپ اٹھا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آ جاتی ہم سب چھپ بھیے ہیں۔آزادی کے بعد ہم بھی کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے رہیں گے

اتنے میں مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت جواہر لال نہرو آ گئے نہرو نے مجھے گلے لگا لیا۔اور مجھ کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ ان کے باپ کے مکان میں ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔اس وقت وہ بھی قیامت تھے اور میں بھی۔

اس کے بعد ہم سب پنڈال جانے کے لیے باہر آئے......اللہ اللہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا جوش وخروش وہ کوثر و گنگا کی موجیں دوش بدوش......آنکھوں میں عزائم کے وہ ہونکتے گرداب اور وہ سورماؤں کے گرجتے شباب......وہ گجراتی والنٹیر لڑکیوں کے جوشیلے گیت' گیتوں میں وہ پیت کی ریت...... وہ امنگوں کا زور وہ ترنگوں کا شور......وہ جیالوں کی سج دھج وہ نعروں کی گونج گرج......وہ تمناؤں کے طوفان......وہ لودیتے ارمان......وہ گونجتے یمین و یسار......وہ ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہندوستان کی زمین آسمانوں کی طرف ہمک رہی ہے ہر طرف ایک بجلی ہے کہ لپک رہی ہے۔فرنگی کھڑے سینے کوٹ رہے ہیں۔غرور حکومت کے شیشے چھنا چھن ٹوٹ رہے ہیں۔طوفان بن کر آرہا ہے سوراج اور ہندوستان کے سر برہنہ جاں بازوں کے قدموں کی طرف بہتا چلا آرہا ہے برطانیہ کا تاج۔

بکوئے مے کدہ یارب' سحر چہ مشغلہ بود
کہ شور شاہد و ساقی و شمع مشغلہ بود
حدیث عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست
بنالہ دف و نے در خروش و ولولہ بود
مباحثے کہ در آں حلقہ جنوں ری رفت
ورائے مدرسہ و قال و قیل مسئلہ بود

کانگریس پنڈال میں قدم رکھا تو حاضرین کے جوش وخروش کو دیکھا اور خون میرے بدن میں تین کروڑ میل فی لمحہ کی رفتار سے گردش کرنے لگا۔

اور تھوڑی دیر میں ہندو مسلم فساد کے سرکاری ایجنٹ مدن موہن مالویہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو تمام پنڈال بپھر گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں نہیں سنیں گے نہیں سنیں گے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس

رات کے وقت جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہو کر پنڈال کی پشت سے گزرنے لگا۔ (جہاں روشنی اور آمد و رفت بہت کم تھی) تو میں نے ایک والنٹیر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی نصر من اللہ و فتح قریب۔

میں نے اس نعرے کو بہت اچھا شگون سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خلافت کے پنڈال میں گیا دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی کے درمیان بڑی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مصر تھے کہ سر دست برٹش تاج کے زیر سایہ آزادی طلب کی جائے اور دوسری طرف مولانا حسرت موہانی ہیں جو آزادی کامل کا ریزرولیشن پاس کرانا چاہ رہے ہیں۔

حضرت حسرت موہانی کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے ......اور سیدھے سٹیج کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنا آزادی کامل کا ریزولوشن لے کر......اسٹیج اونچا تھا اور حسرت پستہ قد آدمی تھے۔ میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھا دیا اور جب انہوں نے آزادی کامل کا ریزولوشن پیش کیا تو پنڈال میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور میں اس ہنگامے سے اکتا کر اس والنٹیر لڑکی کے پاس پہنچ گیا جو پنڈال کی پشت پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں احمد آباد سے روانہ ہونے لگا تو چھوٹے دادا نے (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہا بھائی شبیر حسن خاں مجھ کو اجمیر شریف کی زیارت کرا دو ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ میں نے ان کی بات منظور کر لی......اجمیر سے دو چار سٹیشن پہلے ہی ڈسٹنٹ سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حسن نے مجبور کر دیا کہ اس کو پاس سے جا کر دیکھوں۔ میں گاڑی سے اتر کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اور اس قدر

مبہوت و مسحور ہو گیا کہ گاڑی رینگنے لگی چھوٹے دادا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دی۔

میں نے پکار کر کہا کہ آپ جائیں اجمیر کے ویٹنگ روم میں ٹھہر جائیں میں دوسری گاڑی سے آجاؤں گا دوسری گاڑی سے شام کے وقت میں اجمیر پہنچ گیا۔ ار جب کھانا کھا کر لیٹنے لگا تو چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کر آئیں...... میں نے کہا آپ جائیں میں خواجہ صاحب کا مہمان ہوں...... اور

میری نظم جنگل کی شاہ زادی اسی رومانی سفر کی یادگار ہے (وہ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہے اف رے سفاک وقت)

جب تک خود میزبان بلانے نہیں آئیں گے میں نہیں جاؤں گا۔ چھوٹے دادا نے مجھ کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے میں کفر بک رہا ہوں۔ اور منہ بنا کر درگاہ چلے گئے۔

حسب دستور کوئی چار بجے میری آنکھ کھلی میں نے شیروانی پہنی اور چاہا کہ جنگو کو جگا کر ٹہلنے کے لیے نکل جاؤں...... لیکن خلاف دستور نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ جوتہ اور شیروانی اتارے بغیر چارپائی میں دراز ہو کر سو گیا...... اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا کہ ایک مرد بزرگ میرے سرہانے کھڑے بڑی دل داری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں میں نے پوچھا آپ کا اسم گرامی انہوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا میرا نام ہے معین الدین اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلانے آیا ہوں شرط آپ کی پوری ہو گئی اب تو آیئے گا نا؟

میری آنکھ کھل گئی چھوٹے دادا کو جگا کر خواب سنایا ان کو حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ تو چھپے رستم نکلے...... اس کے بعد ہم دونوں درگار چلے گئے۔

اجمیر سے پلٹ کر جب لکھنو پہنچا غلغلہ سنا کہ ٹیگور آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا کیا

www.pdfbooksfree.pk

یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں؟ میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا شاید انہوں نے میرا نام پوچھا...... جب میں نے اپنا تخلص بتایا انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجنی نائیڈو نے آپ کی ایک نظم طلوع سحر کا ترجمہ سنایا تھا اور آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کی نظم لاجواب ہے اور اس کے سننے کے بعد میں ااپ کو فرزند سحر گاہ کہہ سکتا ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے سکالر تھے۔ اور دیوان حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ شانتی نکیتن آ کر کچھ روز کے لیے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی سپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کر دیں؟ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی۔ اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا......اور مطالعے کے لیے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لے لیں۔

ٹیگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے ایک طالب علم برنی صاحب کے کمرے میں مجھ کو ٹھہرادیا۔

وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی لیکن گوشت وہاں ہیں کھایا جا سکتا تھا۔ اس کی تکلیف ضرور تھی پھر بھی جگنو چوری چھپے گوشت کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

صبح کی مشی دونوں وقت کا غسل صبح و شام کی موسیقی اور گھنے درختوں کے سائے میں تدریس وہاں کی زندگی کے اجزائے لاینفک تھے۔

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں ٹیگور کس قدر وسیع القلب تھے ا سکا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایکروز کسی بوڑھے پروفیسر نے آ کر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مابین حدود سے متجاوز تعلقات کی جب شکایت کی تو انہوں نے اس سے پوچھا یہ صورت جبر یا تراضی طرفین سے پیدا ہوئی تھی؟ اور جب

اس پروفیسر نے بتایا کہ اس صورت حال میں جبر کا کوئی دخل نہیں تھا تو ٹیگور نے قہقہہ مار کر کہا تو پھر اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں قدرتی تقاضوں کے دھاروں پر بند باندھنا فطرت انسانی کے خلاف ناانصافی ہی نہیں بغاوت بھی ہے۔ آپ شاید بھول گئے لیکن مجھ کو اب تک یاد ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں نوجوان تھا۔ یہ باسن کر میں بھی لڑکیوں سے کھل کر ملنے جلنے لگا۔

ہر چند میں تصوف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا مگر ٹیگور کی شاعری اس کے باوجود مجھ کو بے حد متاثر کیا کرتی تھی اور میں ان کے ترجمے پڑھ پڑھ کر سر دھنا کرتا تھا۔ اور اب بھی میرے دل میں یہ چور ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری پر میں وجد کرنے لگتا ہوں۔ اور اس کی شاید یہ علت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بے حد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی ترجموں کی وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آب گینہ ہے اور ترجمہ گھن شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ و گل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلہ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں یہاں تک مان لینے پر تو اپنے اپ کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا؟ جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معنی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ان کے سروں پر بالکل جدید معنی کے

www.pdfbooksfree.pk

تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک پرت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صدہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں۔ جہاں مختلف النسل لفظوں کے نقطہ ہائے اتصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے۔ جہاں طوائف حرم کو رقص اور رقص کو طواف حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ جہاں اکائی کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں دو دو مل کر چار نہیں ہوتے ایک ہو جاتے ہیں...... جہاں دوش نفی پر علم اثبات لہرایا جاتا ہے۔ جہاں تلوار کی دھار سے مرہم ٹپکتا ہے۔ جہاں نشتروں کی نوک سے زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں سبو کے دستے سے کعبے کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جہاں کانٹے گنگناتے اور پھول کراہتے ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو اور آنسوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں۔ جہاں نازک حبابوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بولوں کے کٹاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں...... جہاں اولوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں...... جہاں ڈوب جانے کے بعد سفینے ابھرتے ہیں جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں۔ جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں۔ جہاں ٹکوروں سے فولاد برمایا جاتا ہے۔ جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے۔ جہاں فکر کے پروں پر ذات وصفات کو اسایا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی بوندوں میں الاؤ روشن کیے جاتے ہیں۔ جہاں آنچ کی لہروں میں زہرا کی کمر لچکتی ہے جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تتلیوں کی دھاریوں پر کرہ ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر کروڑوں صدیاں تھرکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور جہاں جزویت اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج کج کرکے آفاق کو اپنے جوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرہ رقصاں کی جانب نگاہ اٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہڈیاں

www.pdfbooksfree.pk

بو لنے لگتی ہیں۔ اس کی تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے وجود کا ڈورا چپٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پرائز کے ارباب حل وعقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن نا آشنا سو اور اے قدامت پست اندھو! اگر تم ادب کے قدر دان ہو تو شاعر کے کلام کو اسکی زبان میں پڑھو۔ خود نہیں پڑھ سکتے تو اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کر دو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمہیں آ کر یہ کون ساد ماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے۔ اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو لم کلیجے سے لگا لیتے ہو...... اے جسم بیزار و لاش نوازو لوگو...... ادب کی دیوی تمہاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ خیالات کے دھارے کبھی یوں بھی بہتے ہیں۔ اب پھر آ جایئے ٹیگور کی طرف اور چند کلمات ان کی شخصیت کے بارے میں بھی سماعت فرمالیجیے۔

جس طرح بنگالی سے نا آشنا ہونے کی بنا پر میں نے ان کی شاعری کے باب میں ایک مستند نقاد کے مانند کوئی جامع تبصرہ نہیں کر سکتا اسی طرح میں ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی بھی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے۔ اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا شرمیلا پن کم نہیں ہوتا...... جناب والا ٹیگور یا کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ہر چند بچپن سے لے کر اس پرانہ سالی تک علی الاتصال وبہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں لیکن قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ در حقیقت میں ہوں کیا

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے

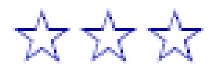
www.pdfbooksfree.pk

بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں

اور پھر میں ٹیگور کے ساتھ رہا بھی کتنا۔صرف چھ مہینے اس لیے عرض ہی کیا کر سکتا ہوں۔البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ہی وسیع المشرب' نہایت زندہ دل بےحد شریف حد سے زیادہ بےتکلف' حساس اور جمال پرست انسان تھے۔

لیکن ایک چیز ان میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی۔اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔میں نے ہمیشہ اس بات کو بری نظر سے دیکھا ہے کہ جب کوئی غیر ملکی انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا تو اس کے آنے سے پیشتر وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے عود ان کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا۔اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ وہ کسی پراسرار دیوتا کو دیکھ رہے ہیں۔

بیوی میری مفارقت برداشت نہیں کر سکیں۔شانتی نکیتن ایک تار بھیجا کہ میں اس ہفتے کے واسطے ملیح آباد چلا آؤں۔اس لیے میں نے وہاں اپنا سارا سامان اور ساری کتابیں چھوڑ کر آ گیا ملیح آباد آ گیا اور بیوی نے پھر اسی بری طرح گھیرا کہ میں دوبارہ شانتی نکیتن جا ہی نہ سکا۔اور وہ میرا تمام سامان پھر مجھے کبھی نہیں ملا۔



ایک خواب

یہ سنہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت جب میں قصر سحر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامن کی پھولی ہوئی شفق کی رنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا دن رات تمہیں انہیں باتوں کی دھن لگی رہتی ہے۔ بھولے سے بھی اپنے گاؤں گراؤں کی خبر نہیں لیتے...... خواجہ حون کو تم نے ضلع دار بنایا ہے اور وہ ایسا دند مچائے ہوئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں تمہاری رعایا کو۔ ہر طرف مادھولوٹ مچی ہوئی ہے گاؤں گراؤں کا نہ حساب ہے نہ کتاب۔ اور جب تم حساب مانگتے ہو تو وہ باتوں کے طوطے اڑانے لگتے ہیں' اور زبانی حساب بتا کر الٹے کچھ روپے تمہارے ہی ذمے نکال دیتے ہیں۔ تم کو دس ہزار دے کر بیس ہزار اپنے ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ کاغذ کی ناؤ آخر لچے گی کب تک؟ میں نے کہا اچھا اشرف جہاں اب میں خود ہی کام کروں گا۔ انہوں نے تنک کر کہا ارے تم اس قابل ہوتے تو پھر یہ رونا کیوں ہوتا۔ تم تو اپنی جائے داد کا ایک بڑا حصہ اور ڈیڑھ لاکھ روپے نقد آنکھیں بند کر کے اپنے بڑے بھیا کی نذر کر چکے ہو۔ اور جو بچا کھچا رہ گیا ہے اس کو بھی کسی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔ ڈھاک کے تین پات رہ جائیں گے...... نہ لڑکی کا بیاہ ہو سکے گا نہ لڑکے کی پڑھائی۔

میں نے کہا اشرف جہاں اتنا دل چھوٹا نہ کرو میرے پاس جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی خدا کے فضل سے اس قدر ہے کہ ہم تم بڑے آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں انہوں نے بگڑ کر کہا سدا اپنے ہی بارے میں سوچتے ہو۔ ارے یہ بھی تو سوچو کہ ہمارے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے بچے اپنے باپ دادا کا بھرم قائم رکھ سکیں گے؟

بیوی کی باتیں سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ دل میں کہا کہتی تو ٹھیک ہیں۔ اور وہ پہلا دن تھا کہ عقل معاش میرے سینے میں کنمنائی اور سوچنے لگا۔ اپنی آمدنی اور اپنے

جائے داد کیوں کر بڑھاؤں اور جب خاک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دل اداس ہو گیا اور چہرے پر بڑی بے کسی برسنے لگی۔

بیوی نے مجھے اداس دیکھا ان کے دل پر چھری چل گئی۔اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں تم گھبراؤ نہیں......تم جانتے ہو کہ باوا کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کا کتنا شوق ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مامائیں ہیں اصیلیں ہیں باورچنیں ہیں۔مگر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی چیز خود نہیں پکا لیتے 'انہیں چین نہیں پڑتا انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے اس قدر اچھا پکانا آ گیا ہے کہ میں لکھنو میں کھانے کا ایک ہوٹل کھول لوں گی اور اس سے اتنا پیدا کر کے دکھا دوں گی کہ پشتوں تک کاٹے نہیں کٹے گا۔ ہمارے تمہارے بزرگ خالی ایک تلوار لے کر یہاں آئے تھے اور اس تلوار کے زور سے اتنے بڑے محل کھڑے کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوا دیا اور میں اللہ نے چاہا تو کف گیر سے سونا اگلوا دوں گی۔

بیوی نے ڈھارس بندھائی......میرا دل اور بھی مغموم ہو گیا۔اور دوسرے کمرے میں آ کر بچوں کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں خدا جانے یکا یک کیا لہر آئی کہ میں نعت کہنے لگا۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشہ خوف بن گیا ' رقص بتان آذری

نعت کہہ کر کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو کر لحاف اوڑھ لیا۔نعت سر میں گونجنے لگی بیوی کے خراٹوں نے میرے پپوٹے بوجھل کر دیے۔فاران کی ہواؤں نے لوری دی اور دو چار کروٹیں بدل کر سو گیا

سو گیا تو پچھلے پہر ایک انوکھا خواب دیکھا......سچا خواب یا میرے تصورات کا گرداب میں کیا فیصلہ کروں یہ دنیا بڑی حیرت ناک اور پراسرار ہے۔

ہاں تو یہ خواب دیکھا کہ ایک تابناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے

کھڑے ہوئے ہیں اور میں چاند ان کا طواف کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی آنکھوں میں خیرگی آئی بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا۔ پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا میں پہچان کر ان کے قدموں میں گر گیا اور منہ ملنے لگا ان کے نعلین پر۔ انہوں نے ہاتھوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھا لیا۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ وہ میرے رسول ہیں جنہوں نے اپنا دیدار لڑکپن میں[1] مجھے دکھایا تھا۔ یہ سن کر وہ مسکرائے اور فرمایا ہاں میں وہی تمہارے پہلے خواب کا محمدؐ ہوں۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں پر گر پڑا اور ان کی نعلین سے منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

میرے محمدؐ نے فرمایا اٹھ کھڑے ہو۔ میں ہات باندھ کر ان کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا تم ہنسنے کے لیے بنے ہو روتے کیوں ہو۔ اور یہ کہتے ہی میری پائنتی کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ میں نے ادھر نگاہ اٹھائی وت یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہے میں نے کہا یا رسول اللہ یہ کون ہے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا...... یہ نظام دکن ہے تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے۔

یہ سن کر میرا دل یکا یک اس طرح دھڑکنے لگا کہ اس کے ضربات پیہم سے میری آنکھ کھل گئی اور روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

---

[1] ایک اسی قبیلے کا خواب پہلے بھی دیکھ چکا تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

جی بھر کے رو چکا تو بستر سے اٹھا منہ ہات دھونے لگا۔ منہ پر دو چار چھپکے زور زور سے مارے تو حواس بجا ہوئے۔ اور حواس بجا ہوتے ہی ایک بے پایاں حیرت نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا۔ اور سر پکڑ کر یہ سوچنے لگا کہ میں نے ایسی اوسر زمین پر مکان بنوایا ہے جہاں دور دور تک کوئی باغ نہیں ہے اور ابھی تک میں نے اپنے مکان

کے اردگرد چمن بندی بھی نہیں کی ہے۔ نہ گھانس ہی لگائی ہے نہ خوشبو دار پودے ہی نصب کیے ہیں! اورتو اورابھی تک اس مکان کو پھولوں کے گملوں سے بھی نہیں سجایا ہے اوراس کے باوجود ایک نرالی خوشبو میرا احاطہ کیے ہوئے ہے......اور خوشبو بھی ایسی کہ عطر اور پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔آخر یہ طلسم کیا ہے؟ کیا یہ خواب کے اثر کا جادو ہے یا سچ مچ کی خوشبو ہے۔یہ خیال کر کے میں نے بیوی کو جگایا کہ دیکھوں وہ بھی خوش بو محسوس کرتی ہیں یا نہیں۔

بیوی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ پوچھا ٹہلنے جارہے ہو؟ میں نے کہا اور کیا نوکری ا س ایپات کے ہیں کہ جلدی سے گلوریاں بنادو بیوی نے اٹھ کر کلیاں کیں پاندان کھولا اور جیسی ہی انہوں نے چونے کی چمچی اٹھائی۔بگڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا سچ سچ بتاؤ یہ رات کوسوتا چھوڑ کر مجھے کہاں چلے گئے تھے۔کہ ایسے مہکے مہکائے اور پھولوں میں بسے چلے آرہے ہو۔میں نے کہا اللہ اللہ کرو اشرف جہاں اس چٹیل میدان میں کہاں جاؤں گا۔لکھنو ہوتا تو بات بھی تھی۔اور میں لکھنو میں بھی کبھی ایسا نہیں کرتا۔کہنے لگیں اللہ ڈھتائی جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے جارہے ہو تمہارے پاس سے ایسی خوشبو کی لپٹیں چلی آرہی ہیں کہ میں تو تمہارے کپڑوں میں عطر نہیں لگایا تھا۔پھر یہ نگوری خوش بو کیوں آرہی ہے۔یہ کس غیبانی کی خاک میں ملی سیج کی خوشبو ہے؟

میں نے کہا تمہیں جگا کر تو میں گناہ گار بن گیا......آؤ اور سونگھ کر دیکھ لو میرے کپڑوں کو اگر میرے کپڑوں میں خوش بو ہو تو میں گناہ گار ٹھہر جاؤں گا۔

لے ظہور علی خان کی کہانی کا ایک بار بار دہرایا ہوا فقرہ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

وہ میرے کپڑے سونگھنے کو اٹھیں اور سونگھ کر کہا تمہارے کپڑوں سے برابر خوش بو آرہی ہے۔اب بھی انکار کرو گے......؟ میں نے کہا دوسرے کمرے میں چل کر میرے

کپڑے سونگھ لوتب ٹھیک ٹھیک پتا چل جائے گاتم کو......انہوں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا چلی تو چلوں دوسرے کمرے میں پھر یہ سارا ماجرا بیان کر دوں گا...... دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے خوب زور زور سے میرے کپڑے سونگھے بار بار سونگھے اور کہنے لگیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ وہاں تمہارے کپڑوں میں خوشبو تھی یہاں بالکل نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی جنتر منتر سیکھ لیا ہے؟ اس کے بعد میں نے ان سے اپنا سارا خواب بیان کر کے کہا کہ یہ اس خواب کا کرشمہ ہے۔ انہوں نے پہلے تو اپنے منہ پر تھپڑ مار مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اس خوشبو کو نگوڑی کہا تھا اور پھر مجھ سے کہا۔ تم کو بڑی بشارت ہوئی ہے۔ میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں...... میں نے ان سے کہا تم کچھ نہ بولنا میں گلابو ا کو اوپر بلاتا ہوں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ میں نے گلابو کو آواز دی۔ وہ اوپر آئی تو میں نے کہا حقہ بھر لاؤ۔ وہ تنبا کو نکالنے کے لیے الماری کی طرف بڑھی۔ اور دو قدم چل کر اس نے ایک لانبی سانس لے کر کہا بی بی یہ کھس بو (خوشبو) کیسی آ رہی ہے؟ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا ہوبھونچکا ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں نیچے سے چھوٹے دادا کی آواز آئی...... بھائی شبیر حسن خاں آج ٹہلنے کے لیے نہیں چلیے گا۔ میں نے کہا اوپر آ جایئے حقے کے دو ایک کش لے کر چلیں گے۔ چھوٹے دادا حسب عادت قہقہے مارتے ہوئے اوپر آئے اور ٹوپی تڑ سے تخت پر پھینک دی اور کان کھڑے کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگے اور پوچھا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی آج تم نے یہ کیسا عطر لگایا ہے کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے۔ ایک پھریری ہمیں بھی دو۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے تک وہ خوشبو میرے کمرے کے اندر مچلتی رہی۔

وہ خواب اور خوش بو کا امتزاج آج تک ایک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جس کو میں قطعیت کے ساتھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب اور اس کے بعد کی وہ خوش بو

www.pdfbooksfree.pk

میرے آبائی عقائد کی ایک محسوس کیفیت یا میرے شاعرانہ تصورات کی ایک حیرت ناک خلاقی ہو۔ایسی خلاقی جو حواس کو فریب دے سکتی ہے۔یا جناب والا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے اس ابتدائی دور کے تمام قیاسات اور اب تک کے تمام سائنسی انکشافات سے قطعاً مختلف کوئی اور ہی چیز ہو...... بابا اس عالم امکان میں وہ کیا ہے جو ہو نہیں سکتا۔ ہماری اس دنیا کا یہ ہوسکنا پن اور اس کی یہ امکانیت ایک ایسا بے کراں میدان ہے جس کی حد بندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہر کس نہ شناسندہ راز است وگرنہ

ایں ہا‘ ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است



سریر امارت سے حصیر ملازمت کی جانب

اس خواب کے بعد میری ضعیف الاعتقاد بیوی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم کو رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ دکھن جانے کا جاؤ اور جلدی کرو۔

بیوی بے چاری کو تو میں نے کھٹ سے ضعیف الاعتقاد کہہ دیا...... لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈالکر یہ بات نہیں سوچی کہ اس وقت بھی کون سا بقراط اعظم تھا یہ سچ ہے کہ میں تقشّف کو ترک کر چکا تھا۔ اور انسان کی دردمندی کو دیکھ کر خدا کی شفقت و رافت سے بھی بدگمان ہو چکا تھا۔ لیکن ان دو برجوں کے گر جانے سے ہوتا کیا ہے۔ دین کی پوری عمارت تو مسمار ہو کر نہیں رہ گئی تھی...... اس لیے میں بھی اس بشارت کے امتحان کی خاطر حیدر آباد جانا چاہتا تھا۔ یعنی بیوی ہی کے دل میں نہیں میرے دل میں بھی چور تھا۔ جو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفر دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدر آباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔[1]

---

[1] حیدر آباد پہنچ کر میں نے تیرے لیے کی سرخی سے ایک نظم کہی تھی جس کے دو تین شعر پڑھ کر آپ کو میرے اس رومان کا پتا چل جائے گا۔

دیکھ کر کیوں جی رہا ہوں دل ربا تیرے لیے
ہر نفس ہے اک حدیث کربلا تیرے لیے
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنو کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے

(مطبوعہ نقش و نگار سنہ ۱۹۳۶ء)

www.pdfbooksfree.pk

ہر چند حیدر آباد جانے کی بات میرے دل میں ٹھن چکی تھی مگر سوچتا تھا کہ وہاں مجھے پوچھے گا کون۔ نہ ایم اے ہوں نہ صدر الافضل لے دے کے میری سرف ایک کتاب روح ادب چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ مگر ایک ٹڑوں ٹوں کتاب سے ہوتا ہی کیا ہے...... ایک کتاب...... ایک کتاب کی اشاعت ومقبولیت سے کہیں شخصیت بنا کرتی ہے۔ شخصیت تو بنتی ہے ایک جگ بیت جانے سے اور سالہا سال خون جگر تھوکنے کے بعد۔ اور پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ میرا مزاج بہت ہی نازک نوکری کا ننگ برداشت ہوگا کیوں کر۔ اور اقربا اور احباب بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ اس خبط سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر ایک مہینے کے اندر نظام دکن کو گالیاں دے کر واپس نہ آ جاؤ تو جو چور کی سزا ہے وہ ہماری یہ تمام باتیں سچائی کے عنصر سے خالی نہیں تھیں...... لیکن میری بیوی اور خود میرا دل حکم دے رہا تھا کہ حیدر آباد جائے بغیر دم نہ لے۔

الغرض عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین صاحب سلیم سے خط و کتابت کر کے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے نام حضرت اقبال مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت اکبر الہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی سے سفارشی خط حاصل کر کے میں سنہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد[1] پہنچ گیا۔

---

[1] میرا رخت سفر جب گھر سے باہر جانے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ عزت آباد کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اور میری ماں نے جب یہ بین کیا کہ اے میرے قبر میں سونے والے سرتاج آؤ دیکھو کہ تمہارا نازوں پر پلا بچہ نوکری کرنے باہر جا رہا ہے۔ تو گھر بھر میں پٹس پڑ گئی۔ اور جب آہ و فغاں کے شور میں سب سے گلے مل مل کر میں رخصت ہونے لگا اور آداب خاندان کے جبر سے بیوی کو گلے نہ لگا سکا تو ان کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھ سے کہا ہم سے گلے نہیں ملے۔ میں نے اداسی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں اور جب

www.pdfbooksfree.pk

اپنے دھڑکتے دل پر قدم رکھتا باہر آیا تو تمام نوکر چاکر بھی رونے لگے۔اور جب ملیح آباد سے ریل چلی۔باپ کی رندھی ہوئی آواز آئی اے میرے لاڈلے بیٹے اللہ تیرا نگاہ بان۔ہائے کیا کروں۔موت نے بیکس کر دیا ہے تجھ کو روک نہیں سکتا۔اور اسی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کے باغوں نے جھک جھک کر مجھے سلام کیا۔اور سر زمین وطن نے گریبان پھاڑ کر خدا حافظ و ناصر کا نعرہ لگایا۔اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا اور حزیں کا یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

بنو مید حزیں از کوئے او بار سفر بستم
خدا صبرے کند روزی دل امید دارم را

(میں نے ایک اور نظم اسی زمانے میں الوداع کے نام سے کہی تھی جو نقش و نگار میں موجود ہے اسے پڑھ کر میری اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔)

1 حیدر آباد میں سب سے پہلے، مہاراجہ کشن پرشاد سے ملا مجھے دیکھتے ہی، انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کا مجموعہ کلام "روح ادب" دیکھ کر میں نے تمنا کی تھی کہ اللہ اس درویش صفت رئیس زادے سے ملائے، سو میری وہ تمنا آج پوری ہو گئی۔میں نے وہ سفارشی خط پیش کیے، انہیں پڑھ کر، وہ کچھ سوچنے لگے، اور تخلیئے میں لے جا کر، مجھ سے کہا جوش صاحب یہ بات اپنے تک رکھئے گا کہ میں آج کل سرکار کا معتوب ہو چکا ہوں، اگر آپ میرے زمانے میں تشریف لاتے تو میں اسی دن آپ کا انتظام کر دیتا۔بہر حال میں فنانس منسٹر اکبر حیدری کے نام ابھی خط لکھے دیتا ہوں، وہ مجھے بہت مانتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے یہ کہتے ہی کوئی تین صفحوں کا لمبا چوڑا خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور فون کر کے اسی وقت انہوں نے حیدری سے میری زبردست سفارش بھی کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ، سر راس مسعود کو بھی فون پر ہدایت کر دی کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر، حیدری سے ملا دیں راس مسعود مجھے حیدری کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ ہماری قوم کے ایک ابھرتے ہوئے

شاعر ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں، آپ کے دوست حضرت اقبال نے بھی ان کی بڑی زبردست سفارش کی ہے، اور مہاراجہ نے بھی یہ خط آپ کو بھیجا ہے۔۔۔۔۔ حیدری صاحب نے خط پڑھ کر کہا ان کے متعلق مہاراجہ مجھ کو فون بھی کر چکے ہیں اور پھر میری طرف منہ کر کے حیدری صاحب نے کہا آپ آئندہ جمعرات کے دن، صبح دس بجے میرے پاس آ جایئے گا میں آپ کو سرکار سے ملا دوں گا۔2ے

1ے حسن اتفاق سے اس وقت مہاراجہ کے دربار میں سید محمد حسین صاحب، صدر محاسب، نواب بہادر جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب قادر نواز جنگ، نواب مہدی یار جنگ، اور سر امین جنگ موجود تھے جو آگے چل کر میرے بہت گہرے دوست بن گئے اور میرے بہت کام آئے۔

2ے ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدہ سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی، مگر وہ جو کہاوت ہے کہ بکری نے دودھ دیا، سو وہ بھی مینگنی بھرا، مجھے ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ ''میں'' کے لفظ کو ''بکسرہ میم'' ادا کر کے بکریوں کی طرح ''میں'' ''میں'' کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ نے میری کشو وکار کی صورت نکالی تو مگر ایک بکری کی معرفت خوب جانتا ہوں کہ درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ برے، ان کا اچھا یا برا لگنا مبنی ہوتا ہے کانوں کی موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن سے جس

ابھی جمعرات میں دو دن باقی تھے کہ حیدری صاحب نے مجھے بلا بھیجا راس مسعود بھی وہاں موجود تھے نہایت نفیس چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے مجھ کو ان قطعات کا ایک بنڈل دیا، جو شاعروں نے ان کے خطاب ''سر'' کی مبارکباد کے طور پر کہہ کر، ان کی خدمت میں پیش کئے تھے میں وہ قطعات پڑھ چکا تو حیدری نے کہا جوش صاحب آپ بھی ایک ''کتا'' قطعہ کر دیں۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک طرف تو لفظ ''قطعہ'' کو ''کتا'' سن کر میں بھنا گیا، اور دوسری طرف چونکہ میں فرنگی حکومت سے بیزار تھا میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔۔۔۔

حیدری صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ یکا یک اس قدر سیریس (Serious) سنجیدہ کیوں ہو گئے میں نے کہا آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ فرنگی جس شخص کو خطاب دیتا ہے اس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے یہ سن کر راس مسعود اور حیدری چراغ پا ہو کر کھڑے ہو گئے، مجھ کو تنہا چھوڑ کر، دوسرے کمرے میں چلے گئے، اور میں اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ 1

جب یہ بات سنی تو نواب مہدی یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کو اپنے

طور پر سنتے آتے ہیں، جب وہی لفظ بدلے ہوئے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود آج بھی کوئی شخص لفظ ''ادب'' کی دال کو ساکن کر کے ''ادب'' یا گاڑی کو ''گڈی'' کہتا ہے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھا کر دے ماروں یہ بات فقط لہجوں تک محدود نہیں عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہن انسانی کے موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں۔

یہ دنیا ذہن کی بازی گری معلوم ہوتی ہے
جہاں جس شے کو جو سمجھو وہی معلوم ہوتی ہے!!

1 ذرا دیکھئے تو میری دانائی، ارے ملازمت کی خواست گاری اور اس پر یہ برہنہ گفتاری سچ کہا تھا خدا بخشے محمد غنی خاں نے کہ بھائی شبیر حسن خاں، شعر، وہر، میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم مہاتماتم کے چوتیے ہو۔

والد نواب عماد الملک کے پاس لے جانا چاہتا ہوں میرے والد، سفارش کے

معاملے میں اس قدر سخت ہیں کہ جب میں کیمبرج سے امتحان پاس کر کے آیا تھا تو انہوں نے میری سفارش تک سے انکار فرما دیا تھا۔بہر حال میں آپ کوان کے پاس لئے چلتا ہوں، ہر چند، مشکل ہے، دو فیصد امید ہے لیکن اگر انہوں نے سفارش کر دی تو حیدر صاحب کی لاکھ سفارشوں پر بھاری ہو گی۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اسی پچاسی برس کے مرد بزرگ، برآمدے کی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے پر علم وفضل اور مضبوط کردار کا جلال برس رہا ہے مہدی صاحب نے میرا تعارف کیا؟ اعتناء کی ایک دھاری بھی ان کے چہرے پر نہیں دوڑی، میرے دل پر زبردست چوٹ لگی، لیکن پی گیا۔۔۔۔میری اہمیت ظاہر کرنے کے لئے، مہدی صاحب نے کہا ابا یہ جوش صاحب حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں یہ سن کر وہ چونک پڑے اور کہنے لگے شالی ہندوستان کا وہ ایسا کون باشندہ ہے جوان کے دادا کے نام سے واقف نہ ہو لیکن ان کی ذات میں بھی کوئی جوہر ہے؟ مہدی صاحب نے کہا یہ بہت اچھے شاعر ہیں، آپ اجازت دیں تو جوش صاحب کچھ سنائیں۔

انہوں نے کہا اچھا۔۔۔مہدی صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب ارشاد

اور جب میں نے اپنے ایک مسدس کے تین چار بند سنائے۔

تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے اس نوجوان میں تو انیس کی روح بول رہی ہے، یہ عمر، اور اس قدر پختگی۔۔۔۔۔میں تو سمجھتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح یہ بھی آئیں بائیں شائیں کہتے ہوں گے مگر ان کے کلام میں تو روانی بھی ہے، اور معانی بھی مہدی خط لکھنے کا کاغذ لاؤ، مہدی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، جلدی سے، اندر جا کر کاغذ وقلم لے آئے آرام کرسی کے دونوں ہتوں پر، ایک تختہ رکھ دیا۔۔۔نواب عماد الملک نے، پورے ایک صفحے کا سفارشی خط لکھا، اور کہا کہ مہدی تم نے یہ خط سر امین جنگ کے حوالے کر کے، میری طرف سے کہہ دینا کہ سرکار کے روبرو پیش کر دیں۔

نواب عماد الملک کے مکان سے گیسٹ ہاؤس آیا ''چھوٹے دادا1'' نے تار دیا تار کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ میری بیوی پرسوں شام کی گاڑی سے حیدر آباد آ رہی ہیں میں حیران ہو گیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے ملازمت تو درکنار، میں نے ابھی تک تو نظام کو دیکھا بھی نہیں ہے اور بیوی ہیں کہ چلی آ رہی ہیں۔

لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا تیسرے دن میری بیوی، دونوں بچوں اور اپنے ماموں کو ساتھ لئے حیدر آباد آ گئیں اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی، آب دیدہ ہو کر کہنے لگیں کہ میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے دونوں بچے تمہارے حوالے کر دوں، اور خود اپنی ہیرے کی انگوٹھی نگل کر کھالوں اور اس دنیا سے سدھار جاؤں یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے، اور گھبرا کر پوچھا اشرف جہاں خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے انہوں نے روتے ہوئے کہا ماموں کو بلا کر پوچھ لو۔

ماموں نے آ کر جیب سے ایک تار نکالا میں نے تار پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اللہ کے بندے نے ان کے پاس یہ تار بھیجا تھا کہ آپ کے شوہر عقد ثانی کر رہے ہیں فوراً حیدر آباد پہنچ جائیے میں نے کہا اشرف جہاں یہ تار بالکل جھوٹا ہے بیوی نے کہا کہ اگر یہ تار جھوٹا اور تم سچے ہو تو اپنے بچوں کے بازو پکڑ کر قسم کھالو کہ تم دوسرا نکاح نہیں کر رہے تھے اور جب میں نے اپنے بچوں کے دونوں بازو پکڑ کر بڑے ولولے کے ساتھ قسم کھالی تو ان کا چہرہ بحال ہو گیا۔

اتنے میں چھوٹے دادا، ہنستے ہوئے آئے اور میری بیوی کے دل پر اپنی خیر خواہی کا سکہ بٹھانے کی خاطر، انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی یہ تار میں نے دیا تھا۔۔۔ میں نے، برا مان کر کہا چھوٹے دادا آپ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا انہوں نے کہا میرے بھائی برا نہ مانو، مجھ سے یہ کب ہو سکتا تھا کہ تمہارا گھر بگڑے اور میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہوں میں نے کہا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میرا گھر بگڑ کب رہا تھا۔ انہوں نے کہا وہ شوق والی بات یاد کرو جو ایک لڑکی کا پیام لے کر تمہارے پاس

1میں انہیں اور رمضانی باورچی کو، ملیح آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

آئے تھے بیوی نے بگڑ کر مجھے دیکھا اور کہا لو اب تو بات کھل گئی، ہائے تم کیسے باپ ہو کہ تم نے اپنے دونوں بچوں کی بانہیں پکڑ کر جھوٹی قسم کھالی۔

میں نے جھلا کر کہا اپنے بچوں کی جھوٹی قسم کھانے والے قصائی پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، اب پوری بات مجھ سے سن لو یہاں ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کی صاحبزادی نے خدا جانے مجھے کیوں کر دیکھ لیا کہ مجھ پر عاشق ہو گئیں، اپنی خادمہ کے ہاتھ خط بھیجا اور لکھا کہ میری ماں نے میرے باپ کو اس بات پر تیار کر لیا ہے کہ وہ آپ سے میری شادی کر دیں، کل ابا کے مصاحب شوق صاحب آئیں گے آپ کے پاس چنانچہ اس کے دوسرے روز ہی شوق صاحب نے ان جاگیردار صاحب کا نام لے کر مجھ سے آ کر یہ کہا کہ اگر آپ ان کی صاحبزادی سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کے والد ماجد کو اس بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کر دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپ کے رہنے کے لئے ایک کوٹھی اور ایک کار کا انتظام کر دیا جائے گا، آپ کے تمام خانگی مصارف جاگیر سے ادا کئے جائیں گے، اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی آپ کو دیا جائے گا۔ بیوی نے بری گھبراہٹ کے ساتھ بات کاٹ کر پوچھا اور تم نے کیا جواب دیا میں نے کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ شوق صاحب، میری شادی ہو چکی ہے میں دو بچوں کا باپ ہوں "ہم میاں بیوی کو ایک دوسرے سے بے حد محبت ہے اور میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ان پر سوت لاؤں یہ کہہ کر میں نے چھوٹے دادا سے کہا کیوں صاحب میں نے آپ سے یہی بات کہی تھی نا یا کچھ اور؟" چھوٹے دادا نے کہا نہیں یہی بات کہی تھی میں نے کہا جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں سرا سر انکار کر چکا ہوں تو پھر آپ نے میری بیوی کو تار کیوں دے دیا۔۔۔۔۔ چھوٹے دادا نے کہا میرے بھائی آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی، میں نے سوچا کہ تمہاری بیوی کو بلا

www.pdfbooksfree.pk

کرتم پر مسلط کردوں۔

یہ بات سن کرمیری بیوی کے دل کا کانٹا نکل گیا کہنےلگیں اس بھڑو ے شوق کر اب کبھی اپنے گھر نہ آنے دینا علی کی تیغ ٹوٹے اس نگوڑے پروہ میرا لاکھ کا گھر خاک کرنے آیا تھا موا دوسرے ہی دن بیوی نے مٹھائی منگا کر مولا مشکل کشا کی نیاز دلائی اور گھر کا مطلع صاف ہو گیا۔

ایک روز میں اس بات پر غور کررہا تھا کہ نواب عمادالملک کے خط کو بھی تقریباً ایک ماہ گزر چکا ہے، لیکن نظام نے اب تک مجھے طلب نہیں کیا ہے شاید وہ تیر بھی خطا کر گیا کہ پل بھر میں غم گیں ہونے کے عوض میرے دماغ میں ایک مسخر گی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے کھٹ سے، ایک بازاری سا مطلع کہہ کر پیش کر دیا۔ اس مطلع پر مجھے، بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں ہنستا ہوا بیوی کے پاس آیا، لو اشرف جہاں، ایک مطلع سنانے اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اس مطلع کے بعد میرے دل سے برابر یہ آواز آ رہی ہے کہ یا تو نظام آج ہی مجھ کو حیدر آباد سے نکال دیں گے یا آج ہی اپنے پاس بلا لیں گے ان دو باتوں کے سوا کوئی تیسری بات ہو ہی نہیں سکتی بیوی نے مسکرا کر کہا مجھ پر تمہاری درویشی کا سکہ نہیں بیٹھ سکتا تم آئے دن تو "زلف پیچاں" اور "روئے خوباں" بکتے رہتے ہو اور میرے سامنے آئے ہو ولی اللہ بن کر میں نے کہا تم میرے مرتبے سے واقف نہیں حشر کے میدان میں جب تم پوچھو گی کہ ارے یہ کون ہے کہ اللہ میاں کے قدموں کے پاس بیٹھا ہوا گڑ گڑ حقہ پی رہا ہے تو فرشتے جواب دیں گے کہ یہ اصلی حضرت جوش صاحب قبلہ ہیں اور تم بھڑ بھڑا کر میرے قدموں پر گر پڑو گی وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور خوب ہنس چکیں تو کہا اچھا وہ شعر تو سناؤ میں نے کہا مطلع کو شعر کہہ رہی ہو، ماشاء اللہ، انہوں نے کہا زیادہ لیاقت نہ بگھارو، اور مطلع سناؤ میں نے کہا لو سنو

دشمن ہوں، اس زمین پہ، شادہ و زیر کا
لونڈا ہوں، آسمان پہ، جناب امیر کا

مطلع سنتے ہی تو بہ تو بہ کر کے انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا، کہنے لگیں تم کھڑے دوزخ میں جاؤ گے تو بہ،توبہ، ارے کہاں جناب امیر، اور کہاں یہ باتیں اور پٹھان ہو کر اپنے کو لونڈا کہتے ہوئے تمہیں شرم بھی نہیں آئی میں نے کہا ارے خاک سمجھتی ہو، تم شاعری کی زبان کو۔۔۔۔اس شعرے میں ''لونڈے'' کے معنی ہیں ''روحانی چیلا'' اور ''چھینا'' تمہیں کیا خبر کہ ہم شعرائے کرام، الفاظ کے معنی یوں بدل دیتے ہیں کہ لغات کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

بیوی نے کہا بھاڑ میں جائے ایسا مسخرہ پن کہ اسی آن، دروازے پر موٹر آ گئی زن زن اور برآمدے میں تالی 1 بجنے لگی ٹھن ٹھن

باہر آیا تو دیکھا نواب قادر نواز جنگ کھڑے ہیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا مبارک ہو، جوش صاحب سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے ابھی تیار ہو جائیے۔

میں اندر گیا اور بیوی کے سامنے جھک کر کہا آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحب کیا میں نے ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ یا تو نظام مجھے آج ہی نکال دیں گے، یا آج ہی بلا لیں گے؟ دیکھا جو اس درویش نے کہا تھا، وہی ہوا نا؟ نظام نے مجھے بلا بھیجا ہے بیوی نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، کہا بہت شیخی نہ بگھارو، جلدی کپڑے پہنو اور جاؤ۔

کنگ 2 کوٹھی کی، کائی لگی، کالی کالی دیواروں اور اس کے شاہانہ پھاٹک کے بوسیدہ پردے پر عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالتا اور بے پایاں دولت کے پیدا کردہ بے کران افلاس پر غور کرتا جب محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشا دیکھا کہ وہاں سبزے کا فرش ہے، نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سرو چنار۔۔۔۔۔سوکھا، روڑھا صحن ہے اور اس بجھے بجھے صحن میں، ہزاروں چیزیں، نہایت بے قاعدگی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین سیڑھیوں کا برآمدہ ہے برآمدے میں ایک بے

1 اہل حیدرآباد تالی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں

www.pdfbooksfree.pk

نظام کے محل کا نام اصلی میں کوٹھی تھی کسی کمال خاں کی جس نے چھچھورے پن سے کام لے کر اس کوٹھی کے تمام دروازوں وغیرہ پر K, K یعنی کمال خاں کھدوا دیا تھا جب نظام نے قبضہ کر لیا تو اس کے کے حروف کو "کنگ کوٹھی" میں تبدیل کر دیا گیا وہ کمال خان دروازہ پر ک خ نہیں کھدوا سکتا تھا؟ لیکن اس نے اپنے حروف ہجا سے گریز کر کے انگریزی کے حروف کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس کو "صاحب بہادر" سمجھا جائے ڈوب مرا اے چڑیا کے غلام!

پالش، چھوٹی سی کرسی پر، ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا دبلا پتلا آدمی میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے، اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور اس کی بے پھندنے کی بوسیدہ تر کی ٹوپی کے کناروں پر میل کی ایک چوڑی تہ جمی ہوئی ہے اور اس کے سامنے تیس چالیس عمائد شہر اور اعیان ریاست، دستار و بکلوس لگائے، اونگھی مرغابیوں کے مانند، دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سے چیڑ کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں۔

میری نذر قبول کر کے انہوں نے اپنے دست بستہ حاضرین سے کہا، انہیں پہچانتے ہو عماد الملک نے لکھا ہے کہ یہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں اگر اودھ کی سلطنت برباد نہ ہو جاتی، تو یہ دکن کیوں آتے آدھے مسلمانوں کو اودھ سنبھال لیتا، آدھے مسلمانوں کو دکن۔

اس کے بعد نظام نے اپنے استاد، حضرت جلیل مانک پوری کو مخاطب کر کے کہا، استاد ان کے خاندان سے تم تو خوب واقف ہو گے استاد نے ہاتھ جوڑ کر کہا خداوند ان کے والد نواب بشیر احمد خاں نے اس وقت میری امداد کی تھی جب کہ میرے استاد، حضرت امیر مینائی کے انتقال کے بعد کوئی میرا سرپرست باقی نہیں رہا تھا جلیل صاحب کی اس شرافت پر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں نظام نے حضرت جلیل کا یہ اعتراف احسان سن کر اور میری آنکھوں کی نیم نا کی کو دیکھ کر کہا استاد آپ، اور جوش

www.pdfbooksfree.pk

دونوں بڑے شریف آدمی ہیں آپ نے سب کے سامنے یہ بے بے جھجک کہ دی کہ ان کے والد نے تمہاری مدد کی تھی اور تمہارا یہ اعتراف سن کر جوش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مجھ کو تم دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر نظام نے کہا عماد الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود تمہاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے اپنی کوئی چیز سناؤ۔

میں نے مطلع سنایا

1 استاد تک کو آپ نہیں تم سے مخاطب کیا جاتا تھا دولت جو چاہے کرے کون بول سکتا ہے

2 پائے اتحاد اور شاگرد سے بات جوڑ کر بات کرے حکومت کی ریت کیا کہنا تیری شرافت کا۔

ملا جو موقع، تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا

پڑھوں گا، رحمت کا وہ قصیدہ، کہ ہنس پڑیگا عتاب تیرا

نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا، زیر لب ''واہ'' کہا اور جب میں نے یہ شعر پڑھا:

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا، عرش کانپ اٹھتا

اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زور شباب تیرا

تو نظام نے، جھوم کر، کہا بہت اچھا بہت اچھا بہت اچھا اور تمام حاضرین زور زور سے داد دینے لگے اور میری غزل کے اختتام پر نظام نے کہا استاد جلیل ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ بوڑھے ہو کر یہ تمہاری سری 1 کے ہو جائیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا جوش تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہا میری شادی ہو چکی ہے اور میری بیوی یہاں آ بھی چکی ہے۔۔۔۔۔ ''یہاں آ چکی ہیں'' انہوں نے حیرت سے کہا اور پھر فرمایا کہ تمہاری ملازمت سے پیش تر، وہ یہاں کیوں

چلی آئیں انہوں نے یہ خیال کیوں نہ کیا کہا گر یہاں تم کو ملازمت نہ مل سکی تو ان کا یہاں چلا آنا بیکار ہو جائے گا۔

میں نے کہا سرکار، میری بیوی کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ کو یہاں ملازمت نہ ملے۔

نظام نے پوچھا تمہاری بیوی کو اس بات کا یقین کیوں تھا کہ تم کو یہاں ملازمت ضرور ہی مل جائے گی یہ سوال سن کر میں چپ ہو گیا سوچنے لگا کہ اس خواب کا ماجرا کہوں یا نہ کہوں۔

میری اس شش و پنج کو دیکھ کر نظام نے کہا بولو جی بولتے کیوں نہیں

اس موقع پر نواب مہدی یار جنگ، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور چوں کہ میں ان سے اپنا خواب بیان کر چکا تھا انہوں نے کہا خداوند کی اجازت ہو تو ذری اس کی علت 1 در ہے کہ آلہ ہم سر

بیان کر دے نظام نے کہا بولو اور جب مہدی صاحب نے میرا تمام خواب بیان کر دیا تو نظام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا تو یہ بولو کہ سرکار دو عالم نے جوش کو میرے سپرد فرمایا ہے یہ کہا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ، سینے پر رکھ کر جھک گئے اور تمام دربار پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔

اس باریابی کے ایک ہفتے کے بعد، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ کے ناظم، عنایت اللہ صاحب نے جو مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی کے فرزند، اور اکبر حیدری وراس مسعود کے پرستار ہونے کی بناء پر میرے بدخواہ بن چکے تھے مجھے بلا کر کہا جوش صاحب مبارک ہو یہ لیجئے شاہی فرمان سرکار نے پولیٹکل اکانومی کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے۔

میں نے ان سے کہا پولیٹکل اکانومی سے میرا کوئی تعلق نہیں انہوں نے خوش ہو کر کہا تو پھر آپ انکار لکھ دیں۔۔۔ میں نے فرمان کے حاشئے پر یہ لکھ دیا کہ سرکار والا

تبار کا بے حد شکریہ، لیکن چوں کہ پولیٹکل اکانومی میرا سبجکٹ نہیں رہی ہے اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو باحسن الوجوہ نہیں کرسکوں گا البتہ اگر انگریزی ادب کے ترجمے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا تو اسے بڑی خوبی کے ساتھ، انجام دے سکوں گا۔

عنایت اللہ نے کہا انگریزی ادب ہی میں پڑھایا جاتا ہے اس لئے اس کے ترجمے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے آپ یہ عبارت قلم زد کردیں میں نے کہا کیا مضائقہ ہے رہنے دیجئے کانوں کانوید سنائی پیدا ہوجائے گی۔

عنایت اللہ نے کہا ناظم شعبہ ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی عبارت کے نیچے یہ نوٹ لکھ دوں کہ انگریزی ادب براہ راست پڑھایا جاتا ہے اس کا ترجمہ ایک فعل عبث ہوگا آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا میں نے کہا بڑے شوق سے لکھ دیں آپ۔

اس کے چوتھے پانچویں دن عنایت اللہ خود میرے پاس آئے اور کہنے لگے صاحب مبارک ہوسرکار نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے یہ لیجئے فرمان، اور لکھ دیجئے اس پر اپنی منظوری۔

میں نے دیکھا کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر چند اس نئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن سردست جوش ملیح آبادی کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے میں نے شکریئے کے ساتھ، اس فرمان پر دستخط کردیئے۔۔۔۔۔اور عنایت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے بیوی کو یہ خوشخبری سنائی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹکا کر کہا قربان جاؤں اپنے رسول اللہ کے دیکھی تم نے اس خواب کی تعبیر، تم نے تو حیدری سے بگاڑ کر، اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی تھی لیکن اللہ نے تمہاری مدد کی عماد الملک تمہاری پشت پناہی کو کھڑے ہوگئے میں تو کہتی

ہوں پتھر سے پانی نکل آیا۔۔۔۔اور دوسرے ہی دن، بیوی نے بڑی دھوم سے میلاد کی ااور محلے بھر میں مٹھائی بٹوائی۔

تقریر کے بعد، شکریئے کی نذر لے کر پہنچا ایک نذر اپنی طرف سے اور دو نذریں بیوی بچوں کی طرف سے پیش کیں نظام نے کہا ابھی کیا ہے، میں تمہیں اس قدر دوں گا کہ گھر میں رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی کئے بیویاں ہیں تمہاری؟ میں نے کہا میری تو صرف ایک ہی بیوی ہیں انہوں نے کہا میں نے سنا ہے ''اودھ کے تعلقہ داران کے بہت سے بیویاں ہوتی ہیں'' میں نے کہا سرکار والا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتےہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی بھی میری ہی طرح پٹھان نسل کی ہیں اور اس پر یہ طرہ کہ کئی برس سے وہ بے چاری شدید اختلاج میں مبتلا ہیں اگر میں دوسری شادی کرلوں گا تو ان کی پھنولی اور ان کا اختلاج، یہ دونوں مل کر انہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

نظام نے اختلاج کا حال سنا تو پوچھا کب سے ہے، میں نے کہا چار پانچ برس سے ہے پوچھا کس کس کا علاج کرا چکے ہو میں نے ان معالجوں کے نام بتا دیئے پھر سوال کیا اب تک علاج پر کس قدر روپیہ برباد کر چکے ہو میں نے کہا کم سے کم پندرہ بیس ہزار تک برباد کر چکا ہوں لیکن مرض ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ سن کر نظام نے سیدھے ہو کر بڑے فخر یہ انداز میں کہا کہ میں ڈاکٹری اور طب میں اس قدر دست گاہ رکھتا ہوں کہ ماہر چند میں باقاعدہ مطب نہیں کرتا لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لباں نہیں کھلتے ہیں میرے سامنے۔۔۔۔۔یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور دو چار منٹ کے بعد آ کر چوب دار کو آواز دی کہ لے یہ پانچ رپاں عیسیٰ میاں کے بازار کے دوا خانے سے گاؤ زبان اور خمیرہ مروارید لے آ جب دونوں دوائیں آ گئیں تو ان کو میرے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ دوائیں صبح و شام اپنی بیوی کو کھلاؤں پلاؤں، کسی دن ناغہ نہ ہونے دوں، اور عین مرگ 1 کے دن آ کر بتاؤں کہ اب میری

بیوی کیسی ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس دن کے بعد عین ''مرگ'' کے دن کنگ کوٹھی گیا دو نذریں پیش کیں اشرفیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی پوچھا یہ دوسری نذر کس کی طرف سے ہے میں نے کہا یہ میری بیوی کی طرف سے ہے انہوں نے پوچھا بتاؤ، میری دواؤں کا اثر، میں نے سفید جھوٹ سے کام لے کر کہا سرکار کی دواؤں نے تو جادو کا اثر کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کبھی اختلاج تھا ہی نہیں۔۔۔ یہ سنتے ہی، ان کے چہرے اور ان کے تمام بدن میں خوشی اور مناخرت کی لہر دوڑ گئی اور چوب دار کو حکم دیا کہ فلاں فلاں ''طبیباں'' اور ''ڈاکٹروں'' کو فوراً حاضر کر دے۔

جب تمام نامی ''طبیب'' اور ''ڈاکٹر'' حاضر ہو کر نذریں پیش کر چکے تو انہوں نے حکم دیا کہ تمام ''طبیب'' میرے داہنے طرف اور تمام ''ڈاکٹر'' میرے بائیں جانب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائے اور جب حکم کی تعمیل ہو گئی تو کوتوال شہر ونکٹا مارا ریڈی کو ان صفوں کے درمیان ''مرج البحرین'' کے طور پر کھڑا کر دیا گیا۔۔۔۔

1۔ دکن میں پرتگال کے یوم اولیں کو مرگ اور آغاز موسم باروں کا مرگ لگنا کہا جاتا ہے اس واقعہ عجیب کی شہر میں ڈگ پٹ گئی کہ جوش صاحب اس قدر بلند اقبال ہیں کہ سرکار نے ان کی بیوی کے علاج کی خاطر اپنی جیب سے ایک نہیں پورے پانچ روپے صرف کر ڈالے اور مہاراجہ پرشاد نے تو اس خوشی میں میری دعوت بھی کر ڈالی اور کہا ممالک محروسہ سرکار عالی میں آپ وہ پہلے آدمی ہیں جن پر نظام نے پانچ روپے اپنے جیب سے خرچ کر ڈالے ہیں۔

اور عین اس وقت جب کہ حکیم ڈاکٹر ان کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آج ہم سب پر کوئی نہ کوئی نوازش ضرور کی جائے گی نظام نے کڑک کر ان سے کہا دیکھو یہ جوش ملیح آبادی تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں یہ بے چارے اپنی بیوی کے علاج میں پندرہ بیس ہزار روپیہ تم بے ایمان مسخروں کو چٹا چکے ہیں لیکن تم

انہیں تندرست نہیں کر سکے، میں نے دو دوائیں دیں اور بیس دن کے اندر ان کی بیوی کا مرض غائب ہو گیا اب اے سالو اگر تم میرے سامنے حذاقت کا دعویٰ کرو گے تو میں تمہاری۔۔۔۔۔گا اور فقط یہی نہیں میں تم سب کی۔۔۔۔۔میں ریل چلا دوں گا اور اس ریل میں بیٹھ کر دھکا دھک کرتا منما ڑتک چلا جاؤں گا۔

اپنے آقا کی زبان سے یہ فحش الفاظ سن کر ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ان کے گل مچھے لانبی داڑھیاں ہوا میں پھڑپھڑانے لگیں ڈاکٹروں کی مونچھوں کی کھڑی چونچوں پر بھیروں ناچنے لگا ذلت کے کوے ان کے سروں پر قاؤں قاؤں کرنے لگے اور ان کی جھکی پلکوں کے نیچے لال لال منہ کے بندر جست وخیز کرتے نظر آنے لگے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بہت بھاری پتھر کسی پہاڑی سے ٹوٹ کر دریا میں آ گرا ہے اور ساکن موجوں میں یکا یک بھونچال آ گیا ہے۔

میں نے بڑی عبرت کے ساتھ دیکھا کہ ان معزز ارباب فن کی پنڈیاں کانپ رہی ہیں ان کی گردنیں پتلی ہو ہو کر ان کے سروں کا وزن اٹھانے سے انکار کر رہی ہیں ان کی آنکھیں بجھ گئی ہیں ان کا جذبہ غیرت منہ پیٹ رہا ہے ان کی ناکیں سرخ ہو ہو کر لمبی ہو چکی ہیں اور ان کی خودداری ان کے رخساروں کی دونوں ابھری ہوئی ہڈیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی لید کر رہی ہیں ہائے انسان تیری مجبوریاں [1]

[1] اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب ان میں سے کسی نے بھی میری بیوی کا علاج نہیں کیا ہے تو پھر انہیں ذلیل کیا جا رہا ہے لیکن اس اس کی یہ علت سمجھ میں آ رہی ہے کہ چونکہ نظام اپنے کو تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دل اس بات پر کڑھا کرتا تھا کہ اگر میں مطب کرتا تو جو دولت یہ لوگ کما رہے ہیں میری جیب میں آتی اور منصب شاہانہ کی مجبوری سے

دارالترجمہ مقام دفتر کم اور دارالتفریح زیادہ تھا ہم تمام لوگ [1] (سید ابوالخیر مودودی کے علاوہ) روز ہاشمی صاحب فرید آبادی کے کمرے میں جمع ہو کر گپیں اڑاتے

اور شاعری کیا کرتے تھے میں نے وہاں مترجم ادب انگریزی 2 کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ برس کام کیا اور جب علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو پنشن مل گئی تو اکبر حیدری اور راس مسعود کے علی الرغم نواب اکبر یار جنگ کے مخلصانہ مساعی کی بناء پر مجھے ترقی مل گئی میرا عہدہ توڑ دیا گیا اور میں علامہ طباطبائی کی جگہ ''مشیر ادب'' کے عہدے پر کام کرنے لگا میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہو گی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پورا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پوچھا کبھی شاداب اور بارآور نہ ہوتا۔

چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نا اہل مزے اڑا رہے ہیں کیا ہوا اگر ان میں کوئی جوش کی بیوی کا معالج نہیں رہا ہے مگر ان کی بیوی کے معالجوں کے یہ لوگ ہم پیشہ اور ایک ہی ہتھیلی کے چٹے بٹے وہیں وہ معالج میرے ہاتھ نہیں آ سکتے تو پھر ان کو ذلیل کر کے اپنے جی کیوں نہ ٹھنڈا کر لوں؟ ممکن ہے میری یہ رائے غلط اور اس کی علت کچھ اور ہی ہو اس لئے کہ دولت کی ضرورت سے زیادہ فراوانی اور مسخرے مصاحبوں کی حد سے بڑھی قصیدہ خوانی کے بگاڑے ہوئے دماغوں کی اچھل کود اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ کوئی ذی عقل اسے گرفت میں نہیں لا سکتا اے اللہ مجھ کو دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی سے محفوظ رکھنا، اس لئے کہ ان دونوں حالتوں میں انسانیت کا دم نکل جایا کرتا ہے۔

1 یعنی احسان احمد، علامہ عمادی، مولوی فدا علی، محمد ابراہیم، رشید احمد، مرزا طبیب، سخا جے پوری اور گاہ گاہ قاضی غلام حسین، مسعودی علی محوی علامہ طباطبائی اور مرزا محمد

www.pdfbooksfree.pk

ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادا بھی شریک بزم ہو جایا کرتے تھے 2 میرے ذمے حیات بیکن کا ترجمہ تھا۔

میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے میں دکن آ کر پھر ان سے پڑھنے لگا، اور اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب، اور فلسفے کا بھی با قاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ ہر چند 1918ء میں شراب کے لطف سے آگاہ ہو چکا تھا، اس لئے کبھی کبھی کسی دعوت میں تو پی لیتا تھا لیکن اپنی تنخواہ سے خرید کر کبھی نہیں پیتا تھا اور اسی وجہ سے مجھے یہ فرصت حاصل تھی کہ روزرات کے گیارہ بارہ بجے تک اردو فارسی، انگریزی ادب اور فلسفے کا بلاناغہ مطالعہ کیا کرتا۔

ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدر آباد کیا چیز تھا اوزانی اور اس پر دولت کی فراوانی ہر طرف ایک چہل پہل تھی امراء کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے متوسطین تک غرق نشاط رہا کرتے تھے اور اسکاچ وسکی صرف آٹھ روپے میں ملتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔

وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی ابھار اور تہذیبی نکھار وہاں کی رامش و رنگ میں ڈوبی شامیں، پہاڑوں پر تھرکتی صبحیں، شبستانوں میں ناچتی گاتی راتیں، بانہوں اور بوسوں کی سوغاتیں یاران دلنشیں کی ترنگیں، اٹھتی جوانیوں کی امنگیں، باغ عامہ کی لچکتی ڈالیاں، عثمان ساگر کی، گنگناتی متوالیاں، اونچی اونچی گاتیاں بہکی بہکی مدھ ماتیاں۔۔۔ وہاں کے میلے ٹھیلے پریوں کے ریلے ہر چہرے پر رونق ہر گوشے میں ہوحق بجتی گلیاں تھرکتی رنگ رلیاں، ساحلوں پر براتیں اور وہ خیمہ ہائے جشن کی سنہری قناتیں وہ شاہزادہ معظم جاہ کا دربار، گویا مصر کا بازار، وہ پریاں قطار اندر قطار، وہ گردنوں کو پیچھے ریلتے ہوئے سینوں کے ابھار، وہ جھمکے، وہ چندن ہار، وہ چٹانوں کے بیوپار، وہ طوفان گیسو و رخسار، وہ پازیبوں کی جھنکار، وہ بلبلے وہ ستار وہ گیتوں کی ہلکی ہلکی

www.pdfbooksfree.pk

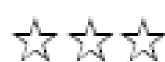
پھوار وہ غزلوں کے گونجتے اشعار، وہ ابلتے انوار وہ کھنکتے درو دیوار اور وہ چھلکتے شیشہ ہائے سرشار۔

ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں حافظے کا سرہ سفید ہو چکا ہے۔ اور پرانی صحبتیں کجلا چکی ہیں اب شام کے وقت کراچی میں جب اپنے مکان کے کھلے ہوئے مغربی چھجے میں شمالی ناظم آباد کی دور کی روشنیوں کے سامنے تنہا پینے بیٹھتا ہوں تو انسان کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے والی مشیت میری زمانہ ماضی کی سرخوشیوں کی سزا دینے پر کمر بستہ ہو کر میرے بیتے دنوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ میرا تعاقب کرنے لگیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیدر آباد کی راتوں کی براتوں کے جلوس گم کردہ لمحوں اور گہنائے مکھڑوں کے درو انگیز جلوس دامن شفق کو پھاڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور غلغلے مچانے والے یاروں کے چہرے اور آغوش میں مچلنے والے دلی داروں کے مکھڑے، فضا پر تیرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور میرے پیاسی نظریں، جب انہیں پکڑ لینے کے واسطے، دوڑتی ہیں تو وہ دریائے شفق میں غوطہ لگا کر میری آنکھوں سے پل بھر میں اوجھل ہو جاتے ہیں اور ایک سوگوار دھواں میرے سر پر منڈلانے لگتا ہے۔

اگر میں، کل، جی بھر کے، ہنستا نہ ہوتا، تو آج، دل تھا کر یوں نہ روتا، سچ کہا ہے انیس نے

روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں!!

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شہ میں خیرہ اور خیر میں شر کا ایک عنصر ہوتا ہے وہاں کا دوسر بھیانک رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔



www.pdfbooksfree.pk

حیدر آباد سے اخراج

حیدر آباد کے سر پر جاگیرداری اور شہر یاری کا گدھ ٹھونگیں مار رہا تھا ہر طرف درباری سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے نظام کے مصاحب ہر چند لکھے پڑھے نہیں تھے لیکن اس قدر کڑھے، ایسے دربار مسخرے، موروثی مراثی، خاندانی خوش آمد خورے، مشاق بھانجی مار، جھوٹے قصیدہ خواں پختہ دروغ باف، چھٹے تہمت کار، بولی ٹھولی میں اس قدر طاق و مشاق، اور نظام کے اس درجہ مزاج شناس تھے کہ ان کو انگلیوں پر نچاتے، چاپلوسی کے توؤں پر روٹیاں پکاتے، اپنے کو ابھارتے، حریفوں کو گراتے روز ماں بہن کی گالیاں کھاتے اور شربت کی طرح پی جاتے باتوں کے طوطے اڑاتے اور ان طوطوں کو اپنے آقا کی بھوؤں پر بٹھاتے اور ان سے ''بنی جی بھیجو'' کے نعرے لگواتے تھے۔

جس طرح سانپ والے، بانسریوں پر ناگوں کو نچاتے ہیں اس طرح یہ مسخرے بھی اپنے ملائم لہجوں کی گاڑیوں میں اپنی آنکھوں کے گھومتے ہوئے عیار ڈھیلوں کے پہئے لگاتے اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کر دینے کی خاطر، اپنے سدھے ہوئے چہروں کے منہ میں لگام لگا کر، اپنی منزل مقصود کی جانب ہنکاتے اور نظام کو اپنے راستوں پر چلاتے تھے اور بڑے سے حاکموں اور جاگیرداروں سے اگر بگڑ جاتے، تو سر دربار ان کو پٹوا کر نکلوا دیتے، اور ان کے گھروں میں جھاڑو پھروا دیا کرتے تھے۔

ان کی زبانیں ایسی رینگتی ہوئی ناگنیں تھیں جن سے اور تو اور شہزادے تک محفوظ 1 نہیں تھے۔

بہر حال اے حیدر آباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا، تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا، تو نے مجھے کتاب کا کل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا کتاب نے میری آگاہی

www.pdfbooksfree.pk

میں اضافہ کیا، کاکلوں کی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کر دی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو وادی حیرت کی جانب موڑ دیا۔

میں نے ''غلط بخشی'' کے نام سے نظام کے خلاف ایک نظم کہی تھی جس کا ذکر آگے

1 یہ بات فقط حیدرآباد ہی سے مختص نہیں تمام دیسی ریاستوں کا یہی عالم تھا ہر جگہ مسخرے مصاحبوں کی ریشہ دوانی، اور پاگل ہزہائی نسوں کی حکمرانی تھی مصاحبوں کی زبانیں ان کی کھیتیاں تھیں اور والیاں ریاست کے کان ان کھیتوں پر برسنے والے ابر تھے اور چونکہ انہیں کبھی ان کی غلطیوں پر مطلع نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنے ہر برے سے برے فعل کو روا سمجھتے تھے اور چونکہ وہ مسلسل وململ فراغت کے آغوش میں رہتے تھے اس لئے ان کے قوائے فکر کو زنگ چاٹ چکا تھا، اور ان کی عقلوں پر چربی چھا گئی تھی اس لئے وہ خطرناک قسم کے پاگل ہو چکے تھے اور اسی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر آبرو داروں کو ذلیل کر دینا، ارباب علم کے سروں پر ٹھوکریں مارنا، بھانڈوں بھگتیوں کو سر چڑھانا اور شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر سانڈوں کی طرح چڑھ جانا ان کا آئے دن کا مشغلہ اور آبائی کھیل تھا۔

اور ان سانڈوں ان دیوانوں اور ان کالے ناگوں کو فرنگی حکومت نے اس لئے قائم رکھا تھا کہ جب کبھی ہندوستان میں آزادی کا طوفان آئے گا یہ لوگ اسے روکنے کے واسطے فلک پیا بند تعمیر کر دیں گے اور رراجہ پورس کے ہاتھوں کے مانند خود اپنی ہی قوم کو روند کر مار ڈالیں گے۔

آئے گا وہی نظم بظاہر میرے اخراج کا سبب بن گئی لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور اسباب بھی کام کر رہے تھے ان کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی بیان کر دوں۔

www.pdfbooksfree.pk

مجھ کم بخت گھر پھونک تماشا دیکھنے والے کی یہ افتادِ مزاج ہے خواہ اسے ہنر سمجھا جائے یا عیب کہ میں عامۃ الناس کے قدموں پر سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت اور خداوندانِ اقتدار کے تخت کے روبرو گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں اور میر تقی میر کے مانند:

سر کسو سے، فرو نہیں آتا

حیف بندے ہوئے، خدا نہ ہوئے

کا نعرہ لگاتا رہتا ہوں

اور اس افتادِ مزاج کے ساتھ، میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا ان کو ''سرکار'' کہتا اور ان کی زبان سے اپنے متعلق ''تم'' سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلا اٹھتا تھا زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے چہرے کا تغیر اور میرے چوٹ کھائے دماغ کی برقی لہریں نظام کے دل پر اس طرح اثر کیا کرتی ہیں جیسے میدان میں سونے والے پر شب نم گرتی ہے اور اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرے سر میں یہ دھمک کیوں ہو رہی ہے۔

اپنے پاش پاش غرور کے ساتھ دربار سے جب گھر آتا تھا تو، بیوی کے سامنے، اپنی اس بے عزتی کا رونا رویا کرتا تھا اور وہ بھی اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ نوکر چاکر سب سن لیا کرتے تھے۔

مجھ کو مطلق یہ معلوم نہیں تھا کہ نظام کی خفیہ پولیس کا گھر گھر میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ کوئی اس کی زد سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتا۔ صرف گھر کے نوکر چاکر یا مامائیں ہی نہیں، سودا بیچنے والیاں تک خفیہ پولیس میں بھرتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا پتا کیوں کر چلا، وہ بھی سن لیجئے ایک روز، نواب قادر نواز جنگ بڑا خوفناک چہرہ بنائے میرے پاس آئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے محل میں جس بات کا رونا رویا کرتے ہیں سرکارِ والا تک وہ بات پہنچ گئی ہے اور مجھ کو اس بات کی بڑی

www.pdfbooksfree.pk

خوشی اور انتہائی حیرت ہے کہ یہ بات سن کر سرکار نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ جوش بڑا مغرور آدمی ہے ملازمت کر رہا ہے مگر اس کے سر سے بوئے امارت ابھی تک نہیں نکلی سنتا ہوں وہ خدا سے بھی گستاخیاں کیا کرتا ہے لیکن کیا کروں سرور کائنات نے اس شخص کو میرے سپرد فرمایا ہے۔

نظام کی سالگرہ وغیرہ پر تمام شعراء قصائد پیش کیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی قصیدہ نہیں کہا ایک سالگرہ کے موقع پر ایک رسالے کے مدیر نے میری ایک بہاریہ نظم "قصیدہ" بنا کر شائع کر دی جس کا یہ مطلع تھا۔

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر

گہر باریاں کر گل افشانیاں کو

اس نظام میں سالگرہ کی جانب کوئی ادنیٰ سا بھی اشارہ یا نظام کی مدح میں کوئی ایک شعر بھی نہیں تھا لیکن میرے اس مقطع پر شاہی عتاب نازل ہو گیا۔

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما

کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

نظام اس دھوکے میں پڑ گئے کہ اس قطعے کا روئے سخن ان کی طرف ہے اور دوسرے ہی دن فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ جوش نے کسی خاص وقت ہنگام بادہ نوشی میں کہا ہے ان کو چاہئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کیا کریں اگر آئندہ وہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہوگا۔

اس واقعے کے کوئی دو برس کے بعد ایک روز نواب مہدی یار جنگ بہت گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا بڑا غضب ہو گیا ہوش بلگرامی نے سرکار عالی تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ آپ کے۔۔۔شاہزادی سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور یہ بھی انہوں نے کہا ہے کہ۔۔محل میں جس وقت۔۔۔۔۔۔شہزادی جوش کو روک رہی تھی اور جوش عذر کر رہے تھے اس وقت میں نے پردے کے پیچھے سے یہ خود سنا تھا کہ

شہزادی نے بڑے پیار کے لہجے میں ان سے فرمایا تھا کہ ''اگر تم اس وقت نہیں رکو گے تو میں تمہیں مار ڈالوں گی''

نظام کے دل میں یہ متذکرہ بالا چاروں خمیر نامعلوم طریقے سے ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ میں نے وہ اشتعال انگیز نظم جس کا ذکر کر چکا ہوں جاگیرداروں اور وزراء کی بھری محفل میں سنا دی۔ اور تمام محفل پر ایک دہشت ناک سناٹا چھا گیا۔۔۔ نواب نظامت جنگ، وزیر سیاست نے میرے کان میں کہا کلہاڑی مار لی آپ نے اپنے پاؤں میں۔۔۔ اولاً تو آپ کو ایک ملازم سرکار عالی کی حیثیت سے ایسی نظم کہنا ہی نہیں چاہئے تھی اور کہہ بھی دی تھی تو پھر یہ چاہئے تھا کہ اس کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے حد کر دی آپ نے ناعاقبت اندیشی کی خیر میں تو اس پر کوئی کارروائی نہیں کروں گا خفیہ پولیس والوں نے یہ نظم لکھ لی ہے یقین رکھئے کل تک یہ کنگ کوٹھی پہنچ جائے گی اس نظم کے چند اشعار یاد ہیں آپ بھی سماعت فرمالیں یہ نظم میرے کسی مجموعے میں طبع ہو چکی ہے۔

الٰہی اگر ہے، یہی روزگار
کہ سینے رہیں اہل دل کے فگار
وناحت کو حاصل ہوں سرداریاں
شرافت کرے کفش برداریاں
سر بزم جہل آئیں، اہل نظر
بشکل غلامان زریں کمر
لیموں کی ہر شب ہو، غرق شباب
بناز نگاروں بصورت رباب
رہیں فضل باراں میں بھی تشنہ کام
خرابات کے اولیائے کرام

www.pdfbooksfree.pk

سر محفل ممسک بد خصال

کریم آ کے پھیلائیں دست سوال

ہنر ہو اور اس درجہ بے آب رو

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!!

دوسرے ہی دن وہ نظم نظام تک پہنچ گئی کوئی دوسرا ایسی زبردست گستاخانہ نظم کہتا تو جن بچوں سمیت کولھو میں پیل دیا جاتا لیکن ان کی شرافت دیکھئے کہ انہوں نے بڑے خفیہ طور پر میرے ہم نوال و ہم پیالہ دوست آغا جانی نائب کوتو ال کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ، کنگ کوٹھی لے آئیں آغا نے مجھ سے کہا مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ ہر چند آپ نے اس قدر سخت نظم کہی ہے پھر بھی سرکار آپ کے خلاف کسی قسم کا اقدام پسند نہیں فرماتے ہیں اور انہوں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جوش مجھ سے معافی طلب کر کے، اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو میں انہیں دل سے معاف کردوں گا اس لئے ابھی ابھی میرے ساتھ چلئے اور اس معاملے کو رسیدہ بود بلائے بنا دیجئے میں نے ان کی بات سن کر سر جھکا لیا آغا نے کہا، ارے دیر نہ کیجئے کپڑے پہنئے اور میرے ساتھ ہو لیجئے میں نے کہا آغا معافی مانگنے پر میں تیار نہیں ہوں وہ یہ سن کر دنگ ہو گئے مجھ سے کچھ نہیں کہا زنانے دروازے پر جا کر آواز دی بھابی ذرا ایک بات سن جائیے اور جب میری بیوی پٹ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں تو انہوں نے کہا بھابی آپ کے شوہر نامدار سرکار سے معافی مانگنے پر تیار نہیں ہیں بیوی نے آغا سے کہا ذرا انہیں بلا لیجئے آغا نے مجھے پکارا میں پہنچ گیا اور بیوی نے بڑے تیہے کے ساتھ ڈانٹ کر مجھ سے کہا ارے کیا تمہارا دماغ چڑ گیا ہے آدھی سے زیادہ جائے داد تباہ کر کے یہاں آئے ہو اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ اس آدھی جائیداد کو بھی ملیح آباد جا کر تین برس کے لئے خواجہ حسن کو ٹھیکے پر دے آئے ہو اور وہ سارا روپیہ بھی بالا بالا بمبئی جا کر برباد کر آئے ہو معافی نہیں مانگو گے تو کیا جھنے

جھاڑے پھرو گے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ لڑکی لڑکے کو لکھانا پڑھانا، اور ان کی شادیاں کرنا ہے جاؤ اس گھڑی جاؤ، اور سرکار سے جا کر معافی مانگ لو نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا سن رہے ہو تم؟

میں نے کہا اشرف جہاں یہ بات سچ ہے کہ ہم تم سے ڈرتے ہیں، مگر یہ بھی سن لو کہ اس قدر نہیں ڈرتے ہیں کہ بھیگی بلی بنے جائیں اور معافی مانگ آئیں یہ سن کر بیوی ہکا بکا ہو کر رہ گئیں دیر تک مجھے گھورا اور پھر آنکھیں جھکا لیں اور آغا جانی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ جو شخص خودکشی پر تل جائے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

آغا کے چلے جانے کے بعد میں نے ڈر کے مارے گھر میں قدم نہیں رکھا اور دوسرے دن جلدی جلدی استعفےٰ لکھ کر اپنے محکمے کے سیکرٹری نواب ذوالقدر جنگ کے پاس چلا گیا۔

ذوالقدر نے کہا جوش صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں جذبات میں نہ بہیئے عقل سے کام لیجئے جائیے اور سرکار سے معافی مانگ لیجئے آپ کو معلوم نہیں ملازم کی کھال کو موٹا ہونا چاہیے سرکار مجھے گالیاں تک دے چکے ہیں یہ آپ سے کہہ رہا ہوں لیکن میں پی گیا استعفےٰ نہیں دیا اور آپ کی بات تو قطعی اس کے برعکس ہے آپ نے خود سرکار پر لعن طعن کی ہے اور اس کے باوجود الٹے استعفےٰ دے رہے ہیں۔

دیر تک وہ مجھے سمجھاتے رہے دیر تک بڑی رد و قدح رہی اور جب میں نہیں مانا تو انہوں نے غصے میں آ کر میرا استعفےٰ کنگ کوٹھی روانہ کر دیا۔

میرا استعفےٰ، جنگل کی آگ کے مانند نظام تک پہنچ گیا اور نظام چیخ چیخ کر کہنے لگے" بڑا غضب ہوا جوش مجھ سے جیتے جا رہے جوش مجھ سے جیتے جا رہے ہیں، نواب سر امین جنگ نے کہا خداوند سے کون جیت سکتا ہے کہاں جوش اور کہاں شاہ دکن جوش کی سری (مرتبے) کے تو سینکڑوں شاعر لکھنو کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں نظام نے کہا امین تم باتکی نزاکت نہیں سمجھ رہے ہو مزا تو جب تھا کہ ان کے استعفے سے

پیش تر ہی میں ان کو برطرف کر دیتا۔لیکن اس عالم میں جب کہ وہ خود مستعفی ہو رہے ہیں بات الٹ گئی ہے اور میں ہارا جا رہا ہوں۔''

نواب امین جنگ نے دست بستہ عرض کیا خداوند اس استعفے کو خانہ زاد کے حوالے فرما دیا۔فدوی ابھی معاملے کو پلٹ دے گا نظام نے میرا استعفیٰ ان کی طرف پھینک دیا امین جنگ نے اسے اٹھا کر فوراً چاک کر دیا اور ہوا میں اس کے پرزے اڑا کر کہا سرکار والا اس استعفے کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا ہے اب سرکار فرمان جاری کر دیں میرے استعفے کے چاک ہو جاتے ہی نظام کا چہرہ دمک اٹھا اور کہنے لگے امین تم نے مجھ کو جتا دیا، ہمارے سیکرٹری کو ایسا ہی قابل ہونا چاہئے لکھو فرمان کہ جوش ملیح آبادی کو ممالک محروسہ سرکار عالی سے خارج کیا جاتا ہے پندرہ دن کے اندر وہ روانہ ہو جائیں اور تا حکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔

فرمان لے کر آغا جانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے اس فرمان کو سمجھے بھی؟ میں نے کہا اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں سرکار والا کا مزاج شناس ہوں اس لئے فرمان کے دو نکتے بتانے آیا ہوں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ سرکار جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں آپ کو چوبیس گھنٹے کے عوض پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے اور وہ اس مقصد سے کہ آپ صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ کر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس میں تا حکم ثانی لکھ کر آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے دیکھئے اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ابھی میرے ساتھ سرکاری کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لیجئے اگر اس وقت یہ فرمان منسوخ نہ کر دیا جائے تو میری ناک کاٹ لیجئے گا۔

میں نے آغا جانی کو گلے لگا کر ان کی پیشانی چوم لی اور کہا آپ واقعی میرے پکے دوست ہیں لیکن میں کسی طرح معافی طلب نہیں کروں گا۔

آغا نے سر پکڑ کر کہا بھائی راج ہٹ بالک ہٹ تریا ہٹ تو سنی تھی آج معلوم ہوا

کہ چوتھی ہٹ، بھی ہوتی ہے جس کو شاعر ہٹ کہنا چاہئے

اندر جا کر میں نے بیوی سے کہا اب رخت سفر باندھو، ہم یہاں پندرہ دن کیوں پڑے رہیں، تین چار دن ہی میں کیوں نہ چلے جائیں بیوی نے کہا یہ تو سوچو جاؤ گے کیسے جانے کا دم درود بھی ہے؟ تمہاری بہن بہنوئی ان کے بچے اور پھر ہم لوگ اور چھوٹے دادا اور دو نوکرا تنے آدمیوں کا کرایہ بھاڑا کہاں سے آئے گا اور پھر تمہاری یہ ضد بھی ہے کہ ہم اپنی موٹر اور اپنے دونوں کتے بھی ساتھ لے جائیں گے اور ان کو یہاں کی گلیوں میں مارا مارا نہیں پھرنے دیں گے ان سب کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا اسی دن کے لئے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کے روز شرابیں نہ پلاؤ اتنے اللے تللے نہ کرو اب بتاؤ کیا کرو گے اور کیسے جاؤ گے نہ تو من تیل ہو گا نہ رادھا جی ناچیں گی۔

بیوی کی باتیں سن کر میں چکرا گیا اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ان حالات میں سفر نا ممکن ہے میں نے کہا پھر اشرف جہاں کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا جاؤ اور شہزدے اور مہاراجہ کشن پرشاد سے جا کر قرض مانگو میں نے کہا میں قرض مانگنے نہیں جاؤں گا یہ تو ان دونوں کا فرض تھا کہ وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر خود پچھواتے کہ ہم اس موقع پر کیا امداد کر سکتے ہیں جب انہوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا تو میں بے غیرتی لاد کر ان کے پاس کیوں جاؤں بیوی نے کہا ہاں سچ کہتے ہو لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اب بیتا کیا کیا جائے میں نے کہا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے الغرض ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور اخراج کی تاریخ قریب سے قریب تر آنے لگی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی اور میرا عالم اس مسافر کا سا ہو گیا جو راستہ بھول کر جنگل میں سر ٹکراتا اور چیختا پھرتا ہے۔

شب تاریک وبیم موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند، حال ما، سبک ساران ساحل ہا

ایک رور، اسی ربودگی و بے چارگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ حکیم آزاد انصاری نے آکر کہا کچھ خیال بھی ہے کہ یہاں سے جانے میں اب فقط چار دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا آزاد صاحب اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اخراج کے دن میں بڑے اطمینان سے اپنے پھاٹک کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں اور نظام کی نافرمانی کے جرم میں اپنے کو گرفتار کرا کے جیل چلا جاؤں لیکن میرے بال بچے کیا کریں گے؟

آزاد نے کہا گرفتار ہوں آپ کے دشمن، میں ایک ایسی تدبیر نکال کر آیا ہوں جو پٹ پڑ ی نہیں سکتی آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ خاندان آصفیہ کی یہ ایک قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ شاہی معتوبوں کو تاحیات وظیفہ دیا جاتا ہے آپ بھی معتوب ہیں اس لئے آپ کو بھی وظیفہ دیا جائے گا اس لئے آپ اللہ کا نام لے کر اس مضمون کی درخواست کے ساتھ اکبر حیدری کے پاس جائیں کہ آپ کو خزانہ عامرہ سرکار عالی سے پانچ ہزار کی رقم بطور قرض دے دی جائے اور اس رقم کو وظیفہ عتاب میں سے بالاقساط وضع کرلیا جائے۔

میں نے کہا تدبیر تو آپ نے ایسی نکالی ہے جو تیر بہدف ہے لیکن کیا منہ لے کر حیدری کے پاس جاؤں انہیں تو ان کے خطاب کے معاملے میں ذلیل کر چکا ہوں۔۔۔۔آزاد نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ حیدری سے تو قرض نہیں مانگ رہے ہیں آپ کو تو خزانہ عامرہ سے قرض ملے گا میں نے کہا بہت اچھا میں تیار ہوں لیکن درخواست لکھنا تو مجھے آتا نہیں آزاد نے اپنی جیب سے ٹائپ شدہ درخواست نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا اسی خیال سے میں آپ کے پاس مسلح ہو کر آیا تھا کہ درخواست لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔

اپنے مزاج کو لاکھوں کوڑے مار مار کر میں حیدری کے پاس گیا انہوں نے بڑی نرمی کے ساتھ پوچھا جوش صاحب میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں لفظ کھدمت کے

www.pdfbooksfree.pk

زہر کو پی کر میں نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ میرے اخراج میں اب صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں کہ میں سفر کر سکوں اس صورت میں آپ مجھ پر دو عنایتیں کر سکتے ہیں پہلی عنایت تو یہ ہو گی کہ آپ میری اس قرض کی درخواست کو منظور فرما لیں اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری عنایت کریں کہ مجھ کو بجرم سرتابی گرفتار کرا سے جیل بھجوا دیں۔

انہوں نے میری درخواست اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے یہ کہا آپ گرفتاری کی بات نہ کہیں اگر آپ کو گرفتار کر لیا گیا تو لٹریچر کی ہسٹری حیدر آباد کو کبھی ''مان'' معاف نہیں کر سکے گی۔

میری درخواست پڑھ کر وہ داڑھی کھجانے لگے میں نے کہا حیدری صاحب آپ اپنے دماغ پر بار نہ ڈالیں میں ہر مصیبت کے لئے بخوشی تیار ہوں انہوں نے کہا جوش صاحب یہ فنانس کا معاملہ ہے اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے میں نے کہا مجھے تو صرف چار دن کی فرصت ہے۔

یہ سن کر انہوں نے سر جھکا لیا سوچنے لگے پھر اپنی خشخشی داڑھی کھجائی عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی اور آخر کار گردن کے ایک فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ میری درخواست منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے اور دوسرے ہی دن مجھ کو پانچ ہزار مل گئے۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا، در و دیوار دیکھ کر!

ہائے کیسے بتاؤں کہ حیدر آباد سے روانگی کے وقت۔ میرے دل کا کیا عالم تھا ایک طرف غم دوراں تھا اور ایک طرف غم جاناں میری معاش کی شمع بجھ کر دھواں دے رہی تھی اور میرے معاشقے کا چاند گہنا کر اداسی برسا رہا تھا بیوی ریل کے ڈبے میں اداس بیٹھی تھیں اور محبوبہ، اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں اور میرا یہ عالم تھا

www.pdfbooksfree.pk

کہ بیوی کی نظر بچا بچا کر بار بار ویٹنگ روم جاتا محبوبہ کو گلے لگا کر روتا، اور آنسو پونچھ پونچھ کر باہر آتا اور سید علی اختر مرحوم، سید ابوالخیر مودودی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے (جو مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے) باتیں کرنے لگتا تھا۔

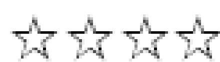
میں اسی عالم میں تھا کہ نواب ذوالقدر جنگ آ گئے اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا یہ میرے نام کا شاہی فرمان ہے اسے پڑھ لیجئے فرمان حرف بحرف یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ ہندوستان جا کر وہ اپنے قلم کو ہمارے خلاف استعمال نہ کریں اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے میں نے کہا نواب صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں میرا شکر یہ عرض کر کے یہ کہہ دیجئے کہ میں ان کی ہدایت پر عمل کروں گا لیکن معافی طلب کرنے پر آمادہ نہیں ہوں نواب ذوالقدر جنگ نے کہا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سرکار والا کو برا کہیں اور سرکا والا الٹے آپ سے معافی طلب کریں اتنے میں ریل رینگنے لگی، میں دوڑ کر سوار ہو گیا سب کو سلام کیا میری محبوبہ ویٹنگ روم سے نکل آئی اس نے آنسو سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھے رخصتی سلام کیا، سلام کر کے لڑکھڑا گئی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گلے لگا لیا اور گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہرچند اس عالم پر اب ایک جگ بیت چکا ہے لیکن آج بھی جب کبھی اس کی یاد آ جاتی ہے کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں قیامت کے دن ایک متنفس بھی زندہ نہیں رہے گا وہ مجھے دیکھیں کہ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے اور آج تک زندہ ہوں لیکن ایسی زندگی بھی کس کام کی کہ جیتا جاگتا آدمی اپنے کو ''مرحوم'' لکھنے لگے ہائے وہاں سے کوچ کے وقت زلفوں سے مہکتی اور طبلوں سے گمکتی سرشار، راتیں، عثمان ساگر کی سہانی صبحیں، پہاڑوں کی رنگین بدلیاں سکندر آباد کی البیلی شامیں اور یاران دکن کی چہکتی صبحیں میرے سامنے کھڑی ماتم کر رہی تھیں معظم جاہ کا دربار آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھ رہا تھا اور کسی کی حریم ناز سے ہائے ہائے کی آوازیں آ رہی

تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ میں خود اپنے ارادے سے فردوس دکن کو تج دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
یاں لبوں پر جنبش آہ تنگ جاں وانصیب
واں مژدہ میں لرزش اشک گریزاں ہائے ہائے
یاں کف پا چوم لینے کی بھنچی سی آرزو
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے
میں سراپا ساز عشرت اور وقف درد و غم
تو مجسم ناز کی اور بار حرماں ہائے ہائے
وہ مرے ہونٹوں میں کچھ کہنے کی حسرت دل شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے

میں اپنے ڈبے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا غم دوراں اور غم جاناں کی پرشور موجوں نے میرے تمام وجود کو ڈھانک لیا اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے آبائی جائیداد نے پکار پکار کر مجھ سے کہا جب تک تین برس کا ٹھیکہ موجود ہے مجھ سے کسی فائدے کی امید نہ رکھنا پھر ان احباب کے چہروں پر تصوری نگاہ ڈالی جن کی بار ہا عقدہ کشائی کر چکا تھا وہ ہچکچاتے نظر آئے اقرباء کا خیال آیا تو دیکھا کہ وہ میری بربادی پر مسکرا رہے ہیں اور آخر کار جھانسی تک آتے آتے میں نے یہ بات طے کر لی کہ اپنے قدر شناس قاضی سر عزیز الدین کے پاس چلا جاؤں جو دتیا کے وزیر اعظم ہیں۔



www.pdfbooksfree.pk

دربدری

جھانسی پہنچ کر میں نے بیوی کو جب اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لو، وہ بڑی اداسی کے ساتھ ملیح آباد کی طرف روانہ ہو گئیں اور میں ریاست دتیا جانے کے لئے جھانسی اسٹیشن پر اتر گیا۔

دتیا پہنچ کر قاضی صاحب کو میں نے اپنی ساری داستان سنا دی انہوں نے کہا جوش صاحب آپ شخصی حکومت کا بار اٹھانے کے واسطے بنے ہی نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا جوہر عطا فرمایا ہے میری رائے ہے کہ آپ آگرے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کر دیں پرچے کا نام رکھئے ''سلطنت۔۔۔۔'' آگرے میں آپ کو رہنے کی دشواری اس لئے نہ ہو گی وہاں آپ کے نانا کا عالی شان محل موجود ہے۔

میں نے کہا قاضی صاحب رائے تو بہت اچھی ہے مگر کس برتے پر اخبار نکالوں انہوں نے جواب دیا کہ آپ ریاست دتیا کے برتے پر اخبار نکالیں سر دست، ریاست آپ کو ساڑھے چار سو فی ہفتہ کے حساب سے سولہ سو روپے ماہانہ دے گی اور سال آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دگنی کر دی جائے گی منظور ہے آپ کو؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے ان کی پیش کش فوراً منظور کر لی اس کے بعد انہوں نے کہا آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیں میں دوسری ریاستوں سے بھی آپ کو امداد دلا دوں گا قاضی صاحب کی اس تجویز سے میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اور رات کو مشاغل سے فرصت پا کر سو گیا صبح جب ان کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہو گی میں نے کہا آپ فرمائیں انہوں نے کہا پرو برٹش (فرنگی حکومت کی حمایت) یہ سنتے ہی میرا چہرہ ملگجا سا ہو کر رہ گیا قاضی بھانپ گئے انہوں نے بڑے ولولے کے ساتھ میز پر گھونسا مار کر کہا جوش صاحب برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ) ایک نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت اگر یہ حکومت خدانخواستہ

باقی نہ رہی تو میری یہ بات کان کھول کر سن لیجئے کہ ہندو ہم کو کچا چبا ڈالے گا سرکاری نوکری تو بڑی بری چیز ہے وہ ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دے گا، گائیں آپ کی کھیتیاں چر لیں گی، اور آپ گائے پر ہاتھ اٹھائیں گے تو کم سے کم آپ کا ہاتھ توڑ ڈالا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ قتل بھی کر ڈالے جائیں ہندو آپ کے خون سے ہولی کھیلے گا آپ کے ایم اے لڑکوں پر ہندو میٹرک کو ترجیح دی جائے گی، اور آپ کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا فرمایئے کیا آپ اس پر تیار ہیں؟ میں نے کہا قاضی صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھ کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے میری بات کاٹ کر انہوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آ گئے ہیں دیکھئے یہ آپ کی روزی، اور تمام مسلمانوں کی فلاح کا سوال ہے آپ فیصلے میں جلدی نہ کیجئے۔

لیکن جب ان کے بار بار سمجھانے کے بعد بھی میں نے فرنگی کی حمایت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انہوں نے مایوس ہو کر کہا اگر آپ برٹش حکومت کی مخالفت کریں گے تو مجھے افسوس ہے کہ ریاست آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکے گی اور اگر میں ریاست سے آپ کی امداد کروں گا تو میری پرائم منسٹری ہی ختم ہو جائے گی میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کو آپ کے وعدے سے سبکدوش کرتا ہوں۔

اور رخصت ہوتے ہوئے، میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آپ نے تو دل سے یہ چاہا تھا کہ میری زندگی سدھر جائے لیکن میرے مزاج کی انفاد نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا لیکن میں اس کرم کا بار اٹھا نہیں سکا خطا آپ کی نہیں میری ہے۔

مہر چہ ہست، از قامت کوتاہ بے ہنگام ماست
ورنہ تشریف تو بربالائے کس کوتاہ نیست

www.pdfbooksfree.pk

ڈھول پور آیا تو ڈھول پور کے سب سے بڑے جاگیردار، اور اپنے حقیقی ماموں کی حویلی کے عوض اپنے پرانے دوست سردار روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرا۔

میں نے اپنی روداد سنائی اور کہا کہ مہاراجہ کے پاس آیا ہوں شاید وہ کوئی ملازمت دے دیں روپ سنگھ نے کہا مہاراجہ بڑا پاپی ہے، مجھے اس سے کوئی امید نہیں جب تک تمہاری کوئی صورت نہ نکلے تم میرے ہی ساتھ رہو ملیح آباد جا کر بھابی کو بلا لاؤ۔ نواب صاحب (میرے ماموں) کے باڑے کی حویلی میں ان کو ٹھہراؤ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے میں پانچ سو روپے ماہانہ تم کو دیتا رہوں گا جب اچھے دن آ ئیں تو ادا کر دینا۔

میں نے کہا میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے بے کہے تم میری امداد پر آمادہ ہو گئے روپ سنگھ نے میری بات کاٹ کر کہا یہ کون سی انوکھی بات ہے کیا ہم دونوں بہت پرانے دوست نہیں ہیں؟ کیا تم نے، اپنے ماموں پر ترجیح دے کر میرے یہاں قیام نہیں کیا ہے؟ کیا ہم میں کوئی غیریت ہے؟ میں راج پوت ہوں تم پٹھان، تم مسلمان راج پوت ہو، میں ہندو پٹھان۔

میں نے کہا بھائی روپ سنگھ میں سوچ کر جواب دوں گا روپ سنگھ نے کہا سوچ کر جواب دینے والے کی ایسی تیسی ابھی ابھی جواب دو ورنہ چھاتی پر چڑھ کر گلا دبا دوں گا میں نے ہنس کر کہا ایسی ہول جول کا ہے کی ذرا سوچ تو لینے دو یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے جست لگائی مجھ کو فرش پر گرا دیا میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور زور زور سے میرا گلا دبا دبا کر کہنے لگے منظور ہے کہ نہیں یا مار ڈالوں؟ میں نے کہا منظور منظور اے ظالم منظور میری آنکھوں سے شکریئے کے آنسو بہنے لگے۔ کانوں سے سنتے تھے ورنہ ستانی بستم می رسد، آنکھوں سے دکھا دیا روپ سنگھ نے دوست ہو تو ایسا میں نے تار دے کر بیوی کو ڈھول پور بلا لیا وہ چھوٹے دادا اور سخاوت وظفر 1 کو ساتھ لے کر آ گئیں میں بھی روپ سنگھ کے باڑے سے اٹھ کر ماموں کے باڑے آ گیا اور ان کی خالی حویلی میں رہنے لگا

کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملا، ہر بار انہوں نے ملازمت کا وعدہ کیا لیکن ایفاء کی نوبت نہیں آئی جب اس گومگو میں دو تین مہینے گزر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

اسی اثناء میں خواب دیکھا کہ مولوی احمد حسین 2 صاحب فرما رہے ہیں کہ مہاراجہ سے کوئی امید نہ رکھئے آپ ایک رند پاک باطن ہیں، وہ بگلا بھگت صبح ایک تار آئے گا اس پر عمل کیجئے گا میں نے بیدار ہوتے ہی روپ سنگھ کو یہ خواب سنا دیا انہوں نے کہا یہ خواب تو ایسا ہے کہ اس کے سچے جھوٹے ہونے کا تو آج ہی پتہ چل جائے گا۔

اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر گپ شپ کر رہے تھے کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری آ گئے اور مجھ سے کہا میں آپ سے تخلیئے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور جب میں ان کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو انہوں نے کہا سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا درخت اور چھال کا ہوتا ہے اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو میں بے بکل کا درخت ہو جاؤں گا میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ دینا چاہتا ہوں مگر دو شرطیں ہیں ایک تو کہ وہ شراب ترک کر دیں اور دوسری یہ ہے کہ روپ سنگھ 3 سے ملنا چھوڑ دیں میں نے کہا مہاراجہ سے جا کر کہہ دیجئے کہ انہوں نے میری ذات کے ساتھ جس یگانگی کا اظہار کیا ہے میں اس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود نہ تو میں شراب ہی ترک کروں گا نہ روپ سنگھ ہی کی محبت سے دست بردار ہوں گا۔

روپ سنگھ پردے کی آڑ سے یہ باتیں سن رہے تھے میرا یہ آخری فقرہ سن کر وہ یہ

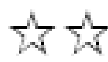
1 ایک پر دہ وہ دوسرا ملازم 2 آ گے ان کا تفصیلی حال آئے گا 3 روپ سنگھ مہاراجہ کے ساتھ کھیلے ہوئے دوستوں میں تھے جو آب معتوب ہو چکے تھے۔

کہتے کمرے میں در آئے کہ سیکرٹری صاحب ٹھہریئے سرکار سے جا کر کہہ دیجئے کہ جوش شراب بھی چھوڑ دیں گے اور روپ سنگھ سے بھی منہ پھیر لیں گے۔ سیکرٹری نے

پوچھا جوش صاحب آپ کیا کہتے ہیں میں نے کہا میں شراب اور روپ سنگھ دونوں کو نہیں چھوڑوں گا مجھے سرکار کی یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں روپ سنگھ نے ڈپٹ کر کہا تم کو چھوڑنا پڑیں گی یہ دونوں چیزیں میں نے کہا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا نہیں چھوڑوں گا اور اسی شوروغل میں سیکرٹری صاحب ارے رام ایسی پکی دھن ایسی پکی دوستی کہتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

سیکرٹری کے چلے جانے کے بعد روپ سنگھ نے انگلی اٹھا کر کہا تم ڈیم فول ہو، سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا میں نے کہا تم ڈیم فول ہو، میں نے سارے بگڑے ہوئے کھیل کو سنوار دیا انہوں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ میں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے؟ انہوں نے کہا میں ہرگز ہرگز اپنی غلطی تسلیم نہیں کروں گا اب میں نے جست کر کے ان کو گرا دیا سینے پر چڑھ بیٹھا، اور ان کا گلا دبا کر کہا تسلیم کرو اپنی غلطی انہوں نے کہا اچھا باوا جان تو چھوڑ دو، میں ہی غلطی پر ہوں میں ان کے سینے سے اتر آیا اور وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگے کہ میری خاطر تم نے بہت بڑا ایثار کیا۔

اب ہم پھر برآمدے میں آ کر بیٹھ گئے روپ سنگھ نے کہا تمہارے خواب کا پہلا حصہ تو سچا نکلا کہ مہاراجہ سے قطع تعلق ہوگیا اب اگر تار بھی آ گیا تو پورا خواب سچا ثابت ہو جائے گا۔



www.pdfbooksfree.pk

رسالہ ''کلیم'' کا دہلی سے اجراء

دہلی پہنچا تو مسز نائیڈو برس پڑیں کہنے لگیں ذرا اس کا نام تو بتایئے جس نے آپ کو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مر چکی ہے۔۔۔میں نے حیران ہو کر پوچھا یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انہوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھ کو زندہ سمجھتے تو سیدھے میرے پاس آ کر اپنی بپتا کہتے اور میرا جواب سنے بغیر انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر گھوش مجھ کو نہ لکھتے تو مجھے یہ پتا ہی نہ چلتا کہ آپ ڈھول پور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے کہا میں آپ کے ٹمپرامنٹ سے واقف ہوں کچھ نہ کہئے میری خواب گاہ میں جایئے میرے تکئے کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے اسے کھولے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیجئے ذرا سنبھال کر رکھئے گا تا کہ گر نہ جائے اب آپ کا یہ کام ہو گا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہ نامہ نکالیں گے اور کسی ریاست کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔

میں رسالے کا نام ''کاخ بلند'' رکھنا چاہتا تھا میرے دوست ذوالفقار علی صاحب بخاری نے رائے دی کہ میں رسالے کا نام کلیم رکھوں کاخ بلند نام مشکل ہے میں نے یہ رائے مان لی اور رسالے کے اجراء کے ابتدائی مراحل میں سرگرم ہو گیا۔

رسالہ نکالنا ایک تجارتی امر ہے میری سات پشتیں بھی تجارت سے واقف نہ تھیں اس لئے ابتدائی مراحل ہی میں بہت سا روپیہ برباد ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دہلی کے احباب نے مجھے گھیر لیا روز بوتلیں کھلنے اور دعوتیں ہونے لگیں اور کاتبوں کاغذ والوں بلاک سازوں اور چھاپہ خانے والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں سرا سر لرآ دمی ہوں مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ تر بھر ہو گیا شرم آئی کہ مسز نائیڈو سے یہ داستان

کہوں اورسوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بیمار پڑ گیا بخار اس قدر تیز آیا کہ حواس گم ہو گئے اور نزلہ اس قدر شدید ہوا کہ تمام سینہ رندھ کر رہ گیا اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی اور میں سمجھا کہ اب جانبر نہیں ہوسکوں گا۔

میں اس زمانے میں فتح پوری کے کراؤن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا بڑی مشکل سے ایک پرچہ پر میں نے مسز نائیڈو اور جواہر لال کا نام لکھا اور پرچہ لے کر کراہتا نیچے آیا مینجر کو وہ پرچہ دے کر کہا اگر میں مر جاؤں تو فوراً ان دونوں کو خبر کر دیجئے گا مینجر نے بے حد بدحواس ہو کر مجھ سے کہا جوش صاحب خدا کے واسطے خودکشی نہ کیجئے گا مجھ کو مینجر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی اور کہا مینجر صاحب میں بزدل نہیں کہ خودکشی کروں میری حالت خراب ہے اس لئے سوچا کہ مسز نائیڈو اور جواہر کو خبر ہو جائے مینجر دوڑا ہوا گیا اور ڈاکٹر سید ناصر عباس صاحب کو جن کا مطب وہاں سے دس قدم پر تھا اپنے ساتھ لے آیا ڈاکٹر صاحب مجھے پہلے سے جانتے تھے میرے سینے کا معائنہ کیا اور مطب جا کر، اپنے آدمی کے ہاتھ دوائیں بھیج دیں۔

دوائیں پی کر ابھی لیٹا ہوا اپنی بے کسی پر غور اور اپنی موت کی آمد کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی اور پنڈت شیونرائن صاحب (جن کا مطبع ہوٹل سے ملا ہوا تھا اور جن کو مطلبی فرید آبادی مجھ سے ملا چکے تھے میرے کمرے میں داخل ہو گئے) میں نے کہا آیئے شیونرائن صاحب افسوس کہ میں اٹھ نہیں سکتا آپ میرے سرہانے بیٹھ جائیں مزاج پرسی کے بعد انہوں نے کہا جوش صاحب مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ رسالہ نہیں نکال سکتے میں کاروباری آدمی ہوں میرے پاس اپنا ذاتی چھاپہ خانہ بھی ہے اس لئے آپ پسند کریں تو میں آپ کا پچاس فیصد شریک ہو جاؤں۔ قلم آپ کا چلے گا روپیہ میں لگاؤں گا اور جب تک رسالہ چلنے نہ لگے پانسو روپیہ ماہانہ آپ کو بطور پیشگی دیتا رہوں گا میں نے اس تجویز کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور فوراً قبول کر لیا۔

دو چار دن کے اندر پنڈت شیونرائن نے ہوٹل کے سامنے ہی دو کمروں اور کشادہ

صحن کا فلیٹ دفتر اور میری سکونت کے واسطے کرایہ پر لے لیا اور میں ہوٹل سے وہاں اٹھ آیا۔

اس کے کچھ روز کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آنا چاہتا ہوں تو انہوں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس کو فرنیچر سے آراستہ کر دیا اور میں بیوی کو لے آنے کے لئے دھول پور چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ میری بیٹی بیمار ہے بیوی اس کو آگرے لے کر چلی گئیں اور کسی ہسپتال میں وارڈ لے کر مقیم ہیں اور میرا بیٹا میرے دوست لطیف الدین کے مکان میں رہتا ہے سخاوت اور ظفر و بھاگ چکے ہیں دوسری ہی گاڑی سے گھبرایا آگرے۔ لطیف کے گھر گیا، دیکھا کہ میرا بیٹا اور اس کا چچا زاد بھائی دونوں ایک نہایت بوسیدہ اور میلی دری پر اداس بیٹھے ہیں میرے بیٹے نے مجھے دیکھا دوڑ کر میرے گلے لگ گیا اور روہانسی آواز میں کہنے لگا ابا ہم یہاں اس دری پر سوتے ہیں ہم کو چارپائیاں بھی نہیں دی گئی ہیں اور ہم روز دس روپے دیتے ہیں تو ہمیں کھانا ملتا ہے اور وہ بھی ابلا سبلا۔ جی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگوں لیکن اس خیال سے ضبط کیا کہ میرے پرانے دوست لطیف برا مانیں گے غالباً لطیف کی معاشی حالت اس وقت بگڑ چکی تھی۔

لڑکے کو لے کر ہسپتال پہنچا دیکھا بیوی کا منہ اترا ہوا ہے اور بیٹی نڈھال پڑی ہے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور آنسو جاری ہو گئے بیٹی بھی رونے لگی بیوی نے آنسو پونچھ کر کہا اللہ کے لئے اس طرح نہ روؤ، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ارے ہم کیا ہیں بڑی بڑی شہزادیوں پر اس سے بھی برے وقت پڑ چکے ہیں اللہ کا شکر کرو لڑکی کو پلوریسی ہو گئی تھی اب اچھی ہو چکی ہے بس طاقت آنے کی دیر ہے۔

میں نے بیوی سے کل حالات بیان کر دیئے انہوں نے کہا بس آٹھ دن کی دیر ہے یہاں ٹھہر جاؤ، پھر ہم سب ساتھ دہلی چلیں گے۔

آٹھویں دن دہلی آ گیا،قرول باغ کی کوٹھی آباد ہوگئی۔۔۔۔''کلیم'' اچھا خاصہ چلنے لگا،معقول آمدنی ہونے لگی،میری نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ گئے حیدر آباد سے عثمانی وظیفہ بھی جاری ہوگیا اور زندگی چین سے گزرنے لگی۔

سال دو سال آرام سے گزرنے کے بعد،میری زندگی پھر ایک بحران کی جانب مڑ گئی ایک روز شام کے وقت شیونرائن خشک چہرے کے ساتھ آئے اور کلیم سے اپنی دست برداری کا اعلان کر کے کہہ دیا کہ کل سے آپ اپنا پرچہ خود سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ شیونرائن صاحب نے اپنے بھائیوں کے دباؤ میں آکر یہ بات کی تھی، مگر ان کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مجھے کم سے کم تین مہینے کا نوٹس دیتے،مگر انہوں نے صرف بارہ گھنٹے کا نوٹس دے کر علیحدگی اختیار کر لی۔۔۔میں سیدھا اپنے پڑوسی محمود علی خان جامعی کے پاس پہنچا،اور کلیم کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا لیکن جب ایک مہینہ کے بعد انہوں نے کلیم کی آمدنی کے صرف نوے روپے میرے حوالے کیے تو میں دنگ ہو کر رہ گیا مگر فرط مروت سے کچھ کہہ نہ سکا (خدا غارت کرے اس مروت کو، اے خدا مروت کو کیا غارت کرے گا،خود مروت نے مجھ کو غارت کر کے رکھ دیا آج بھی غارت کئے ہوئے ہے اور انشاءاللہ مرتے دم تک غارت کرتی رہے گی)

جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے مسٹر پانی کار کو خط لکھا اور پانی کار نے تار بھیج کر مجھ کو پٹیالہ بلا لیا پٹیالے پہنچتے ہی انہوں نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ سے ملوا کر میرا وظیفہ مقرر کرا دیا۔اب دہلی آ کر میں نے محمود علی خان سے رسالہ نکال لیا۔قرول باغ سے دریا گنج اٹھ آیا۔ایک کوٹھی ادیبۃ بھون کرائے پر لے لی ایک لکھے پڑھے ذہین پنجابی نوجوان اور دہلی کے دو تجربہ کار بوڑھوں کو ملازم رکھ کر میں

1۔وہ مدراسی زبان کے شاعر ادیب اور مہاراجہ پٹیالہ کے وزراء میں سے تھے جن سے سروجنی نائیڈو ملا چکی تھیں۔

خود رسالہ نکالنے لگا،اور حکیم حضرت آزاد انصاری بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے اور

حیرت ہے کہ خود میری بیوی بھی کلیم کے کاروبار میں میری دستگیری کرنے لگیں اور ''کلیم ''صوری و معنوی، دونوں حیثیتوں سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

میں نے اسی زمانے میں اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد خان سے اپنی بیٹی سعیدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی، میری بیٹی کی شادی کا کھانا پکوایا تھا قرول باغ کے عبداللہ صاحب نے اور ایسا اچھا کھانا پکوایا تھا کہ باید و شاید خدا جانے عبداللہ صاحب اب کہاں ہیں جہاں کہیں بھی ہوں میری یہ آواز سن لیں کہ میں آج تک ان کو یاد کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ، اس موقع پر میرے جگری دوست سردار دیوان سنگھ مفتون نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا تھا میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دہلی کلاتھ مل کے لالہ شنکر لال اور سروجنی نے جو تحائف دیئے تھے میرے دل میں ان کی یاد اور ان کا تشکر بھی آج تک شاداب ہے۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہذیب، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ اقوال و اوہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم، اور مسلم لیگ کی تنقیص اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بناء پر شاہ فرنگی اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے غلامی پرست مخالفین مسلم لیگ کے '' خطاب یافتہ مجاہدین '' حکومت کے کفش بردار حکام اور منبر و محراب پر بلبلانے والے سرکاری وظیفہ خوار علمائے کرام لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر اکھاڑے میں اتر آئے تھے۔

ادھر پلٹنیں تھیں اور ادھر میں ایک فرد واحد تھا کہ آواز دے رہا تھا۔

من و گرز و میداں و افراسیاب

1 میں کلیم کے دور آخر میں تحریک پاکستان کا حامی بن گیا تھا اور پاکستان کی حمایت میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے

www.pdfbooksfree.pk

ایک ایسی گھن گرج نظم پڑھی تھی کہ ہال گونجنے لگا تھا اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے بے حد شکایت پیدا ہو گئی تھی (وہ نظم میرے کسی مجموع میں شائع بھی ہو چکی ہے)

آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے لگا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گم نام خط آیا کرتے تھے خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی اور بیوی چلاتی رہتی تھیں کہ ارے منہ اندھیرے ٹہلنا چھوڑ دو، نہ جانے اندھیرے میں کون پیچھے سے آ کر چھری مار دے لیکن میں ہر روز تاروں کی چھاؤں میں ایک زبردست تنبیہ الغافلین قسم کا ڈنڈا لے کر جمنا کے کنارے بڑے اطمینان کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا کہ آخر میں بھی آفریدی پٹھان ہوں دو چار کو مار کر مروں گا۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ، بینی پشت من
آں منم، کاندر میان خاک و خوں بینی سرم

اس کلیمہ دور میں ایک بار سر تیج بہادر سپرو صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب اگر آپ برٹش ایمپائر کی موافقت میں اور سوشلزم کے خلاف نظمیں کہنا اور مضامین لکھنا شروع کر دیں تو تھوڑی ہی مدت میں لکھ پتی بن سکتے اور حکومت سے خطاب حاصل کر سکتے ہیں بڑے بڑے والیان ریاست آپ کی شاعری کے رومانٹک اور نیچرل سینریز کے حصوں کو بہت پسند کرتے ہیں اگر آپ اپنی یہ روش بدل دیں تو ریاستوں سے بھی آپ کی لٹریری پنشنیں مقرر ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا سپرو صاحب آپ میرے باپ کے احباب میں سے ہیں میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں لیکن آپ برا نہ مانیں تو اتنا عرض کروں کہ شاعری ایک خالص وجدانی معاملہ ہے جس کو جلب منفعت کا ذریعہ بنانا گناہ ہے اس لئے مجھ کو یہ امر اپیل نہیں کرتا کہ اگر میں حکومت یا امراء کی تعریف کروں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا۔ شاعری کو جانچنا چاہئے اس کے مفید یا مضر اثرات کی روشنی میں۔۔۔۔۔۔اور اگر محکم

دلائل کے ساتھ آپ اس امر کو ثابت فرما دیں کہ ہندوستان کے واسطے انگریز کی حکومت، اور والیان ریاست کی ہستی مفید اور بابرکت ہے تو میں اپنی روش ترک کر دوں گا۔

یہ سن کر سپرو کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ غیظ کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہو گئے اور انہوں نے اپنے تلخ لہجے میں ملائم تبسم کی پھیکی سے شیرینی پیدا کر کے مجھ سے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ پھر آپ حیدر آباد اور پٹیالے سے وظائف کیوں لیتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا سپرو صاحب غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ میں منکر مے بودن وہم رنگ مستاں زیستن پر عمل پیرا ہوں مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کر کے مجھے اس کا موقع دے دیا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں پہلی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ ان والیان ریاست کے پاس جو دولت ہے وہ ان کی نہیں، بلکہ عوام کی ہے اس لئے کہ وہ ہماری محنت کی پیدا کردہ اور انسان کے ضائع شدہ حقوق کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوت استعمال کر کے، ان کی دولت چھین لیں اور اس کا عامۃ الناس میں تقسیم کر دیں اور جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو ہم کو چاہئے کہ ان کی دولت سے تمتع کی سعی کرتے رہیں۔

اگر ہم اپنے اصول قربان کئے بغیر، ان سے ایک روپیہ بھی وصول کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ان کو بقدر یک روپیہ کمزور کر دیا، اور اپنے کو بقدر یک روپیہ قوی بنا لیا۔۔۔۔ اور وہ ایک روپیہ جو مسخروں اور بھانڈوں بھگتیوں پر ضائع ہو جاتا، اپنے مصرف میں لا کر ہم نے اس سے بہتر کام لیا۔

یہ تو مختصر سا اصولی جواب ہے اب میری دونوں پنشنوں کی روداد سن لیجئے۔۔۔۔۔۔ جہاں تک میری حیدر آباد کی پنشن کا تعلق ہے وہ پنشن عتابی پنشن ہے میں نے نظام کے خلاف نظم کہی، معتوب ہوا اور حسب روایت خاندان آصفیہ پنشن کا مستحق ٹھہرا دیا گیا اور اب تک سرتابی کی داد حاصل کر رہا ہوں۔۔۔۔ اب رہا

پٹیالے کی پنشن کا معاملہ تو میری وہ پنشن سیاسی نہیں خالص ادبی ہے آج تک مہاراجہ نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں فرنگی کے خلاف شعر کہنا یا کھدر پہننا ترک کر دوں اگر مہاراجہ کی پنشن مجھے میرے اصول سے منحرف کر دیتی تو مجھ سے زیادہ ذلیل اور کون ہو سکتا تھا لیکن اس عالم میں کہ وہ پنشن قطعی طور پر غیر مشروط ہے میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

میری یہ باتیں سن کر سپرو خاموش ہو گئے لیکن چہرے پر تکدر کی شکنیں ابھر آئیں اور ان کے چشم و ابرو سے یہ بات ٹپکنے لگی گویا میں نے براہ راست ان کی اہانت کر دی ہے۔

وہ تا حیات مجھ سے روٹھے رہے سچ کہا ہے صائب نے:

گفتار صدق مایہ آزار می شود
چوں حرف حق بلند شد دواری شود



سیاست افرنگ کے دو رخ

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہ نامہ ''کلیم'' کو کامیابی سے چلا کر اور ایک ایسے روحانی عذاب میں گرفتار ہو کر جس نے میرے حواس چھین لئے تھے میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آباد[1] چلا گیا۔ اور چوں کہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا، میں نے اپنے داماد التفات احمد کو مینجر بنا دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نام خدا بالکل نکھٹو ہیں، میں نے ''کلیم'' بند کر کے مجاز، علی سردار، اور سبط حسن کی درخواست پر اس کو ان لوگوں کے رسالہ ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا جو ''کلیم و نیا ادب'' کے از روئے قواعد غلط نام کے ساتھ لکھنو سے جاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے ملیح آباد آ کر چھ سات مہینے کے بعد میرے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا۔ اور میں ''قصر سحر'' کی چمن بندی، اور توسیع میں لگ گیا۔

ارے میں ادب نقیب، کشتہ التفات حبیب، اور باغوں کی تنصیب۔۔۔۔۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔۔۔۔۔ بیوی تل گئیں آموں کے باغ لگوانے پر اور ایسی تل گئیں کہ کھانا پینا دوبھر کر دیا۔ ہر آن یہ رٹ لگ گئی کہ باغ لگاؤ، اور جب تک باغوں میں قلم نہ لگ جائیں قلم نہ اٹھاؤ۔ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل ڈرامائی نظم ''حرف آخر'' شروع کی تھی انہوں نے وہ نظم بھی نہیں کہنے دی۔[2]

[1] غالباً 1940ء میں [2] اور آج تک وہ نظم نا تمام پڑی ہوئی ہے نہ جانے اس کو تمام بھی کر سکوں گا یا نا تمام ہی چھوڑ کر سدھار جاؤں گا۔

تنگ آ کر میں نے ماتا دین پٹواری کو بلایا پٹواری نے کہا منجھلے بھیا[1] اب قانون بدل گیا ہے آپ کسی کاشتکار کو بے دخل کر کے اس سے زمین نہیں نکال سکتے اور جب زمین ہی نہیں نکل سکے گی تو باغ کیسے لگے گا۔

ماتا دین کی یہ بات سن کر میں باغ باغ ہو گیا کہ چلو ایک بڑی مصیبت کٹ گئی میں

www.pdfbooksfree.pk

خوشی خوشی بیوی کے پاس گیا اور جھوٹ موٹ کا غمگین چہرہ بنا کر پٹواری کی بات دہرا دی لیکن بیوی مایوس نہیں ہوئیں مجھے اور پٹواری کو ساتھ لے کر گاؤں گئیں، تھانے کے سامنے کاشتکاروں کو جمع کر کے، پٹواری سے کہا پوچھو کاشتکاروں سے کہ منجھلے بھیا1 نے کیا تم پر کوئی ظلم ڈھایا ہے؟ تم پر لگان وصول کرنے میں کبھی سختی کی ہے تم سے کبھی بیگار لیا ہے اور جب ماتا دین نے یہ تمام سوالات کیے تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں ناہیں، ناہیں کبھو ناہیں (نہیں نہیں کبھی نہیں) منجھلے بھیا کی جی منجھلے بھیا کا راج بنا رہے گنگا دھار تک (جب تک گنگا میں پانی ہے) پھر بیوی نے کہا ماتا دین سے پوچھو اگر بھیا باغ لگانے کے لئے تم لوگوں سے تھوڑی تھوڑی زمین مانگیں تو کیا تم نہیں دو گے؟ ساری رعایا نے یک زبان ہو کر کہا ''دیبا، دیبا، ابھوں ابھوں دیبا، گلے گلے دیبا (دیں گے، دیں گے، ابھی ابھی دیں گے، گلے گلے دیں گے)''

اس کے بعد ماتا دین نے استعفے نکالے اور کاشتکاروں نے دھڑا دھڑ انگوٹھے لگانا شروع کر دیئے اور جب تمام استعفے مکمل ہو گئے بیوی نے مجھ سے کہا اب تم ان کا شکریہ ادا کرو اور جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو تمام کاشتکار رونے لگے بھیا، ہم تو تمہاری پنہئی ہیں اس نہ کرو بھیا ہم تو تمہاری جوتی ہیں ایسا نہ کرو۔

بیوی نے مٹھائی تقسیم کی، رعایا نے منجھلے بھیا کی جے کے نعرے لگائے اور دو تین مہینے کے اندر آم کے باغ نصیب ہو گئے اور بیوی نہال ہو گئیں۔

میں غالباً 1941ء میں پھر لکھنو آ کر رہنے لگا یہ سچ ہے کہ ملیح آباد میں بے حد سکون تھا امانی گنج کے میدان کی خالص ہوائیں تھیں، طلوع و غروب کے مناظر تھے۔

1 پہلے بھیا تھا اب بوڑھا کھوسٹ ہوں

بوری خوشبو، کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی ہو تھی اور لکھنے پڑھنے کی فرصت۔

لیکن آدمی، مدنی حیوان ہے شام کو جب لکھنے پڑھنے کے جج اکبر سے فارغ ہو کر بادہ خواری کی عبادت شروع کرتا تھا تو شدید تنہائی کے سوا کسی کو شریک نہیں پاتا تھا اور

دوستوں کو آنکھیں ڈھونڈ نے لگتی تھیں اور چونکہ۔

زاہد کی نماز ہو کہ مے کش کی شراب

دونوں کا مزا ہے با جماعت ساقی

اپنی تنہائی پر دل اداس ہو کر رہ جاتا۔

ایک روز اس گھٹن میں پی رہا تھا کہ دل ڈوبنے لگا، یاروں کے چہرے، اور دل داروں کے مکھڑے آنکھوں کے نیچے پھرنے لگے رباعی کا ایک مصرع زبان پر جاری ہو گیا۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا

جی میں آیا کہ قافیے کو ''ن'' کی شرط پر لگا کر کہوں ن کی شرط لگا کر ''تنہا'' کا ''نباہ'' بڑا ہی مشکل نظر آیا بہر حال طبیعت پر زور ڈال کر رباعی کہہ ڈالی آپ بھی سن لیں اور میری جگر کاوی کی داد دیں۔

افسوس، شراب پی رہا ہوں تنہا

غلطاں بسبو، تمام خون فن ہا

ٹھہری ہوئی، ساغر میں نظر آتی ہے

صہبا۔۔۔ رضی اللہ تعالی عنہا

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ملیح آباد کی بے احباب شاموں سے تنگ آ کر، میں لکھنو چلا گیا تھا اور لگے ہاتھوں اگر یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو میری گھٹن کا پورا اندازہ ہو جائے گا کہ اکثر ایسی بھیانک شامیں بھی گزرتی تھیں کہ میرے اقرباء مجھے گھیر لیا کرتے، اپنے دیوانی فوجداری مقدمات کے روح فرسا تذکرے چھیڑ دیتے۔فوجداری کے وقت، دشمن کے حملے کو خالی دے جانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے گر، اور کالے سانپوں سے بچنے کے پینترے بتایا کرتے تھے۔

ایک روز جب میں اپنی بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنو

www.pdfbooksfree.pk

کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سن رہا تھا جس میں اہل ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل کو بچانے کی خاطر، جنگ عظیم میں، برطانیہ کی مدد پر کمر بستہ ہو جائیں، اس وقت میں نے یہ مندرجہ ذیل نظم ایسٹ[1] انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو
دہر میں، انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا
بھیڑیے کو مارو گولی، پئے امن و بقا
باغ انسانی میں، چلنے ہی پہ ہے باد خزاں
آدمیت لے رہی ہے، ہچکیوں پہ ہچکیاں
بات ہے ہٹلر کا، رخش خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو، جرمنی کی آگ پر

2

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری، اور یہ ذکر!!
نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر!!
جب، یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے

[1] یہ نظم چونکہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں کہی گئی تھی اس لئے اس میں شاعرانہ محاسن کی تلاش نہ کیجئے اور چونکہ یہ نظم ضبط ہو جانے کی بنا پر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس کو یہاں درج کر رہا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔

ہندیوں کے جسم میں، کیا، روح آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ، کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

www.pdfbooksfree.pk

3

اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دور مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم!
سرد لاشوں سے، گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم!
صنعت ہندوستاں پر، موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی۔۔۔ تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

4

اللہ اللہ، کس قدر، انصاف کے طالب ہو آج
میر 1 جعفر کی قسم، کیسا دشمن حق تھا سراج 2
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرت سلطان دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کن کے سر 3 لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے

1 ہندوستان کا روسیاہ غدار (ایسے غداروں کی ہندوستان میں کبھی کمی نہیں رہی)

2 نواب سراج الدولہ بہادر (جو ہندوستان کا سپوت تھا)

3 خونی دروازے میں شہزادوں کے سر کاٹ کر، ان کے باپ حضرت ظفر کے سامنے خوان میں رکھ کر لائے گئے تھے۔

یاد تو ہو گی، وہ مٹیا 1 برج کی بھی داستاں؟

اب بھی، جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہو گا بارہا؟

آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا 2

سچ کہو، کیا حافظے میں ہے، وہ ظلم بے پناہ

آج تک رنگون 3 میں، اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہو گا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی

یاد تو ہو گا تمہیں جلیان 2 والا باغ بھی؟

پوچھ لو، اس سے، تمہارا نام کیوں تابندہ ہے

ڈایر گرگ دہن آلود، اب بھی زندہ ہے

وہ بھگت سنگھ، اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے

اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے

ہند کے رہ بر، رہا کرتے تھے، کس ہنجار سے

پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا

آج بھی گونجی ہوئی ہے، جن میں کوڑوں کی صدا

5

آج کشتی، خلق کے امواج پر، کھیتے ہو کیوں؟

سخت حیراں ہوں کہ اب تم درس حق دیتے ہو کیوں؟

1 کلکتے کی وہ عمارت جس میں حضرت واجد علی شاہ کو قید کیا گیا تھا 2 حضرت واجد علی شاہ کا تخلص۔

1 حضرت ظفر کو رنگون میں قید اور دفن کیا گیا تھا 2 پنجاب کا ایک باغ جہاں شمر خو

جرنل ڈائر نے صدہا محبان وطن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اہل قوت دام حق میں تو کبھی آتے نہیں!
آدمیت کو، کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں!

6

لیکن، آج، اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم!
ہو نہ ہو اپنے میں، اب قوت نہیں پاتے ہو تم!
اہل حق روشن نظر ہیں۔۔۔ اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں
آج، شاہد، منزل قوت میں تم رہتے نہیں؟
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرض اولیں!
کیا قتال و ظلم کا، اب تم میں کس باقی نہیں؟

7

دیر سے بیٹھے ہو، نخل راستی کی چھاؤں میں
کیا، خدا ناکردہ، کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی، نہ آبادی، نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے۔۔۔ اسپ تازی، کیا شفاخانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں، رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت، کیا نصیب دشمناں ناساز ہے
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے!
نوع انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے!
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے

www.pdfbooksfree.pk

لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

6

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل، یزید شمر تھے، اور آج بنتے ہو حسین
خیر، اے سوداگر، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے، جھکا دو گردنیں
اک کہانی۔۔۔ وقت لکھے گا، نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

☆☆☆☆☆

اس نظم کا چھپنا تھا کہ آگ لگ گئی، طلاب اور عامتہ الناس جلوس بنا بنا کر نکلنے اور اسے گلی گلی گاتے پھرنے لگے، آگے آگے وہ لوگ ہوتے تھے، اور پیچھے پیچھے پولیس 1۔

میری یہ نظم جب برلن ریڈیو سے براڈکاسٹ ہوئی تو میری شدید نگرانی ہونے لگی، اور میری کوٹھی سے ملی ہوئی دوسری کوٹھی میں، ایک سی آئی ڈی انسپکٹر صاحب میری شبانہ روز نگرانی کے واسطے آ کر رہنے لگے ایک دن سہ پہر کے وقت پولیس نے میری کوٹھی پر دھاوا بول دیا اور ایک ہندو انسپکٹر کی سرکردگی میں دس پندرہ کانسٹیبل آ دھمکے میری خانہ تلاشی کے لئے اور کھڑے ہو گئے برآمدے میں اور انسپکٹر صاحب کمرے میں آ گئے۔

انسپکٹر سے میں نے کہا جناب میرا گھر کھلا ہوا ہے، آپ شوق سے ایک ایک گوشہ چھان ڈالیں، اس پر انسپکٹر نے سرگوشی کے انداز میں کہا میں آپ کو ایسی عمدہ نظم کی مبارکباد دیتا ہوں میں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لوں گا صرف ضابطہ کی خانہ پری کر

کے چلا جاؤں گا میں نے کہا پولیس میں رہ کر آپ اس قدر شریف ہیں، بڑے تعجب کی بات ہے، اس نے کہا، میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً نوکری کرتا ہوں، مگر میں نے

1: جن لوگوں نے یہ نظم پڑھی وہ گرفتار کر لئے گئے، لیکن مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا اسی زمانے میں سنا تھا کہ تیج بہادر سپرو نے یہ کہہ کر میری گرفتاری رکوا دی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہوگئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر بہت خطرناک ہو جاؤں گا معلوم نہیں یہ خبر جھوٹ تھی یا سچ، مگر یہ واقعہ ہے کہ میری گرفتاری عمل میں نہیں آئی یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی قوم کی شرافت نے میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو انگریز محبان وطن کی دل ہی دل میں قدر کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ بحکم سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑتی تھی حکمران کی حیثیت سے انگریز کمینہ، لیکن من حیث القوم شریف تھا اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہو جاتا تھا۔۔۔ لیکن میری قوم چونکہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے یہ اپنے خلاف آواز سن کر تاپیں مارنے لگتی اور کف درو ہان ہو جاتی ہے۔

کسی انگریز فلسفی نے لکھا تھا کہ دو ڈھائی سو سال کی ذہنی ورزش کے بعد ہم نے اس اعلیٰ شرف کو پالیا ہے کہ جب کوئی ہم کو برا کہتا ہے تو ہم برا نہیں مانتے، ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کہ وہ برائی ہم میں ہے کہ نہیں ہوتی ہے تو ہم اس کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں نہیں ہوتی تو ہم اپنے برا کہنے والے کو سمجھانے کی تو ضرور کوشش کرتے ہیں لیکن اس کی عداوت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔

ضمیر نہیں بیچا ہے میرا دل آپ لوگوں کے ساتھ ہے یہ کہہ کر وہ ایک میز پر، سر جھکا کر ضابطے کی خانہ پری کے واسطے کچھ لکھنے لگا، انسپکٹر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل صاحب نے میری ٹائم پیس اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی، چوری انہوں نے کی، میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

www.pdfbooksfree.pk

اور جب ضابطہ کی کارروائی مکمل کر کے وہ انسپکٹر صاحب رخصت ہونے لگے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور ہندو کی شرافت اور مسلمان کی کمینگی دیکھ کر، مجھ کو دانتوں پسینہ آ گیا۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن، اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اس کے بعد میں نے اس واقعے پر ایک نظم کہہ کر چھپوا دی[1] جو چھپتے ہی ضبط کر لی گئی چونکہ وہ نظم بھی میرے کسی مجموعے میں طبع نہیں ہوئی ہے اس لئے اسے بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ محفوظ رہے،

جس سے امیدوں میں بجلی، آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے اس میز کے خانوں میں ہے؟
بند پانی میں سفیدے کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے؟
گھر میں، درویشوں کے، کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد
جس کے اندر، دشتیں، پر ہول طوفانوں کی ہیں
جس میں غلطاں آندھیاں، اندھے بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستاں
شیر، جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں، جس سے نبضیں افسرو اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبل جنگ کی
جس کے اندر آگ ہے، دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
خامہ دوزخ کو، پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ

www.pdfbooksfree.pk

1ے میں ان ہیڈ کانسٹیبل صاحب سے بخوبی واقف تھا۔ ہزاروں بار میں نے مجالس عزا میں انہیں چیخیں مار مار کر روتے اور ماتم کرتے دیکھا تھا، وہ حسین کے محب یعنی حق کے پرستار تھے اور اس کے باوجود ان کو میری گھڑی چراتے وقت شرم نہیں آئی 2ے فرنگی کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف نظمیں اور مضامین چھپ سکتے تھے اور اخباروں کی ضمانتیں بالعموم ضبط نہیں ہوا کرتی تھیں۔

موت جس میں دیکھتے ہے منہ، اس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

اس واقع کے بعد میں نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدس پڑھا ''حسین اور انقلاب'' کے نام سے

''حسین اور انقلاب'' سننے کے لئے پورا ادبی لکھنو ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی، لکھنو کے تمام شعراء، تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چونکہ اس مسدس میں آہ وفغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لئے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص، بار بار کھڑے ہو کر اس جوش وخروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھپیڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے۔

حکومت نے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اسنے ''شیعہ خان صاحبوں'' خان بہادروں اور ''سروں'' کو طلب کر کے یہ ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدس کا اثر

1ے یوں تو میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی کہ حسینیت کی سی دولت

کے علمبردار، شہادت حسین پر تو آنسو بہاتے لیکن عزیمت حسین سے جی چراتے ہیں اور یہ انوکھی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ کربلا کا داورِ محشر یعنی حسین اعظم کا سا غیور سورما جس قوم کا ہیرو ہو وہ قوم باطل پرستی و بزدلی کا صید زبوں کیونکر بن گئی اور اس نے اس ننگ کے برداشت کر لینے پر اپنے کو کس طرح آمادہ کر لیا کہ وہ باطل بنیاد فرنگی کے آگے سربسجود ہو جائے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں میرے اس شعلے کو ایک آئی سی ایس مستشرق انگریز نے، جو بورڈ آف ریونیو کا صدر تھا شعلہ جو آلہ میں تبدیل کر کے ''حسین و انقلاب'' کہنے پر مجھ کو آمادہ کر دیا تھا اور آپ بھی سن لیں کہ محرم کی پہلی تاریخ کو جب میں اس سے ملنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تاریخ اسلام میں حسین ایک ایسا منارہ حق ہے کہ اگر ہندوستان کے صرف مٹھی بھر شیعہ اپنے ہیرو کی اسپرٹ کو جذب کر کے اس کے راستے پر گامزن ہو جائیں تو ہماری برٹش حکومت کا ایوان پاش پاش ہو کر رہ جائے۔

زائل ہو جائے، اپنے آقا کا حکم سن کر انہوں نے مشورہ کیا اور مشورے کے بعد وہ تمام حسین کے پرستار، یزید کی حمایت پر تیار ہو کر، لکھنو کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے یہ کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانی مجلس، حکیم صاحب عالم صاحب نے بالخصوص ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے اور منبر حسین پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خوار کو بٹھا کر، منبر کی تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے اس لئے آپ اس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیں۔

قبلہ و کعبہ نے مجھے بلا بھیجا، مجھے دیکھتے ہی ان تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔۔اور چائے نوشی کے بعد قبلہ و کعبہ نے اپنے بائیں طرف مصلا بچھوا کر، جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب زحمت نہ ہو تو آپ میرے مصلے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدس سنا دیں، جو آپ نے آغائی صاحب کے امام

بارے میں پڑھا تھا تو حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہوگئی اور جب میں قبلہ وکعبہ کے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں وہ مسدس پڑھ کر اپنی جگہ واپس آ گیا تو انہوں نے سرکار پرستوں کی ٹولی کی طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے یہ حدیث مبارک کہ لاتقرب الصلوۃ آنتم سکارا تو ضرور سنی ہوگی جس کے یہ معنی ہیں کہ جب تم سکر میں ہو تو نماز کے قریب نہ پھٹکو، اور اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ پینے والوں کو، ہوش کے عالم میں نماز پڑھنے سے روکا نہیں گیا ہے او راس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں نہیں ہے تو وہ منبر حسین پر بھی بیٹھ سکتا، اور مسجد میں داخل ہو کر نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی سرکار پرستوں کا رنگ فق ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ دراصل معاملہ کیا تھا، میرے اس مسدس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر جب مسٹر مارش [1] مشیر گورنر

[1] مسٹر مارش میرے باپ کے دوست مجرموں کے دشمن، بے آسرا لوگوں کے مددگار، اور اپنی آدھی تنخواہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اگر حکومت مسٹر مارش کے سے شریف حکام سے کام لیتی تو ابھی سو برس اور حکومت کر سکتی تھی۔

کے ملاحظہ سے گزرا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا بڑی شفقت سے پیش آئے اور کہا اس سے پیشتر جب میں نے آپ کی نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب کا ترجمہ پڑھا تھا میری آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں اور اب جب میں نے آپ کی نظم ''حسین اور انقلاب'' کا ترجمہ پڑھا تو میں نے آپ کے باب میں یہ رائے قائم کی کہ آپ حق کے پرستار، اور باطل کے دشمن ہیں۔۔۔۔اور اب میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مسولینی اور ہٹلر، دونوں اس وقت یزید کا پارٹ کر رہے ہیں کہ نہیں اور جب میں نے کہا بیشک آپ سچ کہہ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے دوسرا سوال کیا کہ اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ عصر نو کے ان زندہ یزیدوں کے خلاف آل انڈیا ریڈیو سے ہر ہفتے ایک نظم براڈ کاسٹ کرتے رہیں جس کے معاوضے میں

یو پی حکومت آپ کو آٹھ سو ماہانہ آنریریم دیا کرے گی، تو کیا آپ اس آفر (پیش کش) کو قبول نہیں کر لیں گے؟

یہ سن کر میں نے سر جھکا لیا انہوں نے پوچھا کیا بات ہے یہ "آفر" تو آپ کی افتاد مزاج سے ہم آہنگ ہے میں نے کہا مسٹر مارش میں دو وجوہ کی بنا پر آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں ایک تو آپ میرے مرحوم باپ کے دوست اور دوسرے آپ غریبوں کے بہت بڑے سرپرست ہیں میں کسی آنریریم کے بغیر آپ کے ارشاد کو مان لیتا مگر کیا کروں اپنے اصول سے مجبور ہوں کانگریس نے اس جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں آپ کی حکومت نے انہیں نہیں مانا مارش نے میری بات کاٹ کر کہا میں آپ سے حکومت کے تعاون کی درخواست نہیں کر رہا ہوں میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ فقط مسولینی اور ہٹلر کو بے نقاب کرتے رہیں میں نے کہا اگر میں ایسا کروں گا تو اس کا جو گرانڈ ٹوٹل نکلے گا وہ بالواسطہ آپ کی حکومت کی موافقت پر مشتمل ہوگا۔

مارش یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو خاموش ہو گئے پھر اپنی عینک کی تال صاف کر کے وہ بڑے ولولے کے ساتھ کھڑے ہو گئے میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کریں گے میں بھی جوابی حملے کے واسطے کھڑا ہو گیا۔

لیکن وہ میرے قریب آئے اور میری پیٹ ٹھونک کر کہنے لگے "ونڈر فل ینگ مین" (حیرت ناک جوان آدمی) آپ کے انکار نے میرے دل میں آپ کی عزت قائم کر دی، آپ اپنے باپ کی مانند بڑے آدمی ہیں آپ کو دیکھ کر میں نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کر دی ہے کہ ہندوستان کی زمین کریکٹر پیدا نہیں کرتی اگر آپ کو کبھی میری ضرورت پڑے یاد کر لیجئے گا یہ کہہ کر وہ مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے اور برابر مسکراتے رہے۔



کچھ دن فلمی دنیا میں

امید صاحب امیٹھوی، اور ساغر صاحب نظامی کو ساتھ لے کر جب میں ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا تو اس کے دوسرے ہی دن شام کے وقت شالیمار پکچرز پونا کے مالک احمد صاحب بنے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم لوگوں کا کلام سننے کے بعد وہ بنے میاں کو دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب رخصت ہو گئے تو بنے میاں نے مجھ سے کہا کہ احمد صاحب آپ کو، اور ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا آپ کا معاوضہ گیارہ سو تک اور ساغر صاحب کا معاوضہ ساڑھے پان سو تک حاضر[1] کیا جائے گا میں نے کہا یہ سرخوشی کا وقت ہے اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں کل جواب دوں گا صبح کو ساغر نے مجھ سے کہا اگر آپ یہ شرط لگا دیں گے کہ میرا اور ساغر کا معاوضہ بالکل مساوی ہو گا تو احمد صاحب کی چونکہ یہ تمنا ہے کہ آپ ان کے وہاں کام کریں، اس لئے وہ اس شرط کو قبول کر لیں گے، اور میری زندگی بن جائے گی میں نے ساغر کی بات مان لی۔

میں نے بنے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر معاوضہ دیا جائے، اگر احمد صاحب اسے قبول نہیں کریں گے تو میں ان کی یہ پیش کش نامنظور کر دوں گا۔

احمد صاحب نے، بادل ناخواستہ یہ شرط قبول کر لی اور تھوڑے دن کے بعد،

[1] معاوضہ اچھی طرح یاد نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ساغر صاحب کا معاوضہ مجھ سے نصف تھا۔

ہم لوگ، پونے آ گئے اور شنکر سیٹھ روڈ کے ''طاہر پیلس'' میں رہنے لگے۔

پونے کے موسم کا اعتدال، وہاں کے مناظر، وہاں کی دل فریب صبحیں اور شامیں وہاں کی پابند اوقات برسات، اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک

بھلا نہیں سکا ہوں۔

میں نے اپنے دہلی کے رہنے والے پنجابی دوست ملک حبیب احمد، اور اپنے دکنی دوست حبیب اللہ رشدی کو بھی شالی مار میں ملازم رکھا دیا تھا، کرشن چندر کو بھی احمد صاحب پونے کھینچ لائے تھے بے چارہ جوانا مرگ شام تیواری،حمید بٹ مرحوم، برج بھوشن، اور بھارت بھوشن (ہندی کے شاعر) بھی شالیمار سے وابستہ تھے میرے پرانے فوجی دوست منان خاں رام پوری بھی بسلسلہ تبادلہ پونے آ چکے تھے اور پونے کے نئے دوست قدوس گھڑی والے اور محمد فصیح بھی ایسے دلچسپ نکلے کہ رات کی اکثر نشستیں ان کے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور ایک اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آئی تھی۔

اسی اثناء میں قمر علی 1 صاحب اور سید 2 آفتاب حسین صاحب سے بھی بڑے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے فصیح 3 صاحب کی گردن میں ایک ذرا سا خم تھا اس لئے ان کو مردکج گردن کہا کرتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ وہ تاویلات وقوائی پر بڑی وسعت رکھتے تھے میں ان کو ''امیر تاویلات وقوانی'' کا خطاب بھی دے دیا تھا۔

وہاں میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے ''مولا ڈینا'' جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے اور ایک سلسلہ خاص میں انہوں نے میری اعانت بھی کی تھی جس کو میں فراموش نہیں کرسکوں گا۔

وہیں ساغر صاحب کا مراد آباد کی ایک صاحبزادے سے قلمی معاشقہ بھی چل رہا تھا اور کچھ روز کے بعد وہ صاحبزادی طاہر پیلس میں دلہن بن کر آ گئی تھیں۔

1 قمر علی ٹیلرنگ فرم کے مالک اور لکھ پتی انسان تھے 2 آفتاب صاحب ایک لانڈری کے مالک اور آسودہ حال آدمی تھے کراچی آ کر دونوں تباہ ہو چکے ہیں کراچی نے چھوٹوں کو ابھارا اور بڑوں کو دفنا دیا ہے 3 آگے چل کر یہ بات کھل گئی کہ وہ دل چسپ زیادہ اور مخلص بہت کم تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات، شب برات تھی اور ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جا کر کسی کے آستان جمال پر سجدہ ریزی بھی کر آتا تھا لیکن احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر وہ سارا طلسم توڑ دیا وہ چپ چپاتے پاکستان کی طرف پرواز کر گئے، اور ہم سب لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور وہ سارا کھیل خوش و رخشید، و لے دولت مستعجل بود ہو کر رہ گیا۔

پونے کو خیر باد کہہ کر میں بمبئی آ گیا اور 1 بنے کے خالی گھر میں رہنے لگا اس گھر کے ایک گوشے میں ممتاز حسین (جو آج کل کراچی کے کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں) بھی رہتے تھے جہاں سعیدہ کے بچوں اور ان کے مابین روز کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا اس لئے کچھ روز کے بعد میں اپنے ایک بے تکلف ملنے والے ماسٹر عبدالعزیز صاحب رام پوری کے جیکب سرکل والے خالی فلیٹ میں اٹھ آیا تھا اس زمانے میں فلمی بازار، ٹھنڈا پڑا ہوا تھا ساغر، ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ خاں صاحب اب ہو گا کیا۔

پروڈیوسر اس بات پر مصر تھے کہ جوش صاحب ہمارے اسٹوڈیو آئیں گے تو ہم ان سے گیت لکھائیں گے اور جوش صاحب اس بات پر اڑ گئے تھے کہ وہ ہمارے گھر آنے کا دکھ سہیں گے تو ہم گیت کہیں گے۔

میرے دوست آغا جانی کاشمیری، اور خواجہ احمد عباس نے بہت کوشش کی کہ معاملات رو براہ ہو جائیں مگر کچھ نہ ہو سکا اس کش مکش میں میرا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا آمدنی کچھ تھی ہی نہیں اور بیوی کے پاس جو کچھ اوچھی پونجی تھی وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

میں اسی عالم میں ایک روز شام کے وقت شغل کر رہا تھا کہ بازار میں یکا یک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور ہر طرف سے ''مارو، مارو، مارو'' کی آوازیں آنے لگیں میں برآمدے میں جا کر جھانکنے لگا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے کہ اتنے میں کسی نے زور

www.pdfbooksfree.pk

زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا میں نے بھری سوڈے کی بوتل ہاتھ میں لےکر دروازہ

1؎ وہ کہیں بہت دور گئے ہوئے تھے۔

کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک صورت آشنا ہندو پڑوسی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا مسٹر جوش آپ فوراً یہاں سے کسی مسلم محلے میں چلے جائیں کسی نے مہاتما گاندھی 1؎ کو گولی ماردی ہے ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے اس لئے فوراً یہاں سے چلے جایئے میں اپنے بال بچوں اور بوتل کو لے کر اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں جو بھنڈی بازار میں تھا چلا گیا اور وہاں پہنچا تو ریڈیو پر جواہر لال کا یہ اعلان سنا کہ مہاتما جی کو ایک ہندو مرہٹے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اس اعلان نے مسلمانوں کو قتل عام سے بچا لیا اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا دوسرے دن میں اپنے فلیٹ میں آ گیا، ادھر، زندگی، فاقہ، وفقر کے سائے میں گزرنے لگی ایک دن میں نے دیکھا بیوی بےحد اداس بیٹھی ہیں پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں میرے پاس جو روپیہ تھا اب وہ سسکیاں بھر رہا ہے جلدی کوئی سبتیا کرو نہیں تو خدا نہ کرے دھڑا دھڑ فاقے ہونے لگیں گے یہ سن کر یہ بات میرے دل میں آئی کہ اب میں اپنی آن توڑ دوں اور قلم کان میں لگا کر ''کام گیت لکھنے کا'' کے نعرے لگاتا، اسٹوڈیوں کی گلیوں میں پھرنا شروع کر دوں۔

کہ، جاہا سپر باید انداختن!

میرے خون میں جب اس ارادے کی دھمک پیدا ہوئی تو میرے سینے کا خوابیدہ شاعر جوش یکا یک بیدار ہو گیا اور جامے سے باہر ہو کر کہنے لگا کہ تو اس دنیا ردار شبیر حسن خاں کے بہکانے میں آ کر پروڈیوسروں کی طرف جائے گا تو تیری ٹنگڑیاں توڑ کر رکھ دوں گا۔

www.pdfbooksfree.pk

اپنے غیور شاعر کی یہ گھن گرج سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بجلی کی لپک کے مانند فوراً ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی میں سیدھا بیوی کے پاس گیا اور کہا اشرف جہاں پانچ دن اور راستہ دیکھ لو اگر اس مدت میں کوئی سبیتا نہ ہوا تو مجھے تیس چالیس روپے اور یہ کالا کمبل دے دینا بیوی نے کہا اس روپے سے کیا کرو گے اور روپے کے ساتھ یہ کمبل کیوں مانگ رہے ہو میں نے کہا میرے ایک کاروباری ملنے والے ہے ان کو ساتھ لے جا کر مارکیٹ سے

1 اسی بمبئی نے گاندھی جی کی موت کی منحوس خبر سنائی تھی اور اسی بمبئی نے آزادی ہند کا مژدہ بھی سنایا تھا پہلی خبر پر میں نے انسو بہائے تھے اور دوسری خبر سن کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑکوں پر ناچا تھا۔

ترکاریاں لاؤں گا اور عین اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے کمبل بچھا کر آلو، گوبھی اور ہنڈے بیچنا شروع کر دوں گا میرے باپ کو ہنڈے بہت پسند تھے اور ان کے خدام بازار سے ہنڈے خرید کر لاتے تھے اب ان کا بیٹا سڑک پر بیٹھ کا ہنڈے بیچے گا اور اول وآخر میں ایک نسبت پیدا ہو جائے گی یہ سنتے ہی بیوی اچھل پڑیں گویا خدا نہ کردہ بجلی کا جھٹکا لگ گیا ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے کہنے لگیں ایسا کرو گے تو ناک کٹ جائے گی میں نے کہا اشرف جہاں تعلقہ داری کی بو دماغ سے نکال ڈالو حلال کی روزی کمانے میں کہیں ناکیں کٹا کرتی ہیں ناک تو کٹتی ہے چوری چکاری کرنے ، اپنی آن توڑ دینے اور اسٹوڈیوں کے چکر لگانے سے اور بفرض محال اگر اس بات کو بے عزتی مان بھی لیا جائے تو میرے اس طرح سڑک پر بیٹھ کر ترکاری بیچنے سے میری نہیں ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی۔

بیوی نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے دیکھا ''اے اللہ تو کہاں جا کر سو گیا ہے'' کہا تکیے پر سر رکھ دیا اور بڑے بیکسی کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

بیوی کی اس اداسی پر میرا دل بھر آیا دوسرے کمرے میں لیٹ کر سو گیا اور خواب

www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے لگا کہ میں اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے سڑک پر کمبل بچھائے ترکاریاں بیچ رہا ہوں اور سامنے سے جنازے گزر رہے ہیں میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ جنزے کس کے ہیں لوگ کہہ رہے ہیں تمہارے آباؤ اجداد کے جب بیدار ہوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آ رہا ہے اس نے اخبار دے کر کہا ماموں سرکار ہند کو اپنے رسالے آج کل کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے جس کی درخواستیں مانگی گئی ہیں آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے آپ فوراً درخواست روانہ کر دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس اسی درخواست کی نقل بھیج دیں میں نے کہا بیٹا درخواست تم لکھ لاؤ میں دستخط کر دوں داماد تھوڑی دیر میں درخواست لکھ کر آ گیا اور درخواست دہلی بھیج دی گئی۔

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن، حسن اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام، دونوں بمبئی آ گئے میں نے ان کی اس آمد کو وہ سمجھا جس کو عرف عام میں تائید غیبی کہتے ہیں اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پنڈت جی اور مولانا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ایک گھنٹے میں پلٹ آئیں گے۔

جی میں آیا کنور 1 مہاراج سنگھ سے کیوں نہ مل لوں، اور خالی بیٹھ کر، انتظار کیوں کروں پرچے پر اپنا نام لکھ کر بھیجا انہوں نے فوراً بلا لیا اور بڑے تپاک سے پیش آئے اور پوچھا خاں صاحب آپ یہاں کہاں میں نے کہا میں تو آج کل بمبئی میں رہتا ہوں انہوں نے کہا اور پھر بھی مجھ سے کبھی نہیں ملے میں نے کہا میں اس وقت پنڈت جی سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں ہیں اس لئے آپ سے ملنے آ گیا ہوں میں بے سوچے سمجھے یہ کہہ تو گیا مگر فوراً خیال آیا کہ میں نے بڑی بے تکی بات کہی ہے اس کے تو یہ صاف معنی ہیں کہ میں کنور صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پنڈت جی اس وقت غیر حاضر نہ ہوتے تو میں آپ سے ملنے نہ آتا، یہ سوچ کر میرے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا ہو گئے مہاراج سنگھ بڑے ذہین آدمی تھے بھانپ گئے اور مسکرا کر کہنے لگے آپ

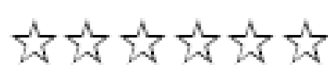
پٹھانوں کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ جو بات آپ کے دل میں ہوتی ہے، وہی پھٹ سے زبان پر آجاتی ہے۔ میں نے کہا میں اپنی بدحواسی کی معافی چاہتا ہوں انہوں نے کہا میں جس بات کی دل سے قدر کرتا ہوں آپ اسی کی معافی چاہ رہے ہیں ان کے یہ کہتے ہی مولانا آگے آگے اور پنڈت جی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے مولانا نے فقط ہاتھ ملایا اور پنڈت جی لپک کر میرے 2ے گلے لگ گئے اور چھوٹتے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں میں نے کہا پنڈت جی ''آج کل'' کے واسطے درخواست دے کر اس کا انتظار کر رہا ہوں پنڈت نے مسکرا کر کہا یہ ''آج کل'' کی الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مولانا نے لال بھبھوکا بن کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے ہمارے سرکاری رسالے ''آج کل'' کا جو اشتہار نکلا ہے اس کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہوگی پنڈت جی نے کہا تو پھر چھٹے روز آپ دہلی آجائیں میں بندوبست کر دوں گا۔

مولانا آزاد نے کہا پنڈت جی آپ کو معلوم نہیں یہ محکمہ سردار پٹیل کا ہے آپ سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں پنڈت جی نے کہا جوش صاحب ہمارے شانے سے شانہ ملا کر برٹش ایمپائر سے لڑ چکے ہیں پٹیل کو بھی یہ بات معلوم ہوگی اور نہیں معلوم ہوگی تو میں ان کو بتا دوں گا آپ بڑے اطمینان کے ساتھ دہلی آجائیں۔

1ے کنور مہاراج سنگھ اس وقت بمبئی کے گورنر تھے اور میرے پورے خاندان سے ان کو واقفیت تھی

2ے مولانا بے چارے پر تعلیمات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا اور ہندو وزارت عظمیٰ کا پورا مے خانہ خالی کر دینے کے باوجود ہوش میں تھے یہ فرق دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں اور پنڈت سالک کے درجے پر فائز ہیں افسوس کہ مسلمان پر حکومت کا نشہ جلد چڑھ جاتا ہے۔



www.pdfbooksfree.pk

مژدہ! خار دشت پھر

وہ غالباً 1948ء کا ورد تھا کہ میں تر کاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کر کے دہلی پہنچا اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کر کے میری ملازمت کی بات پکی کر لی اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشنیں بھی مقرر کرا دیں گے اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اس وقت اطلاعات عامہ کے سیکرٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے میں ان کی شرافت سے بے حد متاثر ہوا اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی آپ اس قلیل تنخواہ میں کیوں کر زندگی بسر کر سکیں گے میں نے کہا میاں صاحب پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پنشن مقرر کرا کے اس قلیل تنخواہ کی خانہ پری کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے میں نے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں قدم رکھا جہاں ''آج کل'' کی ادارت کے امیدواروں کا ایک لشکر بیٹھا ہوا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی تمام امیدواروں کے چہرے فق ہو گئے اور میرے مقابلے میں اپنی ناکامی کا یقین ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھچکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آ کر اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا اور عرفی کا یہ شعر سر میں گونجنے لگا:

اے متاع درد، در بازار جاں، انداختہ
گوہر ہر سود، در جیب زیاں، انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار پانچ آدمی ایسے بھی ہال میں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا اس کمرے میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو

www.pdfbooksfree.pk

صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے مجھ سے انگریزی میں کہا یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں میں پان کھانے سے باز نہیں آ سکتا پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں میں ڈبیا بٹوا اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا لیں، بس وہ نظم سنا دیجئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی میں نے کہا اجمل خان جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مہر لگی ہوئی ہے وہ میری نظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں اور ان کے ساتھ کئی اصحاب نے ہم زبان ہو کر کہا جوش صاحب آپ ہماری طرف دیکھیں اور ہم کو نظم سنائیں ہم سب آپ کے قدر دان ہیں میں نے اس نظم کے چند شعر سنائے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

''آج کل'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد، جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر، سردار پٹیل سے اب تک ملے کہ نہیں میں نے کہا نہیں اور نہ ملنے کا ارادہ ہی ہے پنڈت نے پوچھا کیوں میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ:

''Because he has got a criminal face'' اس لئے کہ ان کا چہرہ مجرموں کا سا ہے۔

یہ سن کر پنڈت جی نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے کہا نہیں نہیں آپ کو ان سے ضرور مل لینا چاہئے میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں انہوں

نے فون کیا جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ دھوتی باندھے،
برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے میں نے ہاتھ ملاتے ہی ان سے کہا سردار صاحب
مجھے آپ سے ملنے کا ایک خاص وجہ سے بڑا اشتیاق تھا وہ بڑے گھاگ آدمی تھے''
خاص وجہ'' سن کر بھانپ گئے اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا میں نے
کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سن چکا ہوں۔

یہ سن کر وہ مجھے کمرے میں لے گئے، بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں کہا آپ
نے یہ سنا ہوگا کہ میں مسلمان کا دشمن ہوں آپ جس قدر خوفناک برہنہ گفتار آدمی ہیں
اسی قدر میں بھی ہوں اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کے سے
ان تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں، جن کے خاندان، باہر سے آ کر یہاں آباد
ہو گئے ہیں لیکن میں ان مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق ہندو قوم کے شودروں اور
نیچی ذاتوں سے تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آ کر انہوں نے اسلام قبول کر
لیا تھا یہ لوگ دراصل نہایت متعصب، شریر اور فسادی ہیں اور اقلیت میں ہونے کے
باوجود ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا سردار صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے
ہیں میں ذات پات کا بالکل قائل نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر آج سے دو تین سو
برس کسی کے پرو ادا کا پردادا چمار تھا تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کے چمارپن میں
آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی ہے؟ اور وہ آج تک چمار ہی چلا آ رہا ہے اس بات کا
وہ جواب دینے والے ہی تھے کہ ان کے سیکرٹری نے آ کر کہا آپ نے مہاراجہ پٹیالہ کو
ٹائم دیا تھا وہ آ گئے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے ابھی نکلا تھا کہ مولانا آزاد سے مڈبھیڑ ہو گئی انہوں نے اپنی موٹر
روک کر مجھے آواز دی اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر ان کی موٹر میں بیٹھ گیا انہوں
نے مجھے بڑے درد انگیز تیوروں سے دیکھ کر کہا جوش صاحب آپ اور سردار پٹیل میں

www.pdfbooksfree.pk

نے سر جھکا لیا، اورانہوں نے یہ شعر پڑھا:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش، روشن کند چشم زلیخارا

مولانا آزاد تو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے لیکن میرے دل کا عجیب عالم ہو گیا میں سوچنے لگا کہ ہم نے اپنے ملک کو اتنی قربانیاں دے کر کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اردو کا بیڑا غرق ہو جائے اور مسلمانوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کان میں ریاست دتیا کے وزیر اعظم عزیز الدین کی آواز آئی کہ جوش صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہندو، مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان بنانے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا حشر کیا ہوگا وہ ایک ایک مسلمان کو پاکستان کیوں نہیں لے گئے پھر میں نے اپنے کو اس امید سے تسلی دی کہ نفرت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی چار دن میں یہ تعصبات ختم ہو جائیں گے اور سوشلسٹ حکومت آ جائے گی، اور پھر یہ ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی اور دینی برادری ختم ہو کر، انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ ایک شب کی تڑپ ہے سحر تو ہونے دو
بہشت سر پہ لئے روزگار گزرے گا
فضا کے دل میں پر افشاں ہے آرزوئے غبار
ضرور ادھر سے کوئی شہ سوار گزرے گا!

1955ء میں جب بسلسلہ شرکت مشاعرہ تیسرے بار میں پاکستان آیا تو ہر چند اس سے پیشتر بھی میرے دیرینہ دوست سید ابو طالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے لیکن اس مرتبہ تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

www.pdfbooksfree.pk

میں پاکستان آنے پر بالکل تیار نہیں تھا لیکن صاف انکار نہیں کیا کہ نقوی کا دل نہ ٹوٹ جائے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

اس اثناء میں انہوں نے اپنے گھر پر مجلس کی تمام اکابر شہر کے ساتھ، اسکندر مرزا صاحب کو بھی بلایا، اور سب کو میر امسدس ''حسین و انقلاب'' سنوایا، اوران تمام اکابر نے جن میں اسکندر مرزا بھی شامل تھے مجھ سے اصرار کیا کہ میں پاکستان کا باشندہ بن جاؤں ان کی دعوت پر ہر چند میں نے اپنے دل میں تو یہ کہا کہ خدا کی قسم، میں ایسا ہرگز نہیں 1 کروں گا لیکن زبان سے یہ کہا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں اب نقوی کا یہ تکیہ کلام ہو گیا کہ جوش صاحب آخر آپ کب تک سوچیں گے تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر میں کب تک ٹالتا اور بے دودھ کا بچہ پالتا رہوں گا۔

اسی دوران میں ایک روز، وہ میٹروپول آ گئے اور مجھ سے کہا سارے کام چھوڑ کر آج آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے پاکستان آ جانے کا اقرار لے کر، دم لوں۔

میں نے کہا نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھ کو آپ سے کس قدر محبت ہے اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کر دوں لیکن نقوی صاحب نے کہا دیکھئے'' لیکن'' کے بعد انکار نہ کر دیجئے گا میں چپ ہو گیا وہ اپنا سودا چھوڑ کر میرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے فرمائیے آپ پاکستان کب آ رہے ہیں اب جی کڑا اور آنکھیں نیچی کر کے میں نے کہا نقوی صاحب جب تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا اور نہرو کے بعد کیا ہو گا، یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں نے کہا خدا نہ کرے کہ میں ان کے بعد زندہ رہوں۔ انہوں نے کہا شاعر کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تولا کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی ہی میں سدھار گئے تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا، آپ کی یہ نوکری،

آپ کی یہ فراغت وعزت کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے، یہ بھی فرض کر لیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ خدا نہ خواستہ آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ دیکھئے جوش صاحب آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے دردر مارے پھریں گے اور ایک متنفس بھی ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔۔۔۔۔ یہاں تک تو معاشی پہلو پر میں ہاتھ کر رہا تھا اب ذرا تہذیبی پہلو پر بھی نگاہ ڈالئے یہ اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہو گا۔ جوش صاحب آپ کے بچے اور اردو بھول جائیں گے۔ ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گی وہ آپ کے کلام کا۔

1 میں جس وقت دل ہی میں دل میں پاکستان نہ آنے کی قسم کھا رہا تھا اس وقت فرمان روزگار مجھ پر مسکرا رہا تھا۔

ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی، روائتی اور ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست وعبرت ناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے اس کا کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا کیا یہ عظیم لسانی مزاجی اور روائتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ اور اگر آپ یہاں نہ آ گئے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ آپ اپنی وقتی فراغت وعزت کی قربان گاہ پر اپنے پورے خاندان کو بھینٹ چڑھا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان کی اس طویل جذباتی ومنطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا، اور میری آنکھیں کھول دیں اور میں سوچنے لگا کہ میرے بعد یہ میرے نازوں کے پلے بچے اور میری یہ شاہانہ مزاج رکھنے والی بیوی کیا کرے گی نقوی صاحب سے میں نے کہا آپ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا بے شک میری آل اولاد ہندوستان میں پنپ نہیں سکے گی نقوی صاحب، مجھ کو چوبیس گھنٹے اور دے دیجئے کہ میں اس مسئلہ پر ایک بار اور غور کر لوں۔ کل اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر، اپنا آخری فیصلہ سنا دوں گا۔

نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے ناصر احمد خاں سے کہا تم نے سن لی

نقوی صاحب کی ساری تقریر، اب کیا کہتے ہو، ناصر نے کہا مجھ کو ان کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے اگر آپ یہاں منتقل نہ ہوئے تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ یہ کہتے ہی ناصر میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ انگشت شہادت بلند کر کے کہنے لگے خاں صاحب آپ کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں، آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھراتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے کل اسی دو کوڑی رعایا کے بچے، آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے، ان کو دھوتیاں بندھوائیں گے اور ان کے سروں پر چوٹیاں رکھوائیں گے اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیش تر ہم مر جائیں۔

صبح اٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا نہا دھو کر نقوی صاحب پاس گیا اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر تیار ہو گیا ہوں یہ سنتے ہی نقوی کی باچھیں کھل گئیں دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور اسی وقت ڈپٹی کمشنر کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہانگیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہے اس کو جوش صاحب کے نام الاٹ کر دیجیے اس پر ان کا سینما ہال اور مکان تعمیر کیا جائے گا اور فلاں 1 مقامی پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجیے وہاں ان کا باغ نصیب کیا جائے گا۔

---

1 ناصر احمد ملیح آبادی، میرے قرابت داروں میں سے ہیں وہ مجھ سے پہلے ہی پاکستان چلے آئے تھے اور جب سے میں آیا تھا وہ ہر وقت میرے ہی ساتھ رہتے تھے لیکن اب اس خطا پر کہ ان کی ایک مصیبت کے وقت میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا، انہوں نے مجھ سے ملنا جانا ترک فرما دیا ہے ایک اور کا آج کام نکلا ہم سے ایک اور ہوا دشمن جانی پیدا۔

جب ان کے حکم کی تعمیل ہو گئی تو دونوں زمینوں پر مجھ کو قبضہ دے دیا گیا اور میرے چوکی دروازہ جھونپڑیاں ڈال کر وہاں رہنے لگے۔

اور جب تمام لکھا پڑھی مکمل ہو گئی تو نقوی صاحب نے کہا آپ دہلی جا کر ایمر جنسی سرٹیفکیٹ پر اپنے بال بچوں کو یہاں لے آئیں آپ کے آتے ہی سینما کی تعمیر کا کام

www.pdfbooksfree.pk

شروع کرا دوں گا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے سیکرٹری ربانی صاحب کو بلا کر میرے مکان کی تلاش کے لئے کہا ربانی صاحب نے سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک اچھی سی کوٹھی میرے حوالے کر دی اور میں دہلی پرواز کر گیا۔

دہلی پہنچا، معلوم ہوا پنڈت جی باہر گئے ہوئے ہیں دو تین دن میں آئیں گے سیدھا مولانا کے پاس گیا مولانا کسی اخبار میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ہندوستان کے ایک شاعر پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے انہوں نے چھوٹے ہی مجھ سے کہا غالباً آپ ہی وہ شاعر ہیں جس پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے میں نے کہا جی ہاں مولانا میں وہی شاعر ہوں اس کے بعد میں نے اپنی ساری روداد بیان کر دی نقوی صاحب کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو دہرایا اور پھر ان سے پوچھا اب آپ کی کیا رائے ہے مولانا؟

انہوں نے چند سوال کر کے جب معاملے کے ہر پہلو کو سمجھ لیا تو کہا آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگرانی کا باعث ہوگا لیکن جہاں تک کہ آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں نقوی نے یہ سچ کہا ہے کہ نہرو کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔

میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا خوگر ہوں لیکن جواہر لال شدید جذباتی آدمی ہیں وہ آپ کی ہجرت پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوں گے۔

1۔ نام یاد نہیں رہا اس مقام کا

تیسرے دن یہ سن کر کہ پنڈت جی آج آ رہے ہیں میں پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا وہ اترے تو میں نے ان سے کہا مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے اور آج ہی انہوں نے کہا تو پھر ابھی میرے ساتھ چلئے اور جب ان کے گھر آ کر، میں نے اپنا کل ماجرا بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولانا آزاد کی اس باب میں کیا رائے ہے تو ان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہو گئے اور کہا جوش صاحب آپ نے

www.pdfbooksfree.pk

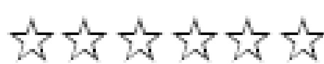
مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہندو کی تنگ 1 دلانہ حب الوطنی یہ صورت حال نہ پیدا کر دیتی تو آپ کے دل میں ترک وطن کا کبھی خیال پیدا ہی نہ ہوتا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے میں خود بھی غور کروں گا، اور مولانا سے بھی رائے لوں گا۔

دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اٹھاتے ہی میں نے ان کے دل موہ لینے والے چہرے پر اس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھانے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اٹھائی شیریں تبسم لبوں پر مچلنے لگا اور انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ کے معاملے کا ایسا اچھا حل نکال لیا ہے جسے آپ بھی پسند کریں گے کیوں صاحب یہی بات ہے نا کہ آپ اپنے بچوں کے معاشی و تہذیبی مستقبل کو سنوارنے، اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے انہوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو پاکستانی بنا دیں لیکن آپ یہیں رہیں اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے اردو کی خدمت کر آیا کریں سرکار ہند آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اچھل پڑا میں نے کہا یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی پنڈت جی میری منظوری سے بے حد بشاش ہو کر میرے گلے لگ گئے حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زرند!

1 انہوں نے انگریزی میں Narrowmtnded Patriolism کہا تھا۔

دوسرے ہی دن اخبار والوں نے مجھ کو گھیر لیا میں نے وہ تمام معاملہ جو میرے اور پنڈت جی کے مابین ہوا تھا بیان کر دیا اور تیسرے روز ہی میرا انٹرویو ہندوستان کے تمام انگریزی و اردو اخباروں میں شائع ہو گیا۔



www.pdfbooksfree.pk

پاکستانی شہریت

جانا، شاہ زادہ گل فام کا، چوتھی طرف
اور گھر جانا اس کا آسیبوں کے نرغے میں

آسیبوں کے ذکر سے پیش تر یہ سن لیجئے کہ جب پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا تو نقوی صاحب نے میری خوشی پر پانی پھیر دیا انہوں نے کہا یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں، اور یہاں زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے، ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں، جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینما بنوائیں، یا باغ لگوادیں اس کے علاوہ، یہ صورت حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی، پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستان آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے جوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا لیکن چونکہ بات تھی باون تولے پاؤ رتی کی، اس

1۔ ہماری کہانیوں کے تمام شہزادے ''گل فام'' ہوا کرتے تھے اور جب وہ شکار کے واسطے جانے لگتے تھے تو ان کی مائیں ہمیشہ ان کو یہ تاکید کیا کرتی تھیں کہ جنگل میں صرف تین طرف شکار کھیلنا، چوتھی طرف ہرگز ہرگز نہ جانا اور چوتھی طرف جانے سے وہ اس انبار پر منع کیا کرتی تھیں کہ انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ چوتھی طرف بھوتوں اور آسیبوں کا رمنا ہے لیکن چونکہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس شے سے منع کیا جاتا ہے اوبدا کر اس شے کی طرف دوڑتا ہے اس لئے تمام گل فام شادی شکار کھیلتے کھیلتے چوتھی طرف ضرور جاتے اور اپنے کو بھوتوں کے نرغے میں گھیر لیا کرتے تھے۔

لئے ان کی منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا اب سنیے آسیبوں کا ذکر۔

میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہوگیا پورے پاکستان میں اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اٹھا گویا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔۔۔تمام چھوٹے بڑے اردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر، خم ٹھونک ٹھونک کر میدان جنگ میں آ گئے تمام ادباء و شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین قطعات، اور کارٹونوں کی بھر مار کر دی۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ بلند ہوگیا کہ دہائی سرکار کی، مغل اعظم، یعنی ابو طالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔۔۔مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر و شکر ہو گئے وہابیوں بریلیوں، دیو بندیوں، قادیانیوں، سنیوں اور شعیوں نے اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا دیا تبرا اور مدح صحابہ کے مابین طرح مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا ابرہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے یا کام دیو، اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے اور تمام کنواری کنیاں ہائے اللہ، ہائے اللہ کے نعرے لگا لگا کر بھاگ رہی ہیں یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

www.pdfbooksfree.pk

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیراعظم تھے،نقوی صاحب کی ان سے کھٹ پٹ ہوگئی نقوی صاحب نے اسکندر مرزا کے بل بوتے پر وزیراعظم سے ٹکر لی تھی سکندر مرزا نے ان کی پشت پناہی سے روگردانی کی اوران کی کمشنری ختم کر دی گئی نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی۔۔۔۔۔میں ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں غیرت نے اجازت نہیں دی۔۔۔۔میں نے دل سے پوچھا خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کیا ہمت نہ ہارا گر خار سے بود گل دستہ گر دو۔۔۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر کاروبار شروع کر دوں مجھ گاؤدی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں تجارت کا اہل نہیں میں نے دوڑنا شروع کر دیا اس دوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہوگئی۔۔۔۔روز صبح کو گھر سے نکلتا دوپہر کو پلٹتا تھوڑی دیر آرام کرکے پھر باہر نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اس گاؤں والوں کے علم کا سا ہوگیا تھا جو محرم کے زمانے میں اٹھایا جاتا ڈھول تاشوں کی تروڑ، تروڑ، جھیم جھیم کی گونج میں ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا اور اسی طرح دن بھر چکر کاٹ کاٹ کر پھر اسی تروڑتروڑ جھیم جھیم کے ساتھ مکان میں لا کر رکھ دیا جاتا ہے اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل وکرم سے کچھ ہاتھ تو آیا نہیں البتہ ڈائرکٹروں، سیکرٹریوں اور وزیروں کے ایسے دو دو کوڑی کے نخرے ایسے اوچھے ٹھسے اور اس قدر غیر شریفانہ گڈامیر پن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ہر ادیب وشاعر کو چاہئے کہ وہ خودکشی فرمالے یہ سچ ہے کہ ہندو حکام بھی بعض اوقات نخرے دکھاتے ہیں لیکن اللہ اکبر یہ مسلمان جب ہیڈ کانسٹیبل ہوجاتا ہے تو ہامان وفرعون بن جایا کرتا ہے اور حکومت کی گدی پر بیٹھ کر، خدمت گاروں اور پھیری والوں کے لڑکے بھی اپنے کو قیصر و دارا سمجھنے لگتے ہیں اللہ بونوں کے در پر لنکا والوں کو نہ لے جائے اب میری مسلسل

www.pdfbooksfree.pk

ناکامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

1 جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ، اور باغ لگانے کی زمین ۔۔۔۔۔خود میں نے واپس کردی۔

2 ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں، میرے نام چھوٹا ۔۔۔۔ قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

3 کاشتکار کے لئے، ہاشمی صاحب، ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی الطاف گوہر نے اسے ضبط فرمالیا۔

4 سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔۔۔۔۔نرخ گر گیا پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

5 کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

6 واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیں دینے پر آمادہ ہو گئے۔۔۔۔۔روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔

7 بیڑی کے پتوں کا لائسنس مل رہا تھا لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کرسکا اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔

8 سینما کے سازوسامان کا دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا۔۔۔۔وزیر معطل کردیا گیا۔

9 ٹیکسٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا۔۔۔۔وزیر بدل گیا۔

10 پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

11 مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا سیکرٹری کو برطرف کردیا گیا۔

12 پٹرول پمپ کی سعی کی گئی ناکام ہوگئی۔

13 ایک مکان الاٹ ہوا تھا آج تک قبضہ نہ مل سکا

14 دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی منظور نہیں ہوئی۔

www.pdfbooksfree.pk

15 اپنی کتابوں کی طباعت واشاعت چاہی 1 کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔

16 فریئر ہال کے ایک کوشے میں ریستوران کھلوا دینے کا وعدہ محکم کیا گیا۔۔۔۔افسر صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔

17 سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔۔۔۔اجرت نہیں ملی

18 محکمہ اباد کاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔۔۔۔۔چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے پھینک دیا۔

19 پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا الغرض:

جس جگہ، ہم نے بنایا گھر، سڑک میں آ گیا

ان مسلسل نا کامیوں نے مجھ کو چکرا دیا۔شدت یاس اور ہجوم افلاس نے میرا احاطہ کرلیا۔۔۔۔۔نقوی صاحب جو ایک ہزار روپیہ بطور قرض دیتے تھے وہ اس قدر کم تھا کہ میرا گھر چلا نہیں سکتا تھا اس لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ بیچ کر کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔۔۔۔بیوی نے کہا ساری مدیں آدھی کر دو اس کی لپیٹ میں آ کر،شراب ترک کر دی۔۔۔۔ترک شراب کے بعد، میرا اس بچے کا سا عالم وہ گیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے شراب کی پھڑکن سے نجات پانے کے واسطے شام ہی سے کھانا 1 کھالیا کرتا تھا لیکن بے چینی میں کمی نہیں آتی تھی جی بہلانے کو کتاب اٹھالیتا تھا کہ شراب کی کلک بہل جائے کتاب کی سطریں ناگنوں کے مانند رینگنے لگتی تھیں اور حروف کے دائروں میں بچھو ڈنک اٹھائے نظر آتے تھے۔

گڑ مڑا کر بستر پر لیٹ جاتا اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا لیکن نیند کسی طرح بھی نہیں آتی تھی اور تمام جسم میں کھجلی ہونے لگتی تھی، گھنٹوں کھر کھر کھجایا کرتا

www.pdfbooksfree.pk

1۔ کھانے کے بعد شراب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کے مانند رات رات بھر تڑپتا رہتا تھا۔۔۔۔۔اور صبح کو جب خط بنانے کے واسطے آئینے کے سامنے بیٹھتا تھا تو اپنا بے خوابی کا روندا ہوا تھیا کا سامنہ دیکھا نہیں جاتا اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تھوبڑ قسم کے مسکین شاہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دانت نکال نکال کر بھیک مانگ رہے ہیں۔

اگر کسی دن کتے کی سی چھپکلی آ بھی جاتی تھی تو اتنے برے برے اور ٹوٹے ٹوٹے خواب دیکھتا تھا کہ بار بار ہڑبڑا کے آنکھ کھل جایا کرتی۔۔۔۔اور گھڑی کی ٹک ٹک دل پر گھن چلانے لگتی تھی۔

نہ جانے کتنے سنسناتے سیلے سپاٹ سوکھے روکھے پھیکے ڈکارتے ڈستے پھنکارتے بھیانک اور بھنبھوڑتے خواب دیکھ ڈالے اس زمانے میں ان خوابوں میں سے ایک خواب 1ے درج کر رہا ہوں:

تکیے پر سر رکھا، اندازہ ہو گیا کہ آج بھی پایاب، اور اوچھی نیند آئے گی۔۔۔۔ تھوڑی دیر چت پڑا رہا۔۔۔۔بدن سنسنانے لگا آہستگی سے داہنی کروٹ لی۔۔۔۔ داہنی کروٹ کو پھر بائیں کروٹ میں تبدیل کیا۔۔۔۔۔۔دماغ کو خالی کر کے چاہا کہ اس میں نیند کو آباد کر دوں۔۔۔۔۔۔رفتہ رفتہ سانس میں ہمواری پیدا ہونے لگی اور سر پر ایسے آہنگ کے ساتھ نیند منڈلانے لگی جیسے اترتے وقت جہاز کی آواز۔۔۔۔۔۔شاید بیس پچیس منٹ میں سو گیا اتنے میں کسی احمق نے فریج میں کوئی چیز رکھ کر دھڑام سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔۔۔۔او چھے کا پیار، بالو کی دیوار۔۔۔اس دھڑاکے سے نیند اچٹ گئی اور آنکھ ہو کر ہنہنانے لگی اور دماغ تپ تپ ہونے لگا دل نے کہا ارے غضب ہو گیا اب نیند نہیں آئے گی گھبرا کر سیدھے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلی کمبل کو سینے تک کھینچ لیا چادر سے کے گوشے کو گل تکیہ بنالیا۔۔۔۔اور دماغ کو اس تصور کی موجوں سے ترانے لگا کہ میں اپنے ریزرو کمپارٹ منٹ میں سفر کر رہا ہوں

1؎اس خواب کو صبح ہوتے ہی لکھ لیا تھا اس لئے محفوظ رہا۔

گھنے اور اندھیرے جنگل سے ریل ستار بجاتی گزر رہی ہے تھوڑی دیر میں دوبارہ ہلکی سے حبابی نیند آنے لگی ایسا لگا کہ دماغ پر اوس گر رہی ہے پھر ہلکے سے کہرے نے میرے وجود کو ڈھانک لیا ریل چھکا چھک چلی جا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں خدا خدا کر کے نیند آ گئی تو خواب دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا میدان ہے جہاں خیمہ نصب کرنے کے لئے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ۔۔۔۔۔اس کے بعد ایک دل بادل خیمہ نصب کر دیا گیا ہے خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کئے جا رہے ہیں۔۔۔۔اس کے بعد دس پندرہ فراش آ گئے اور بڑی بڑی دریوں کو زور زور سے جھٹک کر بچھا رہے ہیں دریوں کے جھٹکے جانے سے گرد اڑ رہی ہے گرد سے مرچوں کی دھانس آ رہی ہے۔۔۔۔۔ایک کچو داڑھی کا فراش چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے ابے رمضیا سالے، زندہ ہے کہ مر گیا ارے اگان دان لا اگال دان۔

اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں ان کی ٹوپیاں دو دو گز لمبی ہیں ٹوپیوں پر مرغے کڑھے ہوئے ہیں کچھ لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے کالے پگڑ ہیں پگڑوں کے اوپر گیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے جوتوں کی ڈوریوں میں مگر مچھ بندھے ہوئے ہیں ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں بندروں کی گردنوں میں ناگوں کے مفلر پڑے ہوئے ہیں اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر تو بیٹھتے ہی ان کی ناکیں دفعتہً چھ چھ فیٹ لمبی ہو گئیں اور ناکوں کی چونچوں پر ریچھ ناچنے لگے۔۔۔۔اوہو، ایک مشلعچی بڑھتا چلا آ رہا ہے اس کی ٹھڈی پر لنگور کی دم کی سی پتلی داڑھی ہے۔۔۔۔اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ۔۔۔۔۔طائفہ خیموں کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔حاضرین حقے پینے اور سازندے ساز ملانے لگے۔۔۔۔سازوں کے ملنے سے دو خوں خوار بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں

اور حقوں کے کڑاکے ایک دوسرے کو فحش گالیاں دینے میں سر گرم ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گانے والی سامنے آئی اس کا منہ گھونس کا سا ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں کھڑاویں بندھی ہوئی ہیں سر نگیا تانت کی طرح پتلا اور تاڑ کی طرح لمبا ہے طبلچی اس قدر موٹا ہے کہ پندرہ گز زمین گھیرے بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنے سونڈوں کے سے ہاتھوں سے دھما دھم طبلہ بجا رہا ہے اس کے طبلے کی تھاپ سے گیس کے ہنڈے چٹختے چلے جا رہے ہیں گھونس کی سی شکل والی مغنیہ گا نہیں، چیخ رہی ہے اور اس کے منہ سے موٹے موٹے کوے نکل نکل کر قاؤں قاؤں کرر ہے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ مشکل سے دو بالشت کا ایک بونا گلی مچھے رکھے مٹکتا چلا آ رہا ہے اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اس دیگ کو ٹن ٹن ٹن ٹن بجا بجا کر تال دے رہا ہے۔۔۔۔۔اتنے میں کیا دیکھا ہوں کہ اس کی دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجیں بجانے لگا اور جھانجیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مجھ بد بخت کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ گھڑی تین بجا رہی ہے اور سیف شاہ جہاں پوری کا یہ شعر دماغ میں گونج رہا ہے:

دل کی لگی شب فراق اپنا اثر دکھائے گی
لیٹو گے، لاکھ بن کے تم نیند کبھی نہیں آئے گی

سہروردی صاحب اسی اثناء میں سہروردی صاحب کو وزیر اعظم بنا دیا گیا اور میں اس فکر میں پڑ گیا کہ اُسنوں کے چکر سے نکل کر میں نے "باب قرطاس وقلم" دا ایکاڈمی آف لیٹرز کے نام سے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کو سہروردی صاحب کی بارگاہ میں کیوں کر پیش کروں اور جب میں نے اپنے ایک مخلص دوست منان خاں ایڈووکیٹ سے اس کے متعلق مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں محمود الحق صاحب عثمانی، جو سہروردی صاحب کے مقرب خاص ہیں ان سے کہوں گا کہ وہ آپ کو سہروردی صاحب سے ملا دیں۔۔۔۔۔چنانچہ ایک روز منان

www.pdfbooksfree.pk

خاں عثمانی صاحب کو لے کر خود میرے گھر آ گئے اور معاملہ طے ہو گیا اس کے دوسرے ہی دن عثمانی صاحب نے مجھے سہروردی صاحب سے ملا دیا سہروردی صاحب نے میری تجویز کو بہت پسند کیا اور وعدہ فرمایا کہ میں اکیڈمی قائم کرا دوں گا۔

لیکن میری بدبختی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن عثمانی اور سہروردی کے مابین ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ ان کی آمد و رفت ہی بند ہو گئی اور میں بے آسرا ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بیگم شائستہ اکرام[1] کراچی آ گئیں اور آفتاب احمد خاں، وزیر اعظم کے سیکرٹری بلکہ دست راست بن گئے۔۔۔۔ اور چوں کہ یہ دونوں مجھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے، انہوں نے میری بڑی دست گیری کی۔

بیگم صاحب، سہروردی کی، رشتے کی بہن تھیں انہوں نے میرے مبالغہ آمیز ''محامد و محاسن'' کچھ اس طرح دلنشیں کر دیئے کہ سہروردی صاحب جو خود بھی ایک ادبی اور صاحب جوہر آدمی تھے مجھ پر بے حد مہربان ہو گئے اور مجھ کو اجازت دے دی کہ میں جب بھی جی چاہے بلا روک ٹوک ان کے پاس آ جایا کروں۔

اس طرح آفتاب احمد خاں نے بھی سہروردی پر میرا سکہ جمانا اور میرا ہاتھ بٹانا[2] شروع کر دیا اور میری تجویز حرکت میں آ گئی۔

حسن اتفاق، یا میری خوش قسمتی کہئے کہ اس اثناء میں زبیری صاحب مرحوم تعلیمات کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔۔۔۔ وہ نہایت ذی علم و ادب نواز انسان تھے میری امداد پر تل گئے اپنی زبردست سفارش کے ساتھ انہوں نے میری کارروائی فنانس بھیج دی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں فنانس سیکرٹری ممتاز حسن صاحب سے مل لوں۔

ممتاز حسن صاحب کا نام سن کر میں چکرا گیا۔

[1] میں اپنے ان دونوں محسنوں کو تا مرگ فراموش نہیں کر سکوں گا

[2] آفتاب صاحب کے توجہ دلائے پر سہروردی صاحب نے لٹریری فنڈ سے مجھے

پانچ ہزار روپے بھی بھیجے تھے پانچ ہزار روپے اس وقت پانچ لاکھ معلوم ہوئے تھے۔

اور اس چکرانے کے دو اسباب تھے پہلا سبب تو یہ تھا کہ چونکہ 1942ء میں دہلی کے ایک مشاعرے کی شرکت کے سلسلے میں، ہمارے مابین ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا تھا، اور اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی مفید ملک کام میں بھی میرا ساتھ نہیں دیں گے، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ حدیث متواتر کے طور پر میں یہ سن چکا تھا کہ ممتاز حسن صاحب، اس بدنصیب صوبے کے دشمن جانی ہیں جس کو ''یوپی'' کہتے ہیں لیکن میں ان سے کیوں کر نہ ملتا۔ ارتکاب ازدواج کے بعد باپ اور نانا بن چکا تھا ان سب کو پالنا کیوں کر اس لئے، اپنی اوقات پر لعنت بھیجتا ہوا دفتر مال پہنچا۔ پہنچتے ہی قدم دو دو من کے ہو گئے۔۔۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اپنا نام لکھ کر، پرچہ اندر بھیج دیا۔

چپراسی نے آکر کہا اس وقت ایک صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں آپ پی اے کے کمرے میں انتظار کریں دل نے کہا اور آؤ پاکستان خون کے گھونٹ پیے اور پی اے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا پی اے صاحب نہ تو کھڑے ہوئے نہ ہاتھ ملایا، مجھ کو فرعون کی طرح دیکھا، اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا مبارک ہو خاں صاحب، پاکستان کی طرف سے یہ عزت افزائی جی چاہا کہ کمرے سے نکل جاؤں پھر سوچا کہ ہم تو طارق کی طرح کشتی جلا کر آئے ہیں اب کہاں جا سکتے ہیں۔

ابھی مشکل سے چھ سات منٹ اس عذاب میں گزرے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں، کہ خود ممتاز حسن صاحب میرے سامنے کھڑے، اور معذرت خواہی کر رہے ہیں۔۔۔ ممتاز صاحب کی اس غیر متوقع اور غیر معمولی شرافت نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا اور میرے دل کو ان کی جانب جھکا دیا اور میں اپنے سوء ظن پر دل ہی دل میں ملامت کرنے لگا۔

اپنے کمرے میں لے جا کر انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اکاڈمی کی تجویز بہت لمبی چوڑی ہے اگر آپ اس کو تدوین لغت تک محدود کر دیں تو فنانس اس کی

منظوری دے دے گا مجھے اپنی اس تجویز کے بچاؤ پر افسوس ہوا لیکن میں بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا ناچار اسی شکل کو غنیمت سمجھا، میں نے ان کی بات مان لی، ترقی پر اردو بورڈ وجود میں آ گیا، اور میری کئی سال کی عرق ریزی اور سعی مسلسل مشکور ہوگئی۔

بورڈ بن گیا تو انجمن ترقی اردو کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کو رکنیت کی دعوت دی گئی مولوی صاحب مجھ کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مجھ کو لغت کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رکنیت کی دعوت کو ٹھکرا دوں گا۔

ممتاز حسن صاحب نے عبدالحق صاحب کی اس ضد پر منہ بنایا۔۔۔۔۔لیکن، کچھ سوچ کر منظور کر لیا اب کیا تھا، عبدالحق چیف ایڈیٹر ہو گئے۔۔۔۔انجمن ترقی اردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا میں نے بورڈ کے لئے دوڑ دھوپ کر جو عمارت کرائے پر لی تھی وہاں چند کلرک رہ گئے اور میں ممتاز حسن صاحب نے مجھ کو ''مشیر ادب'' کا عہدہ دے دیا سب سے زیادہ میری تنخواہ مقرر کر دی لیکن عبدالحق صاحب نے کوئی سوا یا ڈیڑھ برس تک مجھ سے کوئی کام ہی نہیں لیا اور میں دفتر میں بیٹھا تنخواہ لیتا، مکھیاں مارتا اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے جس دفتر کو، کئی سال خون پانی ایک کرنے کے بعد قائم کرایا تھا مجھ کو اسی دفتر میں ''چوں مد بحساب اندر'' بنا کر رکھ دیا گیا ہے بے کاری، اور مفت کی تنخواہ داری سے تنگ آ کر میں نے آخر ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔۔۔اور جب انہوں نے مجھ کو لغت نویسی پر مقرر کر دیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو اس قدر تاؤ آ گیا کہ وہ ادارت و رکنیت، دونوں سے، دست برداری پر آمادہ ہو گئے۔

اس کے بعد بور کے سیکرٹری شان الحق صاحب حقی کا مولوی عبدالحق اور شوکت صاحب سبزواری سے سخت بگاڑ ہو گیا۔ اور گرما گرم مراسلت کا سلسلہ چھڑ گیا مولوی صاحب کے انتقال کے بعد لغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا۔ اور حقی صاحب و سبزواری صاحب کے مابین ظاہری مصالحت تو ضرور ہو گئی، لیکن دلوں میں کدورت

باقی رہی، اور انشاءاللہ تا قیامت باقی رہے گی اس لئے کہ ارباب یوپی اور اہل دہلی کی فطرت ہی یہی ہے۔

اس کے بعد حقی صاحب کے دل میں مجھ سے بھی گرہ پڑنا شروع ہوگئی۔ برتاؤ تو ہمارے درمیان خوردانہ و بزرگانہ ہی رہا۔لیکن چونکہ حقی صاحب کا یہ درپردہ مطالبہ رہتا ہے کہ لوگ ان کے روبرو جھکتے رہیں، اور میں نے ان کے اس مطالبے کو خوراک نہیں پہنچائی اور جب وہ مطالبہ مسلسل بھوکا رہنے لگا تو وہ سوچنے لگے کہ مجھ کو کس طرح زک پہنچا سکتے ہیں اور آخر کار، اللہ نے ان کو وہ موقع دے ہی دیا۔

غالباً اگست 1967ء میں رخصت لے کر، میں اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفیے کی خاطر ہندوستان گیا۔اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے وہاں چار مہینے رہنا پڑا۔ باغوں اور مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا انصاری صاحب کسی اخبار کے نمائندے کو لے کر انٹرویو کے لئے آئے۔۔۔اور میرا انٹرویو کسی انگریزی اخبار میں شائع ہوگیا۔۔۔۔رخصت کے اختتام پر جب لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے نئے معانی پہنا کر، یہاں کے اخباروں نے خوب اچھالا اور مجھ کو پاکستان دشمن ٹھہرا دیا ہے مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لئے تاویلات کے ذریعے سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے لاہور میں ان اخباروں کا ابطال شائع کرا کے جب کراچی آیا اور دفتر پہنچا تو حقی صاحب نے بڑے گستاخانہ انداز میں مجھ سے مراسلت شروع فرمادی۔

اور آخر کار، اس غیر شریفانہ سلسلے کو بند کردینے کے واسطے میں نے حقی کو لکھ بھیجا کہ میں جس خاندان کا رکن اور جس مزاج کا آدمی ہوں اس مزاج کا آدمی ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن لچک نہیں سکتا۔اگر آپ میری معاش پر ضرب لگانے کی ٹھان چکے ہیں تو:

نگاہ گرم ہے، حالت ہو دل کی اور تباہ

اگر یہی ہے ارادہ ترا، تو بسم اللہ

میری اس آخری تحریر کے بعد حقی صاحب کا مراسلہ آیا کہ اب مجھے توسیع نہیں دی جائے گی میں دفتر سے قطع تعلق کر کے گھر آیا اور حقی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔

لیکن اس خبر کو حقی صاحب نے کسی اخبار میں شائع نہیں ہونے دیا، تا کہ ان کا پول نہ کھلنے پائے اور جب ہندوستان کے ریڈیو نے میری برطرفی کا اعلان کیا تو یہاں کے اخبار نے، بڑی ڈھٹائی کے ساتھ، اس کی تردید کرتے ہوئے الٹا اس کو جھوٹا قرار دے دیا۔ چہ دلا ورست دزدے۔۔۔۔میری زندگی کا بحمد اللہ کہ یہ پانچواں معاشی بحران ہے، جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں ہر چند میری ملازمت کو ختم کر دیا گیا میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے میری سیمنٹ کی ایجنسی بھی مجھ سے چھین لی گئی ہے۔۔۔۔اور میرے باغوں کا جو روپیہ ہندوستان کے ریزرو بینک میں جمع ہے وہ بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چند، خدا کے فضل و کرم سے میرا کوئی بینک بیلنس بھی نہیں ہے لیکن میں بدحواس نہیں ہوں بدحواسی تو درکنار میں پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش ہوں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ میرا یہ بحران بھی میرے چار عدد سابق بحرانوں کے مانند، کسی خیر جدید کا سرچشمہ بن جائے گا۔

مجھ کو اس امر کا یقین کس بناء پر ہے؟ یہ بھی سن لیجئے:

میں جب حیدر آباد گیا تھا اور سر اکبر حیدری کی سی طاقت ور شخصیت سے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد جب میرے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔۔۔۔اس وقت نظام نے میری خاطر، ایک جدید و غیر ضروری عہدہ خلق کر کے مجھے برسر روزگار بنا دیا تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا۔۔۔۔اس وقت سردار روپ سنگھ اور سروجنی نائڈو نے میری مدد کی تھی اس کے بعد شیو نرائن نے ہاتھ بٹایا تھا اور جب شیو نرائن نے

ساتھ چھوڑ دیا تھا۔۔۔اس وقت مہاراجہ پٹیالہ میری پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے

جب بمبئی میں نان شبینہ تک سے محروم ہونے کا وقت سر پر آ پہنچا تھا اس وقت پنڈت نہرو نے میری دستگیری کی تھی۔

جب نقوی صاحب کی دعوت اور بھروسے پر یہاں آیا تھا اور نقوی صاحب کی کمشنری جاتی رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔اس وقت سہروردی صاحب شائستہ اکرام، آفتاب احمد خاں، زبیری صاحب، اور ممتاز حسن صاحب نے میری تجویز کو منظور کر کے ترقی اردو بورڈ بنایا اور میری معاش کا بندوبست کر دیا تھا۔

سوچتا ہوں کہ جب کوئی نامعلوم توانائی یا حسن اتفاق کی تکرار ہر برے وقت پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر موقع پر کوئی اللہ کا بندہ ''مردے از غیب'' کی طرح چپکے سے آ کر اور میری مصیبت کے پہاڑ کاٹ کر، غائب ہو جاتا ہے تو مجھ کو اس بحران کی بھی کوئی پروا نہیں کرنا چاہئے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بحران کا سر بھی میرے قدموں پر جھک کر رہے گا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں، ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

اور اسی بناء پر جس دن میری نوکری چھٹی تھی تو نوحے یا مرثیے کے بدلے میں نے اسی روز ایک نظم ''ترانہ بہار'' کے نام سے کہی تھی آپ بھی سن لیں اور داد دیں۔

لو اٹھا جھوم کر، وہ ابر بہار
والشر بو، والشر بو، اعلیٰ الابصار
آؤ، ''یاہو'' کی گونج میں وہ الاپ
کہ دو عالم ہوں رقص پر تیار
آؤ، وہ دھن، کنشت میں چھیڑیں
جھوم جائیں، بہشت کے اشجار

www.pdfbooksfree.pk

خطہ برف سے اگائیں آگ
آگ میں لہلہائیں پھر گل زار
سنگ و آہن کو بخش دیں آہنگ
خار و خس کو عطا کریں چہکار
گھٹ کھٹائیں، سبو کے دستے سے
باب آگاہی و در اسرار
آج، یہ راز فاش کر دیں آؤ
کہ رئیسان شہر ہیں نادار
آؤ، دربار کج کلاہاں میں
عاجزی کو سکھائیں استکبار
بخش دیں، رہ نشیں گداؤں کو
حکم سلطان سے جرأت انکار
گنج باطل کو چھوڑ دیں شاخیں
دست قاتل کی توڑ دیں تلوار
آندھیوں کو بنائیں، موج نسیم
زلزلوں کو سکھائیں وضع قرار
نار گیتی سے بین لیں شعلے
مار گردوں سے چھین لیں پھنکار
آؤ عرفاں کے یوں سبو چھلکائیں
کہ الٹ جائیں، اولیائے کبار
یوں کریں، شرح وحدت آفاق
ایک ہو جائیں کافرو دیں دار

www.pdfbooksfree.pk

ذرہ و آفتاب کے مابین
ڈال دیں، آؤ، طرح بوس و کنار
آؤ، یوں، دھوم سے گلال اڑائیں
کہ گلابی ہو، کہکشاں پہ سوار
آؤ، پیدا کریں، بگردش جام
وقت اندک میں، فرصت بسیار
آؤ، عمر خضر کو، چکرا دیں
تب و تاب لمحہ سرشار
آؤ، ذرات کو، عطا کر دیں
تتلیوں کے پروں کے نقش و نگار
لائی، پھر، بوئے زلف لا محدود
مرحبا، مرحبا، نسیم بہار
ہاں اب اے دل نواز سازندے
اور کچھ اور تھاپ کی گمکار
اور پھر جائے، این و آں سے نگاہ
اور گھر جائے ابر زمزمہ بار
اور بڑھ جائے، صحت مستی
اور چڑھ جائے نرگس بیمار
اور ہو تیز، اے نسیم شمال
اور ہو تند، اے ہوائے چنار
اور اے ابر سرمگیں، دھمال
اور اے آب آتشیں دھکار

www.pdfbooksfree.pk

اور مہکو ہزارہ وسوسن
اور بہکو، ثوابت و سیار
اور بوجھل ہو مے کدے پہ گھٹا
اور گتھل ہو، احتیاط کی دھار
اور ساز الست کی آہنگ
اور رندان مست کی بنکار
اور شیشوں کی انجمن میں کھنک
اور بوندوں کی شاخ سے پڑکار
ہاں، ابل اے شراب کاکل درخ
ہاں بدل، اے مزاج لیل و نہار
ہاں، لہردے میں گھوم جائے گھٹا
ہاں کہردے میں جھوم جائے نکھار
بدلیو، ہاں، یہی گرج، ہر آن
بجلیو، ہاں یہی کڑک، ہر بار
خوف شب خوں پہ، ہاں یہی پتھراؤ
جور گردوں سے ہاں یہی پیکار
ہاں، یہی بھیڑ بھاڑ، اے رندو
ہاں، یہی چھیڑ چھاڑ اے بوچھار
ہاں یہی نغمہ ہو الوجود
ہاں یہی نعرہ ہو الغفار
ہاں گدایان کوئے پیر مغاں
یوں جگا دو، لبوں پہ، صوت ہزار

www.pdfbooksfree.pk

کہ سلاطین آسماں اور تنگ
مانگنے آئیں، رقص و رنگ ادھار
یوں الجھنے لگے، گھٹا سے ہوا
کہ سلجھنے لگیں، نشاط کے تار
کھول دو، ہاں، زمین کے غرفے
بول دو، آسمان پر، یلغار
یوں، پھڑکنے لگے رگوں میں سرور
کہ تھرکنے لگے چمن کا نکھار
مست رامش گرو، دھنوں میں گھماؤ
نغمہ بحرو موجہ انہار
یوں ستاروں پہ، متصل جھالے
کہ پڑے دور تک مہین پھوار
یوں مان آڑے سروں کو قوس بناؤ
کہ جھلک جائے مصر کا بازار
مغبچو گھوم کر کمر لچکاؤ
مطربو، جھوم کر اٹھاؤ ستار
گرہ زلف ناز و بند قبا
کھول دو، دختران قاف دتار
یوں، نقابیں اٹھاؤ مکھڑوں سے
کہ گلابی کو، توڑ دیں، رخسار
اس ٹھکانے کے ساتھ بھاؤ بتاؤ
کہ بدل جائے وقت کی رفتار

www.pdfbooksfree.pk

بوئے گل کو بناؤ خیمہ زر
رنگ مل کو بجاؤ سلسلہ وار
اس انوکھی لٹک سے توڑا کو
کہ دھڑکنے لگے دل کہار
لے کو پہناؤ ادکھلی چولی
سر پہ جھمکاؤ، لٹ پٹی دستار
اس جونٹی دھمک سے رقص کرو
کہ گمکنے لگیں، در و دیوار
یوں ہو چھم چھم کہ فرش بن جائے
تند قلزم کی سطح ناہموار
توڑ دو جال، اے زمان و مکاں
تال دو، تال اے یمین و یسار
ہاں، گلوں کی خمیدہ لیکھوں پر
کم سنو، یونہیں، پتیوں کی قطار
اے بتوں کی چھبو، یہی جادو
اے گلابی لبو، یہی مہکار
مدھ بھری پاگلو، یہی چھل بل
گھومتی چھاگلو، یہی جھنکار
نشتر کرتا ہیں، جوش کے نغمات
ہاں، اٹھو، اے پیمبران بہار!!

دیکھے، آپ نے میرے تیور؟ ایسی تیسی اس بحران کی بر پاپوش قلندر!!!

بحمد اللہ کہ میری نوکری چھٹے 1 ہوئے اب ایک مدت گزر چکی ہے جس روز میں

www.pdfbooksfree.pk

حضرت حق کے فضل و کرم اور حقی صاحب کے قلم فیض رقم سے بر طرف کر دیا گیا تھا، اس روز پورے دن نہ سہی چند گھنٹے تو ضرور پریشانی رہی تھی لیکن میری بیوی کی ہمت اور میری عزیمت نے اس وقتی پریشانی کو شام ہوتے ہوتے، کہنی کی چوٹ کے مانند فراموش کر دیا تھا۔

اور اب چونکہ وہ سارا معاملہ رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے

1ـ نوکری چھوٹ جانے کے بعد میں نے موسیٰ خاں، فدا حسین صاحب، اور خود صدر پاکستان کو اس مفہوم کے خط لکھے تھے کہ اب میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ کبھی سرکاری نوکری نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تمام حجت کے طور پر اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو حکومت کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں حکومت سے کسی خیر کا طالب نہیں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ معاملے کی صفائی کر کے اپنے کو مزید شر سے محفوظ کر لوں۔ اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میں قید سے لے کر قتل تک اپنے کو آمادہ پاتا ہوں اس لئے اپنی صفائی میں دروغ بیانی سے کام نہیں لوں گا اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو سچائی کے ساتھ بیان کر دوں گا۔۔۔ ان خطوں کا حشر یہ ہوا کہ فدا حسین صاحب، اور صدر پاکستان نے تو مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی البتہ موسیٰ خاں نے جواباً لکھا کہ میں اپنی شکایات لکھ بھیجوں لیکن میں نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اب ان کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔۔۔۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دیا کہ روح کو بلا گویا رہے کہ میں نے ''اتمام حجت'' میں کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔

اک پرانا واقعہ ہے، خانہ ویرانی مری
کے حدود میں داخل ہو کر گل دستہ طاق نسیاں بن چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ میں اپنے بزرگوں کے ناموس اور اپنی عزت نفس کو شاہد بنا کر، یہ قسم کھا چکا ہوں کہ مر جاؤں گا لیکن اب سرکاری ملازمت کا ارتکاب نہیں کروں گا یعنی '' اب کھائی تو

www.pdfbooksfree.pk

کھائی، اب کھاؤں تو، رام دہائی" تو اس منزل میں اگر اب میں اپنی پوزیشن صاف
کرنے کا ارادہ کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل کو حکومت کی خوشامد یا
ملازمت کی آرزو نہیں سمجھا جائے گا اور اسی بناء پر میں بہانگ دہل اعلان کر دینا چاہتا
ہوں کہ 1946ء کے اواخر میں میرے خلاف ارادی غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی بناء پر
جو یہ پروپیگنڈا فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن، یا صدر پاکستان کا مخالف ہوں
قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تھا حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ
میں پاکستان کا دشمن ہوتا تو اپنی دولت، اپنی عزت، اپنی فراغت، اپنے احباب، اپنے
بزرگوں کی ہڈیوں سے منہ موڑ کر اور اپنے ناز بردار جواہر لال نہرو کا دل توڑ کر یہاں
آتا کیوں؟

اگر اس موقع پر کوئی زبوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ
کر لے آئی تھی تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی
تھی کہ میں اس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا۔۔۔۔۔اور اس کے ساتھ ساتھ میں ان
بزرگوار سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ میرے مزاج اور میری زندگی کے حالات
سے اگر واقف ہوتے اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ میں ایک لکھ لٹ انسان رہا ہوں، اور لکھ
لٹ انسان کبھی لالچی ہو نہیں سکتا تو وہ میرے باب میں اس قدر اوچھی بات کہنے کی کبھی
جرأت نہ فرماتے۔۔۔۔

اور بالفرض محال تھوڑی دیر کے واسطے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر یہاں
لائی تھی لیکن جب نقوی اور سکندر مرزا کے زوال کے بعد مجھ پر عرصہ حیات تنگ ہوا
کرتا تھا اور میری پریشانیوں کا حال سن کر جب پنڈت جی نے مجھ سے کہلا بھیجا تھا کہ
میں پاکستان کو ترک کر کے ہندوستان آ جاؤں تو اس وقت میں نے ہندوستان جانے
سے کیوں انکار کر دیا تھا؟

اور اب، جب کہ میں پاکستان میں اپنا مکان بھی بنوا چکا ہوں، اور یہیں کی خاک

میں دفن ہو جانے پر بھی آمادہ ہوں تو کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ مجھ کو پاکستان دشمن کہہ کر اپنے خبث نفس یا اپنی حماقت کا اعلان فرما دے۔

پھر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ خدانخواستہ حکومت مجھ پر مہربان ہو جائے میں جانتا ہوں کہ ایک میرے سے مزاج، اور ایک میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دنیا کی کوئی حکومت کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر اور میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے اور اب جب کہ خدا کے فضل و کرم سے میرے چل چلاؤ کا زمانہ سر پر آ چکا ہے، سوچتا ہوں اب کوئی مہربان ہوا بھی تو کیا اور نامہربان رہا بھی تو کیا۔

راس، اول تو نہ آئے گی، زمانے کی ہوا
راس بھی، دو دن، زمانے کی ہوا آئی تو کیا

میں اس نفرت پرورده و سیاست گزیدہ زمانے میں جب کہ ایک ملک دوسرے ملک کو اپنے پیٹ میں رکھ لینے پر تلا بیٹھا ہے اور ملک تو پھر بھی ایک وسیع تصور ہے جب کہ ایک صوبہ دوسرے صوبے پر چھری تانے کھڑا ہے یہ بات کس سے کہوں کہ میں تمام نوع انسانی کا دوست ہوں اور یہ کہوں بھی تو یقین کون کرے گا، ہر سننے والا میرے اس دعوے کو اپنے خبث نفس کی ترازو میں تول کر مجھ کو جھوٹا سمجھے گا لیکن میں اپنے سچ کو اس خوف سے دبا نہیں سکتا کہ اس کو جھوٹ خیال کیا جائے گا اس لئے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں جوتی کی نوک سے کوئی مانے یا نہ مانے، کہ اب ایک مدت دراز سے میرے سینے میں ابوالانسان حضرت آدم کا دل دھڑک رہا ہے میں اس دنیا کے ہر قریب دور ملک کو بلا استثناء اپنا وطن اور اس کرہ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثناء اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔

جب کسی کے گھر میں جشن ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا ہے، اور جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ

میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ انفس و آفاق، وحدت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے اور ایک ہی قسم کے عناصر ترکیبی کے مختلف مظاہر ہیں جن میں صرف اسم و جسم کا فرق ہے اصلیت اور حقیقت سب کی ایک ہے، اس کائنات میں غیریت کا کہیں کوئی نام ہی نہیں ہے اور عینیت کامل سب کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اس عالم وحدت و عینیت میں اگر کسی سے نفرت یا دشمنی کروں گا تو اس کے سوا اور کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے کہ میں خود اپنی ذات سے نفرت یا دشمنی کار رہا ہوں۔

اے دوست، دل میں، گرد کدورت نہ چاہئے
اچھے تو کیا، برے سے بھی وحشت نہ چاہئے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہئے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے، لہو، سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا!!

☆☆☆☆☆☆

میری موجودہ زندگی

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں۔۔۔ اللہ اللہ یہ آب وہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری۔۔۔۔۔یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں۔۔۔۔۔یہ مولدو منشاء سے دوری، یہ غربت کی رنجوری۔۔۔سینے میں یہ کھٹکتی پھانسیں یہ حالات کی اکھڑی سانسیں۔۔۔۔یہ دل پر چلتے بان یہ سر پر کڑکتی کمان۔۔۔۔یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں یہ حکومت کی سرگرانیاں۔۔۔۔۔یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران۔۔۔۔اور یہ چہرہ زندگی پر گردوغبار کا غازہ اور یہ دوش پر عزت نفس کا جنازہ۔۔۔۔

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو، خون تھوک تھوک کر مر چکا ہوتا۔۔۔۔۔لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں آلام حیات پر سکرا بھی رہا ہوں ان دردمندیوں کے بولتے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے،، مجھ اللہ کو میرا جگر لاہے کا ہے میں ایک دقیقے کے واسطے بھی اپنے کو اداس نہیں ہوتے، دنیا غم کو برابر ٹھکراتا رہتا اور:

چوں، غم تو، نہ تواں یافت، مگر دردل شاد
ما بامید غمت خاطر شادے طلبیم

کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں میں خارج سے خوشی کی طلب گاری نہیں کرتا خارج میں رکھا ہی کیا ہے میں اپنے باطن میں خوشی بونا، خوشی کی آب یاری کرنا، خوشی اگانا، اور خوشی کی بالیاں کاٹا رہتا ہوں اور مستی کے عالم میں دنیا کے تمام بےدردوں کو، مخاطب کر کے گنگنا مارتا ہوں کہ:

تھوڑی سی زندگی تھی بہر حال کٹ گئی
تم کو، جو ہم پہ رحم نہ آیا، تو کیا ہوا!

حسب معمول قدیم تاروں کی چھاؤں میں، بلاناغہ، ہر روز دو یا تین بجے صبح کو

بیدار ہو کر خوب اچھی طرح کلیاں اور غرارے کرتا، ڈغڈ غا کر کٹورا بھر پانی پیتا، منہ پر دو چار چھپکے مار کر تولیا سے منہ پوچھتا، اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں میز پر اگر بتی جلتی رہتی ہے اور وہاں پہنچا تا ہوں، جس عالم کا، کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے۔

اس وقت کبھی کبھی میرے گردو پیش ہلکی ہلکی گھنٹیاں سی بجنے لگتیں اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں چھڑ جاتی ہیں کہ بقول حضرت اقبال منازاں نغمہ چیدم کہ سر ددوم نہ تو اں بعض اوقات طبع میں اس قدر نازکی ہوتی ہے کہ موذن کی آواز گراں گزرتی ہے۔ اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرہ ارض عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جارہا ہے اور تمام ثوابت و سیار زمین کی جانب جھکتے چلے آرہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی، سانولے پن میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو کتاب و قلم سے دست بردار ہو کر کبھی کبھی انگنائی میں آتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو بلبلا بلبلا کر پوچھتا ہوں۔

اے پچھلے پہر کے غم گسارو بولو
اے مجمر گردوں کے شرارو بولو
اس پردہ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون؟
بولو[1] اے ڈوبتے ستارو، بولو!!

اس کے بعد، اگر ہمت ہوتی ہے تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں، یا پھر، مکان ہی میں ورزش کر کے خط بناتا، نہاتا، ناشتہ[2] کرتا، اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔۔۔۔اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو یا تین بجے تک بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے پھر نیند آئے یا نہ آئے ایک گھنٹے کے واسطے

---

[1] ایک بار یہ بھی ہو چکا ہے کہ تاروں کو دیکھ کر گریبان کے ٹکڑے گرائے اور

www.pdfbooksfree.pk

ہچکیاں لے لے کر اپنے بے پایاں جہل پر رویا بھی ہوں 2؎ پر تیس برس سے دوپہر کا کھانا ترک کر چکا ہوں۔

لیٹ جاتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ حمام کر کے نوشت 1؎ و خواند کا سہ بارہ آغاز کر دیتا ہوں اور شام ہوتے ہی منہ ہاتھ دھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر سوال کرتا ہوں۔

اے دشمن بے پناہ کب ہو گا غروب؟

اے سنگ رہ گناہ کب ہو گا غروب؟

پیاسے بیٹھے ہیں کب سے، رندان کرام

اے شعلہ رو سیاہ، کب ہو گا غروب؟

اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے تب:

دل کی جانب، رجوع ہوتا ہوں میں

سر تا بقدم، خضوع ہوتا ہوں میں

جب مہر مبیں، غروب ہو جاتا ہے

پیمانہ بکف، طلوع ہوتا ہوں میں!

اس دشمن بے پناہ کی تجہیز و تکفین کی خوشی میں بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے ساتھ، پیمانہ بھرتا ہوں اور یہ سوچ کر کہ اس کرہ آفات میں آج کا دن بھی محض حسن اتفاق سے بخیریت

1؎ کھوکھلے اقتدار کی چھچھوری آرزو کے ڈسے ہوئے، ان سفید اور دیوانے سیاست دانوں کو جو گلی گلی، ووٹوں کی بھیک مانگتے، کوئی دولت کی تابرگ نہ سمجھ سکنے والی پیاس کے مارے ہوئے ان جاہل اور بورانے صنعت کاروں یعنی دولت مند ناداروں کو جو قریوں قریوں نوٹوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ اس دنیا میں دولت کی نہیں دماغ کی فرماں روائی ہے اور سرکار قلم کے

www.pdfbooksfree.pk

در بار میں سکندر اعظم اور قارون پر شکم کی بس اس کے متوالوں کو اس بات کا پتا نہیں ہے
کہ نوشت و خواند ایک ایسی بے نظیر عیاشی بھی ہے کہ راجہ اندر کا اکھاڑ الفظ یا نیا خیال
ہاتھ آ جاتا ہے تو ان کے جشن ہائے فتح مندی کے زمزمے بازار شور بن کر رہ جاتے ہیں
اور اور اسرار حیات و کائنات کی تحقیق ایک ایسی بے لوث و گراں قدر عبادت ہے کہ کرو
روں حج اکبر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں اور جس وقت کہ اس کے نیم دقیقے کو ہزار
سالہ زہد پر لادا جاتا ہے تو اس کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، اور اپل میں وہ اس اونٹ کے
مانند زمین پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے جس کی کمر نا قابل برداشت وزن سے دب کر چٹ
سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔

گزر گیا، یہ رباعی پڑھ کر

جو سامنے آیا تھا، وہ عفریت گیا
میں ہارنے والا تھا مگر جیت گیا
اس مرد فگن، صبر شکن دنیا میں
صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

بھرے پیالے کو نعرہ "بسم اللہ" اور "یاد فلاں، بنت فلاں" کے ساتھ لبوں سے لگا
لیتا اور "الحمد للہ" کہہ کر پیالے کو سامنے کی گھڑی کے قریب رکھ کر شفق پر نگاہیں جماتا
حال سے منقطع اور مستقبل سے بے پروا ہو کر ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا
ہوں۔

ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔۔۔ پہلے یاد وش بخیر بوتل
کھلتے ہی طبلے پر تھاپ پڑتی تھی، نازنینوں کی پائلیں جھنک اٹھتی تھیں اور یاران
سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی۔۔۔ اب طبلے کی تھاپ کی جگہ مہامات
سے اٹھتی بھاپ ہے، پائلوں کی جھنک کے عوض سینے میں بربادی کی کھٹک ہے اور
یاروں کے لطیفوں کے بدلے حالات کے شکنجے ہیں۔

نہ محرمے، نہ شفیقے، نہ ہمدمے وادم
حدیث دل بکہ گریم، عجب غمے دارم

میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس اور کم سے کم پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف چار پیگ پیتا ہوں اور جب تین پیگ ختم کر کے چوتھا پیگ بنانے لگتا ہوں تو ام اشعراء پوچھتی ہیں ''کوتھا'' تو میں ''چوتھا'' کہہ کر ہنسنے لگتا ہوں اور جب چوتھا پیگ آدھا ختم ہو جاتا ہے تو کھانا طلب کر لیتا ہوں اور کھانا کھا کر کلیوں اور غراروں سے فارغ ہو کر تکیے پر سر رکھ دیتا ہوں اور پھر جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں حسب معمول تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو کر لکھنے پڑھنے لگتا ہوں

پہلے شراب تھی مایہ نشاط و آب و حیات اور آج ہے خواب نوشی وار وئے بے ہوشی ہائے، کہاں سے کہاں آ گیا میرا کاروان حیات!!

مجھ کو آخر یہ زبردستی جلایا کیوں جا رہا ہے، کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشق ستم کے واسطے؟ یاں تو جب چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ'' ماضی کے سسکیاں لیتے سمندر میں ڈوب کر مے کشی کا نہیں تے کشی'' کا آغاز کرتا ہوں تو۔۔۔۔۔سلونی فضا، سینما کے پردوں میں تبدیل ہو جاتی ہے ہر آن پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں اور ہر پردے کے اٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں، اور منادی کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے جوش دیکھ۔۔۔۔ یہ تیرا ملیح آباد ہے جہاں تو شہزادوں کی طرح رہتا ہے یہ تیرے محل کے سقف و بام ہیں یہ وہ انگنائی ہے جہاں تو کھیلا کرتا تھا یہ تیری وہ کھلائی ہے جس نے برکھا رت میں کلکتے والا ساون گایا اور گھر بھر کو رلایا تھا اور یہ تیرے ماں باپ ہیں میری ماں، میری طرف، ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر دور سے میری بلائیں لیتیں اور سر پیٹنے لگتی ہیں اور میرے باپ بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھاتے اور'' ہائے میرا بیٹا'' کہہ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب دوسرا پردہ اٹھتا ہے اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔اے جوش دیکھ یہ تیرا سب سے

پہلا شہر درس گاہ سیتاپور ہے یہ تیرا گنبد غنا اور کعبہ تہذیب لکھنو ہے۔۔۔۔یہ تیرا آگرہ ہے۔۔۔۔تیرا حیدر آباد دکن ہے یہ تیری بمبئی ہے اور یہ تیری دہلی ہے میں ان کی گلیوں میں گھومنے لگتا ہوں بہت سے جانے پہچانے لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور جب ان سے ان کے نام پوچھتا ہوں تو پردہ گر جاتا ہے۔

اب تیسرا پردہ اٹھتا ہے، اور منادی کہتا ہے۔۔۔۔۔اے جوش دیکھ۔۔۔۔یہ تیرے بچھڑے اور زیر خاک سوئے ہوئے احباب یعنی تیرے مورخان شباب ہیں تو انہیں پہچانتا ہے؟ ''ہاں پہچانتا ہوں۔۔۔۔ان کو نہیں تو اور کسے پہچانوں گا''

یہ صف اولیں میں کھڑے ہوئے ہیں، ابرار مختار، مانی، صاحب عالم، مجاز اور مخمور تم سب تو ہمیشہ چہچہاتے رہتے تھے ارے اب بولتے کیوں نہیں؟ تم مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو ہائے تمہارا تبسم تو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے ارے کچھ تو بولو سب رو رہے ہیں اور مجاز، اپنا وہی پرانا گیت بریلی کے بجار میں جھمکا گراری سنا رہا ہے میری ہچکیاں بندھ گئیں اور پردہ گر گیا۔

اب چوتھا پردہ جو چھم چھم کی آوازوں کے ساتھ اٹھ رہا ہے منادی آواز دے رہا ہے دیکھ اے جوش۔۔۔۔۔یہ تیری جوانی کے خیمہ رقص و رنگ کی گانے اور ناچنے والیاں ہیں، اور ایک فتنہ روزگار بڑی غمگیں آواز میں گا رہی ہے:

لذت سے نہیں خالی، جانوں کا کھپا جانا
کب، خضر و مسیحا نے، مرنے کا مزا جانا
اے فتنہ محشر، ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے گزرے تو، ہم کو بھی جگا جانا

سارنگی سے نوحوں کی آواز نکل رہی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب پانچواں پردہ اٹھا ہے اور کہنے والا کہہ رہا ہے۔۔۔۔دل تھام کر دیکھ اے جوش یہ تیرے محبوب ہیں جن کے مکھڑوں کی جوت سے، تیری نبضیں چلا کرتی تھیں

جن کی پل بھر کی جدائی بھی تجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب روزگار تیرے اور ان کے مابین فاصلہ پیدا کر دیتا تھا تو نیند، تیرے پپوٹوں پر صبح تک پر بھی نہیں مارتی تھی اور تیرے تکیے روتے روتے بھیگ جاتے۔

اللہ اللہ جگر جگر مکھڑے فضا پر دمک رہے ہیں سب کی انکھڑیوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کسی کسی نے اپنی زلفیں سوگ وارانہ انداز سے بکھرا دی ہیں اور کسی کسی نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا ہے اور فضا پر ''ہائے اللہ ہائے اللہ کی آوازیں تیرنے لگتی ہیں کہ عین اس وقت یکا یک پشت کی جانب سے ایک آواز آتی ہے ''سنو1'' میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ آواز ہے میری دن بھر کی اکتائی ہوئی بیوی کی۔۔۔اور ''سنو'' کے بعد وہ کہنے لگتی ہیں کہ آج نوکر نے حساب میں اتنے پیسے مار لئے'' فریج میں پانچ انڈے تھے اب صرف تین باقی ہیں سعیدہ کے منجھلے

1بات یہ ہے کہ میری بیوی میرے پڑھنے لکھنے کا بہت احترام کرتی ہیں، اور ہرگز نہیں چاہتیں کہ وہ میری مشغولیت میں خلل انداز ہوں اسی لئے صبح سے وہ گھر کے دھندوں میں لگ جاتی ہیں لیکن فرصت پا کر جب وہ تخت پر بیٹھتیں اور مجھ سے گو دین و دنیا سے بے پروا پاتی ہیں تو اکتا کر نیچے اتر جاتی ہیں اور سعیدہ سے کہتی ہیں کہ بٹیا میں کس سے بات کروں وہ تو پچھلے پہر سے لے کر شام تک سر جھکائے لکھتے رہتے ہیں اور میں سارا سارا دن عقا تو بنی بیٹھی رہتی ہوں گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب اوپر آتی ہیں مجھ کو اسی عالم میں پاتی ہیں اور کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر کہتی ہیں ارے اتنی محنت نہ کرو حقنہ نہ کرے بیمار پڑ جاؤ گے اور میں ان سے مسکرا کر کہتا ہوں کہ بیوی تم کو معلوم نہیں ایک بالشت بھر کا فرشتہ چھوٹا سا پستول ہاتھ میں لئے میری میز کے اوپر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تو گولی مار دوں گا اور

بیٹے نے آج بڑی بدتمیزی کی میں نے اسے تھپڑ مار دیا اور ہاں میں نے غزالہ سے کہا تھا اوپر آ کر حساب لکھ دینا وہ ابھی تک نہیں آئی تم اسے بلا کر ڈانٹ دو۔۔۔بیوی

کی یہ باتیں سن کر میری جان نکل جاتی ہے میرے سینما ہال سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور میرے سارے پنچھی پھر امار کر اڑ جاتے ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ بیوی اس بھید کو پا جائیں کہ میں ان کی باتوں سے گھبرا رہا ہوں اس لئے ان کی باتوں سے میرے چہرے کا رنگ جب اڑنے پر تل جاتا ہے تو میں جھپا مار کر اسے اپنے چہرے پر پھر جما لیتا اور مصنوعی طور پر مسکرانے لگتا ہوں۔۔۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے آتے ہی جب میں ایڑ لگا کر اپنے چہرے کو شگفتگی کی جانب موڑنا چاہتا ہوں تو میرا چہرہ شریر گھوڑے کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگتا ہے میرے دونوں گالوں کی ہڈیاں ابھر آتی ہیں منہ چوڑا ہو کر توبڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور میری ناک میرے قابو سے نکل کر ڈیڑھ بالشت لمبی ہو جاتی ہے اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں کا کاتو ا بیٹھا ہوا ہے۔

وہ تخت پر گر تڑا کر لیٹ جاتی ہیں کبھی کبھی تو ان کی اس تنہائی پر ترس کھا کر میں ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ کے بعد پھر لکھنے لگتا ہوں اور جب غروب کے بعد میں شغل شروع کرتا ہوں تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت میں خالی بیٹھا ہوا ہوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور گھر کی باتیں کرنے لگتی ہیں بیوی بے چاری کو کیا معلوم کہ جس وقت وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں خالی ہوں اس وقت تو میں پرانی یادوں سے لبالب بھرا ہوا بیٹھا ہوتا ہوں اور ایسا بھرا ہوا کہ سانس لینے تک کی گنجائش نہیں پاتا ہائے میری بیوی کہ سہاگن ہونے کے باوجود ان پر بیواؤں کی سی تنہائی چھائی رہتی ہے میرا دل کڑھتا رہتا ہے مگر کیا کروں کام بہت ہے اور عمر کم رہ گئی ہے چاہتا ہوں کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے گھبرا گھبرا کر کاغذ کے سپرد کر دوں۔



میرا دین

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اک جری انسان کے مانند، میں با آواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے جو دور ہے وہ قریب آ جائے جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے جواب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر، یعنی لفظ خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں وہ بھی اپنے سوظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین خیابان ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدان جہل کی ارزو اور محرک اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر میں کافر باللہ و مومن بالانسان توائے کائنات سے گرم پیکار، جنس آگاہی کے خریدار ذرات صید و انجم شکار نوع بشر کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ کہہ رہا ہوں کہ من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلا ہے۔

میں بھی ایک زمانے میں عقل بیزار و عقائد پرستار میری دنیا میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح حاصل تھی تیغ روزگار کے روبرو میرے ہاتھ میں بھی ''مصلحت الٰہی'' اور ہر چہ از دوست می رسد، نیکوست کی مضبوط سپر تھی میرے گرد و پیش بھی بہت سی مناجاتیں بہت سی ڈھارسیں بہت سی تشفیاں بہت سی تسلیاں بہت سی امیدیں بہت سی دعائیں بہت سی فردا کی کام گاڑیاں اور بہت سی نجات کی امیدواریاں تھیں اور میرے مشام تک بھی حواران مقصورات کے لب ہائے رنگیں کی مہکیں آیا کرتی تھیں۔

لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے میرے دماغ نے مجھ کو لوٹ لیا ہے اور میں اب بیکسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں کا مصداق بن کر رہ گیا ہوں اور بے مروت عقل میرے از رکدہ تصورات کے تمام خوبصورت مجسموں کو پاش پاش کر کے

میرے سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔

ایک زمانہ دارتک عقل کو آلہ ابلیس خیال کر کے میں اس سے لڑتا اور اس کا راستہ روکتا رہا لیکن وہ میرے عقائد پر سے یوں گذر گئی جس طرح ڈاک گاڑی، ان پتھروں کو پیستی گزر جاتی ہے جن کو بچے پٹڑی پر رکھ دیا کرتے ہیں

اے ایمان والو، تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میرا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے مجھ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھو یہ موقع تو ہے ترس کھانے کا۔

اور اے میرے منکر احباب، تم بھی مجھ پر طنز نہ کرو، اور مجھ سے یہ نہ کہو کہ اے نافہم جو مل تو کیسا عجیب آدمی ہے کہ منقولات سے نجات پانے اور معقولات کے قریب آ جانے پر افسوس کر رہا ہے میں تمہارے طنز کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں بے شک میں عجیب انسان ہوں لیکن اس بات کو نہ بھولو کہ میں ایشیا کا باشندہ ہوں، وہ ایشیا جو روایات، اقوال اور اوہام کا پائے تخت ہے وہ ایشیا جہاں لاکھوں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں بچوں کو سلایا جا رہا ہے جہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنون، اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے چلے آ رہے ہیں جہاں روایت کی قربان گاہ پر درایت کو چڑھایا جا رہا ہے جہاں ''دعائے صبح و آہ شب'' کو ''کلید گنج مقصود'' ٹھہرا دیا گیا ہے جہاں ''دو دو چار'' کے سر کو ''دو دو پانچ کے آستانہ'' پر جھکا دیا گیا ہے جہاں ''الف لیلہ'' ''اندر سبھا'' ''چہار درویش'' اور ''طلسم ہوشربا'' کے عقلیں چٹ لینے والے سائے میں ذہنوں کو پالا پوسا جا رہا ہے اور جہاں براہین قاطع کی گردنوں پر صدیوں سے کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جا رہی ہیں اس ایشیا میں کس خالص منکر کا پیدا ہو جانا تقریباً ایک محال امر ہے اس لئے اگر تم یہ دیکھو کہ میں اپنے دماغ کی آبادی، اور دل کی بربادی پر کبھی کبھی آزردہ سا نظر آتا ہوں تو مجھے قابل معافی سمجھو اس لئے کہوز میں شور سنبل بر نہ آرد۔

اور اے منکر دوستو، اظہار حقیقت میں شرمانا کیسا، میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی

بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آبا ءواجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انہوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں شافع محشر سے اپنے سارے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں حوض کوثر کے کنارے جام پر جام لنڈھاؤں اور حور و غلماں کو بھینچ بھینچ کر گلے لگاؤں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ ان کمزور لمحوں کے روزن سے جب میری عقل جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو میرے مرجھائے گالوں پر تڑاق سے تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر کے بڈھے بول تو نابالغ کب تک رہے گا تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ، تیرے دل میں جو بچہ بیٹھا فیل کر رہا ہے اس کی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی؟

اس جملہ معترضہ کے بعد اپنے موضوع کی جانب مڑ کر یہ عرض کر دینا بھی چاہتا ہوں کہ آج بھی میرے دل میں دنیا کے تمام بانیان مذاہب کا بے حد احترام ہے اور خصوصیت کے ساتھ قوت و حیات کے شاہکار حضرت محمدؐ عربی حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ کا شیدائی اور آبائی عقائد 1 سے آزاد ہو جانے کے باوجود میں ان متذکرہ بالا تینوں مقتدر ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔

آنحضرتؐ کے بارے میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ عرب کی سی جہالت کی راج دھانی میں اور وہ بھی آج سے کچھ اوپر چودہ سو برس پیشتر ان کا پیدا ہو جانا اور کسی ایک متنفس کی شاگردی کیے بغیر جہاں استاد کا مرتبہ حاصل کر لینا روزگار کا ایک ایسا معجزہ عظیم ہے کہ انسانی تاریخ انگشت حیرت کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آج کے دن تک نکال نہیں سکی ہے وہ پیدائشی عالم اور پیدائشی مفکر اور نظری نہیں عملی مفکر تھے۔

---

1 اس دھرتی ماتا پر کون ایسا مائی کا لال اور کون ایسا سورما ہے اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقائد اور ان عقائد کے

پیدا کردہ مزاجی قوام سے کلیۃً آزاد ہو چکا ہوں یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جبہ وجوہ آزاد ہو چکا ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس خودستائی ہے یا خودفریبی دانش مندی ہے کہ حماقت۔

انہوں نے جاہلوں کے درمیان حقائق کو آشکار کر کے سقراط کے مانند، زہر کا پیالہ نہیں پیا اور حقائق کو دل نشیں لباس پہنا کر چشمہ حیواں پر قبضہ کر لیا۔

سقراط نے اپنی قوم کی ذہنی سطح سے بلند ہو کر زبان کھولی، اس کو ہمیشہ کے واسطے خاموش کر دیا گیا محمدؐ نے اپنی قوم کی ذہنی سطح پر قدم رکھ کر بات کی اور وہ بات، اذان بن کر اس دنیا میں اب تک گونج رہی ہے محمدؐ کو ایسی حیرت ناک بصیرت حاصل تھی کہ وہ اپنے گرد وپیش کے لوگوں کی لرزش مژگاں سے ان کے دلوں کی پرتیں شمار کر لیتے اور ان کے انفاس کی درازی وکوتاہی پر نظر جما کر ان کے جذبات وخیالات کا عرض وطول ناپ لیا کرتے تھے۔

وہ ایک طرف تو اپنی قوم کے تمام مکروہات ومرغوبات کے زبردست نباض تھے اور دوسری طرف وہ نوع انسانی کی اس کمزوری کو بھی پا گئے تھے کہ یہ سود وزیاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خود پرست حیوان صرف تخویف وتحریص کی وساطت سے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

اور اسی لئے وہ دوزخ کے انگاروں اور حوروں کے رخساروں کو دمکا کر اپنی قوم کو راہ راست پر لے آئے انہوں نے ایک مصلح عملی حکیم کے مانند، یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں ایسی فلسفیانہ موشگافی، ایسی منقطی پردہ دری اور ایسی حقائق کشابرہنہ گفتاری سے کام نہیں لیں گے، جس سے ایک صحرانشیں قوم کی فعالیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔

اور اسی دانش مندانہ فیصلے کی بناء پر انہوں نے کاروان خیال کی نقل وحرکت کے واسطے ایک وجدانی شاہ راہ تراش لی اور اس کے دونوں طرف روایات، کنایات،

اشارات، تمثیلات اور تشبیہات کے درخت اس قدر ہیوستگی کے ساتھ نصب فرما دیئے کہ منطق کی شعلہ بار دھوپ اس شاہ راہ کے مسافروں کو جھلسا نہ سکے اور تمام قافلے بے روک ٹوک چلتے رہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کلمات کی کھنک، ان کے لہجے کی لچک، اور ان کے پر اسرار الفاظ کی دھنک کے نیچے اس شاہراہ سے لاکھوں قافلے اب تک گزرتے نظر آ رہے ہیں اور محمدؐ کو دل کروڑوں انسانوں کے سینوں میں آج بھی دھڑک رہا ہے۔

اور پھر، دنیا کی سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ موت کے بھیانک میدان میں حوروں کے خیمے نصب کر کے انہوں نے عربوں کے خون میں وہ حرارت پیدا کر دی کہ مٹھی بھر آدمیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کو مسخر کر کے اپنی خاک نشیں کملی والے تاج دار کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔

اے غلاموں کو مقام فرزندی تک لانے والے اے قاتلوں کو مسیحائی کے گر سکھانے والے اے انگاروں میں پھول کھلانے والے اے خوف و حزن کو علامت کفر بتانے والے اور اے رگ ہائے ذرات میں نظام شمسی کا لہو دوڑانے والے

اے وحشیوں کو بردباری اے زلزلوں کو تمکین شعاری اور اے عزائم انسانی کو آفاق شکاری عطا فرمانے والے اے لاوارثوں کے وارث، اے بے آسراؤں کے سہارے، اے یتیموں کے باپ، اور اے بیواؤں کے سہاگ۔۔۔۔۔۔۔۔ اے حروف نا شناس معلم، اے سفر نہ کردہ سیاح، اے فاقہ کش رزاق،۔۔۔۔۔ اے خلق کی برہان عظیم اے امی حکیم۔۔۔۔۔ اے خدیو اقلیم جبل المتین اے اولاد آدم کی فتح مبین اے ناموس ماء وطین اور رحمت العالمین! روح کائنات کا سجدہ تعظیمی قبول فرما۔

محمدؐ کے بعد اب ان کے نازش روزگار بھائی علی کی طرف، اپنی ٹوپی کو سنبھال کر نگاہ اٹھایئے۔

ہزاروں ماہ و سال کے مسلسل تجربوں کے بعد یہ کلیہ قائم کیا گیا ہے کہ علم اور

شجاعت، یہ دو ایسے اضداد ہیں جو کبھی ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے جس ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے وہ قلم وک اپنی انگلیوں کی گرفت میں نہیں لا سکتا، اور جس ہاتھ میں قلم ہوتا ہے وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن انسانی تاریخ میں علی کا ہاتھ وہ تنہا جامع اضداد ہاتھ تھا جو تلوار اور قلم دونوں کو مساوی روانی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔

وہ ادیب شاعر اور مفکر تھے اور اسی کے دوش بدوش، عدیم النظیر سپاہی بھی وہ صفحہ قرطاس پر مجسم کلک گوہر بار اور میدان کارزار میں سراپا شمشیر آب دار تھے۔

وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ موت ان پر گرے یا وہ موت پر ان دونوں کو وہ مساوی طور پر محبوب سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی نگاہوں نے موت کی پیشانی پر حیات ابدی کا جھومر دیکھ لیا تھا اس کے علاوہ ان کو ایک ایسی جواں بختی و برکت بھی حاصل تھی جس سے اس دور کا کوئی انسان بہرہ ور نہیں ہوا تھا اور جس نے ان کو اپنے تمام معاصرین پر وہ فوقیت بخش دی تھی، جو آفتاب کو ذرات پر حاصل ہے اور وہ فوقیت یہ تھی کہ انہوں نے جو چہرہ سب سے پہلے دیکھنے کی طرح، دیکھا وہ محمدؐ کا چہرہ تھا اور انہوں نے جو آواز سب سے پہلے سننے کی طرح سنی وہ محمدؐ کی آواز تھی۔

محمدؐ نے ان کو گودوں میں پالا اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا اپنے سائے میں پروان چڑھایا اور وہ ان کے وجود میں اس طرح جذب ہو گئے کہ علی کو اپنے انفاس سے بوئے محمدؐ آنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ علی حق پر اس مضبوطی سے قائم ہو گئے کہ وہ حق کا جسم، حق کی جان، حق کا اعلان، اور حق کی آواز بن گئے اور یہاں تک کہ حق کو علی سے اور علی کو حق سے پہچانا جاتا تھا اور چونکہ بہر آن و بہر نفس حق پر قائم رہنا ایک بہت بڑا خطرناک مرحلہ ہے اس لئے ان کی زندگی کبھی پنپ نہیں سکی۔۔۔ دنیا والے ان کی شدت حق پرستی کو برداشت نہیں کر سکے اور تو اور خود ان کے حقیقی بھائی ان کا ساتھ چھوڑ کر اس ایوان میں چلے گئے جہاں اسلام کے سر پر شاہی تاج رکھ دینے کے منصوبے تیار کئے جا رہے تھے اور جہاں شہد میں اس نیت سے زہر ملایا جا رہا تھا کہ

ارباب حق کو موت کے گھاٹ اتار کر باطل کو تخت شاہی پر بٹھا دیا جائے۔

علی کو حق پرستی کی تاب نہ لاکر، مسلمانوں کو ایک جماعت کثیر نے ان سے منہ پھیر لیا تھا اور یہاں تک کہ انہیں آخر کار یہ کہنا پڑا تھا کہ دنیا نے مجھ کو ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا ذلیل کر دیا اور اس قدر کہ میرا اور معاویہ کا تقابل کیا جانے لگا۔

علی کی زندگی اس کرہ ارض کے تمام عظیم انسانوں کے مانند محرومی و ناکامی کے سوا انہیں کوئی اور چیز نہیں دے سکی لیکن جب انہیں قتل کر دیا گیا تو ان کی موت نے ان کی قبر پر وہ چراغ عظمت جلا دیا جس سے ان کی زندگی کو محروم کر دیا گیا تھا۔

ان کا کام کار حریف اپنے تمام کروفر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں لیکن ان کی زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود ان کا نام تاریخ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے اور وہی لوگ جنہوں نے ان کی طرف سے منہ موڑ لئے تھے ان کی موت کے بعد جب کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ''یا علی'' کے نعرے لگانے لگتے ہیں

اے علی، شرافت انسانی، تیرے ان دو اخلاقی معجزوں کو قیامت تک فراموش نہیں کر سکے۔گی کہ جب تیرے حریف نے تیرے منہ پر تھوک دیا تھا تو نے اس کی جاں بخشی فرما دی تھی اور موت کے وقت جب تیرے سامنے شربت کا پیالہ پیش کیا گیا تھا تو نے یہ کہا تھا کہ جب تک میرے قاتل کو شربت نہیں پلایا جائے گا، میں نہیں پیوں گا۔

اے علی، اے میدان جنگ کے سورما جز خواں اے منبر امن کے شیریں سخن خطیب اے ایوان عدل کے دیدہ ور قاضی اے کشور سیف و قلم کے خدیو صحیح کلاہ اے نان جویں کی بے پناہ طاقت کے مظہر اے زندگی کے معتوب اے موت کے محبوب۔۔۔۔اے علت العلل کے باب میں ''لاغفور'' ''لارحمٰن'' اور ''لاقھار'' اور ''الاھو'' کی سی معنی خیز و خیال انگیز بات کہہ کر خاموش ہو جانے والے مفکر۔۔۔۔سیف و قلم کا مجرا قبول کر!

اب دل تھام کر نگاہ اٹھایئے علی کے سورما بیٹے اور محمدؐ کے لہولہان نواسے حسین کی جانب جو گریاں تاریخ کے سینے کا ناسور اور گزراں وقت کی پیشانی کا نور ہے۔

وہ حسین جس کے نظام انفاس کی اطمینان آمیز ہمواری کی زد پر میدان کربلا کی باد سموم کا دم ٹوٹ گیا تھا۔۔۔۔جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی کو دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

وہ حسین۔۔۔۔۔جس نے اس ارادے سے کہ ایوان حق کے چراغاں پر کوئی آنچ نہ آسکے اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا۔۔۔۔اور ناموس انسانی کو بچانے کی خاطر جس نے فولاد کو پگھلا دینے والے عزم اور زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا توارہ جاری ہو گیا تھا حسین ناتواں تھے یزید توانا تھا قانون قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہئے تھا کہ یزید، حسین کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گل کر دیتا۔

لیکن ہوا یہ کہ قانون قدرت کے علی الرغم، حسین کی ناتوانی نے یزید کی توانائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔۔۔۔اور اپنی مقتولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا وہ موت جس کے صرف تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں وہ موت منہ کھولے جب حسین کے سامنے آئی تو حسین اس کو دیکھ کر ایسی حقارت کے ساتھ مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جب کہ تیروں کا موسلا دھار مینہ برس رہا تھا اور حسین اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں، میدان سے اٹھا اٹھا کر، بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ جب کہ ان کے تمام انصار و اقرباء موت کی نیند سو چکے تھے اور ان کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا عین اس نازک ترین، اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے اور ایک بہادر سپاہی

کا حوصلہ مندانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔۔۔۔اور یہ دیکھ کر کہ ہیبت باطل سے حق کا چہرہ سفید ہو چلا ہے وہ اس پر سرخی دوڑانے کے لئے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا خون روانہ کرر ہے تھے صرف یہی نہیں کہ اس یقینی ہلاکت کے موقع پر ان کے حواس بجا تھے بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر اس فخر ومباہات کی ایک ایسی معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اہل اسلام میں نے غیرت اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر،تم پر احسان کیا ہے،اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسین۔۔۔۔۔اے دریائے زہر سے آب حیات پینے والے۔۔۔۔۔ اے بپھرے طوفان کو اپنے سفینے میں ڈبو دینے والے۔۔۔۔اے حریم شہادت کے، سب سے اونچے منارے اے ہمت مردانہ کے اوتار اور اے ثبات وعزم کے پروردگار۔۔۔۔۔۔ازل سے لے کر ابد تک کے انسانیت کا غلامانہ سلام قبول کر!

لیکن میری زبان سے ان متذکرہ بالا اعیان ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جایئے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مداح سرا ہوں میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط مزوک، خورتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیشس، مسیح، کبیر داس، گرونانک، مارکس، لینن، نٹشے اور برٹنڈرسل کا بھی جان و دل سے شیدائی ہوں اور جب تک رام چندر اور کرشن کے متعلق مجھ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں تاریخی انسان نہیں صرف اساطیری کردار ہیں اس وقت تک میں ان کا بھی بہت احترام کرتا تھا لیکن ان متذکرہ بالا شخصیتوں کی شیفتگی کے یہ معنی نہیں کہ میں ان کا ہم خیالی اور ان کا پیرو بھی ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

بات یہ ہے کہ مبلغان ادیان و مصلحان اذہان نے جس ''منشت اول'' پر اپنے نظام کے تصور تعمیر فرماتے ہیں وہ ''خشت اول'' سائنس دانوں کی سی کرید اور کھرے سونے کی سی تحقیقی نیت کے باوجود اب تک میرے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکی ہے۔

اور یہی میرا دیانت دارانہ اعتراف جہل ہے جس کو یاروں نے الحادعدوان اور ارتداد کا نام دے کر میرے خلاف ایک غوغا بلند کر رکھا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ میری عقل کا قصور ہو لیکن یار لوگ اس کو میری نیت کا فتور سمجھ بیٹھے ہیں اور لطف یہ کہ جو لوگ مجھ سے برافروختہ ہیں وہ علت العلل یا محرک اول کے باب میں مجھ سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔۔۔ان کو اپنے جہل کا علم نہیں اور اسی بنیاد پر وہ دین دار ہونے کے مدعی ہیں۔

کاش ان کو اس بات کا پتا ہوتا کہ ہمارا ایمان اس پیڑھی اور سیڑھی کے مثل ہے جس کو ہم نے والد مرحوم کے ترکے میں پایا ہے ہمارا ایقان تحقیقی نہیں تقلیدی ہے ہم حادثہ اتفاقی کے طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں اس لئے مسلمان ہیں اگر یہودی کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہم سے بڑا یہودی کوئی نہ ہوتا اور ہمارے معتقدات کا پرفسوں محل، ٹھوس کھوپڑی پر نہیں کھوکھلے کانوں پر تعمیر فرمایا گیا ہے اب رہا علت العلل اور محرک اولیں کا مسئلہ جس کو ''خدا''، ''بھگوان''، ''اللہ''، ''یہوا''، ''منروا'' یا گاڈ کے نام دیئے گئے ہیں جو تتریہ کے دائرے میں ''نور'' یا ''ہو'' ہے لیکن تشبیہہ کے میدان میں ایک مطلق العنان بادشاہ اور انسانوں کا سا مزاج رکھنے والا انتہائی طاقت ور شخص ہے سو یہ بحث اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اس کے واسطے اس کتاب میں گنجائش نکالی نہیں جاسکتی۔

بہر حال میں اقرار و انکار کے دو کروں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا ہوں نظام سادی کو دیکھتا ہوں تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا دل اقرار کرنے لگتا ہے اور نظام ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروڑوں خلا نظر آتے ہیں اور حیات انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور

اس کی بے کراں دردمندیوں پر نگاہ رکتا ہوں تو دل انکار پر مصر ہو جاتا ہے۔

نوع انسانی، ابھی تک اس قدر۔۔۔۔جہل میں گرفتار ہے کہ ہم اپنی اس موجودہ ذہنی سطح پر بیٹھ کر اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

اقرار یا انکار کا موقع اس وقت آئے گا جب ہم، ذرے سے لے کر افتاب تک کے علم پر حاوی ہو جانے کے بعد علت العلل کے ہر پہلو کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے میرا یہ خیال ہے کہ اس آخری منزل تک پہنچنے میں ابھی لاکھوں سال بیت جائیں گے اور میں اس تذبذب کے عالم میں خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔

لیکن مجھ کو یقین کامل ہے کہ لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد ہی مگر ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ نوع انسانی آخر کار روح کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گی اور پوری کائنات پر فرماں روائی کرنے لگے گی۔

جس وقت بفیض مشق فکر جولاں
انسان بنے گا تاجدار دوراں
مجھ کو نہ ملا، تو اے نگار آفاق
بچ کر، مری اولاد سے جائے گا کہاں؟

☆☆☆☆

میرا خاندان

میرے پردادا

تہور جنگ، حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر، گویا [1] ان کے دادا، یار بیگ خاں درہ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

---

[1] کتاب کی طباعت سر پر آ گئی ہے وقت نہیں کہ تاریخوں سے حضرت گویا کے تمام حالات جمع کر کے قلم بند کر دیں اس لئے اختصار سے کام لوں گا ان کے تفصیلی حالات مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سراپا سخت، جلوہ خضر تاریخ محتشم، از محمد محتشم خاں پسر نواب محبت خاں، تاریخ دنا سی، تاریخ اسپر نگو، نامہ مظفری، تذکرہ شعرا راز ابن امین اللہ خاں طوفان، بوستان اودھ از راجہ درگا پرشاد، سندیلہ، تاریخ آفتاب اودھ، سیرت سید احمد بریلوی، از ابو الحسن علی تاریخ امیر خانی، قیصر التواریخ، از کمال الدین حیدر، زائر لکھنوی لکھنو گزیٹیر، از مسٹر نیل آئی سی ایس، تاریخ ادب اردو، از رام بابو سکسینہ، تاریخ نظم اردو، از محمد باقر ایم اے دہلی، داستان اردو، از حامد حسین قادر تاریخ اودھ ایسٹ انڈیا کمپنی از ڈاکٹر باسو تاریخ غازی الدین حیدر، از محمد تقی ایم اے پی ایچ ڈی لکھنو تاریخ واجد علی شاہ از ڈاکٹر بھٹناگر، خطوط گویا کتب خانہ ٹونک و دار الانشاء رام پور تذکرہ خوش معرکہ زیبا، از سعادت علی خاں، ناصر لکھنوی، تذکرہ گلشن بے خزاں از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از عبد الغفور، نساخ کلکتہ، تذکرہ شعرائے اردو، از صغیر بلگرامی تاریخ عمادت السعادت از غلام علی آزاد، تذکرہ ریاض الفصحا، انہ مصحفی، روزنامچہ قاضی، کاکوری، وصیت نامہ فقیر محمد خاں بہادر گویا (قاضی عظیم ملیح آبادی) تاریخ فرخ آباد شیو پرشاد قدیم نسخہ قلمی ناسخ (کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی لکھنو) تذکرہ آب حیات از آزاد شعر الہند از عبد السلام ندوی نغمات القلندریہ (تکیہ شریف کاکوری) شباب لکھنو از احمد علی لکھنوی تاریخ داستان اردو از ڈاکٹر گیان چند جین ایم اے اور

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے کا نام محمد نام دار خاں اور چھوٹے کا محمد بلند خاں، نام دار خاں درہ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر 1234ھ میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انہوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنو آ کر مقیم ہو گئے۔

اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپیہ ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پا کر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا میں آزاد قبائل کا فرد ہوں، کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ہے شہر میں میرا دم گھٹتا ہے مجھ کو اطراف لکھنو کے کسی ایسے قصبے میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنو آؤں اور فرائض منصبی انجام دے کر شام کو وہاں چلا جاؤں۔

نواب نے کہا آپ اطراف لکھنو میں کوئی قصبہ منتخب کر لیں زمین آپ کو دے دی جائے گی۔

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے کنول ہار کو پسند کیا جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلّہ ہے زمین ان کو دے دی گئی اور انہوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کر لی اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنو جاتے، اور شام کو کنور ہال پلٹ آتے تھے۔

کنول ہار میں انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بد دل ہو کر ریاست اندر چلے گئے، اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

کنول ہارے چلتے وقت انہوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اپنے ساتھ اندور لے جائیں لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی آپ جائیں میں تعلیم سے فراغت پا کر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھ سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بھائی نے ان کو بھی رسالہ داری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی نیت سے آیا ہے اندور کے قریب اس کی فوج کا پڑاؤ ہے اور صبح ہوتے ہی حملہ ہونے والا ہے۔

یہ سنتے ہی مہاراجہ ہلکر نے بگل بجوا دیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔

اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا بھائی اب صبح ہوتے ہی میدان جنگ میں اترنا ہے، دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ چھوٹا بھائی علم حاصل کر کے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی قتل کیوں نہ کر دوں، تاکہ خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے پائے لیکن برادرانہ محبت جوش میں آ گئی انہوں نے سوچا کہ جب میدان جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا ابھی جلدی نہ کرنا چاہئے۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کا اٹھارہ سال کا چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے یہ

جوان مردی دیکھ کر ان کا دل ہاتھ بھر کا ہو گیا۔

معرکہ بے حد سخت تھا لیکن یہ دونوں بھائی اس جوان مردی کے ساتھ لڑے کہ راجہ ملکر کی فوج کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دن ڈھلتے ڈھلتے، دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ

1۔ یہ سارا ماجرا دادی جان نے مجھ سے کہا تھا۔

گئے اور حملہ آور راجہ بھاگ کھڑا ہوا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجہ کا تعاقب کیا بیس میل کا فاصلہ طے کر کے اسے گرفتار کر لیا اور مہاراجہ ملکر کے قدموں میں ڈال دیا اس واقعہ کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونوں بھائیوں کی بہادری کے جب ان کی شجاعت اور کارناموں کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کر کے ٹونک پہنچا تو نواب میر خاں والی ٹونک نے مہاراجہ ملکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجہ ملکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا سوچا کہ اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھر رہ کیا جائے گا اور اگر انہیں نہ بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں ان تمام باتوں پر غور کر کے اس نے والی ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار رہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، اور رسالدار بنا دیا۔

ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال کر ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خان اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی اور چونکہ نواب میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے دشمن جانی تھے انہوں نے بڑے

www.pdfbooksfree.pk

ولولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گوروں کے دوش بدوش نواب میر خاں کی فوج سے برسر پیکار تھے پنڈاروں نے فقیر محمد خاں کے تیور دیکھ کر یہ سوچا کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہو گی اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی گولا ان کی ران میں آ کر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے ایک پنڈار تلوار سونت کر ان کی طرف جھپٹا انہوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی گھوڑا دوڑاتے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا۔ اور چاہا کہ انہیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تا کہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو خوب کس کر باندھ لیا ہی سپاہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا آپ یہ توپ میرے قریب کرا دیں میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انہوں نے اس قدر شدت کے ساتھ دشمن پر گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز کے بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔

جب انہوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے جب یہ دیکھا کہ فقیر محمد خاں کا مقابلہ آسان نہیں ہے تو بانسوں پر اپنے اپنے دوپٹے بندھوکر، ہوا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔

فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انہوں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور رشتے کو

یہاں تک نباہا کہ جب بھی کبھی کسی نے جے پور یا گوالیار پر حملہ کیا انہوں نے فوراً موقع پر جا کر انہیں بھگا دیا۔

اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کر دیا۔

ان کی شجاعت، اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر روائی اودھ سے ملے نواب نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی اور جب سیاسی مسائل پر بات چھڑی تو نواب اودھ نے بڑی حیرت سے کہا خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانش مند اور ذی علم انسان بھی ہیں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔

انہوں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرے باپ محمد بلند خاں آپ کی سرکار کے ملازم تھے وہ ملیح آباد میں موجود ہیں غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ حق بحق (اررسید) کی طرح اپنے وطن ہی میں آ جائیں گے۔

اس پر انہوں نے کہا لیکن یہ بات آئین وفاداری اور اصول شرافت کے منافی ہے کہ میں والی ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔

نواب نے کہا خاں صاحب میں ابھی اس مسئلے کو حل کیے دیتا ہوں اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب معتمد ولہ آغا میر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔

آغا میر کے آتے ہی انہوں نے حکم دیا کہ اس جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔

خط روانہ کر دیا گیا اور چند روز کے بعد آغا میر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والی ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔

انہوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں

دے گے میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آ گیا تو انہوں نے شاہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی اور یہ عرض کیا کہ خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب اس تزک و احتشام کے ساتھ وہ ملیح آباد پہنچے کہ ان کے ہاتھی کے پیچھے تین سو سوار رہیں اور ان کی ہاتھی کے آگے آگے نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آ رہی ہے کے نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ، ادھر سے گزرتا غالباً سند یلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب یہ سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انہوں نے لوگوں سے کہا ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا کہ جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آ رہا ہے اور آپ کے اس کچے مکان میں دربار کریگا۔

اس پر محمد بلند خاں نے کہا مسخر و ہنستے کیا ہو اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد جب وہ ''شاہی سواری'' سندیلے کا راستہ چھوڑ کر کنول ہار کی طرف مڑنے لگی ہتو تمام پٹھانوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پوری آبادی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگی اور جب وہ جلوس محمد بلند کے مکان کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فقیر محمد خاں کی نظر جب اپنے باپ پر پڑی انہوں نے ہاتھی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کی پیٹ پر سے ''باوا باوا'' کہتے کود پڑے اور جا کر باپ کے

www.pdfbooksfree.pk

قدموں پر سر رکھ دیا باپ نے ''ارے میر افقیر'' کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا اور بوڑھے باپ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے جب وہ لکھنو واپس آئے غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ انہیں ''سرکار خیر آباد'' کا گورنر بنا دیا[1] اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا اس قطعے کے انہوں نے دو ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑے کا نام'' احاطہ پختہ فقیر محمد خاں'' اور دوسرے احاطہ کا نام ''احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔''

احاطہ پختہ فقیر محمد خاں میں متعدد محلات تعمیر کرا کے خود رہنے لگے اور احاطہ خام

---

[1] راجہ صاحب محمود آباد کے دیوان میں جس کا نام ''دیوان سحر'' ہے ایک قطعہ موجود ہے جو انہوں نے ان کے گورنر بنائے جانے کی خوشی میں بطور مبارکباد کہا تھا۔

میں اپنے ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کو آباد کر دیا[1] ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انہوں نے مرزا گنج میں سینکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنائے بارہ دری تعمیر کی آم کے باغ نصب کرائے اور گرمیوں کے واسطے ایک پختہ برف خانہ بنوا دیا۔

اسی اثناء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھنو کیا پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچا دی جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربین میں سے ایک مرزا حاجی۔

مرزا حاجی نے دو راجپوتوں وک دس دس ہزار روپے رشوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں

شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغا میرے دروازے میں قدم رکھیں تم دونوں بیک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغا میر کے محل گئے ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا اور جب آغا میر کے لڑکے کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچے ہی انہوں نے آغا میر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا، اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

ہن کی اس انوکھی درخواست سے آغا میر کے تمام رفقاء دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے آغا میر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہاں خاں صاحب آپ کی تجویز منظور بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا راجپوت نے تلوار چلا دی جس سے ان کا داہنا ہاتھ بڑی

1 وہ دونوں احاطے، اپنے چند محلوں کے ساتھ دو بڑے محلوں کی صورت میں آج بھی لکھنو میں موجود ہیں۔

طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار سونت کر انہوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے تلواریں گر پڑیں انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر کلیجے سے لگا لیا ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے

کی فرمائش کی تھیا سی وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے پوری سازش کا حال بتادیا۔مرزا حاجی کو کھڑے کھڑے حبس دوام کیس زادی گئی اور آغامیر نے ان کو دوبارہ گلے لگا کر کہا خاں صاحب آپ نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچالی یہ مجھ پر آپ کا وہ احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یادرکھوں گا۔

شاہ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ایثار سنا ان کی بے حد تعریف کی سات پارچے کے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ تہور جنگ کا خطاب بھی عطافرمادیا۔

حضرت ناسخ نے اس واقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا جوان کے دیوان میں ''تاریخ مجروح شدن دست فقیر محمد خاں بہادر کے عنوان سے موجود ہے۔''

لگے ہاتھوں میرے پرداداکا ایک دوسراواقعہ بھی سن لیجئے۔

آغامیر پر جب زوال آیا اور ان کے حریف میر مہدی کو قلمدان وزارت ملا تو چونکہ فقیر محمد خاں آغامیر کے طرف داروں میں سے تھے اور میر مہدی کے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ فقیر محمد خاں ایک نہ ایک دن اپنے اثرات سے کام لے کر آغامیر کو پھر برسر حکومت لے آئیں گے اس لئے اس نے ان کی ہلاکت کا منصوبہ بنا کر ایک روز انہیں دوپہر کے کھانے پر اپنے وہاں مدعو کیا۔

اوراس منصوبے کی تکمیل کے واسطے اس نے یہ صورت نکالی کہ خودتو بالائی کمرے پر بیٹھا اور سنگین دیواروں سے محصور تنگ انگنائی میں ایک بھینسے کو خواب شراب پلا کر آزاد چھوڑ دیا کہ جیسے ہی وہ انگنائی میں قدم رکھیں وہ بھینسا ان پر حملہ کرکے ان کا کام تمام کردے۔

چنانچہ یہی ہوا کہ جب فقیر محمد خاں نے انگنائی میں قدم رکھا بھینسے نے شیر ببر کے مانند جھپٹ کر ان پر حملہ کر دیا انہوں نے بھینسے کا وار خالی دے کر پینترا بدلا اور دوسرے گوشے میں تلوار تول کر کھڑے ہو گئے وہ ادھر بھی تیر کی طرح آیا انہوں نے

اس پر تلوار چلادی جس سے اس کی پیٹھ زخمی ہو گئی زخمی ہو کر وہ اور بھی خوفناک ہو گیا اور اپنے دونوں سینگ جھکا کر دوڑا کہ ان کا پیٹ پھاڑ ڈالے لیکن جیسے ہی اس نے سر جھکایا انہوں نے تلوار کا ایک ایسا دو ٹوک وار کیا کہ اس کی پہاڑ سی گردن کٹ گئی اور خون کا ایک فوارہ آسمان کی طرف جست کرنے لگا۔

وہ اپنی خون آلود تلوار لئے اوپر چڑھ گئے، میر مہدی اور ان کے مصاحب، دوسرے کمرے کی طرف بھاگے انہوں نے جھپٹ کر میر مہدی کا گریبان پکڑ لیا اور اس کی گھگی بندھ گئی اور پھر انہوں نے اس کے منہ پر اس قدر زور سے تھپٹر مارا کہ وہ اوندھے منہ گر گیا اور دستار وزارت ڈھلکتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی اور فقیر محمد خاں یہ کہتے ہوئے اتر گئے کہ اوگندھی کے بچے تو پٹھانوں کی شجاعت کا امتحان لیتا ہے۔

یہاں تک تو سرسری طور پر ذکر تھا ان کی عالی مرتبگی اور دلیری کا اب ان کی تہذیبی زندگی کے بھی چند واقعات سماعت فرمالیجئے۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ ہر چند پشتو ان ان کی مادری زبان تھی پھر بھی انہوں نے اردو شاعری اور اردو زبان پر اس بلا کی قدرت حاصل کر لی کہ ناسخ سے کٹر آدمی نے ان کو اپنے حلقہ تلامذہ میں لے لیا اور ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ میرے زمانہ تعلیم تک ان کا کلام نصاب میں داخل تھا۔

اور ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے انہوں نے لکھنو کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنو کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست، ان کی بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ان کے مشاعرے ان کے شبستان میں راتوں کے مجرے ان کی ادب نوازیاں اور اہل علم پر ان کی زر پاشیاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں

www.pdfbooksfree.pk

تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دین تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں اور دراصل ایک بالکل اجنبی زبان اور ایک قطعی ناموس تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی یہ حریت ناک صلاحیت و اخاذیت ایک ایسی نادر صفت ہے جو لاکھوں ہی نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیر معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند وہ بہت دولت مند انسان تھے اور میری دادی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا تمہارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیا تا تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ تھیلیوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا لیکن تمول کے باوجود وہ کثرت زر کی نحوست سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گاؤں یا کسی قسم کی کوئی جائیداد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے خلاف دولت وعشرت کی فراوانی کی سیدزیوں بن کر اوصاف انسانی سے محروم ہوکر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

اور اس خیال کے تحت انہوں نے اپنے نائب مرزا احسن علی بیگ، عرف مرزا حسو کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدیں۔

ایک روز جب یہ بات ان کے علم میں لائی گئی کہ مرزا حسو بیگ ان کے نام پر سینکڑوں زمینیں سینکڑوں باغ اور سینکڑوں گاؤں آئے دن دھڑا دھڑ خریدتے چلے جا رہے ہیں تو ان کو یہ بات بے حد ناگوار گزری، انہوں نے حسو بیگ کو طلب کر کے ان سے کہا مرزا میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ میں نے تم سے وہ کون سی ایسی برائی کی ہے کہ تم میرے واسطے جائیدادوں کی خریداری پر اتر آئے ہو، اور میری اولاد کے حق میں کانٹے بو رہے ہو مرزا حسو بیگ نہایت دور اندیش آدمی تھے انہوں نے

www.pdfbooksfree.pk

دست بستہ عرض کیا کہ خاں صاحب بہادر آپ کی سرکار میں تعمیرات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور میں دوسرے زمینداروں پر دباؤ ڈال کر ان کے وہاں سے مزدور بلاتا رہتا ہوں اس لئے آئے دن کی مصیبت سے نجات پانے کے واسطے میں نے جائیداد اس لئے خرید لی ہے کہ آسانی کے ساتھ مزدور مہیا ہوتے رہیں یہ سنا تو فقیر محمد خاں کا غصہ فرو ہو گیا اور ارشاد فرمایا کہ جائیداد کی یہ خریداری صرف مزدوروں کی فراہمی کے حدود میں رہے اور ریاست نہ بننے پائے۔

مرزا صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ تو کر لیا مگر در پردہ جائیداد کی خریداری کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رکھا۔

ایک روز فقیر محمد خاں سے چوب دار نے آ کر عرض کیا کہ کان پور کی ایک بیگم صاحب سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں انہوں نے فرمایا بلا لاؤ۔

وہ بیگم صاحب آتے ہی رونے لگیں اور کہا میرا بیٹا بد راہ ہو گیا ہے باپ کا سارا اندوختہ چوک میں اڑا چکا ہے اور پرسوں اس نے بہت بڑی جائیداد صرف ڈیڑھ لاکھ میں آپ کے نائب کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے آپ کی دریا دلی اور سخاوت کے اودھ میں ڈنکے بجے ہوئے ہیں اس لئے میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوئی ہوں کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ نقد لے کر میری جائیداد واپس فرما دیجئے۔

انہوں نے حسو بیگ کو بلایا انہوں نے آتے ہی جھک کر سلام کیا فقیر محمد خاں نے سلام کا جواب نہیں دیا مرزا صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہا فدوی سے کوئی قصور ہو گیا ہے؟ فقیر محمد خاں نے بگڑ کر ارشاد فرمایا مرزا جائیداد پیدا کرنے کا چسکا تم سے جائے گا نہیں، یہ دیکھو کان پور کی بیگم صاحب بیٹھی ہوئی ہیں جن کو تم شکار کر چکے ہو۔

مرزا نے کہا خدا گواہ ہے کہ میں ان بیگم صاحب سے بالکل واقف ہی نہیں اس پر بیگم صاحب نے جلدی سے بات کاٹ کر اپنے بیٹے کا نام لیا اور پوچھا کیا آج سے ایک مہینہ پیشتر آپ نے اس کی جائیداد نہیں خریدی ہے اور جب مرزا صاحب گھبرا کر

سر کھجانے اور کوئی عذر ڈھونڈنے لگے تو فقیر محمد خاں نے کہا ان بیگم صاحب کے لڑکے کی جائیداد اسی وقت واپس کر دو مرزا صاحب نے کہا میں نے وہ جائیداد تین لاکھ میں خریدی ہے اور بیگم صاحب ڈیڑھ لاکھ کہہ رہی ہیں انہوں نے حکم دیا کاغذات لاؤ، اور جب کاغذات آ گئے تو معلوم ہوا کہ میرزا صاحب سچ کہہ رہے تھے اس پر ان بیگم صاحب نے کہا کہ اب پتا چلا کہ وہ جائیداد ڈیڑھ میں نہیں تین لاکھ میں خریدی گئی ہے آپ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو میں اپنے ساتھ لائی ہوں اپنے خزانے میں جمع کرا دیں اور مجھ کو دو مہینے کی مہلت عطا فرما دیں اس مدت کے بعد میں جب باقی ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاضر خدمت کر دوں تو میری جائیداد میرے بچے کے نام کر دی جائے۔

فقیر محمد خاں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیگم صاحب آپ کا فرزند اس جائیداد کو پھر کسی کے ہاتھ فروخت کر ڈالے گا بیگم نے یہ بات سنی تو یہ سمجھ کر رونے لگیں کہ فقیر محمد خاں ان کی جائیداد واپس کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے فرمایا بیگم صاحب آپ میری بات نہیں سمجھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فرزند کے عوض وہ جائیداد آپ کے نام منتقل کرا دوں تا کہ آپ کا لڑکا دوبارہ فروخت نہ کر سکے۔

بیگم کا چہرہ یہ سن کر کھل گیا اور کہا خاں صاحب جیسا کہ ابھی کہہ چکی ہوں یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آپ اسی وقت لے لیں، باقی روپیہ جب دو مہینے کے بعد لے کر آؤں تو ان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا مرزا بیگم صاحب سے مطلق روپیہ نہیں لیں گے تم ان کے فرزند کی جائیداد میری طرف سے بیگم صاحب کے نام اسی وقت ہبہ کر کے ہبہ نامہ ان کے سپرد کر دو۔

یہ سنتے ہی مرزا صاحب کا رنگ اڑ گیا بیگم کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے اور ان کی جائیداد واپس کر دی گئی۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے جن کا نام غالباً محمد علی خاں تھا، ان سے کہا کہ

ریاست رام پور پر میرے ایک قرابت دار ناجائز طور پر قابض ہو چکے ہیں حالانکہ ازروئے شریعت و قانون یہ ریاست مجھے ملنے چاہئے کہ میں اس کا صحیح وارث ہوں میں نے غاصب پر مقدمہ دائر کیا تھا لیکن رشوت کے بل بوتے پر وہ جیت گیا اب میں اس مقدمے کو ولایت کی پریوی کونسل تک لے جانا چاہتا ہوں جس کے واسطے اسی ہزار کی شدید ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ پریوی کونسل میں رشوت نہیں چل سکے گی اور میں یقیناً مقدمہ جیت جاؤں گا ان کی اس استدعا پر فقیر محمد خاں نے ان کو اسی ہزار روپے دے دیئے۔

اور جب مقدمہ جیت لینے کے بعد، ان کو رام پور کا نواب بنا دیا گیا، تو انہوں نے فقیر محمد خاں کو خط پر خط لکھے کہ رام پور تشریف لائیے، کچھ روز میرے مہمان رہئے میں اس اثناء میں تمام اعیان ریاست کو جمع کر کے، آپ کے اس احسان کا اعلان کروں گا۔ جو آپ مجھ پر کر چکے ہیں اور اسی دربار میں آپ کے اسی ہزار بڑی نیازمندی کے ساتھ واپس کر کے آپ کی خدمت میں ایک بڑی جاگیر بھی پیش کروں گا فقیر محمد خاں نے اس روپے کے واپس لینے سے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ "حساب دوستاں در دل" کے طور پر دی گئی تھی میں کوئی بنیا نہیں کہ اسے واپس لے لوں [1]

[1] میں نے جب کہ میں 1927ء میں والئی رام پور، نواب حامد علی خاں کے زمانے میں بطور مہمان رام پور میں ٹھہرا ہوا تھا ان تمام خطوں کو ریاست کے دارالانشاء سے منگا کر خود پڑھا تھا لیکن جوانی کے لاابالی پن میں ان کی نقلیں نہیں کرائی تھیں اور اب جبکہ مجھے ان نقلوں کا خیال آیا تو میں نے کتب خانہ رام پور کے لائق مہتمم عرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ نقلیں مجھے بھیج دیں تا کہ اس کتاب میں درج کر لوں تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ دارالانشاء کے تمام کاغذات کو حکومت نے الہ آباد بھیج دیا ہے اب اتنا وقت کہاں کہ الہ آباد جاؤں اور نقلیں حاصل کروں۔

اب چند تذکرہ نویسوں اور مورخوں سے بھی ان کے حالات ملاحظہ فرمائیے:

www.pdfbooksfree.pk

صاحب الیاقوت والمرجان فی ذکر علمائے یہوان لکھتے ہیں کہ حکیم بدر الدین فاروقی، ابن شیخ محمد صدر الدین تھانیسری و شاگرد شاہ رفیع الدین، محدث دہلوی، نواب فقیر محمد خاں بہادر کے مشیر وندیم اور ان کے محلات کے معالج رہے۔

صاحب ''تاریخ اودھ'' کا بیان ہے کہ نواب فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپاہ سالار ہی نہیں مزاج بھی شاہی پایا تھا۔ ایک بار نواب آغا میر نے ان سے کہا کہ اس فصل میں ہم آم کھانے ملیح آباد آئیں گے، اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں نے ان شاہی مہمانوں کے لئے ایک بارہ دری تین لاکھ روپے میں تعمیر کرائی اور تین لاکھ کے فرنیچر سے اس کو آراستہ کیا۔

صاحب صبح ''گلشن'' نے لکھا ہے کہ اس قصبے (ملیح آباد) میں عمارات رفیع و بساتین وانہار رواں، ان کی عظمت وثروت کے آثار ہیں۔

صغیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انہیں آموں کا بہت شوق تھا، اور آم بڑے اہتمام سے لگائے تھے اور سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے تحریر کیا ہے کہ باوجود ہجوم دنیا، قدر دان اہل ہر فن است تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' میں درج ہے اہتمام اس (فقیر محمد خاں) کا آغاز سے خوش تر جب کہ دولت مند تھا اب شیعہ امیر المومنین حیدر [1]

کریم الدین خاں ان کے باب میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ شیعوں سے ہنگامہ رہتا ہے سننے میں آیا ہے بہت متعصب سنی ہے [2] تاریخ ''محتشم'' میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے وزیر منتظم الدولہ فقیر محمد خاں سے ناخوش ہو گئے تھے۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ انہوں نے وزیر کے روبرو، تاج الدین حسن خاں کے حق میں کلمات درشت کہے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فقیر محمد خاں جری آدمی تھے، اور ان کے سامنے ظلم ہوتا تو مظلوم کی پاس داری۔

1۔ ان کے شیعہ ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا 2۔ انہوں نے حضرت علی کی شان

www.pdfbooksfree.pk

میں جو قصیدے اور امام حسینؓ کی جناب میں جو سلام کہے ان سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

کرتے تھے اس لئے ان کے خلاف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ دربار میں ہتھیار باندھ کر نہ آئیں گویا نے کہا میں اس پر خانہ نشینی کو ترجیح دیتا ہوں اس پر انہیں ہتھیار لگانے کی اجازت دے دی گئی۔

الہ آباد کے رسالہ ''ہندوستانی'' میں ایک مقالہ ''مخزن آلام'' اور ''احمد کی شاعری'' کے عنوان چھپا تھا جس میں صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ گویا کا عروج، نصیر الدین حیدر تک رہا، وہ اودھ کے ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کے سالار تھے اور خود چودہ سو پیادے اپنی ذات خاص میں رکھتے تھے۔

صاحب ''نامہ مظفری نے لکھا ہے کہ گویا، عربی بھی ایسی صاف بولتے تھے کہ گویا مادری زبان ہے اور ان کی ترکی بولنے پر بھی لوگوں کو حیرت ہوتی تھی چودہ سو سپاہی ان کے ذاتی ملازم تھے فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑی آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان ہی میں رہے، بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کئے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔''

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑی کو لنگوری 1 چال سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا، ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا یہ سوار کون ہے نائکہ نے کہا چپ رہ، یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔

یہ سن کر، وہ غصے میں بھرے ہوئے، گھر آئے اور بیٹے سے کہا فقیرے اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا۔ بیٹے نے سبب پوچھا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا، دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بہی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے لعنت، ہزار لعنت، چوک سے

گزرنے والے پر۔

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم "باغات" نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے

1۔ گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر، اچھلتا، اور قوس سی بناتا، زمین پر قدم رکھتا ہے۔

والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول ان کے پیچھے آتے اور ہزاروں کچے پکے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے ہیں۔

یہ خبر سن کر، فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام، لکھنو سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ باوا تمام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے، آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انہیں باغوں میں نہ جانے دیا جائے۔

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیر امیر ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے چلو میرے ساتھ لکھنو، میں آج فقیرے کو مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شہزادوں اور عمائد لکھنو کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوب دار نے آ کر عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں گا۔

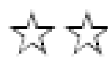
فقیر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا میں اس بڑی الماری کے پیچھے جا کر چھپ جاؤں گا باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔

اتنے میں بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آ گئے، تمام محفل کھڑی ہو گئی، انہوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہے، حاضرین نے جواب دیا کہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورو، جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔

''خوشامد خوروں'' کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ ہو کر رہ گئے لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے، کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا اڑتا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے، بیٹے کو کھڑا کر، الماری کے پیچھے سے نکالا اور ان کا گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال ہے کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والے کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا اور جب طمانچہ کھا کر انہوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس اب اس سے زیادہ اور ذلیل نہ کیجئے۔

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد باہر جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا باوا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا اور شعراء نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انہوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔



میرے دادا

نواب محمد احمد خان بہادر، احمد صاحب[1] ''مخزن الآم'' اور تعلقہ دار کسمنڈی، جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

میں نے ان کو اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا ان کا جسم بے حد گٹھا ہوا تھا کلائیاں دو آدمیوں کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں۔

ان کی آنکھیں بہت بڑی تھیں منہ پر داڑھی تھی، سر پر پگڑی باندھتے تھے اور جب داڑھی اور پگڑی کے مابین ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں تو ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہونے لگتا تھا وہ انگرکھا پہنتے اور انگرکھے کے اوپر ایک مخملی رومال لپیٹ لیا کرتے تھے۔

ان کی چال اس قدر نپی تلی تھی کہ اس میں تیز رفتاری کا عنصر پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ تیز تیز چلنے کو وہ آداب شرفاء کے خلاف سمجھتے تھے۔

وہ صرف ایک وقت، یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے اور صبح روز تے کر کے ناشتہ کیا کرتے تھے۔

ان کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں

---

[1] ان کے دیوان کا نام

تھیں۔۔۔۔۔۔وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے ان کے بچوں کے غالباً پچاسی نام میرے پاس لکھے ہوئے ہیں، باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں۔

ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا انہوں نے بلوغ کے بعد سے، انتقال تک، کبھی ایک رات بھی عورت کے بغیر نہیں گزاری۔۔۔۔۔۔البتہ جب لکھنو جاتے تو پردے کی شدت کی بناء پر چوں کہ بیویاں کیسی، لونڈیاں باندیاں بھی ان کے ساتھ

نہیں جا سکتی تھیں اور چوں کہ طوائفوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے اس لئے دو ایک راتیں ناغہ ہو جاتی تھیں اور صبح ہوتے ہی ان کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔۔۔۔۔اس عالم میں یہ ایک بندھا ٹکا معمول تھا کہ دو مضبوط جسم کے خدمت گار، ان کی کنپٹیوں پر روئی کے گالے چپکا کر ایک گھنٹے تک سنسی سے ان کا سر دبایا کرتے تھے۔

ان کی اس غیر معمولی جنسی طاقت کا غلغلہ سن کر لکھنو کے بڑے بڑے سول سرجن اور ڈاکٹر ان کے پاس آتے ان سے ان کی غذا، ان کے معمولات مرغوبات ومکروہات کے بارے میں دیر تک سوال کرتے، اور ان کا خون جانچتے تھے مگر کسی کو ان کی بے مثال جنسی طاقت کی لم نہیں معلوم ہو سکی۔

میں نے کم سنی میں ان کی اس بے گراں طاقت کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ چونکہ وہ کاکوری کے تکیہ شریف کے شاہ صاحب کی دعا سے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے، دادا میاں کو ان کے لڑکپن میں اپنا پائے جامہ پہنا کر، کچھ زیر لب دعا کی تھی اس لئے ان میں یہ غیر معمولی طاقت آ گئی تھی (اس بات کو میں ایک افسانے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا)

ہمارے خاندان کا یہ اصول تھا کہ خلف اکبر کو باپ کا جانشین اور تعلقہ دار بنایا جاتا تھا اور باقی بچوں کو صرف گزارہ دار کی حیثیت دی جاتی تھی۔۔۔۔لیکن دادا میاں کو چونکہ اپنے تمام بچوں سے بے حد محبت تھی انہوں نے اس اصول کو دوسری شکل دے دی، یعنی میرے حقیقی چچا اور میرے باپ کو، ہر چند سب سے بڑی جائیداد عطا فرمائی اور تعلقہ داری چچا کو بخش دی، لیکن اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا، اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے، بعض کو مرتبے کے لحاظ سے زیادہ جائیداد دی اور بعض کو کم لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا اور ان بیٹوں کو بھی جو لونڈیوں، باندیوں کے پیٹ سے ہوئے تھے کم سے کم دو دو

گاؤں اور دو دو باغوں کا مالک بنا دیا۔

جس طرح ململ کی چادر کو ببول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے اسی طرح انہوں نے اپنی جائیداد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیئے۔

اودھ کے تمام تعلقہ داروں کی طرح، دادا میاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ ان کے تمام فرزند جاہل رہ گئے اور حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دادا میاں کو عورتوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اپنے علاقے کی نگرانی اور ضلع داروں سے حساب فہمی کرتے، اس لئے تمام کارندوں نے خوب جی بھر کر لوٹا اور ایک کارندے صاحب نے تو جن کی تنخواہ فقط بیس روپے ماہوار تھی ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لئے جو ان کے انتقال کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی کو مل گئے۔

مہینے، دو مہینے کے بعد جب وہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو لوگوں میں یہ غلغلہ بلند ہو جاتا تھا کہ آج بڑے خاں صاحب برآمد ہوئے ہیں اور احاطے میں اہل ملیح آباد اور رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے سلام کرنے کی غرض سے، شرفاء کے واسطے کرسیاں اور رعایا کے واسطے دور دور تک بنچیں رکھ دی جاتی تھیں اور ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اس سرے سے لے کر اس سرے تک ہر شخص سے فرداً فرداً باتیں کرتے اور کسی ایک فرد کو بھی مکالمت سے محروم نہیں رہنے دیتے تھے۔

وہ انگریزوں کو ناپاک سمجھتے تھے اور دورے کے سلسلے میں جب ملیح آباد میں کمشنر کا پڑاؤ ہوتا تو حسب دستور وہ سب سے پہلے دادا میاں سے آ کر ملتا تھا اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب وہ اس فرنگی سے ہاتھ ملاتے تو اسی وقت تسلہ آ جاتا اور وہ اس کے سامنے بیسن مل کر ہاتھ دھولیا کرتے تھے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد (جس کو فرنگی ''غدر'' سے منسوب کرتے تھے) جب تعلقہ داری کے اسناد تقسیم ہو رہے تھے تو تمام تعلقہ داروں کے ساتھ دادا میاں بھی

تجدید سند کے واسطے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے تھے اور جیسے ہی لیفٹیننٹ گورنر کی نظر دادامیاں پر پڑی اس نے چیخ مار کر کہا دل ہم نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہے جو بشیرت گنج کی لڑائی میں برٹش کے خلاف لڑا تھا، آپ نے ہمارا بہت سا آدمی مارا تھا ہم فوج کا کرنل تھا ہم نے آپ کو دوربین سے دیکھا تھا نائیں نائیں ہم آپ کو سند نہیں دے سکتا۔

جب یہ سنا تو دادامیاں نے گرج کر کہا۔ بے شک میں آپ کے خلاف لڑا تھا اور مجھے لڑنا ہی چاہئے تھا میں نمک حرام نہیں ہوں کہ نواب اودھ اور اپنے ملک سے غداری کرتا ہم پٹھانوں کے خون میں غداری نہیں ہے ہم لوگ تو آن پر جان دے دیا کرتے ہیں آپ سند نہیں دیتے شوق سے نہ دیں۔

دادامیاں کی اس گرج سے دربار پر خاموشی چھا گئی، بہت سے تعلقہ دار ڈر گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے لیکن لیفٹیننٹ گورنر بڑا معقول اور شریف آدمی تھا، وہ مسکرایا اور کہا بہت اچھا بولا، بہت اچھا بولا ہم آپ کا تعلقہ داری کی سند دے گا بہت اچھا بولا پٹھان کیریکٹر کے ماچھق (موافق) بولا۔

لیفٹیننٹ گورنر نے ان کو تعلقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ درجہ اول کا آنریری مجسٹریٹ بھی بنا دیا اور وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹی کے فرائض انجام دینے لگے۔

ملیح آباد چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لئے آئے دن وہاں لٹھ پونگا ہوا کرتا تھا اور برابر فوجداری کے مقدمے پیش ہوا کرتے تھے لیکن ان کی مجسٹریٹی کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی پر جرمانہ کرتے تھے تو جرمانے کی رقم خود ان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

ایک بار ان کے اجلاس پر ایک پٹھان کا مقدمہ پیش ہوا جس نے ملیح آباد کے اسٹیشن پر ایک بدکلام انسپکٹر پولیس پر لٹھ سے حملہ کر کے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

انہوں نے اس پٹھان پر جرمانہ کر کے، جرمانے کی رقم حسب دستور اپنی سرکار سے

ادا کر دی اور شام کے وقت اسے بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے اس بدتمیز انسپکٹر کا دماغ صحیح کر دیا۔ میں اس صلے میں تین روپے ماہانہ تمہارا وظیفہ مقرر کر رہا ہوں جو تمام عمر تم کو ملتا رہے گا دادا میاں کے بعد بھی ان کو وہ وظیفہ تا حیات ملتا رہا۔

ایک دن علاقے کے چند کاشتکار خاں صاحب بہادر کی دہائی خاں صاحب بہادر کی دہائی کے نعرے مارتے آئے اور کہا حضور ہمارے گاؤں سیدا پور سے داروغہ جی گزر رہے تھے، انہوں نے ہمارے ٹھوکریں ماریں اور کہا سالو سلام کے لئے کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔

دادا میاں نے کسی سپاہی کو حکم دیا کہ ان کے سر پر کس کس کر چپتیں مارو کاشت کار چلائے کہ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے تھے آپ الٹے ہمیں کو پٹوا رہے ہیں اس پر انہوں نے کہا تمہارے سروں پر چپتیں اس لئے لگوا رہا ہوں کہ تم ہماری رعایا ہو اور پھر بھی ٹھوکریں کھا کر آئے ہو جاؤ ابھی جاؤ اور تھانے میں گھس کر داروغہ کے سر پر جوتے مارو اور جب جوتے مار کر آؤ گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

اور جب وہ لوگ داروغہ کو جتیا کر آ گئے تو ان کی پوریوں، کچوریوں اور مٹھائیوں سے تواضع کی گئی اور ان کا آدھا لگان معاف کر دیا گیا۔

انہیں بٹیریں لڑانے، بٹیریں پالنے، اور بٹیریں کھانے کا بہت شوق تھا سپاہی راتوں کو کھیتوں میں جال لگاتے پھندیتوں کے پنجڑے چاروں طرف لٹکاتے، ان کی بولیوں پر بٹیروں کو کھیتوں میں گراتے، اور صبح کو سینکڑوں بٹیریں جالوں میں پھنسا کر لے آتے تھے ان میں سے کچھ، لڑنے کے لئے پال لی جاتیں، کچھ بچوں میں تقسیم کر دی جاتیں اور کچھ دستر خوان کے لئے پکالی جاتی تھیں۔

جب وہ دوپہر کے وقت دستر خوان پر بیٹھتے تھے تو محل کا پورا لمبا چوڑا الق و دق برآمدہ ان کے ساتھ کھانے والے بچوں سے بھر جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ سکندر اعظم

کی فوج ٹوٹ پڑی ہے۔

ایک روز میں اپنے باپ کے پاس بیٹھا برفی کھا رہا تھا کہ دادا میاں کا خاص خدمت گار رحم علی آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا بڑے خاں صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔

جب میں، اپنے باپ کے ساتھ، محل میں داخل ہوا، دیکھا کہ، وہ ایک مخمل سے ڈھکے ہوئے مونڈھے پر تشریف فرما ہیں اور فرط غضب سے ان کا سر ہل رہا ہے اور جب میرے باپ نے جھک کر سلام کیا اور پوچھا باوا کیا بات ہے تو انہوں نے سر کو جھٹکا دے کر فرمایا ''بشیر مجھے آج محمد اسحٰق کی صورت سے نفرت ہو گئی، میرے باپ نے بڑے ادب سے پوچھا باوا کس بات پر دادا میاں نے فرمایا کہ ابھی اسحٰق تیز تیز قدم رکھتا میرے پاس آیا تھا میں نے کہا اسحٰق، اس طرح چھچھورے پن سے تیز تیز چلنا آداب شرفاء کے منافی ہے، تم جانتے ہو اس نے میری یہ ڈانٹ سن کر کیا جواب دیا، اس نے کہا باوا معاف فرمایئے، خوشی کے مارے میری چال بدل گئی، ہمارے علاقے کے گاؤں تھری میں ایک بہت بڑا خزانہ نکل آیا ہے اس کی خوشخبری دینے آیا ہوں، بشیر اس کا یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں نے کہا دور ہو جا میری نظروں سے بھلا خزانہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے شریفوں کی چال میں فرق آ جائے۔

---

1 فرزند اکبر

پچاسی برس کی عمر میں بھی دادا میاں کی صحت اس قدر اچھی، اور ان کے قواء اس قدر مضبوط تھے کہ وہ ابھی دس بیس برس تک اور جی سکتے تھے مگر ایک حسین عورت ان کی موت کا باعث بن گئی۔''

واقعہ یہ ہے کہ ان کو خوش کرنے کے لئے مرزا امداد بیگ نے لکھنو سے ایک نہایت خوب رو اور دراز قامت مغلانی کو بطور تحفہ ان کی سرکار میں پیش کیا تھا، اس عورت کو آتشک کا مرض تھا جو ان کو لگ گیا انہوں نے شرم کے مارے کسی سے نہیں کہا اور کچھ

www.pdfbooksfree.pk

روز بیمار رہ کر اسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک روز رات کے وقت، جب دادا میاں کے پاس گیا تھا ان کی داہنی میز پر ایک بڑا سا اکا جل رہا تھا، اور بائیں جانب وہ صبیح و دراز قامت مغلانی کولے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اس کو جانب، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا تھا اور انہوں نے میری یہ حالت دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا ڈیوٹ الوٹ [1] کیا دیکھ رہا ہے، بدتمیز کہیں کا جھکا لے آنکھیں۔

یہ بات کہیں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دادا اپنے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خان سے خوش نہیں تھے اور نسیم خان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی خان کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے،

دادا جان جب مرض الموت میں گرفتار ہو گئے تو عین ان کے انتقال کے دن ان کو خبر دی گئی کہ محمد علی خان عیادت کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی انہوں نے لونڈیوں سے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو، گاؤ تکیہ پیچھے رکھ دو حقہ سامنے لگا دو، میری دادی جان نے کہا اٹھ کر نہ بیٹھو، ایسا نہ ہو دشمنوں کی طبیعت اور خراب ہو جائے انہوں نے جواب دیا کہ محمد علی مجھ کو دیکھنے آیا ہے

---

[1] ایک بات سوٹ پہنے دیکھ کر انہوں نے مجھ کو "ڈیوٹ الوٹ" صاحب بہادر کا خطاب دیا تھا اور اکثر اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے

آیا ہے، میں اس کو یہ دیکھ کر خوش نہیں ہونے دوں گا کہ چچا اب انتقال کے قریب آ گئے ہیں۔

اور جب وہ اٹھا کر بٹھا دیئے گئے انہوں نے حکم دیا بلاؤ محمد علی کو، محمد علی خان نے پوچھا چچا مزاج کیسا ہے، دادا میاں نے بلند آواز سے ارشاد فرمایا محمد علی اب فاقہ ہو رہا ہے یہ کہہ کر وہ بڑے کڑاکے سے حقہ پینے اور پان کھانے لگے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بھتیجا چلا گیا تو گاؤ تکیہ ہٹوا کر میری دادی سے ارشاد فرمایا، میرے بدن میں جس

قدر بھی طاقت باقی تھی وہ میں نے محمد علی پر صرف کر دی اس کے بعد، کلمہ پڑھا، اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے مجموعہ کلام کا نام "دیوان احمد، موسوم بہ مخزن آلام" ہے ٹائٹل پیج پر مندرجہ ذیل عبارت ایک حلقے میں درج ہے "من نتاج افکار، سخن سنج، معجز بیان و عالی خاندان الا دو دمان جناب محمد احمد خان صاحب بہادر، تعلقہ دار و آنریری مجسٹریری خلف الرشید، دست گیر افتادگان جنت مکاں حضرت فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور"

دادا میاں نے ایک مطبع قائم کر کے ملیح آباد (مرزا گنج) ہی میں یہ دیوان چھپوایا اور خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔

اس دیوان کی ضخامت پانچ چھ سو صفحے سے کم نہیں تھی میرے پاس ان کے پچاس دیوان تھے گھر میں چوری ہوئی تو چور کتابیں بھی لے گیا اب چند اوراق میرے پاس رہ گئے ہیں۔

وہ ٹھیٹ قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے چند اشعار آپ بھی سن لیں۔

کبھی گر سامنا ہو گا رخ گل گون جاناں کا
تو فق ہو جائے گا منہ، دیکھنا صبح بد خشاں کا
علی مرتضیٰ شیر خدا کی مدح لکھتا ہوں
نیستاں نام رکھا جائے گا میرے قلمداں کا
وہ ہوں میں رند، اے واعظ، نہیں کچھ مذہب و ملت
نہ قائل کفر کا سمجھو، نہ تابع مجھ کو ایماں کا

قتل کر کے ومرا بانی بیداد آیا
آرزو تھی مجھے جس کی وہی جلاد آیا
نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی

www.pdfbooksfree.pk

میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا، سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغ جہاں میں یہ ملا نخل جوانی کا
کہ وصل یار حاصل ہے، مزا ہے زندگانی کا
حسینوں میں تمہارا نام ہو تابوت پر میرے
صنم تم ڈال دو اپنا دوپٹہ کام دانی کا

جیتے جی فرقت دل دار نے سونے نہ دیا
قبر میں حسرت دیداد نے سونے نہ دیا
رات بھر گنتے رہے تارے، شب تار میں ہم
یاد افشان رخ یار نے سونے نہ دیا
خواب میں دیکھ لیا، رقص جو کرتے ان کو
گھنگروؤں کی ہمیں جھنکار نے سونے نہ دیا

عدم سے جانب ہستی جو بوتراب آیا
ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

جو یاد ہجر میں ان کی کوئی ادا آئی
پری کا بھیس بدل کر، مری قضا آئی

www.pdfbooksfree.pk

صبا، تو آئی ہے کیا ہو کے اس کے کوچے سے؟
کہ تجھ سے آج مجھے بوئے آشنا آئی
بہایا آنکھوں سے دریا لہو کا احمد نے
تمہاری یاد جو اے شاہ کربلا آئی

پژمردہ ہو کے بے رخی باغباں سے ہم
برگ خزاں کی طرح چلے بوستاں سے ہم
تلقیں کی احتیاج نہیں ہم کو زاہدا
ہیں فیضیاب، صحبت پیر مغاں سے ہم

جب سے عاشق ہوئے تمہارے ہم
لگ گئے گور کے کنارے ہم
وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں
آج تم جیتے اور ہارے ہم

☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

میرے باپ

نام تھا نواب بشیر احمد خاں، اور تخلص تھا "بشیر" مردانہ حسن میں ان کا جواب نہیں تھا یہ منسلکہ تصویر اس وقت کے ایک اناڑی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہے جس سے ان کی صورت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ان میں جمال وجلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہو جاتی تھیں اور جب ریل میں سفر کرتے تھے، تو فرنگی بھی، جن کی تہذیب میں تعارف کے بغیر، بات کرنا بدتہذیبی ہے اس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ ان سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ آپ کا نام کیا ہے، اور آپ کس خاندان کے فرد ہیں ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ ستر ماؤں کی محبت کو ان کی ایک محبت پر قربان کر دیا جا سکتا تھا، وہ رات کے ایک یا دو بجے مردانے سے اٹھ کر جب زنانے میں تشریف لاتے تھے تو ایک خادمہ، لال ٹین ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتی تھی اور وہ ہم ساتوں بھائیوں بہنوں کی نبضیں دیکھے بغیر نہیں سوتے تھے اور جب ہم میں سے کسی کا ناخن بھی دکھتا تو ڈاکٹروں سے ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا اور جب ہم میں سے کسی کے منہ سے کوئی بدشگونی کی بات نکل جاتی تھی تو ہم پر سے صدقے اتارے جاتے تھے اور چونکہ ہمارے تمام محلوں کو بھوتوں اور چڑیلوں کا رمنا خیال کیا جاتا تھا اس لئے ہم سب بچوں کی خواب گاہ کے گرد روز رات کو حصار کھینچا جاتا اور ہماری پائینتی ایک ایک

1۔ میں اپنے باپ کے بہت سے واقعات اوپر درج کر چکا ہوں اس لئے اس موقع پر اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

انا یا دوا سلائی جاتی تھی، جب ہم زنانے سے مردانے میں جاتے تو بھی ڈیوڑھی میں سے گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی خادمہ ہمارے ساتھ کر دی جاتی تھی جب ہم غسل خانے جاتے تو اس وقت بھی دروازے پر ایک ماما کھڑی رہتی اور بار بار پکار

پکار کر کہا کرتی تھی بھیا، یا بٹیا ڈرنا نہیں ہم دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر، تین بار تالیاں بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے، میرے تمام رونگٹے جھن سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

لیکن انتہائی شفقت کے باوجود وہ تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر، اور دادی جان کی اس نصیحت پر کہ "بٹیا" بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، اور دیکھو شیر کی نگاہ سے بڑی شدت کے ساتھ عامل تھے۔

انہوں نے خصوصیت کے ساتھ، ہم تینوں بیٹوں کو، بڑی سختی کے ساتھ، اس بات کی ممانعت کر دی تھی کہ آپس میں یا دوسرے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے کشتم کشتا نہ کرو، شور نہ مچاؤ، کونوں کھتروں میں نہ کھیلو خدمت گاروں کارندوں اور سپاہیوں کی چارپائیوں پر نہ بیٹھو، خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، لکھنے پڑھنے کے وقت کھیل کود کے قریب بھی نہ پھٹکو، کمرے کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھو، اگر کوئی مذاق دل لگی کی بات کرے اسے مارو اور ہمارے پاس لے آؤ، لونڈیوں، باندیوں سے ہنس کر بات نہ کرو۔

ایک روز، کسی مخبر نے آدھی رات کو، ان تک یہ بات پہنچا دی کہ میرے بڑے بھائی اور میں دونوں حضرت احسن 1مارہروی کے صاحبزادے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، باغ میں ٹہل رہے تھے، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے محافظن ماما کی معرفت ہم دونوں بھائیوں کو اسی وقت جگوا کر بلوایا، ہم پہنچے تو انہوں نے فرمایا سنا ہے آج آپ دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں گل گشت فرما رہے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا کوئی بری بات ہے ہم نے اقرار کر لیا ہمارے اقرار کے بعد انہوں نے بھاری آواز میں فرمایا آپ

1وہ ہمارے یہاں اکثر آتے اور ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

دونوں ادھر آ ئیں، جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے انہوں نے کہا آپ دونوں اپنے اپنے ہاتھ کھول کر جھکا دیں، اور جب ہم نے ہاتھ کھول کر جھکا دیئے تو انہوں نے اپنے بھرے ہوئے حقہ کی دہکتی ہوئی چلم کے انگارے ہمارے ہاتھوں پر گرا دیئے ہمارے ہاتھ بری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔

جہاں تک کہ علم وفضل کا تعلق ہے وہ عام روساء سے بالکل مختلف، اور رات کے دو بجے تک کتب بینی کیا کرتے تھے فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ سعدی، حافظ، نظیری، قاآنی اور فردوسی کا پورا کلام ازبر تھا اردو میں وہ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے اور جب انیس کے مرثیے اور فردوسی کا شاہنامہ سناتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔

شاعری میں سب سے پہلے مرزا داغ سے اصلاح لی اس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے استفادہ کیا، ہر چند وہ لکھنوی غالب پرست ''معیار پارٹی'' کے رکن تھے مگر غالب پر میر کو ترجیح دیتے تھے۔

اور تاریخ اسلام جب بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے، مجھ سے ایک بار، سید ناصر حسین صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ آپ کے والد گرامی کو تاریخ اسلام پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ خود مجھے اس پر غبطہ پیدا ہوا کرتا تھا۔

دینی اعتبار سے وہ سنی تھے لیکن اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان ہی نہیں عین ایمان سمجھتے اور حضرت علی کو تینوں خلفاء پر اجل ترجیح دیتے تھے۔

قلب کی گداختگی، شاعری سے شیفتگی اور علم وفضل سے وابستگی، اور لکھنو کی تہذیب سے دل دادگی کے باوصف، ان کے مزاج میں اس قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوف ناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتے تھے اور قبضے پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے کا عالم ان پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔

ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظائف ملا کرتے

www.pdfbooksfree.pk

تھے اور اس کے اخفاء میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ کسی کو کانوں کان، خبر ہی نہیں ہونے پائی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد میں نے وظائف کا رجسٹر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اس رجسٹر میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جو ہمارے خلاف عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے چکے تھے۔ اور اس کے باوجود ان کا وظیفہ بند نہیں کیا گیا تھا۔

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی انہیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمٰن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے انہیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آرہی ہے، پھر وہ میرے باپ سے کیوں ملنے آتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا، کہ عبدالرحمٰن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھلک جاتی ہیں میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمٰن خان سے ڈرتے ہیں جبھی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ کہتا نہیں تھا، جب بہت دن تک یہ تماشہ دیکھتا رہا تو مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا میاں آپ عبدالرحمٰن خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے انہوں نے میرا یہ سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا بیٹا عبدالرحمٰن خاں ایک زمانے میں رئیس تھے اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے اس لئے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں، اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھرے جانے لگا تو انہوں نے فرمایا دیکھ بیٹا میرے سر کی قسم یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا۔

جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا تعلق ہے وہ گاہ گاہ غزلیں کہا کرتے تھے ان کے

www.pdfbooksfree.pk

پاس کوئی بیاض نہیں تھی غزلیں پرچوں پر لکھ کر ادھر ادھر ڈال دیتے یا کبھی صندوقچے پر رکھ لیا کرتے تھے اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا، جو چند غزلیں مل سکیں وہ بھائی صاحب نے ''کلام بشیر'' کی صورت میں چھاپ دیں، جس کا ایک حصہ ترقی اردو بورڈ میں موجود ہے۔

ان کو زبان کی صحت، اور لہجے کی نجابت کا بے حد خیال رہتا تھا اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بولتا تھا، وہ تڑاق سے، تھپڑ مار دیا کرتے تھے۔

افسوس کہ ''کلام بشیر'' اس وقت میرے سامنے نہیں ہے حافظے میں جو چند شعر موجود ہیں وہ سن لیجئے:

آمادہ ہو جو سوز نہاں کے بیان پر
انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر
چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہو گا فیصلہ
میرے بیان پر نہ، تمہارے بیان پر
اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے
دل مر گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

یہ رشک کے صدمے کبھی دل سہہ نہیں سکتا
جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا
سمجھو تو اسی پردے میں کہ جاتا ہے سب کچھ
جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں
وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا

www.pdfbooksfree.pk

دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسنا ان کا
اثر ضبط وہ چہرے سے نمایاں ہونا

راہ پر، ان کو، لے ہی آیا د
اف رے چلتے ہوئے زمانے کے

دم ان کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا
ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے
برا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا
قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

کوئی گریاں قریب تربت ہے
زندگی! پھر تری ضرورت ہے

☆☆

www.pdfbooksfree.pk

میری ماں

نواب خواجہ محمد خاں، جاگیردار دھول پور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں۔

میرے نانا ہرچند بہت معمولی سے پڑھے لکھے آدمی تھے لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انہیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم وتربیت میں بےحد غلو تھا۔ انہوں نے لکھنو سے ایک قابل استانی اور لائق استاد کو بلا کر اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا تھا، اوراسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے لکھنو کی مغلانیوں کو بھی ملازم رکھا تھا کہ وہ انہیں آداب دکھائیں۔

اس لکھنوی اثر کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے ماموں تو بالکل شیعہ ہو گئے اور میری ماں ہر چند اصحاب ثلاثہ کو مانتی رہیں لیکن حضرت علی کو سب پر بمراحل ترجیح دینے اور محرم میں عزاداری کرنے لگیں۔

میری نانی کا سایہ، میری ماں کے سر سے لڑکپن ہی میں اٹھ چکا تھا، لیکن ان کی سوتیلی ماں حاتم زمانی بیگم نے انہیں سگی ماں کی طرح اس لاڈ سے پالا کہ میری ماں کو یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، جب میری ماں کی شادی کا وقت آیا تو چونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دادا براتیوں کا لشکر ساتھ لے کر آ رہے ہیں اس لئے وہ دھول پور سے آگرہ چلی آئیں کہ نانا کے آگرے والے محل میں بیک وقت پانچ چھ سو مہمان ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

میرے نانا کے تعلقات راجپوتانہ کے تمام والیان ریاست سے برادرانہ تھے اسی لئے میری ماں کی شادی میں چھ سات والیان ریاست نے شرکت کی تھی۔

اور چونکہ میری سوتیلی نانی حاتم زمانی بیگم واقعی حاتم ثانی تھیں اس لئے انہوں نے اس قدر جہیز دیا تھا کہ وہ مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد لایا گیا تھا اور اورآگرے میں اس شادی کے ڈنکے پٹ گئے تھے۔

حاتم زمانی بیگم نے دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی اس کے چاندے

سونے کے زیوروں کے ساتھ جہیز میں شامل کر دیا تھا۔

آگرے سے کامل دو مہینے کی مہمان داری کے بعد جب برات ملیح آباد آئی تو میری دادی فرماتی تھیں کہ تمام محل میں چراغاں کیا گیا اور ایک عشرے تک دعوتوں اور مجروں کا سلسلہ جاری رہا۔

دادا میاں چونکہ غیر معمولی طور پر بیحد کثیر العیال تھے، اور چونکہ ان کے بہت سے بیٹے فوت ہو چکے تھے اس لئے ان کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے، شام کے وقت اپنے مرے بیٹوں کو نام لے لے کر پکارتے کہ اے امیر احمد، اور اے رشید احمد واپس آ جا واپس آ جا اور اس قدر زور سے روتے تھے کہ محل کے تمام سقف و بام ہلنے لگتے تھے[1]

دادا میاں کی آواز چراغ جلے جب محل میں گونجنے لگتی تھی ڈر کے مارے میری ماں کا برا حال ہو جاتا تھا وہ کانپنے لگتی تھیں اور میکے سے آئی ہوئی مغلانیاں ان سے کہتی تھیں صاحبزادی یہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے آپ کو شیروں کے کٹہرے میں بند کر دیا ہے۔

میرے باپ کو میری ماں کی اس دہشت زدگی کا علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی محمد اسحٰق خان کے محل میں اٹھ گئے لیکن وہاں پہنچ کر بھی میری ماں کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔

میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اصیلوں

---

[1] یہ ماجرا میری ماں نے مجھ سے بیان فرمایا تھا

کو اس قدر زور سے ڈانٹتے ڈپٹتے تھے کہ ان کی آواز کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چبوترے پر بکھر جاتے تھے۔ خسر کے محل میں ہائے ہائے کی پکار اور دیور کے محل میں شیر کی ڈ ہکار۔۔۔۔۔ میری ماں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔

اس کے بعد میرے باپ کا محل کیسے بنا، اس کی روداد میری ماں کی زبان سے سن لیجئے۔

www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا بیٹا جب میں تمہارے چچا کے گھر میں رہتی تھی ایک دن ایک ایسی ہلچل برپا ہوگئی کہ میں سمجھی آج میرا دم نکل جائے گا اور ہلچل کیسے ہوئی، یہ بھی سن لے۔

ایک دن تمہاری چچی، ساٹن کا بے حد چست گھٹنا پہنے جب چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو اس قدر گھٹنے پر زور پڑا کہ وہ ان کے گھٹنے کے نیچے کوئی ایک بالشت بھر ادھڑ گیا۔ اتنے میں بدقسمتی سے تمہارے چچا ناوقت زنانے میں آ نکلے انہوں نے اپنی بیوی کا ادھڑا گھٹنا دیکھا تو بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جا کر ایک بڑی لمبی سی چھری لے کر آ گئے تمہاری چچی کو چبوترے پر گرا دیا ان بیچاری کے سینے پر چڑھ بیٹھے اور کہا اے بے غیرت بھرے گھر میں ننگی پھر رہی ہے یہ کہتے ہی انہوں نے چھری اٹھائی کہ ان کا گلا کاٹ ڈالیں وہ تو اللہ نے یہ بڑی خیر کی کہ یہ ماجرا تمہاری دادی نے دیکھ لیا انہوں نے آ کر تمہارے چچا کی پیٹ پر، زور سے چھڑی مار کر کہا اسحٰق میرے سر کی قسم میری بہو کے سینے سے اتر آ بڑا غیرت دار بنا ہے۔

جب ماں نے قسم دی تو تمہارے چچا تمہاری چچی کے سینے سے اتر آئے اور چھری پھینک کر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیٹا یہ تماشہ دیکھ کر میں ادھ موئی ہو کر رہ گئی اور جب تمہارے باپ گھر میں آئے میں نے سارا ماجرا بیان کر کے ان سے کہا، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خود اپنا مکان بنوا لیجئے نہیں تو میں ہول کھا کھا کے ایک دن مر جاؤں گی۔

اس کے بعد میرے باپ کا مکان تعمیر ہو گیا اور میری ماں نے اپنے مکان میں آ کر اطمینان کی سانس لی۔

میری ماں کو اس ناز و نعم سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں پکانا ریندھنا، یا سینا پرونا تو بڑی بات ہے ان کو پوری سو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں ان کی خاص

مغلانیاں مومو بیگم اور عباسی خانم ان سے مہینے میں دو دو اور کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کر لیتی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چلتا تھا، اور جب کبھی وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی کو تمہاری تنخواہ دے چکی ہوں تو وہ کہتی تھیں ہے ہے بیگم صاحب بھلا ایسا اندھیر ہو سکتا ہے کہ ہم تنخواہ پا چکنے کے بعد بھی پھر آپ سے تنخواہ مانگیں حضرت عباس کی قسم آپ کو دھوکا ہو رہا ہے تو میری ماں الٹی شرمندہ ہو کر رہ جایا کرتی تھیں ان امور پر نگاہ کر کے، میرے باپ نے گھر کا انتظام کبھی ان کے سپرد نہیں کیا اور میری دادی[1] جان گھر چلاتی رہیں۔

---

[1] میری دادی آگرے کے اس ممتاز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جس کے محل کے چاروں طرف ایک بہت بڑا آئین باغ تھا اور اسی بناء پر اہل آگرہ اس باغ کو "باغ والے" کہا کرتے تھے دادی جان کے باپ کا نام غالباً مرزا نثار حسین بیگ تھا جن کے دادا ترکستان سے آ کر آگرے میں آباد ہو گئے تھے مرزا نثار حسین بیگ صاحب آگرے کے کوتوال تھے اور آگرے کی مشہور "کوتوالی گلی" آج تک ان کے نام سے مشہور ہے میں نے دادی جان کے حقیقی خالہ زاد بھائی مرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کو لڑکپن میں دیکھا تھا وہ کڑھا انگرکھا پہنتے تھے، اور شانوں پر شالی رومال پڑا رہتا تھا حضرت رئیس بڑے وضع دار اور بڑی آن بان کے بزرگ اور آدھے شعرائے آگرہ کے مانے ہوئے استاد تھے آخر عمر میں ان کی جاگیرداری پر زوال آ گیا تھا مگر رکھ رکھاؤ میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی تھی ایک بار کسی نے ان کے سامنے مرزا غالب کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ غالب کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے اس لئے کہ وہ میرے قرابت داروں میں سے تھے۔۔۔۔ دادی جان کو ہزاروں کہاوتیں اور فارسی و اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنہیں وہ بامحل صرف کیا کرتی تھیں اور جب ہم سب بھائی بہن دسترخوان پر بیٹھتے تھے وہ ہمارے ساتھ آ کر بیٹھ جاتیں اور کھانے کے آداب بتایا کرتی تھیں اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا

www.pdfbooksfree.pk

تھا تو وہ منہ پر تھپڑ مار دیا کرتی تھیں وہ بیحد راسخ العقیدہ شیعہ تھیں اور جب وہ چپکے چپکے مجھ کو شیعیت کا درس دیا کرتی تھی تو میری پھپھی جو میرے چچا کی طرح کٹر سنی تھیں ان سے ہنس کر کہا کرتی تھیں اماں پوتے کو شیعہ نہ بنائیے تو وہ بگڑ کر کہتی تھیں چل چخ مردار خارجن آخر گھر میں کوئی تو ایسا ہو جس کا فاتحہ درود مرنے کے بعد مجھ تک پہنچ سکے۔

ان میں اس قدر زبردست انتظامی قوت تھی کہ وہ ایک سلطنت کا کام چلا سکتی تھیں۔

میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور امیر انیس سے بڑی محبت تھی اور ان کے مرثیے پڑھ پڑھ اور سن سن کر رویا کرتی تھیں۔

ہم سات بھائی بہن تھے یعنی افسر جہاں بیگم 1، شفیع احمد خاں، شیر احمد خاں (بعد کو شبیر حسن خاں جوش) انیس جہاں بیگم، رئیس احمد خاں، حشمت جہاں اور شوکت جہاں۔۔۔۔لیکن ہم سات بھائی بہنوں میں میری ماں مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھیں، اوروں کی خدمت گزاری بوا گلزار کے سپرد تھی لیکن میرے ناشتے کا دودھ، شہد اور جلیبیاں ملا کر وہ اپنے ہاتھ سے تیار کر کے مجھ کو آواز دیا کرتی تھیں، ننھے آ، تیرا دودھ تیار ہے۔

ابھی کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ صبح کو میری بیوی نے مجھ سے پکار کر کہا اے ہے کب تک اچھل کود (ورزش) کرتے رہو گے، تمہارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے بیوی کی یہ آواز سن کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئیں دل پر بجلی گر پڑی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔

میری پیاری ماں، آپ سو چکی ہیں اور میں ابھی تک جاگ رہا ہوں زندگی کی رات کس قدر بھیانک ہے یہ آپ سے کیوں کر بتاؤں۔۔۔۔اماں آپ کا ''ننھا'' اب بوڑھا ہو چکا ہے اور اب اس کو ''ابا'' اور ''نانا'' کے ناموں سے پکارا جا رہا ہے۔

کاش! میں آپ کے سامنے مر جاتا اور یہ دن نہ دیکھتا۔

www.pdfbooksfree.pk

میری اچھی ماں اب مجھے اپنے پاس بلا لیجئے اور اے اللہ اب مجھ کو اس دنیا سے اٹھا لے۔

سر گھوم رہا ہے، ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو، فریب عیش دیتے دیتے
اف کار حیات، تھک گیا ہوں معبود
دم ٹوٹ چکا ہے، سانس لیتے لیتے!

---

1 صد صیف، افسر جہاں بیگم، شفیع احمد خاں اور حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا ہے۔

☆☆☆

میرے چچا

نام تھا نواب محمد اسحٰق خان ''کسمنڈی'' کے تعلقہ دار اور بڑے رعب وداب کے بے حد اکھڑ پٹھان تھے آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں مزاج میں اس قدر زبردست غصہ تھا کہ جب بگڑ جاتے تو بے تحاشہ گالیاں دینے اور بکنے لگتے تھے اور یہ بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ بھائی بھتیجے بھانجے، بیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ میرے باپ کے حقیقی بڑے بھائی اور ان سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ میرے باپ نے ان کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ مزاج میں وہ میرے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ علم وادب اور تہذیب سے انہیں کوئی سرکار نہیں تھا میرے باپ تفضیلی اور وہ بیحد کٹر سنی خلیفہ اول کو تمام اصحاب پر ترجیح دیتے تھے۔

جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں تو انہوں نے مجھے اس نیت سے اپنے گھر بلایا کہ میری مرمت کردیں مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گرج کر کہا:

سب کے سر تاج بعد پیغمبر
یعنی بوبکر، افضل و برتر

پوچھا کیسا شعر ہے میں نے کہا بڑے باوا اچھا، میرا جواب سن کر وہ بھنچے ہوئے غصے کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے لگے ہوں، ہوں، ہوں، وہ معمولی آواز کی ''ہوئیں نہیں بڑی گھڑ گھڑاتی، اور طویل الصوت ''ہوئیں'' تھیں۔'' جن کے یہ معنی تھے کہ اگر اس شعر کے خلاف کچھ کہو گے تو مزا چکھا دوں گا لیکن میں بے وقوف نہیں تھا کہ ان کو موقع دے دیتا اس لئے ٹال کر چلا آیا۔

میری دادی جان، میرے باپ کے ساتھ رہتی تھیں اور وہ ہر جمعرات کو ان سے ملنے آیا کرتے تھے ایک روز رئیس احمد انگنائی میں کھیل رہا تھا کہ وہ دادی کے سلام کی خاطر آ گئے رئیس احمد سے انہوں نے کہا آ و میرے ساتھ، اماں کو سلام کرنے کے بعد تم

کو گھر لے جا کر خوب برفی کھلاؤں گا وہ دادی کو سلام کر کے بیٹھ گئے اور رئیس کو گھٹنے پر بٹھالیا۔

دادی جان نے باتوں باتوں میں کہا بیٹا اسحٰق یہ بو کیسی آ رہی ہے، انہوں نے کہا اماں یہاں تو کسی قسم کی بو نہیں ہے دادی نے اپنی لونڈی سے کہا سکونت کیا تجھے بھی بو محسوس نہیں ہو رہی ہے اور جب سکونت نے بھی یہی کہا کہ بی بی مجھ کو تو بو نہیں آ رہی ہے تو دادی نے ناک پر آنچل کا سرا رکھ کر کہا افوہ بو بکر

یہ سنتے ہی چچا جامے سے باہر ہو گئے رئیس کو گھٹنے سے نیچے گرا دیا اور کہا اماں آپ تبرا بازی کر رہی ہیں یہ کہہ کر انہوں نے فرش پر دھم سے ڈنڈا مار کر کہا اماں دم چار یار دم چار یار[1] یہ سنتے ہی دادی نے کڑک کر کہا بیٹا دم پنجتن دم پنجتن اور وہ دم چار یار دم پنجتن کے نعرے اس قدر بلند ہو گئے کہ مردانے تک آواز پہنچی میرے باپ گھبرائے اندر آئے کہ یہ "دم چار" اور "دم پنجتن" کیا ہو رہا ہے۔

میرے باپ کے آتے ہی بڑے باوا غصے میں کانپتے کھڑے ہو گئے اور کہا بشیر تم دیکھ رہے ہو کہ اماں تبرے بازی کر رہی ہیں کیا کروں ماں ہو پڑیں، کوئی اور کہتا تو خون چوس لیتا ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرغی گزرنے لگی۔

---

[1] یعنی میں چار یار کا دم بھرتا اور ان کی برتری کا نعرہ لگاتا ہوں۔

انہوں نے مرغی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیں اور فوراً میرے گھر سے کانپتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہنگامہ 1857ء کے بعد، فرنگی حکومت نے ایک سخت مزاج کمشنر کو، جس کا نام شاید ہیولاک تھا اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ روہیل کھنڈ اور ملیح آباد کے پٹھانوں کو ڈرائے اور ان کے دلوں پر انگریزی حکومت کے رعب کا سکہ بٹھائے۔۔۔۔۔ دورہ کرتا جب وہ ملیح آباد آیا، تو میرے دادا کی مخالف پارٹی نے اس سے کہا کہ نواب محمد اسحٰق خان کے سپاہیوں میں بہت سے بدمعاش اور ڈاکو شامل ہیں اور جب چچا اس

سے اپنے سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ ملنے گئے تو کمشنر نے ان سے کہا "دل کھان صاحب آپ کا سپاہی لوگ بد ماس (بدمعاش) اور ڈاکو ہے یہ سنتے ہی انہوں نے بڑے زور سے ڈانٹ کر کہا ابے تو بدمعاش ہے تو ڈاکو ہے، میں ابھی تیری اور تیری میمنی (میم) کی۔۔۔ پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ اور کھا پچی[1] بھر ہگا دوں گا" یہ کہہ کر وہ اس کی طرف جھپٹے وہ گھبرا کر خیمے سے نکل گیا اور گھوڑی پر بیٹھ کر لکھنو بھاگ گیا۔۔۔۔ اور لکھنو جاتے ہی اس نے ملیح آباد کے تھانے کے انچارج کو تار دیا کہ چچا کے تمام اسلحہ ضبط کر لئے جائیں۔۔۔۔ تھانے دار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی وہ سیدھا دادا میاں کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دادا میاں محل کے اندر جا چکے تھے اس نے ان کے منہ چڑھے خدمت گار رحم علی کی ٹھڈی میں ہاتھ ڈال کر کہا مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے میں اس وقت بڑے خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، خدا کے واسطے میری خبر کر دو۔۔۔۔ رحم علی کو ترس آ گیا، اس نے فوراً ماما کے ذریعہ سے خبر کر دی دادا میاں نے پردہ کرا کے اس کو اندر بلا لیا۔

تھانے دار ان کے قدموں پر گر پڑا اور کہا خاں صاحب بہادر میری جان بچا لیجئے چھوٹے خان صاحب (میرے چچا) کے اسلحہ ضبط کر لینے کا مجھے کمشنر نے تار دیا ہے حضور مدد کر دیں گے تو میری جان اور نوکری بچ جائے گی۔

1۔ بہت بڑا اخر پڑے کا ٹوکرا (یہ ان کا تکیہ کلام تھا وہ جب کسی کو ہگاتے تو کھا پچی بھر ہگاتے تھے)

دادا میاں نے چچا کو بلا کر کہا اسحٰق میرے سر پر ہاتھ رکھو چچا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو انہوں نے کہا ان تھانے دار کو کمشنر نے تار دیا ہے کہ تمہارے اسلحہ ضبط کر لئے جائیں اس میں ان کی کوئی خطا نہیں میرے سر کی قسم انہیں کوئی گزند نہ پہنچانا۔

انہوں نے تھانے دار سے کہا آیئے میری طرف اور لے جایئے ہتھیار۔۔۔۔ اس کے بعد بیٹھک میں ایک بڑی سی میز پر تمام اسلحہ چن دیئے گئے،

سب سے پہلے انہوں نے بندوق اٹھائی، اس کو فرش پر رکھا، اور اس پر پانچ جوتے مارے، اور تھانے دار کی طرف یہ کہہ کر بندوق پھینک دی کہ لیجئے اس کو اپنی ماں کی۔۔۔۔میں رکھ لیجئے اور اسی طرح، ایک ایک کر کے، تمام اسلحہ پر پانچ پانچ جوتے مار کر اور اسے بھی اپنی ماں کی۔۔۔۔ میں رکھ لیجئے کہہ کہہ کر انہوں نے تمام ہتھیار واپس کر دیئے اور گالیاں کھایا ہوا تھانے دار سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

ان کو جب غصہ آتا تھا تو بقدر شدت غضب وہ دیر تک اس قابل نہیں رہتے تھے کہ بات کر سکیں اس عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو باہم پیوست کر کے، اپنے دونوں انگوٹھوں کو اٹھا لیتے اور ایک دائرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد گردش دینے لگتے تھے اور جب تک ان پر یہ کیفیت طاری رہتی تھی کوئی ان کے پاس آنے یا ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی کو گالیاں دینے کے بعد اپنے انگوٹھوں کو گھما رہے اور تمام حاضرین ان کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں لرزاں و ترساں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ان سے ملنے کے واسطے آ گئے، ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ فرط غضب کی بناء پر خاں صاحب کے انگوٹھے گھوم رہے ہیں اس وقت ان کے پاس نہ جایئے۔

چنانچہ ڈپٹی صاحب ان کے کمرے میں داخل ہو گئے داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا آداب عرض خاں صاحب" چچا جان نے، ان کی طرف گھور کر دیکھا بول سکنے کی طاقت نہیں تھی سلام کا جواب نہیں دیا اور "ہوں" کر کے اور تیزی سے انگوٹھے گھمانے لگے، ڈپٹی نے بڑے غور سے ان کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا اور یہ کیا تماشہ ہے کہ ان کے انگوٹھے برابر گھوم رہے ہیں اور دو ایک منٹ کی حیرانی کے بعد جب اس نے پھر کہا" خاں صاحب مزاج کیسا ہے؟" ۔۔۔۔۔ تو انہوں نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا" "

لے۔۔۔۔۔۔۔'' مزاج پرسی کا یہ انوکھا جواب سن کر وہ دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور تنتناتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک بار ہمارے گھر میں مشاعرہ ہونے والا تھا لکھنو کے مشاہیر میرے باپ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ماں کو سلام کرنے کے لئے چچا جان کھڑکی سے نکل کر ہمارے صحن میں آ گئے اور میرے باپ کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر ان کے کمرے میں چلے آئے میرے باپ کھڑے ہو گئے ٹوپی پہن لی حقہ سامنے سے ہٹا دیا گیا انہوں نے پوچھا بشیر یہ کون لوگ ہیں بتاؤ میرے باپ نے کہا میاں بھائی یہ لکھنو کے شعراء ہیں آپ ہیں مولانا صفی، آپ ہیں حضرت عزیز، آپ ہیں حضرت محشر، آپ ہیں حضرت آرزو، آپ ہیں حضرت ابر، آپ ہیں محمد صاحب بہار اور آپ ہیں حکیم منے آغا صاحب فاضل۔

چچا جان نے کہا مولانا صفی، سنتا ہوں آپ شاعر لوگ یہ باندھتے ہیں کہ معشوق کے کمر ہی نہیں ہوتی کیا یہ سچ ہے، مولانا صفی نے کہا جی ہاں خاں صاحب شاعری میں معشوقوں کی کمر کو معدوم و موہوم کہا جاتا ہے، اس پر چچا نے کہا اب ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر معشوقوں کی کمر ہوتی ہی نہیں تو پھر شب وصل میں وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آپ لوگ چخ چخ چخ چخ کرتے رہتے ہیں؟ ان کے اس سوال سے تمام شعراء دنگ ہو کر رہ گئے اور میرے باپ کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

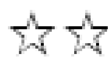
ایک بار ان کے خلف اکبر وصی احمد خاں، ایک ابتدائی قسم کا گراموفون لے کر آئے اور کہا باوا اس باجے سے آدمیوں کی آوازیں آتیں اور گانا سنائی دیتا ہے میں آپ کو سنانے آیا ہوں، انہوں نے کہا یہ عجیب چیز لائے ہو، سناؤ۔

انہوں نے باجا بجایا تو اس سے بڑی مدھم گانے کی آوازیں آنے لگیں، اور جب وہ تیسری چوڑی چڑھانے لگے تو بڑے باوا نے فرمایا ہٹاؤ اس سالے باجے کو اس سے

تو ''چری پھٹی'' ''چری پھٹی'' ''چری پھٹی'' کی آوازیں آ رہی ہیں آئندہ مجھ کو یہ فحش باجا نہ سنانا، ورنہ ڈنڈا۔۔۔گھسیڑ دوں گا۔

اور جب وصی احمد بھائی کھسیانے ہو کر باجہ اٹھنے لگے، تو بڑے باوا نے ڈنڈا مار کر اس کو توڑ ڈالا۔

ایک مرتبہ وصی احمد بھائی سوٹ پہن کر اپنی فرنگی معشوقہ سے ملنے کے لئے لکھنو جا رہے تھے ابھی وہ احاطے کو طے ہی کر رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ بڑے باوا، خلاف وقت و معمول مردانے میں نکل آئے اور ان کی پشت دیکھ کر، سپاہیوں سے پوچھا یہ کون فرنگی جا رہا ہے، سپاہیوں کو یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے فرزند اکبر وصی احمد خان ہیں، لیکن بڑے باوا نے جب ڈانٹ کر پوچھا تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتا دیا کہ حضور یہ وصی احمد خان ہیں، بڑے باوا نے ڈانٹ کر آواز دی پلپلی صاحب ادھر آیئے۔ وصی احمد بھائی اچھل پڑے رنگ زرد ہو گیا سر جھکائے ہوئے آئے بڑے باوا نے فرمایا کہ آپ پٹھان ہو کر ایسے بے غیرتی کے ننگے کپڑے پہنتے ہیں جب آپ پھاٹک کی طرف منہ کئے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے سرین ط، ظ، ط ظ، کرتے اوپر نیچے آ جا رہے ہیں تھوک ہے آپ کی پھٹنولی پر جایئے۔۔۔۔ میں آپ کو عاق کرتا ہوں، ہر چند آپ فرزند اکبر ہیں مگر میں آپ کو نہیں آپ کے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بناؤں گا۔۔۔ جایئے، اور اب بڑے مزے سے اپنے سرینوں کو طوئے ظوئے، طوئے، ظوئے، طوئے ظوئے کرتے پھریئے۔



میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن، چھوٹے بھائی، نواب محمد نسیم خان بہادر، تعلقہ دار سہالامو کے فرزند محمد مقیم خان کی بیٹی، اور سامامہ بیگم کی نواسی ہیں۔

صائمہ بیگم کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

صائمہ بیگم میرے اور میری بیوی کے پردادا نواب فقیر محمد خان بہادر کی نہایت شعلہ مزاج، اور چہیتی بیٹی تھی اور باپ نے اس خیال سے کہ بڑے محل میں ان کی شعلہ مزاجی کی بناء پر کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ انہیں "منجھلا محل" دے دیا تھا، کہ وہاں وہ بلا شرکت غیرے آرام سے رہیں۔

صائمہ بیگم کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے کپڑے دھوبی کے وہاں نہیں جاتے تھے، دھوبن ان کو گھر ہی میں دھوتی اور استری کر دیا کرتی تھی،

ان کا کھانا تو منجھلے محل ہی میں پکتا، لیکن ان کا ناشتہ، ایک روپیوں اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ بطور جیب خرچ، باپ کے گھر سے آیا کرتا تھا جس کو وہ چاندی اور سونے کی آمیزش کی بناء پر "کھچڑی" کہا کرتی تھیں۔

چونکہ ان کے دو تین بچے سنور ہی میں جا سکے تھے، اس لئے اپنی مغلانیوں، اماؤں، اصیلوں، اور لونڈیوں باندیوں کے متعلق انہیں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی، کہ ہو نہ ہو، ان میں کوئی "ٹھیا 1" ضرور ہے۔

اور جب تیسرے یا چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تو انہوں نے محل کے تمام دروں میں پردے جھڑوا دیئے اور زچہ خانے کے دروازے پر عورتوں کا پردہ بٹھا دیا کہ مخصوص ماماؤں کے سوا اور کوئی اندر نہ آ سکے۔

اسی اثناء میں ایک متجسس مزاج کمسن لونڈی نے ان کے بچے کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر کوٹھے پر دبے پاؤں چڑھ کر جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا، صائمہ بیگم کی نگاہ

www.pdfbooksfree.pk

اس پر پڑ گئی، انہوں نے جھٹ سے بچے کے منہ پر پلو ڈال کر،فوراً یہ حکم دیا کہ اس کلموئی ٹھہیا کو زندہ دفن کر دیا جائے اور اسے چار ی لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں قد آدم گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

اس انتہائی ظالمانہ حادثہ کے بعد ایک روز ان کے شوہر نے جو اودھ کی فوج کے عہدہ دار تھے جب لکھنو جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا آج نہیں، پرسوں جانا، شوہر نے کہا ایک ایسا سرکاری کام ہے کہ مجھے آج ہی جانا ہے، انہوں نے کہا، میں آج تو ہرگز جانے نہیں دوں گی ،شوہر نے کہا بیگم مجھے تو آج ہی جانا ہے اتنا کہہ کر وہ محل سے نکل گئے صائمہ بیگم نے کسی لونڈی کو حکم دیا کہ سل اٹھالائے وہ سل اٹھالائی اور سل انہوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے ماری کہ پل بھر میں روح پرواز کر گئی:

دیدی کہ خون نا حق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، ان کے شوہر نے وہ آہ و بکا کی آواز سنی، گھوڑے سے کود پڑے اور جب محل میں قدم رکھتے ہی انہیں بیوی کی خودکشی کا حال معلوم ہوا، تو پستول نکال کر سینے پر مار لیا۔۔۔۔اور بیوی کی چارپائی کے پاس ہی گر کر دم توڑ دیا۔

1۔ وہ عورت جو ٹونے ٹوٹکے سے بچوں کو ہلاک کر کے ان کا کلیجہ نظروں ہی نظروں میں چبا ڈالتی ہے۔

یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر۔۔۔۔۔۔وہ بہمہ وجوہ صائمہ بیگم ہیں اس لئے جب ان کو غصہ آجتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اتر آتی ہیں۔

میں اب تک زندہ ہوں، میری سخت جانی کا یہ معجزہ ہے وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں، میری بیٹی سعیدہ، میرا بیٹا سجاد، اور ان دونوں کے بچے ان سے ڈرتے ہیں اور چونکہ وہ بچوں کو ہر آن ڈانٹتی ڈپٹتی، گھرکتی اور بات بات پر بدتمیز کہتی رہتی ہیں اس لئے وہ ان کے پاس آنے جانے سے گریز کرتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

جب مکانوں کے سقف و بام سے آوازیں اگلوا لینے والا کوئی آلہ ایجاد ہو جائے گا تو میرا سارا مکان ''بدتمیز، بدتمیز'' کی آوازوں سے گونجنے اور کانپنے لگے گا۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ماہرنفسیات، یا ماہرنفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو اس امر کا کبھی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ وہ کب اور کس بات پر ہنسیں اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

کون ان کے مزاج کو پرکھ یا پکڑ سکتا ہے۔۔۔۔۔ میں ہزاروں بار تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک روز میرے جس لطیفے پر وہ خوب جی بھر کے ہنسی تھیں، جب میں نے ان کو وہی لطیفہ دوبارہ سنایا تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائے یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔۔۔۔میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو۔

ہر چند میں نے اپنے معاملات عشق امکانی حد تک ان سے مخفی رکھے تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے، میرے دو ایک اور خصوصیت کے ساتھ، میرے آخری عشق کے معاملات اڑتے اڑتے ان تک پہنچ گئے تھے، اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جو جو ستم مجھ پر ڈھائے تھے ان کی شرح اب بیکار ہے کہ:

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم وجور نا خدا کیجئے

لیکن اب بھی جب کہ میں کم بخت بوڑھا ہو چکا ہوں وہ کم سے کم مہینے میں چار پانچ بار عین اس وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد میں طلوع ہونا شروع کرتا ہوں وہ مجھے بڑی شدت کے ساتھ میری عاشقی پر طعن وتشنیع کا ہدف بنایا کرتی ہیں میں دانت نکال نکال کر کہتا ہوں ارے اشرف جہاں میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے اور جینے بیٹھا ہوں اس وقت تو گڑھے مردے نہ اکھیڑو، اس وقت، میری غلطی سے ہو گیا سو ہو گیا، ارے اب تو اس پر خاک ڈالو، بھول جاؤ، معاف کر دو، لیکن میری

گڑ گڑ اہٹوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور مجھے لگاتار برا بھلا کہتی رہتی ہیں وہ سلسلہ اس قدر طویل اور روح فرسا ہوتا ہے کہ میں تلملا اٹھتا ہوں، کبھی کبھی جلدی جلدی چار پیگ زہر مار کر کے اوراوندھے سیدھے دو چار لقمے کھا کر اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی خواب گاہ کی طرف بھاگتا اور بستر پر جا کر لیٹ جاتا ہوں مگر وہاں بھی وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں اور خواب گاہ میں داخل ہو کر وہی سلسلہ شروع کر دیتی ہیں۔

اثنائے ملامت میں جب وہ پان دان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب تبرے بازی ختم ہو جائے گی اور میں کم بخت سو سکوں گا لیکن وہ وقفہ خاموشی قبل از طوفان بن جاتا ہے اور گلوری منہ میں رکھ کر وہ اپنی ملامت کی بندوق میں نئے کارتوس بھر کر مجھ پر دوبارہ گولیاں برسانے لگتی ہیں۔

اس طرح وہ بار بار پان بناتیں اور دو ایک منٹ خاموش رہ کر پھر تبرا شروع کر دیتی ہیں میں بار بار کروٹیں بدلتا ہوں اور وہ ہر بار ،ٹھہر ٹھہر کر طعن و تشنیع کے بالکل نئے نئے گوشے نکال کر" آتے ہی غیب سے یہ مضامیں خیال میں کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔"

شاید کسی نے یہ شعر میرے ہی واسطے کہا تھا:

آ کر سر مزار وہ کیا کیا نہ کہہ گئے
ہم نے نہ کچھ جواب دیا چپ پڑے رہے

اور بالآخر مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں کے زیر اثر میں تڑپ تڑپ کر سو جاتا نہایت بھیانک خواب دیکھنے لگتا اور صبح کو اس زخمی چوہے کی طرح بیدار ہوتا جس سے جی بھر کر بلی کھیل چکی ہو۔

اب ان کے مزاج کی چند خصوصیات اور بھی سن لیجئے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وسوسے، ہر قیاس، ہر ظن، اور ہر واہمے کو ایک حقیقت کبریٰ اور وحی و الہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

مثلاً جب کسی نواسے یا پوتے کو وہ کوٹھے سے پکارتی ہیں اور وہ بچہ آواز پر آواز نہیں

دیتا تو یہ جانچے بغیر کہ وہ اس وقت مکان میں ہے کہ نہیں، یا کسی ایسے دور کے گوشے میں ہے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی ان کو اس بات کا یقین اور یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے نے اپنے بچوں کو ہدایت کر دی ہو گی کہ وہ میری آواز پر آواز نہ دیں، اور یہ سوچ کر وہ بیٹی اور بیٹے پر برس پڑتی ہیں اور وہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یعنی ان کے دل میں جب کسی امر کے متعلق ایسا ہوا ہو گا کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ہمیشہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے اور اس کے سوائے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو میں بالعموم پچھلے پہر بیدار ہوتا ہوں لیکن مہینے میں کبھی ایک آدھ بار کسی نا معلوم سبب کے باعث، جب میں دیر سے جاگتا ہوں تو اس غم میں سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ جاتا ہوں کہ آج میں جلوہ ہائے طلوع صبح سے محروم ہو کر رہ گیا اور وہ جب مجھے اس عالم میں دیکھتی ہیں تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی معشوقہ کو خواب میں دیکھا ہو گا اور چونکہ ''دیکھا ہو گا کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں ''دیکھ چکا ہوں'' وہ مجھ سے بگڑ کر کہتی ہیں اب بھی تم خوابوں میں اس کلموئی کو دیکھا کرتے ہو، اللہ تم کو غارت کرے کیا اب بھی مجھے چین سے نہیں رہنے دو گے؟''

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں، اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے اگر اس وقت کوئی بلند آواز سے بول دیتا ہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔

چھوٹے دادا کو بلند آواز سے بولنے کا مرض تھا، اور میری بیوی سب سے زیادہ ان کو جھڑکیاں دیا کرتی تھیں اور وہ میرے پاس منہ پھلائے آتے اور کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں تمہاری بیوی نے تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انہوں نے جو چیز کسی جگہ رکھ دی ہے اب وہ چیز قیامت تک اسی جگہ رکھی جائے گی اور اگر کوئی اس چیز کو کسی دوسری جگہ رکھ

دے گا تو قیامت آ جائے گی وہ صبح کو خواب گاہ سے نکل کر، برآمدے کے تخت کے جس گوشے پر سب سے پہلی مرتبہ آ کر بیٹھی تھیں روز اس گوشے پر آ کر بیٹھتی ہیں ہر چند گرمیوں کے موسم میں ادھر دھوپ آ جاتی ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتیں اور جب میں کہتا ہوں دھوپ سے ہٹ کر سائے میں بیٹھ جاؤ تو وہ بگڑ کر کہتی ہیں یہ میری وضع کے خلاف ہے میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں کہ روز ٹھور ٹھکانے بدلتی رہوں اگر میں اس قدر مستقل مزاج نہ ہوتی تو تمہارے سے ہرجائی کو آج تک نباہ ہی نہ سکتی تھی۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتی کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی عورت سے ان کا خلا ملا نہیں بڑھ سکا، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ترتیبی کو برداشت نہیں کر سکتیں، چادروں کی شکنوں اور کرسیوں وغیرہ کے زاویے درست کرتی رہتی ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناشتہ کے بعد، کم سے کم، آدھ گھنٹے کے واسطے ہمیشہ لیٹ جاتیں اور منہ سے نہیں بولتی ہیں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوتے ہی کراہتیں اور کہتی ہیں کہ آج طبیعت بہت خراب ہے ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکپن ہی سے اختلاج قلب میں بری طرح مبتلا ہیں میں نے لاکھوں علاج کر دیکھے مگر وہ بیچاری تن درستی سے آج تک محروم ہیں۔

اور ان کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز ایک ایک پائی کا حساب لکھاتیں اور جب تک حساب نہ لکھ جائے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔

جہاں تک کہ تدبیر منزل کا تعلق ہے ان کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔

میں ایک لکھ لٹ انسان ہوں، اگر میری شادی ان سے نہ ہوئی ہوتی تو میں فاقے

کر کے مر جاتا۔

میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، وہ اس سے چوگنی طاقت کا بریک ہیں اگر اس قدرتی قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن ہمالیہ سے ٹکرا کر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

میں جب حیدر آباد دکن میں تھا وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے تین مہینے کے لئے ملیح آباد چلی گئی تھیں ان تین مہینوں کا حال سن لیجئے۔

جب پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی تو ساری تنخواہ، مہمان نوازیوں اور اللوں تللوں کی وجہ سے دسویں پندرھویں دن ہی ختم ہو جاتی تھی اور ہر پندرھویں کو رام لال بقال سے قرض لے کر، گھر کا کام چلایا کرتا تھا اور جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر گھر آتا۔ رام لال کو اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا یا سوتا پاتا اور رام لال اپنا روپیہ مع سود کاٹ کر باقی رقم میرے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سی دکانوں میں کھاتے بھی کھول لئے تھے اور اس طرح چیزیں گھر لایا کرتا تھا گویا وہ سب آندھی کے آموں کی طرح مفت مل رہی ہیں اور مہینے کی پہلی یا دوسری کو جب ان دکانوں کے بل آتے تھے تو سر پکڑ کر رہ جاتا رام لال سے مزید قرض لے کر بل ادا کیا کرتا تھا۔

بیوی جب ملیح آباد سے آئیں تو گھر کا یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے منہ پیٹ لیا اور تھوڑے ہی دن کے اندر انہوں نے پھر گھر کو درست کر کے رام لال بقال سے نجات دلا دی اور میرے سارے کھاتے بند کرا دیئے۔

ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے جاتے وقت ان سے دس پانچ روپے مانگتا ہوں تو تین چار پیشیوں کے بعد دس مانگتا ہوں تو صرف پانچ دیتی ہیں، اور جب گھر پلٹتا ہوں تو پائی پائی کا حساب لکھا لیتی ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خون جگر، ودیعت مژگان یار تھا

مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے خلاف معمول دیر تک جاگنا پڑتا ہے اور میرے دماغ پر اس کا کم از کم دو تین دن تک بار رہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مشاعروں میں زاغ و زغن کو اس یقین کے ساتھ کلام سنانا پڑتا ہے کہ مفہوم شعر تو الگ رہا سامعین الفاظ کا تک سمجھ نہیں سکیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا کلام سننا بھی پڑتا ہے۔

لیکن چونکہ میں اس قربانی کے بعد مشاعرے سے ایک ہزار روپیہ گھر لاتا ہوں وہ مجھے مشاعروں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا کرتی ہیں اور مجھے قربان گاہ پر نہ چڑھائیں تو کیا کریں اس لئے کہ میری معاش بیحد محدود ہے۔

لگے ہاتھوں مشاعروں کے متعلق میری دو رباعیاں بھی سن لیجئے۔

ہوتی ہے، مشاعروں میں بو گھورے کی
حاجی بخش اللہ کی، میاں نورے کی
افسوس کہ اس عطر سخن کو اپنے
بھرتا ہوں میں شیشیوں میں قارورے کی

یہ بندہ، سر حشر، بجرم تشکیک
دوزخ کا سزا وار ہے؟ تیرے نزدیک
معبود، خطا ایک، سزا ہو سو بار
فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

ابھی پانچ چھ برس کی بات ہے، جب میں حامل کالونی میں رہتا تھا اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا مزاج ایسا ہے کہ نوکری زیادہ دن تک نبھ نہیں سکے گی، اور نبھ بھی گئی تو جب پنشن پر علیحدہ ہو جاؤ گے تو یہ مکان چھن جائے گا اس لئے

میں چاہتی ہوں کہ اپنا ایک ذاتی مکان بنوالوں، یہ سن کر میں نے کہا تھا کہ اب تو میر امقبرہ بننے کا زمانہ ہے تم مکان کی فکر کر رہی ہو۔

لیکن صاحب، میری بیوی کی ہمت پر صد آفریں کہ انہوں نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا دو منزلہ مکان بنوا کر دم لیا ورنہ ایوب خان سابق صدر پاکستان اور ان کے نفس لوامہ الطاف گوہر صاحب کے عتاب کے بعد میں اپنے پورے قبیلے کے ساتھ آج کسی جھونپڑی میں پڑا ہوتا۔ سچ ہے سگھڑ بیوی بڑی دولت ہوتی ہے ان کا ایک کارنامہ اور بھی سن لیجئے۔

ایک روز انہوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک دم بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انہوں نے پوچھا تم کب سے شعر کہہ رہے ہو میں نے کہا لڑکپن سے، انہوں نے کہا وہ پرچے اور کاپیاں کیا کیں جن پر تم نے شعر کہے تھے میں نے کہا سب کی سب تلف ہوگئیں میری یہ بات سن کر انہوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمہاری ایک ایک کاپی اور تمہارا ایک ایک پرچہ اس بکس میں محفوظ کرلیا ہے اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہاتھ فروخت کر دو اور میں نے وہ کاپیاں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر دیں (میں اس باب میں ممتاز حسن صاحب اور پیر حسام الدین صاحب راشدی کا شکر گزار ہوں کہ اگر وہ توجہ نہ کرتے تو یہ سودا کبھی نہ ہوسکتا)

کہاں تک اپنی بیوی کی خوش انتظامی بیان کروں آموں کے چار باغ انہوں نے نصب کرائے اور 1921ء میں انہوں نے ٹھیل ٹھیل کر، مجھے مجبور کیا میری سب سے پہلی تصنیف ''روح ادب'' کے مرتب اور شائع کرانے پر اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر مسلط ہو ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کرائیں اور چھپوائیں اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔

روح ادب، جذبات فطرت، خیالات زریں، اوراق سحر، آوازہ حق، شاعر کی

راتیں، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، آیات و نغمات، سیف و سبو، فکر و نشاط، سرود و خروش، حسین اور انقلاب، اشارات، سنبل و سلاسل، رامش و رنگ، عرش و فرش، سموم و صبا، قطرہ و قلزم، طلوع فکر، نجوم و جواہر، اور الہام و افکار 1

اور میری یہ زیر کتاب ''یادوں کی برات 2'' بھی انہیں کی مرہون منت ہے اگر وہ میرے سر پر سوار نہ ہو جاتیں تو میں اسے بھی مرتب نہ کر سکتا۔

اپنے ان متذکرہ بالا کارناموں کی بناء پر جب وہ حسب سنت جاریہ، مجھ سے

---

1 میری مندرجہ ذیل کتابیں ہنوز شائع نہیں ہوئی ہیں ''مد و جزر'' ''آگ'' ''وحدت انسانی'' ''موت''، ''محمدؐ و آل محمد کی نگاہ میں ''موجد و مفکر'' عظمت انسانی اور ''حرف آ کر'' اس طویل ڈرامائی نظم کا آغاز 1948ء میں ہوا تھا اکے بعد مجھ کو زندگی کے مکروہات سے نجات نہیں ملی اس لئے ابھی تک ناتمام ہے اگر فرصت ہاتھ آئی تو اس نظم کو مکمل کر کے کسی بینک میں یا بیوی کے پاس رکھوا دوں گا کہ اسے میرے مرجانے کے بعد شائع کیا جائے اور یہ اس لئے کروں گا کہ اگر یہ اوہام شکن روایات فگن نظم میری زندگی میں شائع ہو گئی تو مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

---

2 بیوی سے چھپا کر میں نے اس کتاب میں اپنے معاشقوں کا حال قلم بند کیا ہے اب دیکھئے اس کی طباعت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

کسی بات پر، بگڑ جاتی ہیں تو کہتی ہیں کہ میری جوتیوں ہی کا طفیل ہے کہ تم اس وقت جوش صاحب بنے بیٹھے ہو اگر میں تم پر زور نہ ڈالتی تو تمہاری کوئی ایک کتاب بھی نہ چھپتی اور دنیا کو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو۔

اور کبھی یہ بھی کہتی ہیں کہ جب مجھ سے تمہاری شادی ہوئی تھی، اس وقت تک، تم، چھوٹے دادا کی زبان میں لفاجھنا تھے اگر میں جی لگا کر تمہاری تاک نہ کرتی تو تم کو یہ ڈیل ڈول کبھی حاصل ہی نہ ہوتا، اور ہمیشہ دبلے پتلے لقات ہی بنے رہتے۔

ہر چند، جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں وہ نہایت مغلوب الغضب اور تنک مزاج ہیں،

www.pdfbooksfree.pk

لیکن میری ذات کے ساتھ اب بھی ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اسے لفظ عشق سے منسوب کروں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں ان کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں۔

جوانی میں جب میں، باہر سے، رات کے وقت، گھر آتا تھا تو اس امر کا پتہ چلانے کی نیت سے کہ میں کسی عورت سے ہم آغوش ہو کر تو نہیں آ رہا ہوں وہ مجھے روشنی میں لے جا کر غور سے میرا چہرہ دیکھتیں لالٹین اوپر اٹھا کر میری شیروانی پر نگاہ کرتیں کہ کہیں کسی زلف کا بال تو اس میں چمٹا ہوا نہیں ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ میرے کپڑے لمبی لمبی سانسیں لے کر سونگھا کرتی تھیں کہ میرے جسم سے کسی عورت کے بدن یا بالوں کی خوشبو تو نہیں آ رہی ہے

اور: عشق است و ہزار بد گمانی کے تحت یہاں تک ہوتا تھا کہ وہ جاڑوں میں پچھلے پہر، میرے لحاف میں ہاتھ ڈال کر یہ پتہ چلانے کے لئے کہ میں ان کے سو جانے کے بعد کسی عورت کے پاس چلا تو نہیں گیا تھا وہ میرے تلوے ٹٹول کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں یا گرم۔

اور آج بھی جب کہ میں ایک خبیث بوڑھے کی صورت اختیار کر چکا ہوں، جب کبھی کوئی اخباری جوان عورت میرا انٹرویو لینے یا کوئی نوعمر شاعرہ مجھ سے ملنے آتی ہے وہ میرے چہرے کے نشیب و فراز اور میری آنکھوں کے رنگ پر اپنی متجسس نظروں کے آلات لگا کر یہ جانچتی رہتی ہیں کہ میں اس کو محبت کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔اور جب تک وہ عورت بیٹھی رہتی ہے، ان کے چہرے پر بد گمانی کا پیدا کردہ کرب مچلتا رہتا ہے۔

مری خاک بھی لحد میں، نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

وہ مجھ کو آج تک چوتھی کا دولہا سمجھتی اور پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے محبت کرتی

ہیں۔

ہر چند میری پاگل اور اندھی جوانی کے مسلسل معاشقوں نے میری اختلاج کی ماری دھان پان بیوی کے دل پر ایسے ایسے گھن چلائے تھے کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلائے جاتے تو ان کے پرخچے اڑ جاتے لیکن اللہ ری میری بیوی کی استقامت محبت کہ انہوں نے ان روح فرسا حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایسا مقابلہ کہ العظمتہ للہ۔

جھانسی کی رانی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا، میدان جنگ میں شہید ہوگئی مگر دشمن کے سامنے سپر نہیں ڈالی، میری بیوی نے ڈٹ کر میرے محبوبوں کا مقابلہ کیا، نہ سپر ہی ڈالی نہ شہید ہی ہوئیں اور آخر کار مجھ کو سب سے چھین کر، میدان جیت لیا۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گل دستہ گردد

میں نے 1950ء میں ام الشعراء یعنی اپنی بیوی پر ایک نظم کہی تھی جو ہنوز نا تمام ہے آپ بھی سن لیں:

رفیقۂ حیات سے خطاب

دیکھ کر تجھ کو، مرے دل سے ٹپکتا ہے لہو
اے مرے باپ کی، غم دیدہ و ناشاد بہو
تیرا، ہر لمحہ، بجز حسرت و وسواس نہ تھا
میری قصاب جوانی کو یہ احساس نہ تھا
مجھ کو ہر رات، وہ آراہ لئے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی کہ خرمن پہ ترے گرتی تھی
جب مجھے، چھاؤں میں زلفوں کی وہ سلوتی تھی
چاندنی، دھوپ ترے واسطے بن جاتی تھی
آگ تھی جس میں، برستا نہ وہ پانی تجھ پر
کاش بھولے سے بھی آتی نہ جوانی مجھ پر
ہائے، اک شب بھی نہ ہوتی تھی سہانی تیری
کروٹیں، آنچ پہ لیتی تھی، جوانی تیری
جب بھی اٹھتی تھیں، مری سمت، نگاہیں تیری
ان نگاہوں سے برستی تھیں کراہیں تیری
تیری عفت کے شبستاں میں ہے اک حشر بپا
میرے معصوم گناہوں کو یہ معلوم نہ تھا
تجھ پہ بالقصد نہیں تھی وہ جفائیں میری
جبر سرکار مشت تھیں، خطائیں میری
اس قدر قرب پہ بھی، تجھ سے بہت دور تھا میں
الاماں، طبع کی افتاد سے مجبور تھا میں
اب کہ، بالوں کی سفیدی نے جگایا ہے مجھے

www.pdfbooksfree.pk

جذبہ کرب ترے سامنے لایا ہے مجھے
شرم سے جو نہیں اٹھتی وہ نظر لایا ہوں
اپنی بہکی ہوئی شاموں کی سحر لایا ہوں
اپنی آنکھوں کے، ترے در پہ گہر رکھتا ہوں
بخش دے مجھ کو، ترے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں

☆☆☆☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

میری بیٹی

نام ہے سعیدہ خاتون میں پیارے مردانہ نام بنا کر کلوا کہتا ہوں۔

غالباً 1917ء یا 1918ء کے لگ بھگ وہ ملیح آباد میں اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی تھی حیدر آباد دکن میں تعلیم پائی تعلیم جاری تھی کہ مجھے نظام نے خارج البلد کر دیا اور اس کے بعد برابر ایسے مواقع پیدا ہوتے رہے کہ اس کی تعلیم کا تکملہ نہیں ہو سکا۔

وہ غالباً 1936ء کا زمانہ تھا کہ میں نے دہلی میں اس کی شادی کر دی تھی۔ اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے التفات احمد علی گڑھ کا گریجویٹ، خوش فکر شاعر، اور صاحب فکر انسان تھا لیکن اس میں جینے اور ابھرنے کا حوصلہ نہیں تھا کثرت آرام سے بیمار ہو کر وہ بے چارہ بہت قبل از وقت اس دنیا سے سدھار گیا۔

سعیدہ بے حد ذہین اور نکتہ سنج ہے اور سخن فہم بھی، طبیعت موزوں ہے مگر شعر نہیں کہتی وہ ماشاءاللہ نو بچوں کی ماں ہے نانی بھی بن چکی ہے، لیکن مجھ کو اب تک گڑیاں کھیلتی بچی نظر آتی ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے نام بھی لکھ دوں ان خطابات کے ساتھ جو ان کو میری سرکار کی جانب سے عطا ہوئے ہیں۔

انور سعید خاں، عرف ''میاں''، ''مویاں'' اور ''مسٹر بھقا قا'' ۔۔۔۔۔ حیدر مسعود خاں، عرف ''بغا'' ۔۔۔۔ پرویز شہاب خاں، عرف ''پری''، ''مسٹر پریر'' ''مسٹر باٹا'' اور ''وحشت کا چڑغا'' صبوحی خاتون، عرف ''بوئی چوئی'' ۔۔۔۔۔۔ غزالہ خاتون، عرف ''غزلیا'' ۔۔۔۔۔۔ خسرو شہاب خاں عرف بلو ''مسٹر ٹارزن'' اور جاموس اشرف جہاں علی معظم خاں عرف ''مسٹر مہورٹ'' اور ''مسکین شاہ'' ۔۔۔۔۔۔۔ فرخ جمال عرف ''بدھا''، ''قلن'' ''قلندر'' اور ''قلوا ۔۔۔۔'' سراج انور خاں عرف مسٹر کپی اور ''مسٹر کالا گڈون'' ماشاءاللہ اتنے بہت سے بچوں کا پالنا کوئی ہنسی کھیل نہیں اس نے اپنے خون جگر سے ان پودوں کو سینچا اور پروان چڑھایا ہے میری بیوی شکایت کرتی ہیں کہ اب سعیدہ کو ہمارا خیال نہیں رہا ہے میں کہتا ہوں اس بیچاری کو فرصت ہی کب ملتی

ہے اپنے بچوں اور اپنی نواسیوں نواسوں کی خدمت سے کہ وہ کسی اور طرف توجہ کر سکے۔

اس دن رات کی مسلسل کاوش نے اس کی صحت بگاڑ کر رکھ دی اور جب میں اپنی بیٹی کا منہ اترا ہوا دیکھتا ہوں تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

میرا بیٹا

نام ہے سجاد حیدر خاں میں اس کو پیار سے ''چھچوا'' کہتا ہوں سعیدہ کی ولادت کے غالباً دو سال کے بعد وہ لکھنو میں پیدا ہوا تھا۔

وہ بیمار پیدا ہوا، اور آج تک تندرست نہیں ہے وہ اپنڈکس سے لے کر ٹائی فائیڈ ڈبل نمونیا اور طاعون کے سے مہلک مرض میں گرفتار رہ چکا ہے۔

اس نے سات آٹھ برس کی عمر ہی سے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا، اور جب کسی قدر سیانا ہوا تو شوفر کی مدد سے اس نے تھوڑا بہت موٹر کی مرمت کا علم بھی حاصل کر لیا جو آج آڑے وقت اس کے کام آ رہا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی)

میرے پونے کے اثناء قیام میں اس نے محمد فقیہہ صاحب بیرسٹر اور نائب وزیر جونا گڑھ کی بیٹی انور خانم سے اپنی ماں کی علی الرغم شادی کر لی تھی جس پر بیوی اب تک ناخوش ہیں۔

وہ ماشاءاللہ پانچ بچوں کا باپ ہے ان کے نام بھی مع عرفیت سن لیجئے ۔۔۔۔

ساجد حیدر خاں، عرف ''مسٹر ٹارزن'' ۔۔۔۔۔ ناز خاتون، عرف ''امی'' ۔۔۔۔۔ ترنم خاتون عرف ''چمنی'' تاج دار بیگم ۔۔۔۔۔ تبسم خاتون عرف ''ننھی'' اور فواد حیدر عرف ''مسٹر بندر''

سجاد بھی اپنی بہن کی طرح بلا کا ذہین ہے شعر بھی کہتا ہے بعض اشعار آب دار بھی ہوتے ہیں اور وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

۔۔۔۔۔ افسوس کہ بیماریوں کے تواتر سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

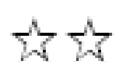
وہ آج سے کچھ اوپر دو برس پہلے میری سیمنٹ ایجنسی کو چلاتا خود اپنے پر خرچ کرتا اور مجھے کما کر دیا کرتا تھا لیکن 1946ء میں جب کہ میں ہندوستان گیا اور وہاں کسی انگریزی اخبار میں میرا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا اس وقت ترقی اردو بورڈ کے سیکرٹری

شان الحق حقی، وزارت اطلاعات کے سیکرٹری الطاف گوہر، اور میرے نئے حواری عیش ٹونکی نے اس انٹرویو کے معنی کچھ اس قدر مسخ کر کے پیش کیے کہ اس وقت کے مطلق العنان صدر فیلڈ مارشل صاحب یعنی ایوب خاں نے برہم ہو کر میری نوکری بھی ختم کر دی میرا پاسپورٹ بھی چھین لیا اور قومی عجائب گھر کو بھی میرے مسودات کی خریدار سے روک دیا میری بیوہ لڑکی کے آئیل ٹینکر کے بارے میں بھی اشارہ فرما دیا کہ اس میں مال نہ بھرا جائے اور میری ایجنسی بھی بند کر دی۔

میری اس بے سروسامانی سے متاثر ہو کر سجاد نے ایک چھوٹی موٹی ورکشاپ کھول لی جس سے وہ لشتم پشتم زندگی بسر کر رہا ہے یا یوں کہیے کہ زندگی کو بھوگ رہا ہے ہائے میرے بچے۔

سجاد نے لکھنو کی بھات کھنڈے یونیورسٹی سے سند حاصل کی تھی وہ پاکستان ریڈیو پر ستار بجانے کے واسطے بلایا جاتا تھا ایوب خاں صاحب بہادر نے اس کا وہ دروازہ بھی بند کروا دیا۔

میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنا لیا تھا میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور ہائے یہ زوال



www.pdfbooksfree.pk

میرے چند قابل ذکر احباب

یاں چمپئی دھوپ ہے، گلابی سایا
رہتا ہے، سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ، کہ منتظر ہے بزم ارواح
آیا۔۔۔۔ یاران رفتہ۔۔۔ آیا، آیا

☆☆☆☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی

خوب صورت، خوش دماغ، حاضر جواب، جادو بیان، داستان سرا، عاشق مزاج، لطیفہ گو، شوخ وطرار، ملیح آباد کی نژادنو میں، سب سے زیادہ ذہین مرغ و ماہی پکانے میں استاد میرے لنگوٹیا یار، میرے بہنوئی، میری سراپا شفقت پھپّی زاد بہن کے منجھلے بیٹے (جو میری صحت کی ناز بردار، اور میری بیماری میں مستقل تیمار دار تھیں) چڑھتی عمر تک سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوفناک دشنام طراز۔ اور میرے اس کوچے کے واہ بر اولین تھے جس کو بدتوفیقوں کی اصطلاح میں کوئے بد اعمالی کہا جاتا ہے چونکہ وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کی پرورش و تعلیم کا بار اپنے ذمے لے لیا تھا ان کے اور میرے مکان کے مابین کھڑکی تھی وہ سونے کے اوقات کے علاوہ ہمارے ہی مکان میں رہا کرتے ہمارے ہی ساتھ کھاتے پیتے اور کھیلتے کودتے رہتے تھے لڑکپن کا ذکر ہے ایک روز ہم لوگ، دوپہر کے وقت، ڈیوڑھی میں بیٹھے غالبًا تاش کھیل رہے تھے کہ ابرار آ گئے، اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی کھیل میں شریک کرو، میرے بڑے بھائی نے (جو سال، دو سال مجھ سے بڑے تھے) ان سے کہا کہ تم کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتے ہو ہم تم کو نہیں کھلائیں گے انہوں نے کہا اگر ہم کو نہیں کھلاؤ گے تو ہم "ترآن مجید[1]" کی قسم تم کو بشیر ماموں[2] سے ابھی پٹوا دیں گے میرے بڑے بھائی

---

[1] نہ جانے ان کی زبان میں کیا خرابی تھی کہ وہ "قرآن مجید" کہا کرتے تھے [2] چونکہ میرے باپ

نے کہا جا بے مردود، تو کیا پٹوا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ میرے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے بشیر ماموں شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) کہہ رہے ہیں کہ ہم سے مسلمانی لڑاؤ یہ سنتے ہی میرے باپ آگ بگولا ہو گئے اور ڈیوڑھی میں آ کر میرے بڑے بھائی کو خوب مارا وہ چیختے رہے کہ ابرار جھوٹا ہے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی اور

ابرار کا چہرہ 1 بحال ہو گیا وہ رئیس 2 احمد کی انا سے اس گمان پر جلتے تھے کہ وہ ان کو باسی کھانا دیتی ہیں اور انا ان سے اس بناء پر کھنستی تھیں کہ وہ ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں ایک روز شام کے وقت ڈیوڑھی کے پھاٹک سے چیخ چیخ کر کہا ہے ہے میاں آگ لگے اس چودھویں صدی کو ارے غضب خدا کا یہ کل کا چھوکرا ابرار مجھ سے کہہ رہا ہے "اوندھی ہو جاؤ" میرے باپ کو تاؤ آ گیا سپاہی کو حکم دیا کہ آٹھ دس چھڑیاں نیم سے کاٹ لاؤ پھاٹک بند کر دو کہ ابرار بھاگ نہ پائے اور جب چھڑیاں آ گئیں ابرار کو پکڑ بلوایا اور میرے باپ نے چھڑی اٹھا کر کہا کیوں بے مردود گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بدتمیزی کرتا ہے ادھر آ آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا انہوں نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا بشیر ماموں توان مجید کی قسم توان مجید کی قسم توان مجید کی قسم میرے باپ نے کہا قسمیں ہی کھاتا رہے گا یا کچھ کہے گا بھی۔۔۔ وہ دوڑ کر میرے باپ کے قدموں پر گر پڑے اور ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا بشیر ماموں توان مجید کی قسم میں نے تو "اوندھی ہو جاؤ" نہیں "اندھی ہو جاؤ" کہا تھا ابرار کی اس ذہانت پر میرے باپ کو ہنسی آ گئی اور چھڑی پھینک کر فرمایا گرو گھنٹال 3 آج تو چھوڑے

کوان کی ماں "بشیر ماموں" کہتی تھیں اس لئے ان کی زبان پر یہی لفظ چڑھ گیا تھا 1 یہ اور بات ہے کہ جب میرے باپ کو دوسرے دن یہ پتا چل گیا کہ ابرار نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ان کی بھی پٹائی کر دی گئی تھی 2 میرا چھوٹا بھائی 3 چونکہ وہ ہم لوگوں کو نئی نئی شرارتیں سکھایا کرتے تھے اس لئے میرے باپ نے ان کو گرو گھنٹال کا خطاب دے دیا تھا۔

دیتا ہوں لیکن اب اگر اس قسم کی کوئی بات زبان پر لائے گا تو تیری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔

ہماری ماماؤں میں سے تھیں ایک کوزہ پشت محبوبن بوا، وہ بھی ان کی شرارتوں کے باعث، ان سے جلتی تھیں ایک روز انہوں نے امام باڑے سے ملے ہوئے کمرے

میں ان کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور میرے باپ سے جا کر کہا میاں ''ابریل'' (ابرار) چرٹ پی رہا ہے اور جب ''ابریل'' خوب تھپڑائے گئے، تو بوا محبوبن کے چہرے کی جھریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس چالاکی سے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حرکت ان کی تھی جس زمانے میں رئیس احمد اور ابرار میرے ساتھ لکھنو کی لاٹوش روڈ کی گلی کے مکان میں بسلسلہ تعلیم رہتے تھے ابرار کا معمول تھا کہ روز منہ اندھیرے وہ سگریٹ پی کر دو غزلیں:

کھلی ہے کنج قفس میں، مری زبان ''صیاد'' اور

محبت میں تری، ہم سے، برآں اہل وطن بگڑا

بالالتزام گایا کرتے تھے اور سگریٹ کے واسطے جب فق سے دی سلائی جلاتے تھے تو دھندلکے کا اندھیرا کانپ اٹھتا تھا اور اس کا شعلہ میری آنکھوں میں اس طرح چبھ جاتا تھا کہ میں آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا اس مکان کا ذکر ہے، میرے باپ، ملیح آباد سے آ کر اس مکان کی نچلی منزل میں اور میرے بڑے بھائی، ہمارے اوپر کے کمرے سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ہفتے کی رات تھی، میں اور ابرار اپنے پڑوسی طالب علم شریف 1 کے ساتھ باتیں کر کر کے قہقہے مار رہے تھے ابرار نے مجھ سے کہا ہم ہنس بول رہے ہیں شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) پر یہ بات شاق گزر رہی ہوگی۔ وہ عجب نہیں کہ بشیر ماموں سے جا کر شکایت کر دیں وہ ہمیشہ ہماری تاک میں رہا کرتے ہیں ابرار کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگے انہوں نے کہا دیکھئے وہ جو میں نے ابھی کہا تھا وہی ہوا۔ شفیع احمد خاں ہماری شکایت کرنے کے لئے نیچے جا رہے ہیں۔

---

1 وہ ''بھدوئی'' کا رہنے والا اور میرا محبوب دوست تھا اب نہ جانے کہاں ہے

میں تو شریف کو لے کر اس چور دروازے سے اسی وقت بھاگا جا رہا ہوں اگر بشیر

ماموں اوپر آ کر آپ کو برا بھلا کہیں تو آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے وہاں آ جایئے گا اور صبح کی گاڑی سے ہم لوگ نواب صاحب رام پور کے پاس چلے جائیں گے ابرار یہ کہہ کر اتر گئے میں تنہا رہ گیا اتنے میں میرے باپ آئے، فرمانے لگے تم لوگوں نے شفیع احمد کی نیند حرام کر دی، شہدے کہیں کے، اور وہ مردو دگر دگھنٹال کہاں ہے، میں نے کہا وہ شریف کے گھر چلے گئے ہیں۔

باپ کی یہ بے جا ڈانٹ پھٹکار، مجھ کو زہر لگی، ان کے نیچے اتر جانے کے بعد میں ابرار کے پاس چلا گیا ابرار نے کہا اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہا ہے قرآن مجید کی قسم شفیع احمد خاں ایک روز ہم کو مروا ڈالیں گے، چلئے انیس خالہ (میری چھوٹی بہن) کے گھر میں رات گزار دیں اور پہلی ٹرین سے رام پور چلے جائیں اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے ابھی ہم شریف کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ دیکھا ہمارے باپ کے سپاہی، ریاست علی خاں، لالٹین لئے چلے آ رہے ہیں ابرار نے کہا کہ یہ مخبری بھی شفیع احمد خاں نے کر دی ہوگی کہ آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے ہاں چلے آئے ہیں، دیکھئے ریاست علی خاں جب قریب آئیں تو قرآن مجید قسم ان کو ماں کی گالی دیجئے گا میں نے کہا ابرار کیسی باتیں کرتے ہو ریاست علی خاں کھرے پٹھان ہیں، اور بوڑھے آدمی بھی ہیں۔ میں ان کی سفید داڑھی کی حرمت کرتا ہوں ان کو ہرگز گالی نہیں دوں گا اتنے میں ریاست علی خاں قریب آ گئے اور کہا خاں صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ فوراً گھر آ جائیں نہیں تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا ابرار نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا ریاست علی خاں سو بات کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم، تمہاری تو ماں۔۔۔۔۔ بے چارے ریاست علی خاں اس قدر فحش گالی سن کر اس طرح اچھل گئے گویا کسی نے ان کو گولی مار دی ہے انہوں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں اور دھل دھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (ان کے بہتے آنسو آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں)

www.pdfbooksfree.pk

انیس کے وہاں ہم دونوں بہت تڑکے بیدار ہو کر سفیر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ مکان کے نیچے گاڑی ٹھہرنے کی آواز آئی انہوں نے جھانک کر دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی ارے بشیر ماموں آ گئے انیس خالہ نے ہماری مخبری کر دی آپ کو ایسا چاہئے نہ تھا اور زینے پر جب قدموں کی آواز گونجنے لگی تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے چارپائی کے نیچے جا کر دبک گئے میں نے آ کر بڑی خشونت کے ساتھ مجھ کو دیکھا میں کانپنے لگا فرمایا گرو گھنٹال کہاں ہے انیس نے چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میاں نے گرج کر فرمایا نکل چارپائی کے نیچے سے مردود ابرار چارپائی کے نیچے سے یوں نکلے جیسے آواز صور سن کر بے چارے مردے اپنی بے حساب دردمند زندگی کا حساب دینے کے واسطے، اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

میاں نے ایک حرف بھی نہیں کہا ہم دونوں کو کوٹھے سے اترنے کا اشارہ فرمایا آگے آگے میاں، اور پیچھے پیچھے ہم مفرورین کوٹھے سے اترے تو میاں نے گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، اور ہم دونوں ان کے سامنے اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئے گویا شیر کے سامنے دو بکرے بندھے ہوئے ہیں راستے بھر میاں نے کوئی بات نہیں کی گھر آتے ہی فرمایا چلو اوپر جب ہم اوپر آ گئے تو میاں نے ابرار کے منہ پر زناٹے کے ساتھ تھپڑ امارا کہ ابرار لوٹ پوٹ ہو گئے لیکن چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہی اندر بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک ایک جست میں تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے مکان سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس ڈرامائی فرار کے بعد میاں نے مجھ سے کہا سنتا ہوں آپ کو سپہ گری کا بڑا دعویٰ ہے امیدی 1 دو لاٹھیاں لے آؤ۔ ایک ان سورما صاحب کے ہاتھ میں دے دو، ایک مجھے آج میرے ان کے مابین دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ اور پتا چل جائے کہ بہادر کون ہے امیدی نے ایک لاٹھی میاں کے ہاتھ میں دے دی اور دوسری لاٹھی میری طرف بڑھائی میری کیا مجال تھی کہ باپ سے نبرد آزمائی کے واسطے لاٹھی ہاتھ

میں لیتا میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

1۔داروغہ امید علی خاں

اور امیدی نے میرے کاندھے سے لگا کر لاٹھی کھڑی کر دی میں پیچھے ہٹ گیا لاٹھی گر گئی میاں نے ڈپٹ کر فرمایا اے بزدل لاٹھی ہاتھ میں لے اور میدان پکڑ اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو میاں نے ارشاد فرمایا کہ تو سراسر زنخا ہے علمائے اخلاق نے سچ کہا ہے کہ بزدلی و بے حیائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو سمجھا میں تجھے بے حیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ تجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ آج کل تیرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا ہے، اگر تو غیرت مند ہوتا تو اس موقع پر گھر چھوڑ کر نہ چلا جاتا کہ اگر میرے باپ مقدمے سے ہاتھ اٹھا لیں گے تو میری بیوی کسی اور کے پہلو میں چلی جائے گی میں نے آب دیدہ ہو کر کہا میاں میں آپ کو اس قدر غیرت منداور شریف انسان سمجھتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہو جائیں مگر مقدمے سے کبھی دست بردار ہو ہی نہیں سکتے میری یہ بات سن کر میاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رئیس احمد کو ابتداء ہی سے شکار، ورزش، گھوڑے کی سواری اور اپنے جیب خرچ کو گنیوں میں تبدیل کر کے جمع کرنے کا شوق تھا ابرار نے ان کے اس میلان صحت کو دیکھ کر ایک دن ان سے کہا رئیس احمد، میں آپ کو قرآن مجید کی قسم، ایک ایسی نایاب دوا دے سکتا ہوں کہ آپ دو مہینے کے اندر اندر ایک دیو پیکر پہلوان بن جائیں، رئیس کی باچھیں کھل گئیں پوچھا اس دوا کا نام کیا ہے انہوں نے کہا ''زبان پر لگانے کا طلا'' رئیس نے قیمت دریافت کی ابرار نے کہا ارے کچھ نہیں فقط پانچ گنیاں رئیس نے چپکے سے گنیاں دے دیں ابرار ایک چھوٹی سی شیشی میں روغن بادام لے آئے، اور کہا دیکھئے روز ایک کوری سینک اس میں ڈبو کر نہار منہ چاٹ لیا کیجئے گا قرآن مجید کی قسم آپ بھونپو ہو جائیں گے بھونپو ایک روز بڑے بھائی صاحب نے رئیس کو سینک چاٹتے

www.pdfbooksfree.pk

دیکھ کر پوچھا یہ کیا دوا ہے رئیس نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا میاں بھائی یہ زبان کا طلا ہے ابرار پانچ گنیوں میں لائے ہیں بڑے بھائی صاحب کو لفظ طلا کے معنی تو معلوم نہیں تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ ابرار ڈاکٹر ہیں نہ حکیم، ہو نہ ہو انہوں نے چھل بٹا کر کے رئیس سے اشرفیاں اینٹھ لی ہیں، میاں سے جا کر سارا واقعہ بیان کر دیا میاں نے رئیس کو بلا کر پوچھا، اسے کیا معلوم تھا کہ اس میں کوئی بری بات ہے کل واقعہ بیان کر دیا میاں نے شیشی دیکھی اس میں روغن بادام پایا اسی وقت ابرار کو بلایا اور فرمایا کیوں مردود تو نے'' دبابا1'' سے گنیاں اینٹھ لیں مجھ کو اس کی پروا نہیں مگر اس دوا کا نام اس قدر فحش بتایا'' زبان کا طلا'' آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا یہ کہہ کر میاں ابرار کی طرف جھپٹے ابرار نے چیخ مار کر کہاں قرآن مجید کی قسم میں نے'' زبان کا طلا'' نہیں'' زبان کا تیل'' کہا تھا رئیس احمد خاں نے میری بات سمجھی ہی نہیں میں نے کہا تھا'' تیل'' وہ سمجھے طلا طلا کیا چیز ہوتا ہے قرآن مجید کی قسم مجھ کو معلوم ہی نہیں میاں سمجھ تو گئے کہ ابرار بات بنا رہا ہے لیکن ان کی ذہانت و حاضر جوابی کی داد کے طور پر انہیں معاف کر دیا۔

جس زمانے میں ہم، 2ے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں زیر تعلیم تھے اور ملیح آباد سے تعطیل کی مدت گزار کر آگرے جا رہے تھے میاں نے رئیس ابرار اور مجھے پانچ پانچ سو روپے دیئے تھے کہ آگرے جا کر جزاول بنوالینا اس وقت ابرار نے یہ لکھ کر کہ میری جزاول پانچ سو روپے میں نہیں بن سکے گی مزید پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔

میاں نے ہم دونوں بھائیوں اور ابرار کو طلب کر کے مجھ سے اور رئیس سے پوچھا کہ تمہاری جزاول پانچ پانچ سو روپے میں بن جائے گی کہ نہیں ہم نے جواباً عرض کیا کہ بن جائے گی میاں نے ابرار سے کہا کہ ان دونوں کی جزاول تو پانچ پانچ سو میں بن جائے گی تمہاری جزاول میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ اس قدر رقم میں تیار نہیں ہو سکے گی؟ تو ابرار نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ جواب دیا تھا کہ بشیر ماموں

www.pdfbooksfree.pk

آپ غصے نہ ہو جائیں تو یہ کہوں کہ ان دونوں کی جڑاول بھی اس قدر کم روپے میں نہیں بن سکے گی یہ آپ کے بیٹے ہیں روپیہ کم پڑے گا تو یہ آپ سے دوبارہ منگا لیں گے میں آپ کا

---

1 رئیس کا پیار کا نام 2 رئیس وابرار

بیٹا نہیں ہوں مجھ یتیم کی ہمت نہیں پڑے گی یہ سن کر میاں نے ابرار اور ان کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو بھی ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرما دیئے تھے۔

ایک بار ان کے ایک کشمیری محبوب نے ان سے چار سو روپے طلب کئے وہ اس سے وعدہ کر کے تو چلے آئے لیکن بڑے خلفشار میں پڑ گئے کہ روپیہ دوں گا کہاں سے کئی روز تک پریشان رہنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا شبیر حسن خاں قرآن مجید کی قسم ایک ایسی تدبیر سمجھ میں آ گئی ہے کہ کبھی پٹ نہیں پڑ سکتی آپ رئیس احمد خاں کو بلا لیں رئیس آ گئے تو انہوں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں آپ سب کو کس قدر چاہتے ہیں وہ آپ کے ناخن کا دکھنا تک برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔

رئیس نے کہا آخر کہنا کیا چاہتے ہو، انہوں نے کہا بشیر ماموں کو جو محبت آپ سے ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں میں نے کہا پہلیاں سی کیوں بجھار ہے ہو، صاف صاف بات کہو، انہوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جائیں ظاہر ہے کہ آپ کی بیہوشی سے بشیر ماموں کا دل دہل کر رہ جائے گا اور تھوڑی دیر بے ہوش رہ کر ہوش میں آ جائیں اور ان سے چار سو روپے کی فرمائش کر دیں اگر رئیس احمد خاں آپ یہ ڈراما کھیل کر مجھے روپے دلا دیں گے تو قرآن مجید کی قسم، میں زندگی بھر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا رئیس نے ان سے امداد کا جب وعدہ کر لیا تو برابر تین دن تک ابرار نے ان کو ریہرسل کرایا جسمانی حرکات بتائیے اور لہجے کے طول وعرض کو بار بار سکھایا خود لیٹ لیٹ کر بتایا کہ کھانا کھانے میں آپ یوں لیٹ جایئے گا یوں نوالہ توڑیئے اور پھر یوں دھم سے گر پڑیئے گا اور ہوش میں آ جانے کے بعد پھر یوں

ٹھہر ٹھہر کر حرف مطلب زبان پر لائے گا۔

جب تین دن تک کا مسلسل ریہرسل ختم ہو گیا تو ہمارا طائفہ ملیح آباد آیا اور شام ہوتے ہی رئیس احمد نے حسب تعلیم ابرار، اپنی انا سے کہا آج طبیعت کچھ خراب ہے کھانا ابھی سے کھلا دو کھانا، امام باڑے کے برآمدے میں چن دیا گیا ابرار اور میں دونوں صحن میں بیٹھ گئے یہ دیکھنے کو کہ رئیس کیسی ایکٹنگ کرے گا۔

رئیس نے ابرار کے کہنے کیمطابق گن کر تین نوالے کھائے چوتھا نوالہ اٹھا کر کراہنے لگا ابرار نے مجھ سے چپکے سے کہا کتنی اچھی ایکٹنگ ہو رہی ہے رئیس نے کراہ کر تین بار آہ آہ آہ کی آواز نکالی نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھم سے لیٹ کر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے ''بے ہوش'' ہوتے ہی گھر بھر میں کہرام برپا ہو گیا انا دوڑی ہوئی باہر گئیں اور دیوانہ وار پکار کر کہا ہے ہے میاں رئیس بے ہوش ہو گیا میاں کے حواس اڑ گئے ننگے پاؤں دوڑتے آئے اور رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعا کرنے لگے کہ اے اللہ میری جان کی قربانی قبول کر، اور اسے اچھا کر دے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آ گئے میاں نے کہا خدا کے واسطے میرے بچے کو بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب نے آلہ لگا کر اور انگلیوں سے ٹھونک کر اس کے سینے کا مطالعہ کیا نبض دیکھی اور کہا خاں صاحب کوئی گھبرانے کی بات نہیں گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میاں پھر رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعائیں مانگنے لگے دادی جان نے جب قرآن کی ہوا دی رئیس نے ابرار کی سکھائی ہوئی انتہائی نقاہت کے ساتھ ذرا سی آنکھیں کھول دیں میری ماں نے کہا مبارک ہو رئیس کو ہوش آ گیا۔

میاں نے انتہائی بے تابی کے ساتھ جھک کر پوچھا طبیعت کیسی ہے؟ رئیس نے سن کر بار بار پلکیں جھپکائیں میاں کا چہرہ فق ہو گیا وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے رئیس

نے دوبارہ آنکھیں کھول کر تاگے کی سی مہین آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا باوا چار سو روپے میاں نے میری ماں سے کہا ارے جلدی سے پانچ سو کی تھیلی لے آؤ اور جب تھیلی اس کے سامنے رکھ دی گئی اس نے بڑی کانپتی آواز میں پوچھا میاں ہمارے سر کی قسم یہ روپے دے کر واپس تو نہیں لے لیں گے؟ میاں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا ارے تیرے سر کی قسم واپس نہیں لوں گا اس کے دوسرے ہی دن ہم لوگ لکھنو چلے گئے اور شام ہوتے ہی ابرار اس کاشمیری لڑکے کو چار سو دے آئے اور باقی سو روپوں سے خوب تفریح کی۔

انہیں کہانیاں کہنے کا بھی نہایت شوق تھا سنی ہوئی کہانیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے ہزاروں من گھڑت کہانیاں اور فرضی قصے بھی سنایا کرتے تھے اور اس جادو بیانی اور اس ڈرامائی انداز کے ساتھ کہ سننے والے چھ چھ سات سات گھنٹے تک مسلسل سنتے رہتے اور بھوک پیاس تک بھول جایا کرتے تھے۔

اور جب وہ مسائل پر زبان کھولتے تو حاضرین پر سناٹا سا چھا جاتا اور بڑے بڑے صاحبان علم وارباب خطابت کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا تھا۔

ابتداء میں بادہ خواری کے وقت وہ بلبل ہزار داستان بن جاتے ٹھمریاں، دادرے اپنا اور دوسروں کا کلام اور لطیفے سناتے اور بسا اوقات انگریزی ناچ بھی دکھایا کرتے تھے لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اس قدر خوفناک ہو گئے تھے کہ شراب پینے کے وقت جس کی طرف بھی ان کی نظر اٹھ جاتی تھی وہ اس کو گالیاں دینے لگتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کھوپڑی میں ماں بہن اور بیٹی وغیرہ کی گالیوں کے کارتوس دن سے چل جایا کرتا تھا میں نے اور مجھ سے زیادہ رئیس نے بے حد کوشش کی اور بارہا سزائیں بھی دیں کہ ان کی اصلاح ہو جائے مگر عمر کے انحطاط اور شراب کی کثرت نے ان کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا کہ وہ راہ راست پر نہیں آئے آخر کار تنگ آ کر میں نے اپنی رات کی محفلوں میں شریک ہونے سے ان کو روک دیا، اور پہرے بٹھا دیئے کہ وہ

باریاب نہ ہوسکیں۔

حقہ پانی بند ہو گیا تو وہ بڑے اداس ہو کر رہ گئے اور اپنے گھر میں بیٹھ کر پینے لگے اور گھر والوں کو گالیاں دینے لگے اور اس مقاطعے اور گھر والوں کے احتجاج مسلسل سے تنگ آ کر وہ نان پارے چلے گئے اور راجہ صاحب نان پارہ کی نوکری کر لی۔

ایک روز میں اپنی لکھنو کی بنارسی باغ کے سامنے والی کوٹھی سے منہ اندھیرے سیر کرنے کے واسطے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ تانگے پر اپنا سامان رکھے آ گئے میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہو نہ ہو وہ راجہ صاحب نان پارہ کو گالیاں دے کر آئے ہیں۔

اور جب تانگے سے اترتے ہی انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ شبیر حسن خاں یہ نان پارے کا راجہ نہایت کمینہ ہے، تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی اس لئے کہ ان کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ رات کو جسے گالیاں دیتے تھے اگر وہ صبح کو شکایت کرتا تھا تو وہ اسے کمینہ آدمی کہا کرتے تھے۔

میں نے کہا تمہارا اس طرح لدا پھندا آنا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ رات کے وقت تم نے راجہ کو ضرور گالیاں دی ہیں انہوں نے کہا قرآن مجید کی قسم میں نے گالیاں نہیں دی ہیں اسی دن سر شام میں انہیں ساتھ لے کر راجہ صاحب کے پاس گیا ان سے کہا تم موٹر میں بیٹھے رہو جب بلاؤں تو آنا اندر جا کر راجہ صاحب سے پوچھا انہوں نے کہا رات کو خاں صاحب نے میری تمام محفل درہم برہم کر دی میرے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی پارٹی تھی جس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جب ہم سب کھانے کی میز پر آئے خاں صاحب چینی کی پلیٹ میں ہڈی توڑنے لگے کھٹا کھٹ، اور جب میرے سیکرٹری نے انہیں روکنا چاہا تو خاں صاحب نے اس کو فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا راجہ صاحب، ابرار کو آپ سے بے حد محبت ہے وہ اپنی اس غلطی پر بے حد پشیمان ہیں اب وہ نوکری کرنا نہیں چاہتے لیکن

www.pdfbooksfree.pk

چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں اس لئے ان کی یہ تمنا ہے کہ آپ کے پاس آ کر معذرت کر لیں راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب میں نے خاں صاحب کو کبھی ملازم نہیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا آپ انہیں بلوا لیں آدمی بھیج کر میں نے انہیں

1۔ جس دعوت میں انگریز شریک ہوتے تھے ہم گھٹیا لوگ اس دعوت کو بڑھیا سمجھتے تھے۔

بلوا لیا ابرار نے جھپٹ کر راجہ کو گلے سے لگا لیا اور رونے لگے راجہ نے کہا خاں صاحب خدا کے واسطے نہ روئیے میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں چھوڑیئے اس ذکر کو پھر آ جائیے میرے پاس اسی اثناء میں آفتاب غروب ہو گیا میں اٹھنے لگا راجہ نے کہا ایسی بھی کیا بے مروتی تھوڑی سی ڈرنک تو کرتے جائیے میں نے کہا میں ابرار کی صحبت میں شراب نہیں پیوں گا آپ کسی دوسرے کمرے میں ان کا انتظام کر دیں۔ ابرار نے مجھ کو بڑی شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور راجہ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ اجازت دے دیں تو خاں صاحب ایک پیگ تو میرے ساتھ کر لیں، پھر دوسرے کمرے میں انہیں بھیج دوں گا اس کے بعد بوتل کھلی سب سے پہلے حسب دستور مہتمم شراب کو ایک پیگ پلایا اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ شراب میں کسی دشمن نے زہر نہیں ملوا دیا ہے ہم لوگوں کے جام بھر دیئے گئے۔

آدھا جام خالی کر کے، ابرار نے صوفہ چھوڑ دیا راجہ کے سامنے فرش پر آ کر بیٹھ گئے ان کے ہاتھ چوم چوم کر ''میر چنوا'' ''میر منوا'' کہنے لگے اس کے بعد جلدی سے اپنا گلاس ختم کر کے انہوں نے میرا جام غٹ غٹا کر پی لیا اور اس کے بعد جلدی سے راجہ کا جام بھی ایک سانس میں خالی کر کے وہ مسکرائے اور اپنی ترکی ٹوپی کج کر لی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ گالی دینے ہی پر ہیں اس لئے کہ بارہا دیکھ چکا تھا کہ گالیاں دینے سے پیشتر وہ مہین مہین مسکراتے اور ٹوپی کج کر لیا کرتے ہیں میں نے چاہا کہ میں فوراً اٹھ جاؤں لیکن راجہ نے میرا دامن پکڑ لیا مجھے بٹھا لیا ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ابرار نے

www.pdfbooksfree.pk

راجہ صاحب کی جانب نظر اٹھائی، ان کا ہاتھ چوما اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

راجہ صاحب قرآن مجید کی قسم آپ بھی بڑے حرام زادے ہیں اور محفل برخواست ہوگئی ایک روز سہ پہر کے وقت لکھنو کے "مقبرہ جناب عالیہ" کے قریب کے مکان میں جہاں اپنی سالی کے علاج کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا وہ میرے پاس اداس اداس آئے اور کہنے لگے شبیر حسن خاں آپ جانتے ہیں کہ مجھے لڑکپن ہی سے آپ سے کس قدر محبت ہے آپ نے جس دن سے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے میری زندگی ویران ہوکر رہ گئی ہے یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے انہیں گلے لگالیا، اور کہا ابرار تم کو بھی معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں مگر بابا تمہاری گالیاں کون برداشت کرسکتا ہے انہوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے "اری ٹیٹ 1" "برافروختہ" کر دیتے ہیں اس لئے مشتعل ہوکر میرے منہ سے آخر پٹھان ہوں نا، گالیاں نکل جاتی ہیں اگر کوئی مجھے "اری ٹیٹ" نہ کرے تو قرآن مجید کی قسم میرے منہ سے گالی نکل ہی نہیں سکتی میں نے کہا اچھا تو آج یہ کرو کہ میرے ساتھ پیو، اور اس طرح کہ میرے تمہارے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو۔ میں تو "اری ٹیٹ" نہیں کروں گا؟ انہوں نے کہا بھلا آپ اور مجھے اری ٹیٹ کریں یہ ہو ہی نہیں سکتا اور آپ نے اگر مجھے "اری ٹیٹ" بھی کیا تو آپ کے قدموں پر سر رکھ دوں گا اور اگر آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو قرآن مجید کی قسم اف تک نہیں کروں گا میں نے کہا میرے گھر پر روز دس پانچ دوست آجاتے ہیں یہاں تخلیہ میسر نہیں ہو سکے گا انہوں نے کہا چلئے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کے نیچے، گومتی کے کنارے بیٹھ کر پئیں گومتی کے کنارے، ایک پیگ کرنے کے بعد، انہوں نے کہا یہاں اندھیرا ہو چکا ہے چلئے چوک چلیں، اور نازنین 2 کے کمرے میں بیٹھ کر پئیں اور گانا بھی سنیں میں نے کہا چلو اسی وقت چلو بسم اللہ، دیکھو میں تمہیں "اری ٹیٹ" نہیں کر رہا ہوں۔

نازنین کے کمرے کے زینے پر پہنچ کرانہوں نے کہا میری رائے یہ ہے کہ پہلے ٹنڈے کبابی کے وہاں دو پیگ پی لیں اور کباب کھا کر گانا سنیں۔

میرے نزدیک کبابی کی دکان پر بیٹھ کرشراب پینا تو درکنار کباب تک کھانا آداب شرفاء کے خلاف تھا مگر ابرار کی خاطر میں نے یہ ننگ بھی گوارا کرلیا۔

---

1 Irritate 2 ایک نہایت حسین طوائف

ٹنڈے کبابی سے میں نے کہا اپنی دکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑے کر دو آج یہاں ہم شراب پئیں گے یہ سن کر کبابی گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کراس نے کہا" خاں صاحب" اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا میں سب جانتا ہوں، لیکن اس وقت ایک ایسی بات آن پڑی ہے کہ تم کو یہ بندوبست کرنا ہی پڑے گا ٹنڈے نے، انتظام کر دیا بیٹھتے ہی میں نے ان سے کہا ابرارحسن صاحب دیکھئے میں آپ کو مطلق "اری ٹیٹ" نہیں کررہا بلکہ آپ کے اشاروں پر چل رہا ہوں ابرار نے اپنا سر میرے پاؤں کی طرف جھکا کرکہا قرآن مجید کی قسم آپ کا سا شریف آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔

انہوں نے دکان پر دو پیگ پیے اور جیسے ہی تیسرا پیگ بنایا میری جان نکل گئی اس لئے کہ میں نے دیکھا وہ مہین مہین مسکرا کر اپنی ٹوپی کو کج کرنے کے لئے ہاتھ بلند کر رہے ہیں یہ آثار دیکھ کر میں دکان سے فوراً باہر آ گیا اور سامنے کی مسجد کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا ابھی مشکل سے ایک منٹ گزرا ہو گا کہ دکان کے اندر سے ابرار کی آوازیں آنے لگی۔۔۔۔۔ ماردوں گا۔۔۔۔۔ ماردوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ماردوں گا۔ اوران کی اس عمومی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر میں نے یہ دیکھا کہ لوگ ٹنڈے کی دکان سے اس سراسیمگی کے ساتھ نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں گویا بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہےاو رابرار کی آواز برابر گونج رہی ہے" ماردوں گا"" ۔۔۔۔ ماردوں گا" اور کبابی کی دکان کے سامنے آنے جانے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ وہ جھومتے جھامتے باہر آ رہے ہیں انہوں نے جب دکان

سے باہر قدم رکھا تو پھر وہی نعرہ لگا۔۔۔۔۔ماردوں گا اور تمام مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

کسی نہ کسی طرح ان کو تانگے میں لاد کر وہاں سے چلا تو راستے بھر جو سواری بھی تانگے سے

1۔وہ ماردوں گا کے حرف گاف کو با تشدید ادا کر رہے تھے۔

مل کر گزری انہوں نے۔۔۔۔ماردون گا کے برابر نعرے لگائے اور گھر آ کر جب تک سو نہیں گئے یہی نعرہ لگاتے رہے اور جب صبح کو میں نے کہا آداب 1۔بجالاتا ہوں ابرار حسن صاحب اثر ملیح آبادی تو وہ پانی پانی ہو کر رہ گئے۔

نورالحسن خاں 2۔نام تھا نورالحسن خاں (بائے مہر نام آخر "تھا" بن جاتا ہے) مجھ سے 20 برس بڑے میری پھپّی کے منجھلے بیٹے نئے نئے الفاظ کے موجد، ہر شخص کی ہر افتاد پر یہ کہنے والے کہ "ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے" دنیا کی ہر چیز کو "ٹکڑے اڑا دینے" کی حد تک برتنے والے قہقہوں کے بادشاہ بجلی میں قارون بارگاہ بیماروں کے قرب سے گریزاں اپنی بیماری میں تیمارداری کے خواہاں کھانے پینے پر جان دینے والے دوسروں سے مذاق کرنے پر ہمہ وقت تیار دوسرے ان سے مذاق کریں تو آمادہ پیکار شدید گرمی سردی کے وقت اپنے ساتھ والوں سے بلا وجہ بیزار صحت کے پرستار، درازی عمر کے خواستگار موت کے نام سے گرم فرار۔۔۔۔۔بڑے کلے ٹھلے کے، موٹے تازے، دراز قامت، بلند آواز، گچھے دار مونچھوں اور چوڑی ہڈیوں کے جرنیل نما انسان تھے۔

1۔صد حیف کہ ان کی بے پناہ ذہانت ان کو لے ڈوبی اور وقت سے پہلے ہی ان کی جان بھی لے لی بلا کی ذہانت بے حد خطرناک چیز ہوتی ہے ذہانت کے منہ میں اگر عقل سلیم کی خاردار لگام نہ لگائی جائے تو وہ اپنے سوار کو زمین پر گرا کر ٹاپوں سے کچل دیتی ہے ابرار کے پاس ذہانت تو تھی لیکن عقل سلیم سے وہ محروم تھے اسی لئے ان

www.pdfbooksfree.pk

بچارے کا یہ حشر ہوا۔

وہ اچھے شاعر بھی تھے افسوس کہ ان کے بیٹے اظہار ملیح آبادی نے ان کا تمام کلام ضائع کر دیا ورنہ میں ان کے شعر سنا کر کے آپ کو یہ تسلیم کرا دیتا کہ وہ بڑے خوش گو تھے انہوں نے حیدر آباد میں دو نظمیں کہی تھیں لو آ ہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی اور ''سینڈھی نے تو اے یار عجب دھوم مچا دی'' جن میں نظیر اکبر آبادی کی سی رونا ئی تھی ایک شعر یاد رہ گیا ہے ان کا

زوال ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے

خرد کے چند فتنے ذہن میں بیدار رہتے ہیں۔

ان کی موت میرے دل کا زخم نہیں ناسور ہے اور ایسا کہ زندگی بھر رستار ہے گا اور ان کا اس دنیا سے اٹھ جانا میری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے جو مرتے دم تک پر نہ ہو سکے گا2ہم پٹھانوں میں بڑے بھائی کو'' دادا'' بھی کہا جاتا تھا۔

چھوٹے دادا کے جملہ خصوصیات کو میں نے ان چند سطروں میں بند کر دیا ہے اب جو کچھ لکھوں گا وہ اس اجمال کی تفصیل ہو گی۔

خدا جانے وہ کون ایسی قبول عام کی گھڑی تھی کہ میں نے ان کو'' چھوٹے دادا'' کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا کہ تمام ملیح آباد اور تمام لکھنو ان کا نام بھول کر انہیں اس طرح ''چھوٹے دادا'' کہنے لگا کہ وہ جگت گرد کے مانند جگت چھوٹے دادا بن گئے اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی ان کو'' چھوٹے دادا'' کہنے لگے۔

اب تفصیلی ملاحظہ فرمایئے۔ ان کا تندرست رہنے اور زیادہ سے زیادہ جینے کا شوق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ امانی گنج کے میدان میں ہر صبح و شام میرے ساتھ ٹہلا کرتے اور ٹہلنے میں ایسے ایسے شندے کرتے تھے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے چکر گھنی کی طرح گھماتے پھر بھالو کی طرح کودتے

گردن کو دائیں بائیں گھما گھما کر "یا علی" کے نعرے لگاتے درختوں کے نیچے جا کر اس زور زور سے سانسیں لیتے تھے گویا عالم نباتات کا تمام جوہر پی جائیں گے اور پھر ہاہاہاہا ہا کی آوازوں کے ساتھ اپنا منہ طلسم ہوش ربا کے حملہ آور دیو کے مانند اس طرح پورا کھول کر دوڑتے تھے کہ میدان کی ہوا کے تمام اجزائے صحت کو چبا کر رکھ دیں گے اور جب ٹہل کر گھر آئے تھے تو چارپائی پر چت لیٹ کر اپنی دونوں کلائیوں کو بلا ناغہ ناپا کرتے تھے کہ اب وہ کتنی اور موٹی ہو گئی ہیں۔

اسی ذوق میں صحت اور تمنائے درازی عمر نے ان میں کھانا کھانے کا ہوکا بھی پیدا کر دیا تھا وہ کھانے کی میز یا دستر خوان پر اس طرح خم ٹھونک کر بیٹھا کرتے تھے گویا وہ میدان جنگ میں کود پڑے ہیں اور اپنے شرکائے طعام کو بڑی ذلیل شکست دینے پر تل گئے ہیں۔

وہ اپنے سامنے کی پلیٹیں اور پیالے جلد جلد صاف کر کے انتہائی بے تکلفانہ بے دردی کے ساتھ ہاہاہا کر کے دوسروں کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا کرتے، اور ان کے شرکائے طعام خالی معدوں کے ساتھ دستر خون سے اٹھ جایا کرتے تھے۔

اور تو اور وہ اس معاملے میں بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے اور جب کوئی بچہ ادھر ادھر کسی گوشے میں ان کو مل جاتا تھا تو وہ اس کو گود میں اٹھا کر گھر سے باہر نکل جاتے اور وہاں جا کر اس کے ہاتھ کی چیز پھسلا کر اس سے لے لیتے، اور ہاہا کر کے کھا جایا کرتے تھے۔

وہ میرے لڑکپن میں میرے گنے چھیلا کرتے دو چار گنڈیریاں مجھے دیتے اور یہ کہہ کر پورا گنا خود کھا جاتے تھے کہ باقی سب گر ہیں نکل گئیں اور جب میرے واسطے برفی آتی تھی تو دونا میرے ہاتھ سے لے کر کہتے تھے مولود شریف تو پڑھوالو اور رو و نے کو "مولود شریف مولود شریف" کہہ کر بلند کرتے اور دو ڈلیاں میرے حوالے کر کے ساری مٹھائی ہاہا کر کے خود کھالیا کرتے تھے۔

ایک بار ابرار تیخ میں لگا ہوا تیتر بھون کر لائے اور کہا رئیس احمد خاں آج ایسا تیتر بھون کر لایا ہوں کہ قرآن مجید کی قسم مزا آ جائے گا یہ کہتے ہی ان کے ہاتھ کو یکا یک ایک جھٹکا لگا اور مڑ کر یہ دیکھا کہ چھوٹے دادا اس تیخ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہاہا کرتے اپنے گھر دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

ایک روز میری کھانے کی میز پر کھانا چنا جا رہا تھا، اور وہ آستینیں چڑھائے بیٹھے تھے کہ کسی نے آ کر ان کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی میں اداس ہو کر کھڑا ہو گیا اور آدمی سے کہا کھانا بڑھاؤ انہوں نے بے حد خلاان ہو کر مجھے دیکھا میں سمجھا ماں کی خبر مرگ نے ان کو غمگین بنا دیا ہے میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے میں نے کہا چھوٹے دادا چلئے آخری دیدار کر لیں انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن کاں زندگی و موت پر کس کا قابو چلتا ہے آخری دیدار سے پہلے کھانا تو کھالیں بھوکے پیٹ سے تو رویا نہیں جائے گا میں بڑی حیرت سے ان کو دیکھنے لگا اور انہوں نے ایک ہاتھ [1] مار چھیلا دو ٹوکے ہو جائیں کہہ کر کھانا شروع کر دیا دیکھا آپ نے ان کا ذوق طعام!

---

[1] اے چھیلا (بانکے محبوب) ایک ایسا ہات میرے مار کہ میرے دو ٹکڑے رہ جائیں۔

اسی تمنائے صحت نے ان میں یہ بات بھی پیدا کر دی تھی کہ جب میں یا میرے گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تھا تو چھوت چھات کے ڈر سے وہ مریض کے کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے اور دروازے کی دہلیز سے ناک پر رومال رکھ کر دور ہی سے مزاج پرسی کر کے فوراً چلے جاتے تھے ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بے حد بخیل بھی تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے ذوق پر بھی وہ بخل حاوی رہتا تھا اور کبھی وہ اپنی جیب سے خرید کر دو پیسے کی چیز بھی نہیں کھاتے تھے۔

انہوں نے زندگی بھر کوئی محنت نہیں کی ان کی آمدنی کا تمام انحصار میری ذات پر تھا، میں جیب خرچ اور کپڑے لتے، جوتے ٹوپی وغیرہ کے واسطے جو روپیہ ان کی

www.pdfbooksfree.pk

خدمت میں حاضر کیا کرتا تھا وہ اس کو ایک پائی خرچ کئے بغیر سیونگ بینک میں جمع کر دیا کرتے تھے۔

انتقال سے کوئی دو مہینے پیشتر، وہ بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے مجھ سے رخصت لے کر پونے سے ملیح آباد چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

جب ان کے پرسے کے لئے میں وطن گیا تو ان کے چھوٹے بھائی محمد علی خاں نے مجھ سے کہا کہ جب چھوٹے دادا بیمار پڑ گئے اور حالت غیر ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا چھوٹے دادا میں بڑی اوچھی پونجی کا آدمی ہوں آپ سیونگ بینک سے دو چار سو روپے نکال لیں تا کہ آپ کا علاج ہو جائے یہ سن کر وہ بگڑ گئے کہنے لگے خاں صاحب آپ روپیہ نکالنے کا ہم کو مشورہ نہ دیں ہمارا علاج والاج کچھ نہ کریں اور اگر ہمارے دشمن مر جائیں تو ہماری لاش کو سمرا[1] تالاب میں پھنکوا دیں اب ان کی خودداری کا حال سنیے ایک بار کوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے ان کے سامنے حقہ رکھ دیا گیا حقے کا دس پانچ کش لگا کر، انہوں نے وہ حقہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر چھوٹے دادا کے سامنے رکھ دیا اور جب چھوٹے دادا حقہ پی چکے تو جوتے کی نوک پر حقہ رکھ کر اپنا پاؤں ڈپٹی کی طرف پھیلا دیا۔اور ڈپٹی بے چارہ منہ تکتا رہ گیا۔

---

[1] ملیح آباد کے ایک تالاب کا نام

ایک بار ایک سہ منزلے کے اوپر کی دیوار پھلانگ کر مجھے ایک فتنہ روزگار سے مل کر یہ کہنا تھا کہ

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہو گا
وہ کام کیا ہم نے ' جو رستم سے نہ ہو گا

میں دیوار پر چڑھ گیا اور منڈیر پر بیٹھ کر کہا چھوٹے دادا آپ بھی آ جائیں انہوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آپ دبلے پتلے آدمی ہیں آپ آسانی کے ساتھ دیوار پھلانگ سکتے ہیں میں ماشاءاللہ موٹا آدمی ہوں مجھے ڈر ہے کہ دیوار پھاندنے

www.pdfbooksfree.pk

میں کہیں خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ میں سڑک کی طرف اتر جاؤں۔

دیکھی آپ نے چھوٹے دادا کی خودداری' اپنے باب میں یہ نہیں کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو سڑک پر گر پڑوں اس لیے کہ گر پڑنے کے لفظ کو اپنی طرف منسوب کرنا انہیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ میں نے کہا چھوٹے دادا اس اتر جاؤں کی بلاغت کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہ کیوں نہ کہا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں گر نہ پڑوں انہوں نے کہا گرتے ہیں وحشیے چلا ہے ہم پٹھان گرتے نہیں فقط سڑک کی طرف اتر جاتے ہیں۔ ہائے ان کے علاوہ' سڑک کی طرف اتر جانا اس دنیا میں اور کون کہہ سکتا تھا۔ اور وہ بھی ''فقط'' کے ساتھ۔

اور ان کی خودداری کا یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ ہے کہ وہ اپنے کو تو بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس امر کا حق دیے ہوئے تھے کہ وہ جس سے بھی چاہیں مذاق کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے کسی کا' اپنی ذات پر یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی ان کے مذاق کا تصور بھی کر سکے۔

اور اسی بنا پر جب کوئی ان سے مذاق کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر اتر آتے تھے اور زندگی بھر کے لیے اس سے تعلقات منقطع کرلیا کرتے تھے۔

ایک بار کاکوری کے عرس پر شاہ جہانیاں پور کے کسی معمر و معزز پٹھان سے' بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے کہ ان معمر پٹھان نے ملیح آباد کے آموں کے تذکرے میں ان سے پوچھا خاں صاحب آپ نے کبھی ہمارے شہر کا ''بلاغنڈ'' بھی کھایا ہے یہ سن کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بلاغنڈ کسی عضو فحش کا نام ہے وہ جامے سے باہر ہو گئے اور آستینیں چڑھا کر کہنے لگے کہ بلاغند آپ نے کھایا ہوگا اور آج بھی کھا رہے ہوں گے' وہ تو کہیے ایک صاحب فوراً چھوٹے دادا اور شاہ جہاں پور کے آمادہ نبرد آزما پٹھان کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا چھوٹے دادا شاہ جہاں پور میں بیل کو بلاغنڈ کہتے ہیں۔ اگر وہ عین موقع پر آ کر رفع شر نہ کر دیتے تو دونوں لڑ مرتے۔

www.pdfbooksfree.pk

چاہیے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا معافی کے خواستگار ہوتے مگر ان کو بلاغنڈ سن کر ہی اس قدر غصہ آ چکا تھا کہ معافی طلب نہیں کی' اور تنتناتے ہوئے باہر چلے گئے اللہ ری بلاغنڈ کی فحاشی آمیز صوتی دھمک ایک بار میرے سکھانے پر ان کا پانچ برس کا بھانجا چوہے دان لیے ہوئے گھر سے نکلا اور دہلیز سے پکار کر اس نے کہا ماموں ماموں چھوٹے دادا نے کہا کیا ہے بیٹا اس نے چوہے دان کی طرف اشارہ کر کے کہا ماموں آؤ اس کے اندر بیٹھ جاؤ یہ سنتے ہی وہ ابے مردود کہتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے وہ بھاگا۔ وہ مکان کے اندر گھس کر اپنی نانی یعنی ان کی ماں کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھپٹے اسے مارنے کے لیے بچے نے غل مچایا ان کی ماں نے پوچھا نورتن کیا ہے انہوں نے کہا میں اس کے ٹکرے اڑا دوں گا۔ یہ مردود مجھ سے کہتا ہے ماموں آؤ چوہے دان میں بیٹھو ان کی ماں ہنسنے لگیں۔ وہ ان کے ہنسنے پر بگڑ گئے اور جیسے ہی انہوں نے چاہا کہ ماں کی پشت سے لپٹے ہوئے بچے کو کھینچ کر ماریں پیٹیں ان کی ماں جھلا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں اگر بچے کو ہاتھ لگایا تو تیرے ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گی۔ دیوانہ ہو گیا ہے۔ معصوم بچوں سے لڑتا ہے۔ آج کی اس نئی نسل کا کوئی بیٹا ہوتا تو بھانجے ہی کو نہیں ماں کو بھی دھنک کر رکھ دیتا مگر وہ تھے پرانے دور کے شریف زادے' ماں کی ڈپٹ سن کر باہر چلے گئے۔ لیکن بھانجے سے اپنے نزدیک یہ انتقام لیا کہ اس کے دوسرے روز جب اس کا ختنہ ہوا تو وہ شریک نہیں ہوئے اور لکھنو چلے گئے۔

حیدر آباد کا ذکر ہے ایک رات رات کے بارہ بجے میں گھر آیا ابرار میرے ساتھ تھے پھاٹک پر آتے ہی موٹر رک گئی میں نے ابرار سے کہا اب موٹر خانے تک کیسے پہنچاؤں ابرار نے صحن میں لیٹے ہوئے چھوٹے دادا کی طرف اشارہ کر کے' کہا یہ کیا قلی پڑا ہوتا ہے اس سے ڈھکلوا لیجیے۔ یہ سنتے ہی چھوٹے دادا نے شیر کی مانند بستر سے جست کی' ڈنڈا اٹھا کر کہا' ابرار کی طرف یہ کہتے ہوئے جھپٹ پڑے کہ ابے مردود' گھس کھدے' ہم کو قلی کہہ رہا ہے۔ ٹھہر جا تیرے ٹکرے اڑا کر رکھ دوں گا۔ ابرار بھاگے وہ ڈنڈا

www.pdfbooksfree.pk

گھماتے پیچھے دوڑے ابرار گلی کے نکڑ پر پہنچ گئے وہ راستے ہی میں کھڑے ہو کر ہا پنے اور غل مچانے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس والے سیٹیاں بجانے اور کتے بھونکنے لگے۔

لکھنو کا ذکر ہے کہ ایک دن رفیع احمد خاں کی انگنائی میں بیٹھے ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ رفیع نے میرے کان میں کہا چھوٹے دادا سے مذاق کرنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ میں نے کہا وہ عمر بھر کے لیے خاموش ہو جائیں گے تمہارے۔ انہوں نے کہا ان کی دوستی ہی کیا مجھے چھپن ٹکے دیے دے رہی ہے کہ ان کی دشمنی سے خوف کھاؤں۔ یہ کہہ کر وہ بالا خانے پر زینے کو اندر سے بند کر کے چڑھ گئے ایک منٹ کے اندر اوپر کی کھڑکی کھولی اور اس سے منہ نکال کر کہا اے چھوٹے دادا اب کیا تھا قیامت برپا ہو گئی۔ ڈنڈا گھما کر پھینکا اور کھڑے ہو کر کہا اے مردود اگر پٹھان کا نطفہ ہے تو نیچے اتر آ۔ ابھی ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ وہ زینے کے دروازے پر زور آزمائی کر کے اول فول بکنے لگے۔ اتنے میں کھڑکی پھر کھلی اور پھر آواز آئی اے چھوٹے ددوا۔ انہوں نے جوتہ کھینچ کر مارا جو نیچے گر گیا انہوں نے گرج کر کہا اے زنخے تجھ پر لعنت اگر مرد ہے تو آ جا نیچے۔ حرام زادے کہیں کے اے...... نیچے اترے گا نہیں؟ جب اوپر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ غصے میں بھرے وہاں سے چلے گئے۔ اور اس کے بعد مرتے دم تک رفیع کا منہ نہیں دیکھا۔

اسی طرح قہقہے لگانے میں بھی کوئی ان کا نظیر نہیں تھا۔ ان کے قہقہے پورے اٹھارہ جھٹکوں کے ہوا کرتے تھے۔ ان کا ہر قہقہہ زمین پر میل ڈیڑھ میل تک پھیل کر آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا ان کے قہقہوں کی آوازیں سن لیجیے قہ قہ قہ قہ قہ قہ قاہا قاہا قاہا قاہا قاہا قاہاہا 'ہاہا 'ہاہا 'ہاہا 'ہاہا 'ہاہا 'ہاہا 'ہاہا۔ ہاہ!

میری کوٹھی آبادی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ راتوں کو جب قہقہوں پر اتر آتے تو ان کے قہقہے دادا جان کی بارہ دری سے ٹکرا ٹکرا کر آبادی کے گلی کوچوں میں

گونجنے لگتے تھے اور قہقہے مار کو جب وہ اخ تھو کرتے اور ان کا تھوک چار پانچ گز آگے جا کر گرتا تھا۔ تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں دیکھا میرے پھیپھڑوں کا زور؟

ان کے الفاظ کی تراش خراش بھی دنیا سے نرالی تھی' ان کے سینکڑوں الفاظ میں چند یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ قرول باغ دہلی کا واقعہ ہے حضرت آزاد انصاری میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ روز صبح ان کے کمرے میں جا کر پوچھا کرتے تھے آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے وہ کہتے تھے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ وہ ہاہا کرتے ان کے کمرے سے نکل جاتے تھے۔ جب یہ سلسلہ آٹھ دس روز تک جاری رہا تو ایک دن' انہوں نے پھر پوچھا آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے اور جب آزاد نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں تو انہوں نے ایسا فارا شگاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اچھل پڑے۔ اور کہا آزاد صاحب اللہ اللہ یہ مقدمہ ہے کہ بالے میاں کی چھیر ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں۔ مگر آپ کی مقدمہ بازی اس قدر طویل ہے کہ قطب مینار اس کے سامنے چرکٹے کا لونڈا معلوم ہوتا ہے۔ ارے یہ پاتابہ سقر لاتی اور قنتورہ زربفتی والا' لمبا چوڑا' جھبر جھاڑ' جھاڑ جھنکار شتر خوار مقدمہ۔ مقدمہ ہے یا صدر پور کے نبی شیر خاں کے تاڑوں کا سر درد روسر و روئسر وٴ روٴ روٴ' قاہ' قاہ' قاہ' قاہ' قاہ' قاہ۔ آزاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اور لوٹنے لگے۔ ایک بار لکھنو کی ایک تنگ گلی سے ہم گزر رہے تھے دیکھا ایک مست سانڈ' رسیاں تڑا کر ہماری طرف سرپٹ دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ میں اور چھوٹے دادا' ایک چبوترے پر چڑھ گئے۔ اور شر رصاحب جب گلی کے ایک کنارے سے مل کر چلتے رہے تو انہوں نے چیخ کر کہا ارے شر رصاحب چبوترے کے اوپر چڑھ آیئے ورنہ یہ ادھیایا ہوا مادہ دیوانہ سانڈ اپنے سینگوں سے اآپ کی دونوں مغیانوں کو پھاڑتا ہوا اور آپ کے سارے جھولے کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک روز میں نے پوچھا یہ آپ کی بھنویں کیوں چلتی رہتی ہیں انہوں نے قہقہہ مار کر کہا بھائی شبیر حسن خاں جب سے میں بوڑھا ہو گیا ہوں یہ خصماتی حرام زادیاں چھنال ہو گئی ہیں اور یاروں کو اشارے کیا کرتی ہیں۔

ایک روز کسی نے پوچھا چھوٹے دادا اپ نے شادی کیوں نہیں کی انہوں نے قہقہہ مار کر کہا۔ جناب یہ دم بھر کی پلپلاہٹ' اور جیتے جی کی جھلبھلاہٹ آپ ہی کو مبارک ہو۔ یار لوگ ایسی نیچال نہیں پالتے۔ خاں صاحب کا ایک مادہ کا نر بن جانے کے بعد دنیا بھر کے نروں کی مادہ بن جانا کون گوارا کر سکتا ہے۔

ایک پلا اس کاندھے پر اور ایک پلا اس کاندھے پر اور میانی کے گولے تھر تھر' تھر تھر ہاہاہا۔ بھبوتیا کون بنے۔ اگر دا شادی او مائی کے نعروں میں بنو کو گھر میں بیاہ کر لے آتا تو اس سارے ہاڑ سے ہاتھ دھو کر خاں صاحب میں بھی آپ ہی کی طرح لقات اور لفا جھنا بنا ڈگ ڈگ ڈگ کرتا پھرتا ہوتا۔

ایک بار میں نے اپنے نانا جان کے ساتھ ریاست رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ میرے ماموں کے ایک بوڑھے اتالیق نے جن کو شاہ صاحب کہا جاتا تھا برآمدے میں بیٹھ کر بری طرح کھانس رہے تھے۔ ان کی کھانسی کی آوازوں کو سن کر انہوں نے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں سن رہے ہیں آپ یہ آوازیں بھوق والی دی' بھوق والی دی ہاہا' ہاہا' ہاہا۔

ہائے اب بھی جب کوئی بری طرح کھانستا ہے تو چھوٹے دادا بھوق والی دی یاد آ جاتی ہے۔

وہ عصر حاضر کی سپاٹ عمارتوں کو حرام زادی کلین شیو کہا کرتے تھے۔ اور نئے فیشن کی لڑکیوں کو انہوں نے لونڈا فیمیل کا خطاب بخشا تھا۔ اور جب کسی موٹے تازے امرد کی پشت پر وہ نظر جماتے تو قہقہہ مار کر کہا کرتے تھے بھائی شبیر حسن خاں ٹھاپ دی بال ہا۔

ان کے مزاج کی یہ بھی ایک نا قابل فہم خصوصیت تھی کہ جس وقت موسم میں غیر معمولی شدت آ جاتی تھی۔ مثلاً شدید گرمی یا شدید سردی پڑنے لگتی تھی تو وہ اپنے ہم نشینوں سے اس طرح بگڑ جاتے تھے گویا موسم کے شدائد کو انہوں نے ہی پیدا کر دیا ہے ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا کہ چھوٹے دادا سختی تو موسم کرتا ہے اور بگڑ جاتے ہیں آپ ہم سب سے آخر اس کی کیا وجہ ہے تو ایک روکھی ہوں کے سوا وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ہاں یہ بھی سن لیجیے کہ ان کا کوئی فعل ٹکڑے ٹکڑے ارا دینے سے کم کا کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مثلاً جب وہ حمام سے نکلتے تو یہ کہتے نکلتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو نہاتے نہاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اسی طرح جب کھانے کی میز سے اٹھتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیے میں نے اور جب ٹہل کر آتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو ٹہلتے ٹہلتے ٹکرے اڑا دیے میں نے یعنی وہ دنیا میں جو بھی کام کرتے اسے ٹکڑے اڑا دینے کی حد تک کرتے تھے۔

ان کی یہ بھی ایک دنیا بھر سے نرالی خصوصیت تھی کہ جس وقت کسی اللہ کے بندے کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے ہم تو پہلے ہی کہتے تھے حالاں کہ وہ کبھی پہلے سے ایک حرف بھی نہیں کہا کرتے تھے۔ میں اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا

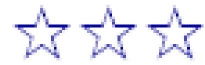
---

[1] یعنی جس طرح فٹ بال پر ٹھاپ سے ٹھوکر لگاتے ہیں اسی طرح تم بھی ایک ٹھوکر لگا دو۔

کہ جب کوئی سائیکل سے گر جاتا یا پھل تراشنے میں کسی کی انگلی کٹ جاتی، کسی شخص کی ریل چھوٹ جاتی تھی تو ان تمام مواقع پر وہ بڑے پیمبرانہ انداز میں ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کا اعلان کیا کرتے تھے۔

آخر میں ان کی ایک اور بات بھی سن لیجیے جس سے پتہ چل جائے گا کہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی عورت نا دیدہ چھوٹے دادا کس قدر بے خبر انسان تھے۔

ایک روز میرے پاس غصے سے بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ نے اپنے دوکوڑی کے خدمت گار جگنو کو بے حد منہ چڑھا رکھا ہے۔ اگر آپ کا منہ نہ ہوتا تو آج مار مار کر سالے کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا وہ مجھ سے بحث کر رہا تھا کہ بچہ مادہ کے آگے کے رخ سے پیدا ہوتا ہے اور جب میں نے اس گاؤدی سے یہ کہا کہ تیرا خیال سراسر غلط ہے بچہ مادہ کے پیچھے سے پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ سالا مجھ پر ہنسنے لگا۔ مجھے ان کے اس بھولے پن پر ہنسی آ گئی میں نے کہا چھوٹے دادا جگنو سچ کہتا ہے بچہ مادہ کے اگلے حصہ سے پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا بھائی شبیر حسن خاں میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے دن دیہاڑے میتھنیا کی بھینس کو خود جنتے دیکھ چکا ہوں کہ اس کا بچہ پیچھے کی طرف سے پیدا ہوا تھا۔ اور جب میرا قہقہہ نکل گیا تو وہ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔



مختار احمد خاں

میرے ساتھ کھیلے ہوئے پڑوسی میرے باپ کے رفیق' شبیر احمد خاں کے بیٹے' نسلی طور پر رام پوری وطنی اعتبار سے ملیح آبادی' عاشق مزاج وصوفی منش دبلے پتلے دھان پان اور بلا کے ذہین انسان تھے۔ ابرار اور چھوٹے دادا وغیرہ کے مانند خصوصیات کثیرہ کے جامع تو نہیں تھے۔ لیکن ان کی ایک خصوصیت ایسی تھی کہ جو ہزاروں خصوصیات پر بھاری تھی اور انسانی تاریخ آج تک اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکی ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں اس خصوصیت پر روشنی ڈالوں' یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ پڑھے کڑھے آداب مجلسی سے واقف لکھنو کی تہذیب سے متاثر تھے اور اس امر کو بھی خوب بدرجہ اتم سمجھتے تھے کہ بے محل کی بات کرنا یا کہنا آدمی کو سبک بنا دیتا ہے...... لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود وہ جب کسی ایسی نا قابل تعظیم ہستی سے دوچار ہو جاتے تھے جس کی ذات سے کسی دینی احترام کا تصور وابستہ ہوا کرتا تھا اس وقت ان کو بے اختیار ہنسی آنے لگتی تھی۔ ہر چند وہ صاحبان کشف وکرامات کے روبرو اس امر کی انتہائی کوشش کرے تھے کہ باادب وسنجیدہ رہیں اور بعض اوقات تو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں ان کی جان تک پر بن جایا کرتی تھی لیکن ان تمام مساعی کے باوجود ان بزرگوں کے سامنے ان کی چھاتی کو توڑ کر قہقہے بلند ہو جایا کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجیے کہ وہ ملحد نہیں بلکہ دین دار آدمی تھے۔ اور تصوف کی چاشنی ان کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ ان بزرگوں کا احترام کرتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے روبرو سر جھکاتے اور ان کے ہاتھ چومتے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ رسم عالم اور خود اپنے عقائد کے خلاف وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔

نفس انسانی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور بعض اوقات تو یہ مسئلہ ایسی بھول

www.pdfbooksfree.pk

بھلیاں بن جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو کر باہر نکلنا بےحد دشوار ہو جاتا ہے۔

اب ان کی زندگی کے چند واقعات سن لیجیے۔ اور زندگی بھر غور فرماتے رہیے کہ ان کی علت کیا تھی۔

پہلا واقعہ: ایک روز میں اپنے نانا کے انتقال کے غم میں چارپائی پر اداس لیٹا تھا اور وہ پائنتی کی طرف غمگین بیٹھے ہوئے مجھے تسلی دے رہے تھے کہ اتنے میں مولانا صاحب تعزیت کے لیے آ گئے میں اٹھ کر بیٹھ گیا...... اور جب انہوں نے فاتحہ کو ہات بلند کیے تو نیچے سے میری چارپائی اچھلنے لگی، میں گھبرا گیا۔ اور تھوڑا سا جھک کر جب چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ وہ چارپائی کے نیچے پڑے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور مولانا صاحب لاحول ولاقوۃ کہتے باہر تشریف لیے جا رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ: ایک بار امین آباد (لکھنو) کے چوراہے پر ہماری مڈبھیڑ ہو گئی، شمس العلما مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محل سے ہم لوگ تانگے اور وہ گاڑی میں تھے مولانا کو دیکھ کر میں نے تانگہ ٹھہرالیا اور مجھے دیکھ کر مولانا نے گاری روک لی۔ صاحب سلامت و مزاج پرسی کے بعد جب مولانا نے پوچھا کہ خاں صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ تو مختار نے قہقہہ مار کر جواب دیا حضور چوک جا رہے ہیں چوک گانا سننے کے واسطے قا قا، قا قا، قا قا۔ ارے جوش جلدی تانگہ بڑھاؤ۔ ہم مرے جا رہے ہیں۔ یہ خلاف توقع بات دیکھ کر مولانا نے کوچ بان سے بلند آواز سے کہا گاڑی بڑھاؤ۔ اور مختار نے جھک کر کہا حضور آداب اور مولانا دور تک مڑ مڑ کر نہایت غصے کے ساتھ دیکھتے چلے گئے۔

تیسرا واقعہ: یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء کا ہے جب کہ لکھنو میں ایک بزرگ وارث جن شاہ صاحب کے کشف و کرامات کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے ان کے خاص مریدوں میں زیادہ تر علماء بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ وہ ان سب کی

www.pdfbooksfree.pk

شراب چھڑوا چکے ہیں۔ اس لیے کہ جب وہ پیگ بناتے تھے تو ان کو یہ نظر آتا تھا کہ جام کے اندر سینکڑوں سور کے بچے تیر رہے ہیں۔

ان کے عقیدت مندوں نے شاہ صاحب کے ٹیلے کی مسجد کے جوار میں ان کے واسطے ایک کوٹھی تعمیر کروادی تھی۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔

اسی اثنا میں ایک روز صبح کو مختار میرے پاس آئے اور کہا چلو حضرت وارث شاہ حسن صاحب کی زیارت کرآئیں۔

ابھی ہم مسجد کی سیڑھیاں طے ہی کرر ہے تھے کہ میں نے کہا دیکھو مختار شاہ صاحب کی زات سے احترام کا تصور وابستہ ہے خدا کے واسطے ان کے سامنے جا کر ہنسنے نہ لگنا۔ وہ میری بات سن کر چوکنا ہو گئے اور کہا خدا تمہارا بھلا کرے بڑے موقع سے تم نے ہنسی کی بات یاد دلا دی۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ شاہ صاحب کا تصور کر کے یہیں سیڑھیوں میں بیٹھ جاؤں۔ وہ بیٹھ گئے اور اس زور زور سے ہنسنے لگے کہ گویا ان کو ہنسی کا ہیضہ ہو گیا ہو۔

شاہ صاحب کے خادم ابو بکر نے اپنے کوارٹر سے جب ان کا یہ عالم دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ ان پر جن آیا ہوا ہے وہ پانی بھرا ہو بدھنا لے کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اور کچھ پڑھ پڑھ کر ان کے منہ پر زور زور سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس عمل نے ان کی ہنسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور وہ ہنسے کے مارے لوٹنے لگے۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے بعد یہ بادل چھٹا اور ہنسی کا مینہ تھم گیا...... انہوں نے منہ دھو کر رومال سے پونچھا پانی پیا گہری سانس لی اور آسمان کو دیکھا۔ ٹوپی درست کی پھریری لی اور مجھ سے کہا اب چلو بڑے اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اس قدر ہنس چکا ہوں کہ اب سال بھر تک ہنسی نہیں آئے گی۔

اب ہم وارث شاہ ساحب کی خدمت میں پہنچ گئے مختار ان کے داہنے ہاتھ پر اور میں الٹے ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اور وہ انتہائی عقیدت کے

ساتھ مکالمت کرتے رہے۔اور میں مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی بات خلاف تہذیب نہیں ہو سکے گی۔

باتوں باتوں میں شاہ صاحب نے پوچھا مختار تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے۔ اس سوال نے ان کے صبر و تحمل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔وہ شاہ صاحب کے احترام کا بار پہلے ہی برداشت کیے بیٹھے تھے۔اب شاہ صاحب کے سوال کے دوش پر ان کے باپ کا احترام بھی لاد دیا اور یہ دہرا بوجھ ان سے اٹھ نہیں سکا۔اور پہلو بدل کو انہوں نے کہا حضور...... میں سمجھ گیا کہ اب حضور کو کیا ہونے والا ہے۔اس لیے کہ میں بارہا تجربہ کر چکا تھا کہ جس طرح گالی دینے سے بیشتر ابرار مہین مہین مسکرا کر اپنی ٹوپی کج کر لیتے تھے۔اسی طرح مختار قہقہوں سے پیشتر اپنی لانبی آواز میں حضور کہا کرتے تھے۔

شاہ صاحب نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضور کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں پھر دریافت کیا کہ بتاؤ تمہارے والد کا مزاج کیسا ہے...... انہوں نے بھنچی سی تھرتھراتی آواز میں کہا حضور خیریت سے ہیں۔اور ان کے شانے ہلنے لگے۔اور شاہ صاحب کے تیور بدل گئے۔

مجھ کم بخت میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب کوئی میرے سامنے ہنسنے لگتا ہے تو میں کسی طرح بھی ہنسی کو ضبط نہیں کر سکتا میں نے فوراً کھنکھار کر اس طرح اٹھنا چاہا گویا باہر جا کر گلا صاف کرنا چاہتا ہوں شاہ صاحب نے کہا میاں اگالدان آپ کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔میں نے منہ موڑ کر اس بڑے اگالدان میں اپنی ہنسی خوب جی بھر کر تھوکی' اور اس قصد سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا کہ اب مردود مختار کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

اتنے میں شاہ صاحب نے بگڑ کر مختار سے کہا اودھ کے شریف زادوں میں یہ کیا ناشائستگی پیدا ہو گئی ہے کہ جب ان کے والد گرامی کا مزاج پوچھا جاتا ہے تو وہ حضور کہہ کر ہنسنے لگتے ہیں۔انہوں نے جھک کر شاہ صاحب کے قدم پکڑ لیے اور قہقہہ مار کر کہا۔حضور میں بدتمیز نہیں ہوں۔میرے پیر تھے دیرے شریف کے حاجی وارث علی شاہ' حضور پرسوں انہیں خواب میں دیکھا تھا جب سے بیکار بیکار برابر ہنسی آتی رہتی

ہے قاہ قاہ قاہ...... اور میں اپنی پسلیاں پکڑ کر اگال دان میں دوبارہ ہنسی تھوکنے لگا۔

شاہ صاحب نے غصہ بھری آواز میں کہا۔ مختار یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ تم نے اپنے پیر کو خواب میں دیکھا اور اس کا یہ اچر ہوا کہ تمہیں بیکار بیکار ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا قلب سیاہ ہو چکا ہے۔ میں تمہیں چالیس تعویز دوں گا انہیں چالیس دن تک گھول کر پینا اس سے جو شیطان تم پر مسلط ہوگیا ہے وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ مختار کے حواس بجا نہیں رہے تھے انہوں نے پھر قہقہہ مار کر کہا اے حضور ایک تعویز کو پورے چالیس دن تک کیسے پیتا رہاں گا...... شاہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا میں تمہیں چالیس تعویز دوں گا تم اسے ایک سمجھ رہے ہو۔ یہ سنتے ہی مختار نے قہقہے میں ڈھلی چیخ مار کر مجھ سے کہا۔ ارے جوش اپنا قلم دے دے ترکیب استعمال لکھ لوں قاہ قاہ قاہ قاہ...... میں نے قلم نکالنے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ ایک من کا ہو کر کانپنے لگا۔ اور ایک زبردست قہقہہ میرا سینہ توڑ کر ہوا میں گونجنے لگا۔ اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ شاہ صاحب یہ خاکسار چلا۔ اور مختار میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ارے قلم تو دے دو۔ اور اسی عالم میں ہم دونوں مسجد سے باہر آ کر مسجد کے فرش پر گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

چوتھا واقعہ: وہ ایک زبردست عشق کے سلسلے میں بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔ اور وہیں پھر تجارت بھی کرنے لگے تھے۔ اور میں بھی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ عشق کو بہلانے اور بھلانے کی خاطر غالباً سنہ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ چلا گیا تھا اور غالباً ڈھائی تین مہینہ ان کے ساتھ رہا تھا۔

میں ان کی ناقابل شرح ہنسی کے تو بہت سے واقعات دیکھ چکا تھا لیکن ان کے ناقابل فہم رونے سے وہاں جا کر دوچار ہوا تھا۔

کلکتہ میں ایک فرنگی لڑکی پر جس کا نام تھا مس میبی وہ عاشق ہو گئے تھے اور وہ اس قدر وفادار تھی کہ روزوقت نکال کر چار بجے سہ پہر سے آٹھ بجے رات تک وہ ان کے

www.pdfbooksfree.pk

پاس بلاناغہ آیا کرتی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ روز اس کے آتے ہی وہ رونے لگتے تھے۔ معشوق کی بے وفائی پر تو سب روتے ہیں وہ معشوق کی وفاداری پر رودیا کرتے تھے۔ ان کی اس روش سے ان کی محبوبہ کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ اور تاسف بھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں مختار کو سمجھاؤں کہ وہ خوشی کے موقع پر رویا نہ کریں۔ میں نے انہیں سمجھایا بھی اور انہوں نے وعدہ بھی کرلیا کہ اب نہیں روئیں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آئی اس اللہ کے بندے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ جب میں نے بہت غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ چوں کہ تصوف کا جذبہ ان کو اپنے باپ سے خون میں ملا تھا اور چوں کہ صوفیا کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ لذات شیرینی میں غم کی چاشنی ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ لزیذ کھانوں میں بھی پانی کی آمیزش کر کے ان کو بدمزہ بنا دیتے تھے۔ اس لیے مختار اپنی معشوقہ کے شربت دیدار میں اپنے آنسو گھول دیتے ہیں کہ مسرت کی تیز دھار کند ہو جائے۔

وہ میرے ناقابل حل پیچیدہ عشق کو بھلانے کی خاطر اکثر کلکتے کی حسینوں کے پاس مجھ کو لے جایا کرتے تھے۔ لیکن میرے دل میں کسی کی جگہ ہی پیدا نہیں ہوتی تھی......ایک روز وہ ایک نہایت حسین لڑکی کے کان میں کچھ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو وہ لڑکی میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ میں مسکرا نہ سکا۔ پھر اس نے چٹ سے میرا بوسہ لے کر میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ میں نے کہا میں ان بانہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے جھینپ کر کہا اللہ رے لکھنؤ کی نزاکت۔ ارے میں تو مختار کا چوتھا واقعہ بیان کر رہا تھا اپنا دکھڑا۔

---

1. وہ دور ایسا دور تھا کہ اپنے عشق کی بنا پر میرے دل میں تل بھر جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ ورنہ میبی کے جال کا وہ عالم تھا کہ اگر میرا دل برائے کرایہ خالی ہوتا تو میں

www.pdfbooksfree.pk

اسے اپنے دل میں بسالیتا۔ چلیے بہت اچھا ہوا ورنہ مختار کے سے جگری دوست سے تصادم ہو جاتا۔ اپنے اس عشق پر میں نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے۔

تیرے پانے پہ بھی نہیں راضی
تیرے کھونے پہ بھی نہیں تیار

ہاں تو سنیے اسی زمانے میں ایک دن مختار نے مجھ سے کہا شبیر میں دنیا ترک کر کے اب اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ساری دکان فروخت کر کے اور زمینی کو اس کا روپیہ دے کر ملیح آباد چلا جاؤں گا۔ اور کاکوری شریف کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا وہیں کوئی حجرہ مجھے بھی دلا دینا۔ وہاں بیٹھ کر ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دوں گا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ان کے سر پر ترک دنیا کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ نہیں مانے دکان کو غالباً ستر ہزار میں فروخت کر کے انہوں نے اپنے پاس فقط تین سو روپے رکھ لیے اور باقی تمام روپیہ اپنی معشوقہ کے حوالے کر دیے ہر چند وہ روپیہ قبول نہ کرنے اور ان سے کلکتہ نہ چھوڑنے پر اصرار کرتی رہی۔ لیکن انہوں نے اس کی بات نہیں مانی۔ مجھے ساتھ لے کر ملیح آباد سے میرے ساتھ ٹم ٹم میں سوار ہو کر کاکوری پہنچ گئے۔

خانقاہ کے گنبد پر نظر پڑتے ہی میں نے کہا دیکھو مختار حبیب حیدر شاہ سے ہمارے تمہارے تین چار پشتوں کے تعلقات ہیں اور پھر میں ان کا مرید بھی ہوں اگر ان کے سامنے جا کر تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو یاد رکھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہ سنتے ہی وہ مجھ سے لپٹ کر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جب ہچکیوں کا تار ٹوٹا تو ڈبڈباتی آنکھیں اٹھا کر انہوں نے کہا شبیر تمہارا ہنسوڑ مختار تو اب مر چکا ہے وہ اب جب تک جیئے گا لگاتار روتا ہی رہے گا۔ اگر مزا ہے تو پچھلے ہر رونے میں اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ میں ان کو حبیب حیدر شاہ کے پاس لے گیا' ان کا اور ان کے

باپ کا نام بتا کر درخواست کی کہ ان کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرما لیجیے۔

شاہ صاحب ہر شخص کو مرید نہیں بناتے تھے لیکن چوں کہ میں نے درخواست کی تھی اور وہ مختار کے پورے خاندان سے بھی واقف تھے انہوں نے میری درخواست منظور کر کے ان کو حکم دیا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو۔ انہوں نے اس قدر طویل رکوع و سجود اور اس درجہ اخلاص مندی کے ساتھ نماز پڑھی کہ عہد رسالت کے مسلمان یاد آ گئے۔ نماز پڑھ کر انہوں نے ان پورے روپوں کی مٹھائی منگائی جو کلکتہ کی دکان کے باقی رہ گئے تھے۔ اب مال دنیا میں ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں تھی۔

اب حبیب حیدر شاہ ان کو اپنے روبرو بٹھا کر حسب دستور قدیم ان کا ہات اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام لے لے کر ان سے یہ کہلانے لگے کہ میرا یہ ہات فلاں فلاں بزرگوں کے ہاتھ پر ہے۔

غالباً تراب علی شاہ قلندر کا نام لے کر انہوں نے مختار سے کہا اب کہو یہ میرا ہات مجا شاہ قلندر کے ہات پر ہے۔ مجا شاہ قلندر کا نام سنتے ہی مختار پر دفعتہً خاموشی چھا گئی۔ شاہ صاحب اس خیال سے کہ ان پر رقت طاری ہو گئی ہے۔ دو منٹ کے واسطے خاموش ہو گئے۔ اور جب ٹھہر کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا ہاں تو کہو میرا یہ ہاتھ مجا شاہ قلندر کے ہاتھ پر ہے تو انہوں نے پھریری سی لے کر کہا حضور۔ ان کے اس طویل الصوت حضور کو سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اور سمجھ گیا کہ اب پل بھر میں کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے میں نے ٹھان لی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوں......لیکن یہ سوچا کہ اگر جوتے پہن کر جانے لگوں تو شاہ صاحب پوچھ بیٹھیں گے کہ میں کہاں جا رہا ہوں اس لیے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔

اور ایک دقیقہ ضائع کیے بغیر میں جھٹ سے اٹھا اور شاہ صاحب کی نظر بچا کر ان کے بائیں ہاتھ کے برآمدے میں آ گیا اور پاکھے لگ کر چوروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ وہ برآمدہ آٹھ دس فٹ بلند تھا۔ اور جھانک کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگ سکتا ہوں کہ

www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔

اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ مختار میاں نماز میں تاخیر ہو جائے گی۔ جلد ان منازل سے گزر جاؤ اور کہو کہ میرا ہاتھ مجا شاہ صاحب کے ہاتھ پر ہے۔

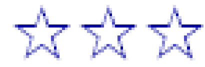
شاہ صاحب کے ہونٹوں کی جنبش ابھی ختم ہوئی تھی کہ ان کے خاراشگاف قہقہے سے خانقاہ کے تمام سقف و بام گونج اٹھے۔

شاہ صاحب نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا' اور تیز تیز قدم رکھتے ہوئے مسجد چلے گئے۔

---

1 تمام ناموں کے بعد حضرت علی کا نام لیا جاتا تھا۔ اور پھر بیعت مکمل ہو جاتی تھی۔

میں ننگے پاؤں دھم سے کود پڑا۔ اور اپنی باہر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کی طرف بھاگا۔ ان کے قہقہے اور ان کے یہ الفاظ میرا تعاقب کرنے لگے کہ حضور ایسا نام تو کبھی سنا ہی نہیں تھا۔ اللہ اکبر مجا شاہ قلندر ہاہا' ہاہا' ہاہا' ہاہا۔ ارے شبیر کہاں غائب ہو گئے ہو ارے مجھے سنبھالو دم نکلا جا رہا ہے میرا اف اف مجا شاہ ارے توبہ قاہ قاہ قاہ' قاہ' قاہ' ہا' ہا' ہا۔



www.pdfbooksfree.pk

قاضی خورشید احمد

ریاضی استاد' شاعر و نقاد' فارسی و سنسکرت ماہر' مکذب بدیہیات' طفل حرکات' اخلاق شعار' دوست نواز' دشمن ناشناس' امر وپسند' آداب شکن' سریع الکلام آشفتہ مزاج' غریب الخصائل' بظاہر بیگانہ' بباطن یگانہ اور

گہے	بر	طارم	اعلیٰ	نشینم
گہے	بر	پشت	پائے	خود	نہ	بینم

قسم کے ایسے سنکی انسان تھے کہ جن کو نفسیات کے ماہر غور و فکر کا ایک اہم موضوع بنا سکتے تھے۔ ان کے سے کثیر الجہات آدمی کے تمام خصوصیات اور گفتنی ناگفتنی حالات پر اگر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھاؤں تو ایک دفتر ہو جائے...... لیکن چونکہ میں بڑی تیزی کے ساتھ غروب ہو رہا ہوں اور اس جھٹپٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا' اس لیے ان کی زندگی کے چند ہی پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

وہ جھانسی اٹاوہ اور الہ آباد کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے بعد مسلمانوں میں ریاضی کے سب سے بڑے ماہر تھے...... ریاضی دانوں کو بالعموم ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دریائے ادب کے بھی پیراک اور اس قدر زود گو شاعر تھے کہ جب کبھی ان کے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک نشست

---

[1] قصبہ تھونہ ضلع سیتاپور کے باشندے تھے۔

میں ہزار ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ Mass Production یعنی وافر پیداواری تکثر آفرینی یا انبار ابداعی میں بڑھیا مال تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اچھے شعر

بھی جھلک اٹھا کرتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں وہ دو بار مجھ سے بگڑ بھی گئے تھے پہلی بار تو شفق پر میری نظم سن کر انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جلدی جلدی کہا تھا...... یہ مناظر کی شاعری انگریزوں کو مبارک ہو مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انگریزی پڑھ کر آپ نے اپنی شاعری خراب کر ڈالی ہے۔ بالکل خراب اور دوسری بار میری ایک فارسی غزل مسلسل کو سن کر انہوں نے کہا تھا کہ آپ مہربانی فرما کر ایران تشریف لے جائیں۔ ایران آپ کو مطلق اردو نہیں آتی مطلق مطلق مطلق نہیں آتی۔ ہر چند میں نے اپنا اب تک کوئی تخلص تجویز نہیں کیا تھا اس کے باوجود آپ سے بہتر کہیں بہتر شعر کہتا ہوں۔

اس پر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا ارے قاضی خدا کے لیے تخلص نہ رکھ لینا ورنہ میں تو خاک میں مل کر رہ جاؤں گا۔

اب ان کے انتقاد کی شان بھی دیکھ لیجیے ان کو جب یہ شعر سنایا گیا

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو انہوں نے زور سے منہ جھٹک کر کہا لاحول بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے شاعر صاحب اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے پر ہزاروں سجدے پھدک رہے ہیں لیکن جب تک تو اطلاق و تنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھپن چھری یعنی جانکی بائی آف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آئے گا میں تیری بارگاہ میں ایک سجدہ بھی نہیں کروں گا اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانت الٰہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... اس کے بعد انہوں نے کہا مجھے اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے ذرا ان کو بھی پرکھ کر دیکھ لیجیے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

www.pdfbooksfree.pk

اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے جس قدر بھی اودے نیلے پیلے سفید اور دھانی گناہ کیے تھے وہ جب عفو بندہ نواز کے تنبو کے دروازے پر پناہ مانگنے آئے تو انہیں بھگا دیا گیا لیکن شاعر صاحب کے جب حبشیوں کی طرح کالے کلوٹے گناہوں نے درخواست کی تو انہیں فوراً پناہ دے دی گئی۔

کاش کوئی اللہ میاں سے جا کر یہ پوچھے کہ آپ کو انسان کے حبشی گناہوں پر کیوں پیار آتا ہے۔اس کے علاوہ اس شعر کے پہلے مصرعے میں جہاں کا لفظ انتہائی خشوع ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھیے

کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا' تجھے کیا ملے گا نماز میں

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عراقی کے شعر کا پرتو ہے

بحرم جو سجدہ کردم زحرم ندا برآمد
کہ مرا خراب کر دی تو بسجدہ ریائی

اور دوسری بات یہ ہے کہ مصرعہ اول کے جزو اول یعنی کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا میں ایک ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے کہ جس کو میں زبان پر نہیں لا سکتا۔تو بہ تو بہ کھڑا ہوا۔

ایسی فحاشی معاذ اللہ

ایک روز میں نے ان کو اپنا ایک مطلع سنایا

حرم کو جاتا ہے کچھ دل سے ساز کرتا جا
طواف کعبہ حسن مجاز کرتا جا

انہوں نے منہ بنا کر کہا میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر ہندوستان کی سکونت ترک فرما کر ایران تشریف لے جائیں جی ہاں

www.pdfbooksfree.pk

ایران ایران ایران تشریف لے جائیں۔ اور وہاں جا کر طواف کعبہ حسن مجاز کی فارسی خوب بگھارتے پھریں۔ اس کے علاوہ مصرعے میں جاتا کا الف گر رہا ہے۔ ہر چند قدما کے نزدیک حروف اصلی کے سوا اور تمام حروف گرائے جا سکتے ہیں۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اس طرح اسقاط حروف سے شعر کی موسیقی خراب ہو جاتی ہے اور ایک عیب اس شعر میں اور بھی ہے کہ طواف کرنا فصیح زبان ہے آپ نے پہلے طواف اور بعد کو کرتا جا کہہ کر اس قدر تعقید پیدا کر دی ہے کہ شعر کا سارا مزا کرکرا ہو گیا ہے اور ایک بڑی نازک بات اور کہتا ہوں آپ نے طواف میں اضافت کا دم چھلا لگا کر طواف کرتا جا کو طوافے کرتا جا کی آواز میں مبدل کر دیا ہے۔ جو صحیح ہونے کے بعد سراسر مکروہ ہے۔

ان کی ہیئت کچھ ایسی عجیب تھی کہ جب کسی اجنبی کی طرف نگاہ ان کی طرف اٹھ جاتی تھی تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان کا قد لانبا تھا رنگ سانولا منہ پر ایک عجیب سی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ آنکھوں پر بھیانک سی عینک ان کی ترکی ٹوپی ان کے ماتھے پر اپنے پھندنے کی سونڈ ہلایا کرتی تھی۔ کسی سے گفتگو کرتے تھے تو انکا لعاب ارار کر سامع کے منہ پر آیا کرتا تھا۔ اور آواز کے ایسے متسل جھونکوں اور الفاظ کی ایسی مسلسل تکراروں کے ساتھ گھبرا گھبرا کر جلدی جلدی باتیں کیا کرتے تھے کہ گویا گھانس کاٹنے کی مشین چل رہی ہے۔ یہ بھی ان کی ایک خاص ادا تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی ہر بات کے ابطال ہر ہر وقت تلے رہتے تھے۔

ہر چند وہ آب حیات کی زبان کے خود بڑے معترف تھے۔ لیکن ایک روز جبکہ میں ان کے وہاں مہمان تھا۔ اور کسی صاحب نے ان کے روبرو آب حیات کی زبان کی تعریف کی تھی تو انہوں نے حسب عادت ان کی اس رائے کا ابطال کرتے ہوئے کہا تھا کہ محمد حسین آزاد کو تو زبان کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ وہ تو بالکل ہی بوڑم آدمی تھے۔ اور جب کسی نے ان کے روبرو میرزا غالب کے باب میں یہ کہا تھا کہ غالب ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا تو انہوں نے بڑی برہمی سے کہا تھا کہ اجی غالب وہ حضرت تو

www.pdfbooksfree.pk

فارسی میں سوچتے اور اردو میں شعر فرماتے تھے لاحول ولا قوت۔

ان کے ابطال کی یہ لے یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ بدیہیات تک کی تکذیب پر اتر آتے تھے مثلاً ان سے اگر کوئی شدت سرما کی شکایت کرتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے اجی سردی وردی کیسی شاید آپ نے کسی اخبار میں پڑھ لیا ہے کہ سردی پڑ رہی ہے سردی کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی بات بھول کر کہنے لگتے کہ یار آج تو بڑی سردی پڑ رہی ہے کہ دانت بج رہے ہیں۔

ان میں ساری دنیا سے جدا ایک ایسی بات تھی کہ جوان کے سوا میں نے اس دنیا کے کسی آدمی میں آج تک نہیں پائی ہے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ جب ان کا کوئی بچھڑا ہوا دوست برسوں کے بعد بھی ان سے ملنے آتا تھا تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے دوڑ کر گلے لگانا اخاہ کہہ کر خیر مقدم کرنا یا مزاج پوچھنا۔ یہ ساری باتیں ان کے معمولات سے یکسر خارج تھیں۔ اور برسوں کا بچھڑا چھپتا دوست بھی جب ان کے گھر جاتا تھا تو وہ اس کو اس طرح دیکھتے تھے گویا وہ ایک گھنٹہ پیشتر ان کے پاس بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ اور اب دوبارہ آ گیا ہے۔

لگے ہاتھوں ان کی سنک کے بھی چند واقعات سن لیجیے ایک بار کوئی پانچ چھ برس کے بعد میں ان سے ملنے جھانسی گیا دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا قاضی صاحب آداب انہوں نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور بری سپاٹ سی آواز سلام کا جاب دے کر پھر لکھنے میں غرق ہو گئے۔ دوسرا ہوتا تو بگڑ جاتا کہ انہوں نے میری آمد ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ میں ان کا مزاج شناس تھا میں نے برا نہیں مانا اور وہ برابر لکھتے رہے۔

جب لکھ چکے تو میری طرف نگاہ اٹھا کے کہا۔ جوش میاں ہم ایک معمہ حل کر رہے ہیں میں نے کہا چلو اچھا ہوا کہ معمہ حل کر لیا۔ اب یہ بتاؤ مزاج کیسا ہے؟ میری مزاج پرسی ان پر بہت گراں گزری انہوں نے اپنے ایک دوست سے جو میرے آنے سے

پیشتر وہاں موجود تھے میری جانب اشارہ کر کے کہا آپ جانتے ہیں ان کو؟ یہ ہیں حضرت جوش ملیح آبادی ان کے دوست ہڑبڑا کر مصافحے کے لیے اٹھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا نہیں نہیں نہیں ان سے ہرگز مصافحہ نہ کیجیے ہر چند یہ میرے بہت ہی پرانے یار ہیں مگر آتے آتے انہوں نے مزاج پرسی کے ذریعہ مجھ پر وار کر دیا ہے۔ میں نے کہا ارے قاضی وار کیسا؟ یہ کیا بک رہا ہے انہوں نے کہا کئی روز سے میری طبیعت خراب تھی۔ آج ارادہ کر چکا تھا کہ جلاب ضرور پیوں گا لیکن معمہ حل کرنے میں جلاب پینا ہی نہیں یہ بات ہی بھول گیا تھا کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے۔ اور اس بھول کی بنا پر ناشتہ منگوانے ہی والا تھا کہ تم نے مزاج پرسی کر کے یہ بات یاد دلا دی کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے آ کر میرا ناشتہ روک کر مجھ کو جلاب پینے پر مجبور کر دیا یہ ہے تمہاری دوستی اب تم مزے سے ناشتہ کرو گے اور میں کم بخت رو رو کر جلاب پیوں گا۔

ابھی یہ سنک چل ہی رہی تھی کہ ایک نہایت خوش رو نوجوان اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے آیا اور انہیں سلام کر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس خوبرو نوجوان کو اپنی داڑھی کھجا کھجا کر گھورنے لگے اور ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی بات یاد کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب انہوں نے اس کو بار بار گھورا اور داڑھی کھجائی تو میں نے کہا گھورے ہی چلے جاؤ گے یا کوئی بات بھی کرو گے۔ انہوں نے کہا جوش میاں! اس سے تمہیں کیا غرض کیا غرض کیا غرض میں تو ان نوجوان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں میں نے کہا پھر پوچھتے کیوں نہیں انہوں نے سہ بارہ داڑھی کھجا کر اس نوجوان سے کہا میاں صاحبزادے ہمارا حافظہ بالکل بالکل بالکل خراب ہو چکا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کبھی آپ کو استعمال میں لا چکے ہیں کہ نہیں ہے۔

یہ سن کر وہ نوجوان نہایت غصہ میں بھرا اٹھا اور بڑے کھڑاکے سے کرسی پیچھے دھکیل دی اور وہ بڑے زور سے کھٹ کھٹ کرتا زینہ سے اتر گیا۔

اس کے جاتے ہی انہوں نے کہا کہ اگر یہ کسی شریف خاندان کا آدمی ہوتا تو اس سنجیدہ بات پر بھی نہ بگڑتا۔ ہو نہ ہو یہ بدقوما ہے بدقوما ہے بدقوما...... سالا بدقوما کہیں کا ہونہہ۔

ایک روز ایک نومشق و نوجوان شاعر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ نہیں ایک سہرا کہہ کر دیں جس کو وہ کسی رئیس لڑکے کی شادی پر پڑھیں گے۔ اور ان غریب

---

1 قاضی نے بڑے عریاں الفاظ میں پوچھا تھا میں نے اسے کسی قدر شائستگی کے سانچے میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

کو کچھ مل جائے گا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا میں بہت تڑکے فن سخن کرتا ہوں' آپ کل ٹھیک آٹھ بجے آجایئے گا۔ سہرا تیار ملے گا۔ تیار ملے گا ان بیچارے شاعر کی شامت اعمال کہ وہ صبح چھ بجے ہی آ گئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ میں نے تو آپ کو آٹھ بجے بلایا تھا۔ شاعر بے چارے نے دانت نکال کر کہا میرا جی چاہا کہ یاددہانی کر دوں انہوں نے بگڑ کر کہا یاددہانی یاددہانی یاددہانی تو جھوٹوں کو کرائی جاتی ہے آپ نے مجھے جھوٹا سمجھا جھوٹا جھوٹا جھوٹا یہ کہتے ہی انہوں نے وہ پرچہ جس پر وہ سہرے کے چند اشعار لکھ چکے تھے چاک کر کے فرش پر پھینک دیا۔ اور شاعر ماتھا پیٹتا ہوا چلا گیا۔

ایک روز میں ان کو اپنے ساتھ موٹر میں لیے باغ عامہ جا رہا تھا کہ چورا ہے پر میرے ایک مولانا قسم کے دوست نے موٹر ٹھہرانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹر روک لی۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا ایں موٹر کیوں روک لی۔ میں نے مولانا کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ کے ایما سے قاضی صاحب نے مجھ سے ان کا نام پوچھا میں نے کہا مولانا عبدالعزیز انہوں نے کہا مولانا عبدالعزیز ہٹ جایئے ہٹ جایئے ہٹ جایئے

ہمارے پروگرام میں یہ بات داخل نہیں تھی کہ ہم اس چورا ہے پر آپ کے لیے موٹر روک دیں گے ۔ جایئے جایئے جایئے اور پھر مجھ سے کہا۔فوراً موٹر سٹارٹ کرو ورنہ میں اتر جاؤں گا میں نے موٹر اسٹارٹ کر دی اور مولانا بے چارے منہ دیکھتے رہ گئے ۔

ایک بار میں ان کے وہاں جھانسی میں ٹھہرا ہوا تھا۔صبح کو انہوں نے مجھ سے پوچھا جوش میاں میرے ساتھ کالج چلو گے کالج کالج کالج ؟ میں نے کہا ضرور چلوں گا انہوں نے ملازم کو پکار کر کہا ناشتہ لاؤ ناشتہ لاؤ ناشتہ۔

جب ناشتہ چن دیا گیا تو ان کے یہاں جو ایک دوسرے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے وہ بھی دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئے ان کے بیٹھتے ہی انہوں نے کہا نہیں نہیں نہیں آپ کا ناشتہ بعد کو آئے گا بعد کو بعد کو بعد کو یہ فقط کالج کالج کالج جانے والوں کا ناشتہ ہے ۔ اور وہ پانی پانی ہو کر دستر خوان سے اٹھ گئے ۔

ایک روز میں ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا اثنائے طعام میں انہوں نے مجھ سے کہا جوش میاں تمہاری یہ برکت ہے کہ آج خالص گھی کا کھانا کھا رہا ہوں ۔ ورنہ چھ مہینے سے شبیرا مجھ کو تیل ملا کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا تھا۔اور جب کھانا ختم ہو گیا تو شبیر نے قہقہہ مار کر مجھ سے کہا پورے چھ مہینے سے اعلیٰ سے اعلیٰ گھی لا لا کر پکوا رہا تھا اور ہر بار قاضی صاحب یہی شکایت کرتے تھے کہ ان کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا ہوں اور آج جب کہ میں نے تیل میں کھانا پکوایا ہے تو قاضی صاحب اس کو خالص گھی کہہ رہے ہیں ۔

ایک بار کچھ ایرانی مذاق کے شکایات سے متاثر ہو کر محکمہ تعلیمات نے ان کو پرنسپلی کے عہدے سے ہٹا کر وائس پرنسپل بنا دیا لیکن تنخواہ وہی پرنسپل والی رکھی ۔ انہوں نے اس خوشی میں کہ وائس پرنسپل بن کر ان کی ذمہ داریاں تو بہ کم ہو گئیں لیکن تنخواہ میں کمی نہیں ہوئی بڑی دھوم سے ہم لوگوں کی دعوت کی کھانا زیادہ تھا اور برتن کم تھے ۔ اور جب ان کے سالے نے کہا پلاؤ کا ہے میں دیں برتن تو باقی نہیں رہے تو انہوں ے کہا

کوئی بات نہیں چار پانچ کموڈ راکھ سے دھلوا کر لے آؤ۔ میں نے کہا گھانس کھا گیا ہے قاضی اب کموڈ میں پلاؤ کھلوائے گا۔ انہوں نے بگڑ کر کہا بس پتا چل گیا کہ تم ہو کیا بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے ہو۔ تم سالے سو فی صدی بورژوا ہو بورژوا ہو' بورژوا ہو' بورژوا ہو۔ اس بات پر تمام مہمانوں نے کہا قاضی صاحب۔ فقط جوش صاحب ہی نہیں ہم سب کے سب بورژوا ہیں بورژوا۔ ہم میں سے کوئی بھی کموڈ میں نہیں کھائے گا انہوں نے کہا جہنم میں جاؤ تم سب بورژوا ہو اور وہ کموڈ میں پلاؤ کھانے لگے۔

لکھنو کا ذکر ہے ایک بار حکیم آشفتہ کی جو شامت آئی تو انہوں نے ایک رفاہ عام کے ایک بہت بڑے جلسے کا قاضی کو صدر بنا دیا۔ اور جب ہال کھچا کھچ بھر گیا تو وہ صدارتی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے شاعری کی ماہیت بیان کی پھر فارسی عربی سنسکرت اور انگریزی شعراء کے کلام پر سرسری سا تبصرہ کیا۔ اور بات جب اردو غزل تک آئی تو انہوں نے کہا پچانوے فیصد غزل گو نہ کسی پر عاشق ہوتے ہیں نہ رندی کے طریقوں سے واقف ہوتے ہیں۔ نہ شراب پیتے ہیں اور نہ بے دین ہی ہوتے ہیں مگر ان سب

ا؎ ان کے سالے کا نام

کی غزلوں کا مدار ہوتا ہے عاشقی رندی' شراب خوری اور کافری پر ان کی تمام شاعری فقط روایتی ہوتی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے سارے غزل گو چوتیے ہوتے ہیں۔ چوتیے چوتیے چوتیے۔ اور دس منٹ کے اندر تمام بھرا ہوا ہال خالی ہو کر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

ان کی ایک انوکھی جنگ سننے سے پیشتر یہ بات ذہن نشین فرما لیجیے کہ وہ اپنے جنسی مسائل کو ایک نہایت مقدس فریضہ انسانی سمجھتے تھے۔ اگر ان کے اس ایرانی مذاق کے

خلاف کوئی ایک کلمہ بھی زبان سے نکلتا یا اس میں استہزاء کا کوئی پہلو پیدا کرتا تھا تو وہ اس کو مداخلت فی الدین سمجھ کر جامے سے باہر ہو جاتے تھے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد اب سنیے کہ شام کا وقت تھا' وہ اپنے لاٹوش روڈ والے مکان کی مہتابی پر میرے ساتھ بیٹھے بادہ خواری کا شغل کر رہے تھے کہ رفیع احمد خاں آ گئے اور چھوٹتے ہی پوچھنے لگے قاضی صاحب اب کبھی انفعالیت کو بھی جی چاہتا ہے کہ نہیں انہوں نے بری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا...... بے شک کبھی کبھی ضرور جی چاہتا ہے کہ اس چیز کو بھی برت کر دیکھوں۔ رفیع نے کہا تو پھر بسم اللہ کیجیے انہوں نے جواب دیا کہ فقط دو چیزیں مانع ہیں ایک تو تکلیف دوسرے سکینڈل (رسوائی) اور جب رفیع نے ان دونوں کا حل پیش کر دیا تو انہوں نے کہا اگر آپ اس کا ذمہ لیتے ہیں تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ ان کی اس آمادگی پر رفیع کا قہقہہ نکل گیا۔ کہہ چکا ہوں کہ ان معاملات میں استہزاء کو قطعی طور پر مداخلت فی الدین سمجھتے تھے۔ اس لیے رفیع کے قہقہے پر وہ جامے سے باہر ہو گئے اور کہا پہلے اپنی......خانم کا چال چلن درست کیجیے پھر مجھ پر ہنسیے گا۔

رفیع پٹھان تھے یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے اور تڑ سے ان کو ماں کی گالی دے دی۔ قاضی نے گالی سنتے ہی اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا غلط درغلط۔ جوش میاں غور کرو انہوں نے مجھ کو گالی دی مجھ کو مطلق غصہ نہیں آیا۔ اس لیے کہ گالی شدت غضب کی ایک مہمل سی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کو میری بات پر غصہ آ گیا اس لیے کہ وہ بات فیکٹ (حقیقت) ہے اور سچی بات پر لوگوں کو غصہ آ جاتا ہے۔

رفیع نے پھر باآواز بلند ان کو ایک موٹی سی گالی دی انہوں نے پھر اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا غلط درغلط جوش میاں مہملیت ان کی طرف ہے اور واقعیت میری طرف اس لیے میں ان کی بات کا برا نہیں مان رہا ہوں۔ اور یہ انگارے کی طرح دہکتے چلے جا رہے ہیں۔ رفیع ان کے اس طرز عمل سے سخت الجھن میں پڑ گئے۔ کہ وہ مجھے حملہ

www.pdfbooksfree.pk

کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ان کی ذہنی کوفت بھانپ کو میں نے ان کو وہاں سے اٹھا کر زبردستی نیچے لایا اور جب ہم دونوں سڑک پر آ گئے تو دیکھا کہ قاضی صاحب اوپر سے جھانک رہے ہیں اور چاندنی رات میں ان کی فرنچ کٹ داڑھی کا عکس زمین پر پڑ رہا ہے۔ابھی ہم دو قدم ہی چلے تھے کہ اوپر سے ان کی آواز آئی خاں صاحب اپنی......خانم کا چال چلن درست کر لیجیے پھر مجھ پر ہنسیے گا۔رفیع نے منہ اٹھا کر کہا اے تیری تو ماں کی......اور انہوں نے کوٹھے سے کہا غلط در غلط......اور جب میں غصہ سے کانپتے رفیع کو گھر پہنچا کر پلٹا تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ جنگ جس کے ایک سرے پر ماں کی گالی تھی اور دوسرے سرے پر غلط در غلط کے نعرے تھے خون خچر کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

قاضی صاحب میں سنجیدگی اور مجلسی تہذیب کی مطلق صلاحیت نہیں تھی اور اس کرہ ارض پر انہوں نے اس طرح زندگی کاٹ دی جس طرح لڑکے بورڈنگ میں رہا کرتے ہیں میرے اس قول کی تصدیق مندرجہ ذیل واقعہ سے حرف بحرف ہو جائے گی۔

ایک بار انہوں نے جبکہ حیدرآباد دکن میں وہ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے مجھ پر فرمائش کی کہ میں ان کو مہاراجہ کشن پرشاد صاحب سے ملا دوں۔میں نے کہا قاضی تم دونوں بُعد مشرقین ہے۔تم اول جلول مطلق العنان اور آزاد رو انسان ہو اور مہاراجہ کا بہر بن مو تہذیب کے آئین و آداب میں گندھا ہوا ہے۔وہ مشرقی وضع داری کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔اس وقت ان کی عمر ست سے متجاوز ہے۔لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود کیا مجلس کہ مجلس میں وہ صوفے سے پیٹھ لگا کر یا پاؤں پاؤں رکھ کر یا ٹوپی اتار کر بیٹھ جائیں۔یہ سنا تو انہوں نے کہا کیا میں کوئی کنجڑا قصائی دھنیا جلاہا ہوں کہ تم مجھے ان سے ملنے کے قابل نہیں سمجھتے ہو میں ہندوستان جنت نشان کا باشندہ ہوں۔افریقہ کا رہنے والا نہیں مشرقی تہذیب تو میرے گھر کی لونڈی ہے تم مچھو ہو تم نے

مجھے سمجھ کیا رکھا ہے میں نے کہا اچھا بھائی نہیں مانتے ہو تو کل ملا دوں گا۔ دوسرے دن مہاراجہ کے دربار کے آداب سلام و اسالیب نشست برخواست سے ان کو بخوبی آگاہ کر کے انہیں مہاراجہ کے پاس لیے گیا۔

مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی انہوں نے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارا۔ تمام دربار میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے دل ہی دل میں کہا وہ مارا۔

مہاراجہ نے پوچھا قاضی صاحب کیا آپ پہلی بار حیدر آباد تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں پہلی جی ہاں بالکل پہلی بار بالکل پہلی بار۔ مہارانہ نے پوچھا دکن کو آپ نے کیسا پایا؟ قاضی نے کہا لا حول و لا قوۃ یہاں کے لوگوں کو اردو نہیں آتی۔ بالکل اردو نہیں آتی ریل سے اترتے ہی تار گھر پر میری نظر پڑی دیکھا کہ اس کے بورڈ پر تاریں لکھا ہوا ہے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ تار مذکر ہے۔ اسمائے مذکر کی جمع اس طور سے بن ہی نہیں سکتی اور پرسوں ایک صاحب جوش میاں سے خان ساماں کو لے کر آنے کا وعدہ کر گئے تھے سو آج تک وہ پلٹ کر نہیں آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے آدمی پرلے درجے کے جھوٹے ہیں جھوٹے جھوٹے جھوٹے ہیں۔

اہل ربار میں یہ سن کر حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور مہاراجہ کے چہرے پر انفعال مچلنے لگا۔ لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیسا جناور پکڑ لائے ہو۔ میں نے آنکھیں جھکا لیں۔

مہاراجہ کی تہذیب دیکھیے کہ ان کے منہ پر ان کے وطن کو اور وہ بھی برسر دربار و علیٰ روس الاشہاد برا بھلا کہا گیا لیکن ہر چند ان کے چہرے پر تو پشیمانی کا رنگ دوڑا مگر زبان سے اف تک نہیں کی۔

قاضی کی اس براں گفتاری کو ضبط کرنے میں دو تین منٹ لگ گئے مہاراجہ کو۔ اور انہوں نے اپنی خوش خلقی کا سہارا لے کر مجھ سے کہا...... جوش صاحب آپ کی زبانی یہ معلوم کر کے کہ قاضی فقط ریاضی داں نہیں شاعر بھی ہیں مجھے اشتیاق پیدا ہو گیا ہے کہ

www.pdfbooksfree.pk

ان کے کلام سے بہرہ اندوز ہوں۔ قاضی نے کہا نہیں نہیں نہیں مجھے اپنا کلام یاد نہیں۔ مطلق مطلق یاد نہیں۔ یہ کہہ کر قاضی نے اپنا سیدھا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا۔ اور بار بار انگلیاں اٹھا اٹھا کر اور جھکا جھکا کر کہنا شروع کیا۔ آپ کچھ سنائیں سنائیں سنائیں۔ آپ کچھ سنائیں۔ ان کی اس لونڈوں کی سی حرکت پر میں عرق عرق ہو کر رہ گیا دل میں سوچا کہ دنیا میں کلام سنانے کی اس طرح بھی فرمائش کی جاتی ہے۔ مگر اللہ ری مہاراجہ کی خوش خلقی اس ادائے فرمائش کو بھی پی گئے۔ اپنی بیاض منگائی کہا کہ میں کس سے بیحد گلو گرفتہ ہوں جوش صاحب آپ کوئی غزل اس بیاض میں سے سنا دیں۔

ہر چند قاضی کی حرکتوں سے میں دریائے شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی موڈ پر قابو پا کر میں نے مہاراجہ کی دو غزلیں قاضی کو سنا دیں۔ انہوں نے اپنی میز پر اپنی ٹوپی پٹک کر کہا میاں جوش بہت غنیمت مہاراج نہ دہلوی نہ لکھنوی لیکن اچھے شعر کہتے ہیں۔ اور وہ بھی ہندو ہو کر ہندو ہو کر قاضی صاحب کے اس ریمارک سے مجھ پر اور پورے دربار پر بجلی سی گر گئی۔ ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا اتنے میں سونے پر سہاگا وہ ٹوپی اتار کر پھینک ہی چکے تھے اب انہوں نے پاؤں پر پاؤں رکھ لیا۔ اور جب میں نے آنکھ بچا کر ان کو ٹھوکا دیا تو وہ حسب عادم قدیم اوں اوں اوں اوں کرنے لگے۔ اب وہاں بیٹھا رہنا میرے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے مہاراجہ سے جھپے ہوئے چہرے جھکی ہوئی آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز میں رخصت کی اجازت طلب کی اور رندھی ہوئی آواز میں ڈوبتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ نیچے آ گیا۔ اور آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے اپنی موٹر کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس پر دھواں سا چھایا ہوا ہے۔ میں بصد ہزار دشواری موتر کا دروازہ کھول کر ایک کراہ کے ساتھ گدی پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ابھی گاڑی سٹارٹ کروں ورنہ کہیں ٹکر کرا دوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک چوب دار ہانپتا ہوا

آیا اور کہا سرکار یاد فرما رہے ہیں یہ سنتے ہی جی سن سے ہو کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مہاراجہ کو کس طرح منہ دکھاؤں گا۔ سیڑھیوں پر من من بھر کے قدموں سے چڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ اپنے کونہیں پانچ ہاتھیوں کو زینے پر چڑھا رہا ہوں۔

جھکے سر اور بوجھل پپوٹوں کے ساتھ جب مہاراجہ کے پاس گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا کل رات آپ اور قاضی صاحب یہیں ماحضر تناول فرمائیں گے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا مہاراج مجھ کو آپ کی اس سنت جاریہ کا علم ہے۔ کہ جب کوئی نیازمند اپنے مہمان کو آپ کی خدمت میں لاتا ہے تو آپ اس کی میزبانی فرماتے ہیں...... لیکن میری یہ استدعا ہے...... میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ مہاراجہ نے جلدی سے میری بات کاٹ کر فرمایا جوش صاحب آپ ہرگز شرمندہ نہ ہوں میں قاضی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں اس لیے کہ اس قیامت کا بے لوث نڈر بے جھک اور صاف گو انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جن کو تہذیب ریاکار بنانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ مہاراجہ کی ان باتوں سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ان کی دعوت منظور کر کے گھر آ گیا۔

گھر آ کر میں نے قاضی سے شکایت کی۔ وہ الٹے مجھ پر برس پڑے اور کہنے لگے کہ اب تم نواب فقیر محمد خاں بہادر کے پوتے نہیں جملی پیادے بن کر رہ گئے ہوں۔ تمہاری رگ و پے میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔ میں نے کہا قاضی اگر تہذیب کی نگہ داری غلامی ہے تو میں غلام میری سات پشتیں غلام۔

انہوں نے کہا اگر تم مناسب نہ سمجھو تو میں کل مہاراجہ کے پاس نہ جاؤں۔ میں نے کہا جانا تو پڑے گا لیکن یہ وعدہ کرو کہ کل شروع سے آخر تک خاموش رہو گے انہوں نے کہا بہت اچھا آپ کی محبت میں اسے بھی گوارا کر لیں گے۔ اور حضرت چپ شاہ قلندر چپ شاہ قلندر بنے بیٹھے رہیں گے۔

دوسرے دن جب ہم مہاراجہ کا زینہ طے کر رہے تھے تو انہوں نے کہا سنتا ہوں

www.pdfbooksfree.pk

ارباب دکن چپاتی نہیں کھاتے چاول کھاتے ہیں میں نے کہا بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے' لیکن شاندار دعوتوں میں چپاتیاں بھی ہوتی ہیں۔ اگر چپاتیاں نہ ہوں تو بھیا اعتراض نہ کر بیٹھنا۔ انہوں نے کہا ہم تو چپ شاہ قلندر بنے رہنے کا وعدہ کر کے آئے ہیں۔

جب ہم کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو پلیٹیں گردش کرنے لگیں۔ اور چپاتیاں بھی قاب میں لا کر سامنے رکھ دی گئیں۔ چپاتیوں کو دیکھتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا ارے چپاتیاں آ گئیں میں نے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ چپ ہو گئے۔

اتنے میں کوفتوں کی ڈش آ گئی انہوں نے گن کر پانچ کوفتے اپنی پلیٹ میں رکھ لیے۔ کوفتہ چکھ کر خوش ہو گئے اور یہ کہہ کر کہ جوش میاں چکھ کر دیکھو کس مزے کا کوفتہ ہے۔ ایک کوفتہ میری جانب لڑھکا دیا۔ وہ سفید میز پوش پر ایک پیلی سی لکیر ڈالتا میرے ہاتھ سے آ کر ٹکرا گیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا گویا مجھ پر بم پھٹ پڑا ہے۔

جب کھانا ختم ہو گیا تو ایسا لگا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانا مجھ کو کھا کر رخصت ہو گیا ہے۔

اب ہم سب رقص و سرود کے جگمگاتے کمرے میں آ گئے تمام حاضرین مہاراجہ سمیت دوزانو بیٹھ گئے۔ میں نے کہا قاضی دوزانو بیٹھنا ہو گا۔ انہوں نے بڑے اکراہ کے ساتھ کہا تمہاری محبت میں یہ بھی بھگت لیں گے۔ اب گانا شروع ہو گیا اور تانیں ہوا میں بل کھانے لگیں...... تھوڑی دیر میں قاضی نے میرے کان میں کہا دم نکلا جا رہا ہے دوزانو بیٹھنے سے۔ میں نے کہا برآمدے کے صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ قاضی نے زور سے کہا وہاں سے رنڈی نظر نہیں آئے گی۔ تمام محفل میں یہ فقرا گونج اٹھا اور وہ بڑے اطمینان سے پالتھی مار کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس حرکت پر لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں۔ میں نے آنکھیں جھپکا لیں انہیں ٹھوکا دیا دوزانو بیٹھ جائیں مگر وہ حسب عادت پھر اوں اوں اوں اوں کرنے لگے۔

گانے والیوں میں ایک برس پندرہ یا سولہ کا سن والی ایسی حسین لونڈیا تھی کہ میرا دل اس پرلہلوٹ ہوکر رہ گیا تھا اور آخر کار اس کے دل کو میں نے جیت لیا تھا۔ کیوں کہ وہ صیاد تو کسی صید پرتو سن ڈالےصید جب خود ہی چلے آتے ہوں گردن ڈالے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ سارنگی کی رؤں رؤں نے ان کی اوں اوں جذب کر لی۔

اب اسی برس پندرہ یا سولہ کا سن والی طوائف کا مجرا شروع ہوا۔ اللہ نے اس کے حسن کے ساتھ گلا بھی بہت اچھا دیا تھا۔ اس نے بحرطویل میں خود مہاراجہ کی ایک غزل چھیڑ دی۔ اس نازنین کے گلے کی چاٹ پھرت بحر کے پیچ وخم اور سازوں ی ہم آہنگ نے وہ طلسمی عالم پیدا کر دیا کہ لوگ سرشار ہو گئے اور مہاراجہ نے اپنی غزل کا پورا رس پینے کے واسطے آنکھیں بند کر لیں اور جھومنے لگے۔

یہ جادو کا سماں بندھا ہوا تھا کہ قاضی نے اپنے گھٹنے پرتال دیتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ میں نے کہا مہاراجہ کی یہ سنتے ہی قاضی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے سبحان اللہ کا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر کہ نظام دکن تشریف لائے ہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب قاضی نے دوبارہ سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا تو مہاراجہ یہ بات محسوس کر کے کہ وہ نظام کے بجائے قاضی کے روبرو ہات جوڑے کھرے ہیں جھینپ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں!۔

اور جب گھر آ کر میں نے کہا کیوں بے قاضی آخر کار مہاراجہ کو ہاتھ جروا کرتو نے دم لیا تو وہ اپنی داڑھی کھجانے گے۔

اب ان سے میری آخری ملاقات کا حال بھی سن لیجیے۔۔۔۔۔۔سنہ ۱۹۵۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ میں رئیس احمد اور اپنے چچا زاد بھائی مصطفےٰ علی خاں کے ساتھ لکھنو کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور کھاپی کر بستر پر دراز ہو چکا تھا کہ برآمدے میں ہوٹل کے

www.pdfbooksfree.pk

بوا ئے کی آواز آئی صاحب وہ سو چکے ہیں دروازہ اب نہیں کھلے گا۔ اور اس کے بعد یہ آواز آئی کہ نہیں نہیں نہیں ہم تو ابھی ابھی ملیں گے تو میں نے کہا مصطفےٰ علی دروازہ کھول دو قاضی آئے ہیں انہوں نے دروازہ کھول دیا تو کیا

لے مہاراجہ کو یہ دھوکہ اس لیے ہوا کہ نظام کے علاوہ ان کی محفل میں کوئی زور سے بولتا نہیں تھا اور نظام ہمیشہ بہت بلند آواز میں باتیں کیا کرتے تھے۔

دیکھتا ہوں کہ چار گردے کی داڑھیوں والے دست بستہ اور سیاہی مائل احمقوں کے جلو میں کوئی سجادہ نشیں صاحب میری چارپائی کی طرف بڑھے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا رئیس احمد دوسری لائٹ بھی کھول دو۔ دوسری لائٹ بھی کھل گئی تو یہ سماں دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ قاضی صاحب چوگوشیا ٹوپی پہنے اور عمامہ باندھے میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ میں اپنے بستر پر اچھل کر بیٹھ گیا۔ اور ارے قاضی ار اس ہئیت میں کہہ کر میں نے مصطفےٰ علی کو آواز دی قاضی درویش ہو گیا ہے اسے چوچنچ دکھاؤ اور جب انہوں نے کھڑے ہو کر قاضی کو چوچنچ دکھائی تو قاضی صاحب ارے یہ کیا بیہودگی یہ کیا یہ کیا یہ کیا بیہودگی کہنے لگے۔ قاضی کی یہ گت بنتے دیکھی تو ان کے چاروں خفیف الوجہ معتقدین بھاگ کھڑے ہوئے اور اس قدر زور سے کہ لکڑی کا زینہ ان سراسیمہ و پریشان مفرورین کے بھدے قدموں کی دھمک سے بجنے لگا

جب معتقدین بھاگ گئے تو میری چارپائی پر بیٹھ کر انہوں نے کہا میں غلام علی میاں کا مرید ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا ارے دیوانے کیسی پیری اور کیسی مریدی پڑھا لکھا آدمی ہو کر اس چوتیا چکر میں پڑ گیا ہے۔ انہوں نے کہا تم کیا جانو ہمارے دل کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ بالکل بالکل بالکل کل رات کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے آنا۔۔

دوسرے دن رئیس و مصطفےٰ کو لے کر ان کی جائے قیام پر پہنچا دیکھا کہ جلاہوں کی

www.pdfbooksfree.pk

سی شکل کے دس بارہ گھامڑ ان کے سامنے دو زانو بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قاضی نے ان کو اٹھا دیا۔ ان کے قریب گیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کے داہنے طرف شراب کی لانبی سی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ اور بائیں طرف ایک چھریرا سا لونڈا بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیوں قاضی اس درویشی میں بھی۔ انہوں نے کہا تم ارباب ظاہر ان ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ہم کو میاں (پیر) یہ نکتہ سمجھا چکے ہیں کہ بحر معرفت اس قدر زخار ہے کہ ایک بوتل اور ایک لونڈا اس کو ناپاک نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا۔ ناپاک نہیں کر سکتا۔ یا حق یا حق یا حق۔



حکیم صاحب عالم

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا...... لکھنو کے حاذق و ممتاز طبیب عربی و فارسی کے منتہی مذہبی قصائد کے عدیم النظر شاعر یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست مملکت شرافت کے تاجدار' اقلیم خلوص کے شہر یار اور کاروان زہد و اتقا کے سالار صاحب عالم...... کیا بتاؤں کس قدر خوش رو خوش وضع' خوش طبع' خوش فکر' خوش اخلاق' خوش پوشاک' خوش گفتار' خوش تبسم خوش اوقات' خوش مدارات' خوش میز بان اور خوش مطبخ تھے۔

ان کا بوٹا سا قد تھا۔ چھوٹے چھوٹے ملائم ہاتھ تھے گورا گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی تھی۔ لکھنو میں ان کے تقوے کی اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ بڑے سے بڑے رند کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کی محفل میں پی کر جائے یا ان کے سامنے خلاف شرع زبان ہلائے لیکن اس قدر زبردست تقشّف کے باوجود مجھ رند نامہ سیاہ کے دوست' اور دوست بھی کیسے کہ میرے پسینے پر خون چھڑ کنے والے دوست تھے اور میرا ان کا یارانہ تقشّف اور تر دامنی کا ایک ایسا عجیب سنگم تھا کہ جو دیکھتا تھا انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور جب کہ وہ میری صحبت ہائے شبانہ میں بھی شریک ہونے لگے اور میری بے پایاں محبت کے طفیل انہوں نے میرے شرکاء بزم کو بھی اپنے سامنے پینے کی اجازت دے دی تو لکھنو میں چرچے ہونے لگے کہ حکیم صاحب عالم کا سا متقی بھی مے خوار بن گیا ہے۔ اور جب اڑتے اڑتے یہ خبر لکھنو کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین صاحب قبلہ تک پہنچی تو انہوں نے صاحب عالم کو بلا کر یہ سمجھایا کہ وہ میری راتوں کی صحبت میں شریک ہونا ترک کر دیں۔ لیکن انہوں نے قبلہ و کعبہ کی بات نہیں مانی اور برابر میری صحبتوں میں شریک ہوتے رہے' ان کو میری شاعری سے عشق تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر بدنام ہو جانا اس امر سے بمراحل بہتر ہے کہ لوگ مجھ کو خاصان خدا میں شمار کرنے لگیں۔

خلق می گوید کہ خرد بت پرستی می کند

www.pdfbooksfree.pk

اے ارے می کنم با خلق و عالم کارنیست

وہ اس بلا کے نکتہ سنج تھے کہ اچھا شعر سن کر جھومنے اور سر دھننے لگتے تھے۔ اور ایک بار تو میری ایک نظم سن کر ان کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ انتہائی مہذب ہونے کے باوجود جست کر کے میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور میرا گلا دبا کر چیخنے لگے تھے کہ آج تجھ کو مار ڈالوں گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میری ملحدانہ نظموں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور ان کی پیروڈی لکھ کر خود مجھ کو سنایا کرتے تھے اور میں ان کی داد دیا کرتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے کہا حکیم صاحب پیروڈی کی جو نظمیں آپ مجھے سناتے ہیں ان میں بڑی جان ہوتی ہے۔ اگر آپ اسی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری کی طرف بھی مائل ہو جائیں تو ڈنکے پٹ جائیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا بھائی میں غزل گوئی تو کر نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میری زندگی میں اس قسم کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آئمہ طاہرین کی شان میں قصیدے کہنا شروع کر دوں...... چناں چہ انہوں نے قصیدے کہنا شروع کر دیے اور ایسے ایسے بے مثال قصیدے لکھے[1] کہ قاآنی سے ٹکر لینے لگے۔

وہ کھانا بھی بہت اچھا کھاتے اور کھلاتے تھے نواب حامد علی خاں والی رام پور کے کھانے کی یوپی بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی میں نواب صاحب کے وہاں بھی متعدد بار

---

[1] افسوس کہ وہ نادر قصیدے ان کے ان بیٹوں کے پاس ہیں جن کو علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ انہیں چھپوا دو۔ وعدہ تو کر لیتے ہیں کہ چچا ضرور چھپوا دیں گے۔ مگر مجھے ایفائے وعدہ کی کوئی امید نہیں۔ اور افسوس کہ وہ متاع بے بہا کیڑوں کی غذا بن جائے گی۔

---

www.pdfbooksfree.pk

کھانا کھا چکا تھا اس بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب کے مطبخ میں جو کھانا پکتا تھا ااس کی لذت رام پور کے کھانوں سے کہیں زیادہ تھی۔

ان کا مطب تھا نخاس میں چڑیا بازار کے قریب جہاں کسی زمانے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں رہتا تھا۔ مطب کی چھت پر ایک چوکور بڑا سا ہال' ہال کے پہلو میں ایک کمرہ مع غسل خانہ' اور چورا سا آنگن تھا۔ میں جب دہلی سے آتا تو کبھی کبھی ان کے اوپر کے کمرے میں ٹھہرا کرتا تھا شام ہوتے ہی رات کی محفل جما کرتی تھی۔ جس میں میرزا جعفر حسین ایڈووکیٹ مولانا ثاقب' سید غلام علی' علی عباس حسینی' مولانا اختر علی تلہری سید اعظم حسین' سابق مدیر سرفراز سید احتشام حسین نواب جعفر علی خاں' اثر' مجاز' مخمور' سراج' قدیر' احسن طباطبائی' میرزا یگانہ چنگیزی اور صدیق حسن خاں (ائی سی ایس) وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے اور آدھی رات تک شاعری ہوا کرتی تھی...... ہائے وہ صحبتیں جواب خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب ان کی یاد آتی ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ایک بار دہلی سے لکھنوا آیا تو ان کے وہاں نہیں ٹھہرا ایک ہوٹل میں قیام کیا اور اوبدا کر انہیں اپنے آنے کی خبر بھی نہیں کی تاکہ ان کے ہاں اچانک پہنچ کر وہ کھیل کھیلو ں جس کو دہلی سے ٹھان کر آیا تھا۔

شام ہوتے ہی رئیس احمد سے ملنے ہن ا کے وہاں پہنچا۔ اور حکیم صاحب سے جو کھیل کھیلنے والا تھا اس کا طریقہ ان کو بتا دیا...... رئیس نے تانگہ منگایا اس پر چادر باندھی مجھے اندر بٹھایا خود کوچ بان کے قریب بیٹھے تانگہ حکیم صاحب کے مطب کے پھاٹک پر روکا۔ اندر گئے حکیم صاحب سے کہا ملیح آباد کی ایک خاتون کو کئی روز سے بخار آ رہا ہے میں انہیں تانگے میں لایا ہوں آپ کو تکلیف نہ ہو تو مہربانی فرما کر ان کی نبض دیکھ لیں حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے واسطے پردے میں ہاتھ ڈالا اور میں نے ان کے ہاتھ میں...... تھما دیا وہ اچھل گئے اور ارے کہہ کر اس زور سے ہاتھ کھینچا گویا ان کا ہاتھ

بجلی کے برہنہ تار سے مس ہو گیا ہے۔ دو تین سیکنڈ

؎ رئیس کی معشوقہ جواب ملیح آباد میں انہیں کے ساتھ رہتی ہے۔

تک تو وہ دنگ ہو کر رئیس کا منہ تکتے رہے اور پھر انہوں نے قہقہہ مار کر کہا تانگے سے اتر آیئے جوش بیگم میری جان میں تانگے سے ہنستا ہوا کودپڑا انہوں نے بم مہاراج کہہ کر مجھ کو گلے لگا لیا اور اس قدر ہنسے کہ انسو نکل آئے لیکن اس تمام مسرت میں انہوں نے اپنا وہ ہاتھ جس سے نبض دیکھی تھی اپنے جسم سے دور رکھا اور مطب آ کر جب اس کو تین بار خوب اچھی طرح صابون سے دھولیا تو اس گیلے ہاتھ سے میرا منہ چھو کر اسے چوم لیا۔

ہائے کل جس بات پر اس قدر ہنستے تھے آج اس پر دل تھام کر رو رہے ہیں...... دنیا کی یہی ریت ہے میری مہاجرت کے سال بھر بعد وہ بھی پاکستان آ گئے تھے اور ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آنے سے معذور تھے۔ میں متعدد احباب کے ساتھ ہر ہفتے ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور چار پانچ گھنٹے کے لیے شاعری و لطیفہ گوئی کی محفل جم جاتی تھی اور لکھنو کا سماں بندھ جایا کرتا تھا۔

ایک روز حسب معمول ہم سب لوگ یعنی منور عباس علی حسنین زیبا مرحوم...... سالک لکھنوی، میرزا عالم گیر قدر، قیصر مرحوم میرزا ابو جعفر، اور نواب ابوالحسن بلگرامی مرحوم ان کے وہاں پہنچے۔ وہ پھولوں کا سا شگفتہ چہرہ لیے باہر آئے۔ میں نے سینے سے لگا کر ان کا ماتھا اور انہوں نے میرا منہ چوم لیا۔ اور کہا کہ آج اپنے راوی ؎ سے ایسا قصیدہ سنواؤں گا کہ آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ میں نے کہا میرے پاؤں زمین پر رہتے ہی کب ہیں میں تو عرش بریں پر قدم جمائے رہتا ہوں وہ ہنسنے لگے۔

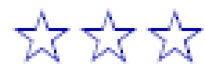
www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں ان کے دونوں چھوٹے بھائی محمد نواب اور لڈن صاحب بھی اپنی بیگموں سمیت آ گئے۔ یعنی پاکستان میں ان کے جس قدر بھی چہیتے اور قرابت دار تھے۔ وہ اتفاق سے سب کے سب یکجا ہو گئے اور انہوں نے سب کو جی بھر کے دیکھ لیا...... ابھی چائے آ ہی رہی تھی کہ ان کو کھانسی آنے لگی۔ ان کے ڈاکٹر بیٹے نے کہا گولی حاضر کروں انہوں نے کہا شاعری کے بعد...... اور جب تھوڑی ہی دیر میں کھانسی بڑھ کر اچھو کی شکل

۱؎ ان کے عزیزوں میں ایک خوش گلو صاحب زادے ان کا کلام سنایا کرتے تھے۔

اختیار کر گئی تو ان کی سانس گلے میں رکنے لگی...... اور پل بھر میں روح پرواز کر گئی۔ ساحب عالم میں مر جاتا تم نہ مرتے ...... تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ ارے حیرت کہ تم مر گئے اور میں ابھی تک جی رہا ہوں

پس از معشوق جینا عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے



رفیع احمد خاں

میرے آبائے اولیں کے چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان تمام دنیا کے فحش نگاروں کے سلطان ۔علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم اے متعدد کالجوں کے پروفیسر' آخری دور میں لکھنو کوآپریٹو سوسائٹی کے سیکرٹری.....متوسط القامت شگفتہ پیشانی' تاش استاد' سدا بشاش چوک رسیا پدر معتوب شہر محبوب' جوانی میں امرو پرستار زوال جوانی میں طوائف گرفتار ۔مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے۔

ان کا امکان میرزا عالم گیر قدر کے مکان کے عین سامنے امین آباد سے بہت قریب اس سڑک پر تھا جس کو اب کوئن روڈ کہا جاتا ہے۔ میں اپنے زمانہ تعلیم میں ان کے مکان کے بالکل قریب راجہ ابوجعفر صاحب کی کوٹھی جعفر منزل میں رہتا تھا۔اس لیے میرزا عالم گیر قدر وہ اور میں ایک ایسا تگڈم بن گئے تھے جس کو ہمیشہ یک جاپایا جاتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کہ ہم لوگ یوسف مرزا ابرار اور شوکت تھانوی کو ہم راہ لے کر شام ہوتے ہی لکھنو کی خاص خاص جوانی مدار پر اسرار وثمر دار گلیوں میں بسلسلہ تلاش امعاش[1] گھوما کرتے تھے۔اور دن کے وقت ہمارے جاں نثار کارندے اس بات کی ٹوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری رچائی ہے۔

---

[1] یہ ہماری چنڈال چوکڑی کی خاص اصطلاح تھی جس کے معنی تھے جستجوئے لالہ رخان۔

ہم ان بوڑھوں کی فہرست تیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف ومشترک احباب کی وساطت سے ان بوڑھوں کے پاس جاتے اور ان پر اپنی پارسائی ودین داری کے سکے بٹھاتے تھے۔ان کی نظروں میں سماتے تھے ان سے پینگ بڑھاتے اور اس طرح آخر

کاران کی بے آب و گیاہ ڈھنوں تک آتے جاتے تھے۔

ان کے باپ کا نام تھا شفیع احمد خاں ان کی عقل آواز اور گردن بہت موٹی تھی۔ داڑھی بے حد ڈراؤنی تھی جب وہ صبح اپنی بھیانک آواز میں تلاوت کرتے تھے تو میرے کمرے تک اس کی خوف ناک آواز کی گونج آیا کرتی تھی اور میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا

گر تو قرآں بایں نمط خوانی
ببرد رونق مسلمانی

خدا کی قسم ان کے گلے سے الفاظ اس طرح ٹھوکر مار کر نکلتے تھے گویا وہ ڈوبتے ستاروں کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہوں......ان کو رفیع سے بے حد نفرت تھی۔ میں نے آج تک دنیا کے کسی باپ کو اس قدر نامہربان نہیں دیکھا۔

رفیع نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ بیٹا خراب نکل آئے تو اس کو ناخلف کہتے ہیں شبیر یہ تو بتاؤ کہ باپ خراب نکل جائے تو اسے کیا کہیں گے۔ اور میں نے کہا تھا ناسلف۔ جب میری پہلی تصنیف روح ادب نکلی تھی اس پر رفیع نے مقدمہ لکھا تھا تو وہ گل رعنا کے مصنف حکیم عبدالحیٔ صاحب کے پاس اس کو لے کر گئے تھے اور کہا تھا یہ دیکھیے ایک بدمعاش کی کتاب پر دوسرے بدمعاش نے مقدمہ لکھا ہے۔ چور کا بھائی گرہ کٹ......اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں ہم سے نفرت کرنا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ وہ بے حد کھڑ ننک ملا تھے اور ہم سب لوگ بے حد آزادہ رو۔ اور ان کے نقطہ نظر سے پرلے درجے کے اوباش تھے۔

ایک بار رفیع احمد خاں کے ایک رشتے دار کے چچا نے ان سے کہا دس بارہ برس ہو چکے ہیں تمہاری شادی کو اب تک کوئی بچہ نہیں ہوا ہے شاید تمہاری بیوی

---

[1] دیکھیے میری نظم یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

بانجھ ہے تم دوسری شادی کرلو نہیں تو نسل منقطع ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے جواب میں انہوں نے چچا سے کہا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹھے پر جا کر وہاں پر اس کا جواب دے دوں۔ چچا نے کہا کوٹھے سے جواب کا کیا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ پٹنے سے بچ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کوٹھے پر دور کر چڑھ گئے اور وہاں سے پکار کر کہا چچا جان میں مر جاؤں گا لیکن بچے کا باپ نہیں بنوں گا چچا آپ کو معلوم ہے کہ ہماری نسل کس قدر شقی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اشقیاء کی یہ نسل ہمیشہ کے واسطے منقطع ہو کر رہ جائے چچا نے کہا تو برا مردود ہے۔ انہوں نے کہا کہ تو کیا اپنے سے بھی ایک برا مردود اور پیدا کر دوں؟

اور ایک بار خدا کے وجود پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رفیع احمد خاں بڑے سکون سے سن رہے تھے۔ لیکن وہ بحث جب اس جانب مڑی کہ خدا کے وجود کے سینکڑوں مسکت دلائل تو ضرور موجود ہیں لیکن شافی و منطقی دلیل ایک بھی نہیں تو انہوں نے میز پر گھونسا مار کر کہا...... شٹ اپ (خاموش) میرے پاس وجود باری کی شافی و منطقی دلیل نہ سہی لیکن ایک دلیل ایسی ہے جو منکرین و متشککین کی کھوپڑیاں توڑ کے رکھ سکتی ہے۔ اور اس دلیل کا نام ہے دلیل ڈنڈا وی مجاز نے کہا کہ تو کیا ہمارے سروں پر ڈنڈا مار کر آپ خدا کے وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں؟...... رفیع نے جواب دیا نہیں ایسا نہیں کروں گا بلکہ آپ حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ اپ تمام حضرات اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ خاکسار نہایت عمدہ سمجھ بوجھ کا آدمی ہے صحت کے اعتبار سے بھی ہزاروں سے بہتر ہے سورت بھی شریفوں کی سی ہے مطالعہ بھی خوب اچھا ہے اور ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ یہ فدوی ایم اے اور گولڈ میڈلسٹ بھی ہے اور اسی کے دوش بدوش فدوی کی لیاقت کو تسلیم کر کے اسے متعدد کالجوں میں پروفیسری کے عہدے بھی بارہا دیے جا چکے ہیں لیکن تھوڑے ہی دن بعد اس ناچیز کو کالج سے

نکال دیا جاتا ہے۔ اور ان تمام حالات پر نگاہ کر کے میں آپ تمام حضرت سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر خدا موجود نہیں تو پھر یہ ڈنڈا کس کا ہے جو رفیع احمد خاں کی...... میں گھسا ہوا ہے؟ اور یہ ناچیز رفیع احمد خاں جس صوبے میں بھی جاتا ہے وہ غیبی ڈنڈا اس کے گھسا ہوا قطع منازل کرتا رہتا ہے جس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ وہ ہے اور ضرور ہے اور لگے ہاتھوں یہ بات بھی پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ صرف موجود ہی نہیں بلکہ حاضر و ناظر بھی ہے...... اب بولو ملعونو!

وہ فحش نگاروں کے بادشاہ تھے یاروں نے جسم انسانی کے اعضائے عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے۔ ان کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے سے یا پوشیدہ اعضا کے نام نظم کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت وصلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے انہوں نے فحش نگاری کو ادب عالی کا جو مقا بخشا تھا اور اس میں جو شعریت پیدا کی تھی وہ شیخ سعدی اور ملا عبید زاکانی کے درجے کی چیز تھی۔ اور بعض اوقات تو وہ ان دونوں سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔ افسوس کہ میری قوم میں ابھی تک مردواپن نہیں پیدا ہو رہا ہے ورنہ میں ان فحش اشعار نقل کر کے اپنے دعوے کو مدلل کر لیتا۔

ان کی رگ رگ میں ایسی شوخی بھری ہوئی تھی کہ وہ ایک لمحے بھی سنجیدگی کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ایک رات کو لکھنو کی گلیوں میں انہوں نے ایک جلوس خرام و دشنام نکالا تھا۔ اس کا ماجرا بھی سن لیجیے...... ایک دن رات کے دو بجے گانا سن کر جب ہم سب چوک سے نکلے تو انہوں نے کہا میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ چوک سے امین آباد تک ملنے والوں کے جتنے بھی مکان پڑیں گے۔ تانگے روک روک کر اور آوازیں بدل بدل کر ان تمام مکان والوں سے مذاق کروں گا اور گالیاں دوں گا میں نے کہا رفیع یہ بات آداب شرفا کے خلاف ہے انہوں نے کہا ایسی تیسی آداب شرفا کی...... سب سے پہلے میرزا محمد ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادقا کا مکان پڑا ان کے مکان کے نیچے!

تانگے روک دیے گئے۔ میں نے دیکھا کہ رفیع ان کو گالی نہ دینا یہ میرے استاد ہیں انہوں نے کہا کہ اگر تم چپ نہیں رہو گے تو میں تمہارا نام لے کر ان کو گالی دوں گا۔ میں

1میرزا صاحب بالا خانے پر رہتے تھے۔

خاموش ہو گیا۔ انہوں نے تانگے سے اتر کر آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ میرزا صاحب میرزا صاحب جناب میرزا صاحب جناب میرزا صاحب جناب میرزا محمد ہادی رسوا صاحب قبلہ دس پانچ ہانکوں کے بعد میرزا ساحب کی باریک سی آواز آئی کون صاحب ہیں؟ ان کی آواز سنتے ہی رفیع احمد نے کہا میں ہوں امراؤ جان ادا کا دھگڑا1 میرزا صاحب کی آواز آئی اائیں آئیں۔ انہوں ے کہا جناب میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیڈلی کا...... چھری سے کاٹ لیا ہے۔ اور اسے گرڑھے2 کی سرائے میں پھینک دیا ہے۔ فل ڈپازٹ کے طور پر جمع کرا دیا ہے۔ یہ سنتے ہی میرزا صاحب نے اپنے ملازم سے پکار کر کہا رمضانی ذرا چھجے سے جھانک کر تو دیکھ یہ کون بدمعاش بےہودگی کر رہا ہے' اتنے میں ہمارے تانگے حرکت میں آ گئے اور رمضانی کی آواز آئی حضور وہ تو تانگوں میں بھاگ کھڑے ہوئے پیر بخارا کے شہدے ہوں گے سرکار۔ اس کے بعد دو تین اور مقامات پر گالیاں دیتا اور مذاق کرتا۔ یہ فحاشی کا جلوس جب امین آباد پہنچا تو پرنس ہوٹل کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے ہانک لگائی جناب تصدق حسین صاحب جناب قرار صاحب قرار صاحب جناب تصدق حسین صاحب قرار اوپر سے آواز آئی کون پکار رہا ہے انہو نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کا لغت قرار اللغات اپنے تمام الفاظ کی پلٹن لے کر آپ کی والدہ کی...... میں داخل ہو گیا ہے۔ آواز آئی لاحول ولاقوۃ یہ کون بیہودہ آدمی ہے۔ بدتمیز کہیں کا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب سید جالب دہلوی مدیر ہم دم کے مکان پر جا کر انہوں نے پکارا جناب سید

جالب صاحب دہلوی..... جالب صاحب جالب صاحب ارے جناب جالب صاحب تھوڑی دیر میں ایک انتہائی جی ہوئی آواز آئی کون ہے؟ کون ہے؟ انہوں نے کہا جناب عالی در دولت پر اس قدر عرض کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اے حضرت جالب صاحب دہلوی مدظلہ آپ کی تو ماں کا..... اندر سے آواز آئی اوف اوف اوف اور ہم گھر جا کر سو رہے۔

لکھنو کی ایک رنڈیوں کی سرائے۔

صبح جب رفیع احمد خاں ہم لوگوں کو ساتھ لے کر ایک نہایت شریف و مہذب انسان کے مانند اپنے دشنام خوردگان شبانہ کے پاس ایک ایک کر کے پہنچے۔ کسی نے پچھلی رات کے واقعے کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ جب ہم سید جالب کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا کہ جوش صاحب لکھنو کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں اب اس کی یہ گت بن چکی ہے کہ کل رات تین چار بجے ایک شخص نے زور زور سے مجھے آواز دی اور جب میں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ کون ہے تو وہ گنڈا میری والدہ معظمہ کی شان میں گستاخی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ جالب صاحب کا یہ فقرہ سن کر رفیع کو ہنسی آ گئی کہ اس کے ضبط کرنے میں ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھیں ابل پڑیں ان کی ٹھڈی کانپنے لگی اور ان کے دونوں گال پر تولنے والی چڑیا کے مانند پھر پھرانے لگے۔



www.pdfbooksfree.pk

پرنس میرزا عالم گیر قدر

خاندان تیمور کی یادگار' لکھنو کے باشندہ باوقار کچھ اوپر چالیس سال سے ضیع النفس میں گرفتار پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار' زود اشتعال وشرارہ بار میرے لڑکپن کے یار' موسیقی اور مزامیر کے ماہر اسرار' کھانا پکانے میں یکتائے روزگار سخن سنجوں کے شہریار اور معلومات عامہ کے پروردگار' سانولے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کے پوست استخوان اور کاغذی بدن کے آدمی ان کے دادا جان کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ اللہ اللہ ان کا جاہ وجلال وہ صبح شام ایک معین وقت پر کوٹھے سے بالائی منزل سے اتر کر ایسے وقار کے ساتھ حویلی میں جاتے تھے کہ مجھے اپنے دادا کی سلطان خرامی یاد آجاتی تھی...... اوران کو اس قدر اعزاز حاصل تھا کہ گورنر جنرل تک ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

کوئن روڈ پر رفیع احمد خاں کے مکان کے عین بالمقابل ان کی عالی شان حویلی[1] حویلی کے پہلو میں ایک دومنزلہ کوٹھی تھی اور پشت پر بڑا سا پائیں باغ تھا اور یہ جو امین الدولہ پارک کے آخری گوشے میں سنٹرل ہوٹل کی دومنزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے

---

[1] افسوس کہ ان کے بڑے بھائی میرزا جہاں گیر قدر نے وہ جائے داد جس کی قیمت اس دور ارزانی میں پانچ چھ لاکھ سے کم نہیں تھی اپنی ڈپٹی کلکٹری کے شہرہ آفاق دور عیاشی میں اونے پونے بیچ کر خاندانی اثار امارت کو برباد کر ڈالا تھا۔ اس حویلی میں رہنے والے میرزا عالم گیر قدر اب ڈرگ کالونی کے ایک چھوٹے سے بھنچے ہوئے مکان میں تنہا رہتے ہیں ہائے کیا پلٹا کھایا ہے روزگار نے ہائے کس قدر ہر آن بشاش رہنے والے چہرے اب مستقل طور پر اداس رہنے لگے ہیں۔

وہ انہیں کے پائیں باغ کو قطع کرکے تعمیر کی گئی ہے۔ وہ اس قدر سخن سنج ہیں کہ شعر سنتے ہی اس کے تمام محاسن ومعائب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو شعر میں ایسے معنی پیدا کر دیتے ہیں کہ شاعر دنگ ہو کر رہ جاتا ہے کہ ارے یہ معنی کہاں سے نکل

آئے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانا پکانے میں بھی ایسی دست گاہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رکاب داران کے سامنے کان پکڑتے ہیں کشمیری چائے ایسی بناتے ہیں کہ باشندگان کشمیر حیران رہ جائے ہیں۔اور طبلہ ایسا بجاتے ہیں کہ بڑے برے طبلچی ان کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں لیکن مغلوب الغضب اس قدر ہیں کہ ذرا سے مذاق پر جامے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ ایک سیدھی بات کو پر پیچ وخم سمجھ کر ترک کر لیتے ہیں۔اور دل اتنا اچھا ہے کہ کچھ روز روٹھے رہنے کے بعد پھر خود بخود من جاتے ہیں۔

اب رہا ان کے معلومات عامہ کا مسئلہ سو اس باب میں اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میرزا صاحب کو کیا کیا آتا ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ یہ پوچھ کہ اس عالم کون وفساد میں وہ کون ایک ایسی بات ہے جو ان کو نہیں آتی

ہر فن میں ہوں استاد مجھے کیا نہیں آتا

؛جناب والا تفسیر حدیث، منطق فلسفہ ہیت ، ادب، موسیقی، نقاشی، ایلوپیتھی، ہومیو پیتھی، اور طب یونانی کے بے شمار علوم کے دوش بدوش ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیر کا شکار کیوں کر کھیلا جاتا ہے کون کون سی پیٹنٹ دوائیں کن کن امراض کے واسطے مخصوص ہیں موٹر کا کون سا پرزہ کہاں مل سکتا ہے۔اور ریلوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات کیا ہیں......اجی آپ میرزا صاحب کو کیا سمجھتے ہیں کان کھول کر سن لیجیے کہ اس کرہ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

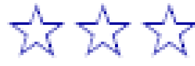
بس یہ سمجھ لیجیے کہ جہاں تک کہ جہاں علم وآگاہی کا سوال ہے آسماں پر خدائے قدیر ہے اور زمین پر میرزا عالم گیر ہیں وہ عرش پر علام الغیوب ہے یہ فرش پر علام الشہود ہیں یعنی

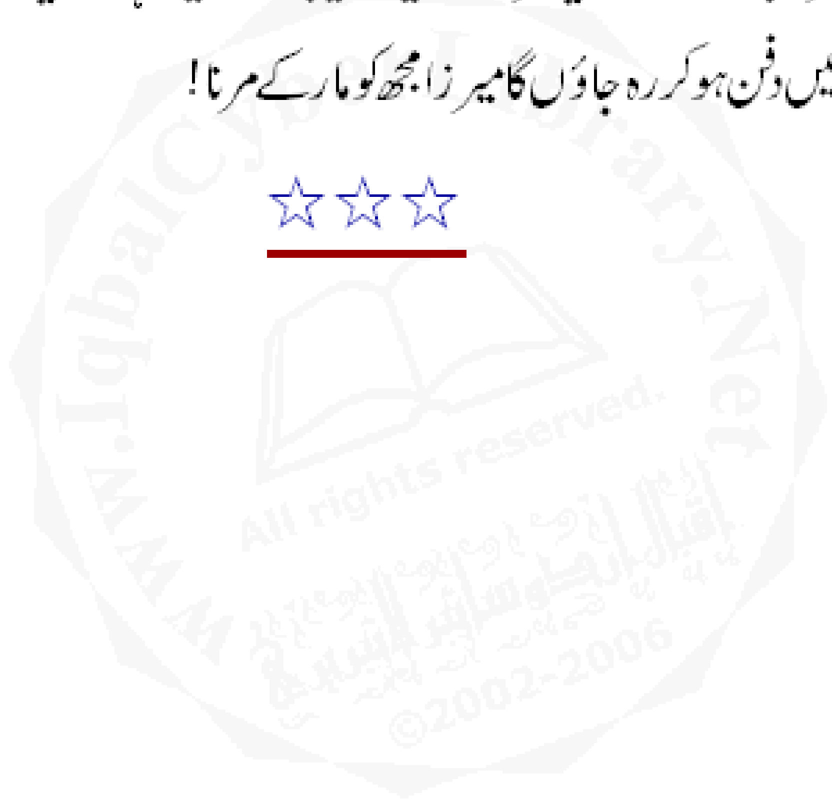
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

میرے موتر خاں طفلی وشباب میں سے اب صرف میرزا ہی باقی رہ گئے ہیں وہ

مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کس قدر نازک اندام و حسین تھا۔ اور جب میں جرنیلی ٹوپی کج کر کے اور سیاہ شیروانی پہن کر دو تین سپاہیوں کو جلو میں لیے امین آباد پارک میں اپنا سونے کا در ہلا ہلا کر ٹہلا کرتا تھا تو میری سیاہ شیروانی پر میری گھڑی کی سنہری زنجیر ایسی لگتی تھی جیسے کالے بادل میں بجلی چمک رہی ہے۔

میری محراب زندگی میں یہ میرزا ہی ایک دیا باقی رہ گیا ہے اگر یہ بھی بجھ گیا تو میں اندھیرے میں دفن ہو کر رہ جاؤں گا میرزا مجھ کو مار کے مرنا!





www.pdfbooksfree.pk

مولانا سہا بھوپالی

وہ اس قدر طفل قامت تھے کہ ان کے روبرو ٹھنگنے اور زیادہ دبتے ہوئے قد کے آدمی بھی بلغم باحور یا بالے میاں کی چھڑ نظر آتے تھے۔ جب ان کو مولانا سہا کے نام سے پکارا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ننھے سے بچے کو مولانا تار کہا جارہا ہے۔

لیکن ان کی ذراسی جان میں قدرت نے علم وادب کی ایک کثیر مقدار کو اس طرح فشار دے کر بند کر دیا تھا کہ جس طرح ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تیس چالیس مچھلیاں منقبض کر کے تلے اوپر بند کر دی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس بنا پر ان کو مجددی کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کی لیاقت کا میں دل سے قائل ہوں۔ جب وہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر باتیں کرتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ پرانے رنگ کے شاعر اور نئے مزاج کے نقاد بھی تھے۔ اور اس کوتاہ قامتی کے باوجود حسینوں پر بے ساختہ دست درازی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ عورت اور شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے ان بے چارے کی عمر کا بہت زیادہ حصہ افلاس میں گزرا لیکن امیروں کے آستانوں پر کبھی نہیں جھکے امیروں کے در پر جھکنا تو درکنار' وہ انہیں ان کے منہ پر بڑی روانی سے گالیاں بھی دے بیٹھتے تھے ایک روز ایک راجہ صاحب کے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی دعوت تھی...... جب سہا صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو راجہ صاحب نے' ایک دوسرے راجہ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ ان راجہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے واسطے ہاتھ بڑھایا اور انہوں نے ان کو موٹی سی گالی دے کر کہا ا بے سالے بدتمیز شاعروں سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملاتا ہے ان راجہ صاحب کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا...... میزبان راجہ صاحب نے جھٹ سے ان کو گود میں اٹھا کر کہا آپ نے میری ناک کاٹ ڈالی کہیں شرفا بھی گالیاں دیتے ہیں۔ سہا نے ان کی گود میں بیٹھے ہوئے کہا راجہ صاحب کیا آپ ناصح مشفق کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ راجہ نے کہا یہی سمجھ لیجیے سہا

صاحب نے کہا تو پھر تو ناصح مشفق بھی ماں کا...... راجہ نے گھبرا کر ان کو گود میں سے اتار دیا اور وہ بچوں کی طرح کھٹ کھٹ کرتے کمرے سے نکل گئے۔

وہ اختری فیض آبادی پر مرتے تھے دونوں کا مکان لال باغ میں تھا اور میں ان دونوں کے قریب بناری باغ کے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے مجھ کو اختری کے وہاں لے جاتے اور بچوں کی طرح گود میں بیٹھ کر سرکار ...... ایک پیار کی درخواس کرتے تھے۔

ایک شام وہ حسب معمول اختری کی گود میں بیٹھے ہوئے پیار مانگ رہے تھے اور شراب پی رہے تھے کہ اختری کی ماں نے کہا مولانا آپ جانتے ہیں کہ اختری نواب صاحب رام پور کی سرکار میں ملازم ہے۔ اور ان کے سیکرٹری صاحب یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ اختری کی گود میں سے اتر آیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دیکھ لیں یہ سنتے ہی انہوں نے بگڑ کر کہا نواب رام پور کی ماں کا و...... اختری کی ماں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور اختری نے ان سے کہا مولانا یہ بہت بری بات ہے۔۔ اس پر انہوں نے بے ساختہ کہا اچھا تو پھر سرکار کی بھی ماں کا......

اور تو اور وہ اپنی بیگم کو بھی گالی دے بیٹھتے تھے اور ان کی بیگم ایک اونچے سے طاق یا مچان پر بٹھا کر گھر کے دھندوں میں لگ جاتی تھیں اور مولانا اوپر سے چیختے رہتے تھے کہ خدا کے لیے مجھے اتارو اب گالی نہیں بکوں گا۔

ایک روز بناری باغ والے مکان میں وہ میرے پاس آئے شام کا وقت تھا' دور چلنے لگا۔ انہوں نے رباعیوں کی فرمائش کی۔ میں رباعیاں سنانے لگا۔ ان کو میری ناچیز رباعیاں اس قدر پسند آئیں کہ دس پانچ رباعیوں کے بعد انہوں نے کہا جوش صاحب آپ کے سامنے تمام ہندوستان کے شاعروں کی ماں کا...... اور سناؤ۔ اتنے میں کسی نے ایک نامور شاعر کا نام لے کر پوچھا کیا ان کی بھی ماں کا؟ انہوں نے ہاتھ بلند کر کے کہا نہیں ان کو تو شامل نہیں کر رہا ہوں جب دس بیس رباعیاں اور سن چکے تو

مستثنیٰ شاعر کا نام لے کر کہا۔ان کی بھی ماں کا......اور چند رباعیاں میں نے پڑھیں تو بے قابو ہو کر انہوں نے بہت زور سے کہا اب تو مولانا سہا مجددی کی بھی ماں کا......

ایک رات کو ہم چوک گئے گانے سننے کے لیے۔مجاز ایک دکان پر پان کھانے کے لیے ٹھہر گئے۔سامنے ایک پٹاخا سی چھوکری چھجے پر کھڑی ہوئی تھی انہوں نے کہا سب سے پہلے اس کی بانگی دیکھیں گے۔کچھ تو پان بننے میں دیر ہوئی اور ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر رک گئے تھے ان سے باتیں کرنے میں وقت صرف ہو گیا۔اب ہم فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سہا صاحب غائب ہو چکے ہیں اور بالا خانے سے آوازیں آ رہی ہیں لدے امی جان دوڑیے کوئی بھوت آ کر مجھ سے چمٹ گیا ہے۔ہائے اللہ ہائے اللہ میں نے مجاز سے کہا ہو نہ ہو سہا صاحب اوپر چڑھ گئے ہیں۔اور جب ہم اوپر پہنچے تو دیکھا کہ اس چھوکری کی کمر سے لپٹے ہوئے ہیں۔ایک بوسہ ایک بوسہ ایک بوسہ کی درخواست کر رہے ہیں اور وہ چھوکری اور اس کی ماں دونوں تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

غالباً یہ سنہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ ایک روز وہ بمبئی میں مجھے مل گئے۔اور دوڑ کر لپٹ گئے۔میں نے پوچھا یہاں کیسے آنا ہوا انہوں نے کہا لوہے کے کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں۔میں نے کہا اللہ اللہ یہ موم کا پتلا اور لوہے کا کاروبار۔کہنے لگے۔میں نہیں میرا ایک ساتھی کام کرے گا۔میں ان کو لے کر گھر آ گیا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہا جوش اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا ہے۔ایک تو یہ دھندا ہاتھ آ گیا ہے جس سے بھوجن چلے گا اور اسی بھوجن کے ساتھ رحمت الٰہی نے میرے......کا بھی معقول بندوبست کر دیا ہے' اور ایک ایسی چاندسی بیوی دے دی ہے کہ چراغ گل ہو جانے کے بعد بھی اس کا مکھڑا اور بھی دمک اٹھتا ہے۔اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ اللہ نے یہ فضل کیوں کیا ہے میں نے کہا آپ بتائیں انہوں نے کہا وسکی اور برانڈی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔البتہ وائن کی دوا اور بیئر کی چار بوتلیں روز شام کو پی لیتا ہوں۔میں نے کہا

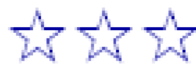
www.pdfbooksfree.pk

واقعی اسے کہتے ہیں توبتہ النصوح۔

شام ہوتے ہی میں نے وائن اور بیئر کا بندوبست کر دیا وہ پی کر غسل خانے چلے گئے۔ دس پانچ منٹ تک تو میں نے انتظار کیا اور جب وہ نہیں آئے تو غسل خانے کے دروازے پر دستک دی دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا اور یہ سماں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ فلش کے چبوترے پر چاروں شانے چت پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

ایک بار یہ سن کر وہ سخت بیمار ہیں میں بھوپال آ گیا۔ ان کو خیراتی وارڈ میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوئے گئے سیدھا نواب صاحب بھوپال کے پاس پہنچا ان کو غیرت دلائی کہ ان کے بھوپال کی اتنی بڑی شخصیت خیراتی وارڈ میں دم توڑ رہی ہے انہوں نے فوراً ہی کسی افسر کو بلا کر حکم دیا کہ سہا صاحب کو ایک پرائیویٹ کمرے میں رکھ کر سرکار کی طرف سے ان کا علاج کیا جائے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ دفتری کارروائیوں کی بنا پر اس قدر دیر میں حکم نامہ جاری ہوا کہ جب ایک دروازے سے ان کا حکم نامہ آیا تو دوسرے دروازے سے ان کی لاش باہر جا رہی تھی...... فردوسی کا سانحہ یاد آ گیا۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا



www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر ایس کے سکسینہ

نہ دبلے نہ دھم دھوسڑ مزاج میں ذرا سی گڑبڑ چہرے کا ملگجا سا گونگا رنگ' لہجے میں بجتا چنگ۔ بدمزاج بیوی کے صید زبوں وہ ظالم لیلیٰ یہ مظلوم مجنوں آنکھیں ذہانت سے ضیا بار' معقولات کے علم بردار' فلسفے کا افتخار' منطق کا وقار کاہلی کا پرستار اور بزدلی کے مہا اوتار۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں جب میں محکمہ اطلاعات کے تین رسالوں آج کل ''نیا عالم'' اور ''کشمیر'' کا مدیر تھا وہ ہندو کالج میں فلسفے کے صدر شعبہ تھے۔ اس وقت کے چیف کمشنر شنکر پرشاد آئی سی ان کے بڑے پرانے دوست تھے اور انہوں ہی نے مجھ کو ان سے ملوایا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ میرے دفتر میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہو گئے تھے اور ہر وقت میری ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اب ہونولولو میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کبھی کبھی دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کی سنہ ۱۹۶ میں دہلی گیا تھا اتفاق سے وہ آئے ہوئے تھے۔ بہت سی ملاقاتیں ہوئیں میں نے کہا ہونولولو میں لولو ہونے گئے ہو وہ بہت ہنسے بیوی آ گئیں ہنسی نے دم توڑ دیا۔

کاہلی اور بزدلی کے علاوہ میرے ان کے مزاج میں تقریباً سو فیصد اشتراک پایا جاتا ہے۔ مزاج کے ساتھ ساتھ کائناتی مسائل میں بھی ہم دونوں کے جادۂ فکر میں یک سر مو فرق نہیں ہے۔ اور بفضلہٖ ہم دونوں وہ ہیں جن کو اوہام پرستوں اور عقل دشمنوں کے حلقے میں کافر کہا جاتا ہے۔

وہ ہندوؤں کی حماقت کا رونا روتے ہیں میں مسلمانوں کی بے عقلی پر آنسو بہاتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں مل کر ہندوؤں مسلمانوں یہودیوں' عیسائیوں بودھیوں' سکھوں اور جینیوں کی زبوں اندیشیوں پر ماتم کرتے ہیں۔ اب ان کی بالیں پرست کاہلی کا ایک واقعہ سن لیجیے میرے صد ہا تقاضوں کے بعد آخر کار وہ اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ میرے ساتھ صبح کو ٹہلا کریں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

چناں چہ دوسرے دن ہی صبح کو' میں ان کے گھر پہنچا ان کو جگایا ۔وہ بستر سے اٹھے بڑی بے کسی کے ساتھ مجھے دیکھا چارپائی سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے ۔قدم اس طرح اٹھے گویا وہ آندھی کے جھکڑوں میں پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں ۔اور ٹانگیں دامنوں کے مانند ہوا میں اڑ رہی ہیں غسل خانے سے نکلے تو چارپائی کر کراہ کر بیٹھ گئے میں نے کہا ان نخروں سے تو کرن پھوٹ جائے گی' اور دھندلے کا سہاگ ہی لٹ جائے گا۔ انہوں نے بڑی بے چارگی سے تھکی آواز میں کہا چلتے ہیں یہ کہہ کر وہ منہ بناتے اٹھے پھاٹک پر آئے اور سر کھجا کھجا کر باتیں کرنے لگے' میں نے کہا راستے میں باتیں کرتے چلیں گے' انہوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے پاؤں کھلیں گے تو زبان بند ہو جائے گی ۔ میں نے جھلا کر کہا ارے بھائی چلنا ہو تو چلیے ورنہ سورج نکل آئے گا۔ انہوں نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ پرماتما نے ٹانگیں فقط اس لیے دی ہیں کہ ہم کو غسل خانے تک پہنچا دیں اور دفتر جانا ہو و پھاٹک تک لے جا کر سواری میں بٹھا دیں ۔ یہ ٹانگیں ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہیں کہ ہم خاک چھانتے مارے مارے گھومتے پھریں سنو ہماری بہترین ٹہل یہ ہے کہ ہم دونوں پاؤں پھیلائے بستر پر چوبیس گھنٹے لیٹے رہیں ۔میں نے کہا مجھ سے ٹہلنے کا وعدہ کیوں کیا تھا۔انہوں نے کہا یار آپ کے آنے اور اپنے وعدے کا یہاں تک تو احترام کر دیا کہ بستر سے اٹھ کر ان لوگوں سے قطعی مختلف ہو گیا جو بستروں پر اینڈ رہے ہیں حالانکہ آپ کی خاطر میں اپنے کو جن لوگوں سے مخلف بنایا ہے و ہم دونوں سے بہت اچھے ہیں اور وہ وہاں سے اپنا سا منہ لے کر ٹہلنے چلا گیا اور عہد کر لیا کہ اب سکینہ کے پاس صبح کے وقت کبھی نہیں جاؤں گا۔

ایک روز میں ان کے گھر گیا کہا آیئے قطب چلیں ۔انہوں نے کہا تھک جاؤں گا ۔میں نے کہا ارے موٹر سے جانا ہے انہوں نے بات کاٹ کر کہا آپ بات سمجھتے نہیں میل دو میل جانا ہو تو کوئی بات نہیں سولہ سترہ میل میں چولیں ہل جائیں گی اور پھر دوسری

بات یہ ہے کہ دل نہیں ہے آج تو مائل سفر۔ میں نے کہا یہ مائل سفر کیا چیز ہوتی ہے انہوں نے جواب دیا اضافت بریکٹ میں رکھ دی ہے۔

(ب) ان کی بزدلی کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعے سماعت فرمالیجیے۔

پہلا واقع انہیں کی زبان سے سن لیجیے دہر لفظ تو یاد نہیں مگر واقعہ سامنے آجائے گا۔

''جوش صاحب کل ہم ناشتہ کر کے برآمدے میں بڑے آرام سے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بیوی نے تیز تیز آواز میں کہا ادھر آؤ ادھر آؤ۔ آپ جانے ہیں کہ ہم بے حد بزدل ہیں اور ہمارا قول ہے کہ ہر دل میں تھوڑا سا بز چاہیے۔ بیوی کے اس گرم ارگھبرائے ہوئے لہجے سے ہم ڈر گئے کانپنے لگے انہوں نے کہا میں کہہ رہی ہوں ادھر آؤ ادھر آؤ ہم کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ جوتہ پہنے بغیر ہی بیوی کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور ہر قدم پر دل بلیوں اچھلتا رہا کہ دیکھیے کیا چیز پیش آتی ہے۔ بیوی نے باورچی خانے کے دروازے پر ہم کو لے جا کر کھڑا کر دیا اور اشارہ کر کے کہنے لگیں دیکھو یہ چار برتن ٹوٹے پڑے ہیں، اگر باورچی اسی طرح دھوتا رہا تو ایک برتن بھی گھر میں باقی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر ہمارے حواس بحال ہو گئے کہ گھر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے ہم نے باورچی کو بلا کر کہا ارے بابا کان کھول کر سن لو کہ تانبے اور پیتل کے برتن چینی کے برتنوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور یہ بھی سن لو کہ نیچر کا یہ اٹل قانون ہے کہ جب قوی اور کمزور میں ٹکر ہوتی ہے و کمزور ٹوٹ جاتا ہے اسلیے کل سے ایسا کرو کہ قوی برتنوں کو کمزور برتنوں سے ملا کر دھونا چھوڑ دو۔ جب یہ سمجھا کر ہم پھر اخبار پڑھنے لگے تو بیوی نے پیچھے سے آکر ہماری پیٹھ پر اس زور سے دوہتڑ مارا کہ ہمارے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور ہم ہائے رام ہائے رام کرنے لگے انہوں نے ہماری چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا میں نے تم کو اس لیے ٹوٹے ہوئے برتن دکھائے تھے، کہ تم باورچی کے سامنے فلسفے پر لکچر بگھار کر باہر چلے جاؤ۔

ہم نے کہا ارے پھر تم کیا چاہتی تھیں کہنے لگیں ہم چاہتے تھے کہ تم نوکر کو مارو ہم نے کہا رام رام کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہم مار کیسے سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کیا تمہارے ہاتھ ٹوٹ چکے ہیں؟

ہم نے کہا ارے بات سمجھنے کی تو کوشش کرو۔ کہیں ہاتھ خالی ہات بھیکسی وک مار سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ خالی بھرے ہات کی کیا بات کر رہے ہو۔ ہم نے کہا ارے بی بی جب کھوپڑی میں غصہ بھر جاتا ہے تو کھوپڑی ہات کو مارنے کا حکم دیتی ہے۔ ہماری کھوپڑی میں غصہ تھا ہی نہیں مارتے کیسے؟ اب سمجھیں؟

میں نے گھر آ کر یہ سارا واقعہ بیوی سے بتا دیا۔ شام کو سکینہ صاحب آئے تو انہوں نے کہا سکینہ صاحب سنتی ہوں کہ آپ کی بیوی بڑی پاجن ہیں اور میں نے دلہی دل میں کہا اور تم کیا کم ہو۔ سکینہ نے جواب دیا کہ اس پاجی پن میں میری بیوی کا رتی بھر بھی قصور نہیں ہے اس میں تمام قصور ہے شادی کے رواج کا بھائی دراصل یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی کمینہ ہوتا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوا وہ اسی کمبخت رشتے کا پاجی پن تھا اور کچھ بھی نہیں اور میری بیوی منہ پھلا کر اندر چلی گئی۔ بیوی کے اندر جاتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا اب ہمیں جانے دو۔ میں نے کہا ابھی تو ایک پیگ باقی ہے اور پھر کھانا بھی کھانا ہے۔ انہوں نے کہا اب میں نہیں ٹھہروں گا۔ آپ کی بیوی بگڑ گئی ہیں۔ ایسا نہ ہو مجھے دیکھنے سے آ کر مارنے لگیں میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب ان کی بزدلی کا دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے۔ دہلی کے قدسیہ باغ میں ایک روز شام کے وقت ہم لوگ موٹر میں بیٹھے پی رہے تھے کہ گشتی پولیس کے دو آدمی ادھر آ نکلے اور ہم سے کہا آپ لوگ پبلک مقام پر شراب پی رہے ہیں تھانے چلیے تھانے چلیے تھانے کا نام سنتے ہی سکینہ کے ہات سے گلاس چھوٹ گیا۔ میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر کہا ہم جانے والے نہیں جائیں گے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے

ہماری رپورٹ کردو۔

پولیس والے میرا منہ دیکھنے لگے۔اور انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا میرے ڈرائیور سے کہا بہاری گاڑی سٹارٹ کردو۔اور قدسیہ باغ کے پھاٹک سے نکل کر بہاری نے جب نئی دہلی کی طرف گاڑی موڑ دی تو انہوں نے کہا نہیں سیدھے چیف کمشنر کے ہاں لے چلو۔میں نے کہا ہم تو انڈیا گیٹ جانے کے لیے نکلے تھے۔اس وقت چیف کمشنر کے وہاں جانے کا کیا تک ہے۔انہوں نے کہا اب انڈیا گیٹ نہیں جائیں گے۔اس لیے کہ یہ پولیس ہمارا تعاقب کررہی ہے۔میں نے کہا گھانس کھا گئے ہو۔پیدل پولیس والے موٹر کا تعاقب کریں گے۔انہوں نے کہا یہ باتیں نہ کرو پولیس سب کچھ کرسکتی ہے۔بہاری گاڑی موڑ دو چیف کمشنر کی طرف شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے وہاں جیسے ہی گاڑی رکی وہ اس قدر زور سے کوٹھی کیطرف بھاگے کہ کتے بھونکنے لگے اور اندر جا کر انہوں نے چیف کمشنر سے کہا۔شنکر پرشاد صاحب خدا کے لیے ہم کو بچایئے پولیس ہمارا تعاقب کررہی ہے۔شنکر پرشاد نے حیران ہو کر پوچھا کیا بات ہے میں نے قہقہہ مار کر سارا ماجرا بیان کردیا۔وہ بھی ہنسنے لگے۔ہم کو ہنستا دیکھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے خطرناک موقعے پر ہنستے نہیں ہیں' اس سے خطرہ اور قریب آ جاتا ہے۔شنکر پرشاد صاحب آپ فوراً چودھری آئی جی کو فون کردیں کہ وہ ان دونوں پولیس والوں کو گرفتار کرلیں۔

شنکر پرشاد نے کہا ارے سکینہ کیسی باتیں کررہے ہو انہوں نے کہا یہ موقع مباحثے کا نہیں پرماتما کا واسطہ ابھی فون کردو شنکر پرشاد نے فون کرکے آئی جی کو اپنے گھر ہی بلا لیا اور ہنس ہنس کر سارا واقعہ بیان کرکے کہا چودھری صاحب ان کی تسلی کردیجیے۔چودھری نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ آپ فکر نہ کریں میں ان پولیس والوں کو بخوبی تنبیہہ کردوں گا۔لیکن ان کا خوف کم نہیں ہوا۔اس کے بعد وسکی کا دور چلنے لگا۔اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو میں نے کہا آیئے

سکینہ صاحب آپ کو گھر پہنچا دوں انہوں نے قہر کی نظر سے دیکھ کر مجھ سے کہا آپ جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ اس میں میں نے اور شنکر دونوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ انہوں نے کہا جتنا چاہو دل کھول کر ہنس لو ہم اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔ شنکر پرشاد صاحب گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگوا لیجیے۔

الغرض وہ دفتر میں رخصت کی درخواست کر کے پورے ایک ہفتے شنکر پرشاد ہی کے گھر رہے۔ اور ساتویں دن آئے تو آئی جی کے ساتھ دفتر آئے۔

جب اس واقعے اور سکینہ کی زبان سے اس خوفناک حادثے کو آٹھ دن گزر گئے تو مجھے شوخی سوجھی۔ اور فون پر ان سے یہ کہا کہ سکینہ صاحب پولیس ہتھکڑیاں لیے ہوئے میرے کمرے کی طرف آ رہی ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے ان کی چیخ اور کھٹاک سے فون گر جانے کی آواز سنی۔ اتنے میں چند اور احباب آ گئے اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی میں باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرے دوست کنور مہندر سنگھ سٹی مجسٹریٹ میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکل گیا آئیں!

میں نے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا سکینہ صاحب عجیب آدمی ہیں انہوں نے ابھی مجھے فون کیا کہ فوراً جائیے جوش گرفتار ہو چکے ہیں اور اب میری باری آ رہی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا میں نے تو ان سے مذاق کیا تھا۔ کنور صاحب نے کہا ان سے ایسا مذاق کرنا تو بے حد خطرناک ہے۔ وہ ایسے مذاق سے مر بھی سکتے ہیں۔ چلیے ان کے کمرے میں چلیں اور جب کمرے میں جا کر دیکھا تو انہیں موجود نہیں پایا۔ میں نے کہا صرف دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ آپ کے وہاں گئے ہوئے ہیں شنکر پرشاد صاحب کے پاس کنور صاحب نے میرے کمرے میں آ کر اپنے اجلاس پر فون کر کے پوچھا معلوم ہوا ہے کہ وہاں نہیں ہیں۔ اتنے میں شنکر پرشاد کا فون آیا کہ جوش صاحب

مجھے بتایئے کہ ہوا کیا' میں نے کہا کچھ بھی نہیں ہوا۔ خالی مذاق کیا تھا سکینہ سے انہوں نے کہا بڑا غضب کیا آپ نے سکینہ کی حالت خراب ہے۔ وہ سات گلاس پانی پی چکے ہیں۔

کنور صاحب کو لے کر وہاں پہنچا دیکھا کہ سکینہ کا چہرہ سفید ہو چکا ہے۔ میں قہقہہ مار کر ان سے لپٹ گیا۔ اور کہا ارے اتنی سی دل لگی میں دم نکل گیا۔ انہوں نے پھٹی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا ایک حرف زبان سے نہیں کہا۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔

میں نے اور کنور صاحب نے ان کولا کھ لاکھ سمجھایا کہ ارے خدا کی قسم آپ سے مذاق کیا تھا لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ شنکر نے کہا ارے بھائی اب تو حواس درست کر لو ہنسو بولو' اور مذاق کا لطف اٹھاؤ۔ انہوں نے کہا شنکر صاحب ہمارے گھر گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجیے۔ اب ہم آٹھ روز تک آپ ہی کے گھر میں رہیں گے۔ اور ہم لوگ جھک مار کر چلے گئے اور جب خدا خدا کر کے دس بارہ روز کے بعد آئی جی کے ساتھ وہ پھر دفتر آئے۔ اور لنچ کے بعد سبزے پر میرے ساتھ بیٹھ گئے تو انہوں نے بڑی متانت سے کہا جوش ہمارے من کی بات سنو گے۔ میں نے کہا ضرور سنوں گا۔ تو انہوں نے کہا جن پولیس والوں نے قدسیہ باغ میں ہم کو لوٹا تھا جب تک ہندوستان کے تمام اخباروں میں ان کی موت کی خبر نہیں چھپ جائے گی اس وقت تک ہم اپنے کو سیف (Safe) نہیں سمجھیں گے۔

ہے دنیا میں کوئی مثال اس بے پایاں بزدلی کی؟

یہ میرے چلا چلاؤ کا زمانہ ہے دیکھیے سکینہ سے اب کبھی ملاقات ہو گی بھی کہ نہیں میں مر جاؤں تو کوئی ان کو میرا سلام پہنچا کر یہ کہہ دے کہ تمہارا سب سے بڑا چاہنے والا اس دنیا سے اٹھ گیا بر شاخوش بادنا خوش ہائے دنیا دنی!

محفوظ

مانی جائسی

گورے رنگ متوسط قامت کے خوش رو بدگمان‘ سریع الغضب‘ خدمات فراموش‘ پریشان روزگاری میں کامل دوست‘ فراغت میں قطعی اجنبی‘ اوہام کی حد تک راسخ العقائد بدرجہ اتم نکتہ سنج‘ قیامت کے ذہین‘ نہایت خوش فکر غزل گو بلا کے عاشق مزاج اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایسا دل ہے جو صبح ازل سے شام ابد تک برابر پھٹتا ہی چلا جائے گا۔ اور لہجے میں ایسی کشش موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جا رہے ہیں۔

میری نوعمری کے زمانے میں وہ میرے چچا نواب محمد علی خاں کی سرکار میں بطور منشی ملازم میرے پرائیویٹ ٹیوٹر اور کچھ روز کے بعد میرے بڑے بے تکلف دوست بھی ہو گئے تھے۔ اور ایسے دوست کہ ایک مدت تک میں ان کو اپنے تمام دوستوں سے زیادہ چاہتا رہا تھا۔

وہ ملیح آباد کے اثنائے قیام میں میرے چچا کی فرنگی بیوی کے بھائی پر مر مٹے اور ہر آن اسی کا نام رٹا کرتے تھے۔ او جب اس سے ان کا دل بھر گیا تو لکھنو کی ایک خوبرو طوائف پر جس کا نام غالباً مہدی جان تھا مرنے لگے تھے اور اس کے عشق میں جب ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی تو میں نے اس طوائف کو ملیح آباد طلب کر کے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے جھانکا تو یہ دیکھا کہ وہ پاؤں دبا دبا کر بری طرح رو رہے ہیں۔

میں نے ان کو بلا کر کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ پاؤں دبائے اور آنسو بہانے کا موقع نہیں ہے۔ جائیے اور خوش فعلیاں کیجیے۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اچھا اور اندر جاتے ہی پھر اسکے پاؤں دبا دبا کر رونے لگے۔ اس بات کا لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا لیکن یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے کہ وہ میرے بار بار سمجھانے

کے باوجود اس طوائف کے پاؤں رات بھر رو رو کر دباتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جناب والا اس کم بخت عشق کی بھی ہزاروں شانیں ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو یہ جذبہ انسان کو اس طرح دبوچ لیتا ہے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ میرے کل کے یار اور آج کے اجنبی دوست مخمور اکبر آبادی نے آگرے سے مجھ کو اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور مانی سے میری شیفتگی پر نگاہ کر کے مجھ کو چکھی دینے کی خاطر یہ بھی لکھا تھا کہ مانی بھی ان کی شادی میں شریک ہونے والے ہیں...... تو میں چالیس فی صد مخمور کی شادی میں شریک ہونے اور ساٹھ فی صد مانی سے ملنے کے لیے اتنا بڑا سفر اختیار کر کے حیدر آباد دکن سے آگرے آ گیا تھا...... لیکن میں جب قیصر باغ میں اس وقت ان سے ملنے گیا جب کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار میں ان کی بیگم کی ریاست بلہرہ کے مینجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے تو انہوں نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی اور میرے منہ پر یہاں تک کہہ دیا کہ جوش صاحب میں ضیاء عباس کے علاوہ کسی اور کو اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ اس بات نے میرا دل اس قدر توڑ دیا کہ میں نے ان کے پاس آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔

لیکن اس واقعے کے کئی برس کے بعد جب حکیم عالم نے مجھے اس امر سے آگاہ کیا کہ مانی کو راجہ صاحب محمود نے چھڑا دیا ہے اور بے چارے کڑہ کے ابوتراب خاں کے ایک ٹوٹے مکان میں بڑی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے دوپہر کی پروا نہیں کی۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ پانی پانی ہو گئے اور جب میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا اور کہا کہ جب تک میں زندہ رہوں گا آپ پریشان نہیں ہو سکتے۔ تو شدید حیرت اور بے پایاں شرمندگی اور لامحدود تشکر کے باعث انکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور جھکی آنکھوں سے انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ سے بڑا غیر شریفانہ برتاؤ کیا تھا۔ اگر کسی اور سے میں وہ برتاؤ

کرتا تو عمر بھر وہ میری صورت نہ دیکھتا۔ میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا بس بس مانی صاحب مجھے شرمندہ نہ کیجیے...... اور ہماری دوستی پھر بحال ہوگئی۔

اور جب معاشی پریشانی میں گھر کر غالباً سنہ ۱۹۴۸ء میں وہ میرے پاس دہلی آئے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں سرکار ہند سے ان کا ادبی وظیفہ مقرر کرادوں.....تو میں نے سیدھا مولانا ابوالکلام کے پاس یا اوران سے درخواست کی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کردیں۔انہوں نے کہا میں تو ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ آپ کا سا بالغ النظر آدمی بھی یہی سمجھتا ہوگا۔یہ اور بات ہے کہ یگانگت کی بنا پر آپ سفارش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مولانا وقت واحد میں آپ نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں ایک معنوی اور ایک لفظی۔معنوی ٹھوکر تو یہ ہے کہ آپ مانی صاحب کو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہیں اور کوئی غزل گو بڑا شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر ہمارے یہاں جو شعر کا معیار ہے اس پر نگاہ کر کے میں ان کو ہزاروں غزل گو بانوں پر ترجیح دوں گا۔اور یگانگت کا لفظ استعمال کر کے آپ نے لفظی ٹھوکر کھائی ہے۔ فارسی لفظ یگانہ میں یہ تارے عربی کہاں سے آگئی مولانا کے شہرے پر شدید انفعال دوڑ گیا۔ پھر بھی انہوں نے سنبھل کر کہا یہ غلط العام ہے...... میں نے کہا جان کی اماں پاؤں تو یہ بات زبان پر لاؤں کہ یہ غلط العام نہیں غلط العوام ہے۔وہ شرمندہ ہو کر مسکرانے لگے۔اور میں پنڈت جی کے پاس چلا گیا۔

انکے سیکرٹری نے کہا جوش صاحب پنڈت جی اس وقت نہایت ضروری کام کر رہے ہیں انہیں بالکل فرصت نہیں ہے۔میں نے کہا تو پھر آپ میرا نام لے کر یہ پوچھ آئیں کہ میں کب آؤں۔

سیکرٹری نے آ کر کہا پنڈت جی سے آپ ابھی مل سکتے ہیں۔میں پہنچا تو وہ ایک اونچے سے ڈسک پر کھڑے لکھ رہے تھے۔میں نے کہا اپنے استاد حضرت مانی جائسی کو آپ سے ملانے آیا ہوں انہوں نے کہا کہ آپ کا بھی کوئی استاد ہو سکتا ہے؟ بلا

www.pdfbooksfree.pk

لیجیے...... مانی نے اپنا دیوان پیش کیا پنڈت جی نے کہا میں آپ کا مشکور ہوں میں نے کہا شا کر کہیے...... ایسے مواقع پر مشکور کہنا غلط ہے انہوں نے ہنس کر کہا آپ کہاں تک میری زبان درست کریں گے۔ میں نے مانی صاحب کے ادبی وظیفے کی درخواست پیش کر دی۔ انہوں نے فوراً منظور کر کے اس پر دستخط کر دیے پنشن جاری ہو گئی اور مانی صاحب نے مجھ سے ملنا ترک فرما دیا۔

لیکن اگر آپ مجھ سے میرے دل کی بات پوچھیں تو میں بتاؤں کہ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو دیر تک روتا رہا اور آج بھی جب ان کی یاد آ جاتی ہے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں ہائے مانی...... ہائے مانی۔



www.pdfbooksfree.pk

منے میرزا اثر لکھنوی

نہایت گورے رنگ بڑی بڑی بھوری مونچھوں کرنجی آنکھوں، اور سجل ناک نقشے کے اس قدر شگفتہ مزاج اور مخلص انسان تھے کہ ان سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایسے خوش فکر مرثیہ و غزل گو شاعر بھی تھے کہ اگر شدید قسم کی سنک ان کا راستہ نہ روک لیتی تو اساتذہ لکھنو میں وہ نہایت نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔

وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے اور میرے باپ کے ملنے والے تھے۔ لیکن میری ہمکتی ہوئی جوانی کی بے پایاں شوخی اور انکی ڈھلتی عمر کی شدید سنک نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں ڈال دی تھیں کہ ہم دونوں میں ہم عمروں کی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

جب کبھی کبھار میں دس پندرہ روز لکھنو نہیں جاتا تھا وہ مجھ سے ملنے ملیح آباد آ جایا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک روز وہ ملیح آباد آئے ہوئے تھے اور ہم لوگ اپنے احاطے کی انگنائی میں بیٹھے ان کی باتیں کر رہے تھے کہ انہوں نے کہا سنیے ایک تازہ غزل کہی ہے؟ قید رسم و رواج کیا کیجیے کی طرح پر جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

ہوس زر، بری سہی، لیکن
ہو اگر احتیاج کیا کیجیے
ہم نے مانا کہ وہ کل آئیں گے
عقل حیراں ہے آج کیا کیجیے

دوسرا شعر سن کر میں نے کہا میں آپ کے اس آج کیا کیجیے کا حل آپ کو بتا دوں؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے چہرے کو گھور کر دیکھا۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھی پکڑ لی اور ہاتھ ہلا ہلا کر کہا اثر صاحب آج یہ کیجیے۔ وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے خدا ہماری سنک کا بیڑہ غرق کر دے جو ہم لونڈوں کی صحبت میں لا کر بٹھاتی ہے۔ اور ایسے فحش اشارات دکھاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ بس

www.pdfbooksfree.pk

ملاقات ختم ہم ابھی لکھنو جا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ من گئے۔ اور جب ان کا مزاج نارمل ہو گیا تو میں نے کہا شر رصاحب ایک مصرع کہتا ہوں سینہ بلبل میں چھالا پڑ گیا۔ اسپر ایک شعر کہہ دیجیے چھالا قافیہ ہو گا۔ انہوں نے دو منٹ تک سوچا اور اچھل کر کہا لو جیسی طرح ہے ویسا ہی لونڈھیائی شعر سن لو

لیٹنے میں پھینک کر دل یہ کہا

وہ پڑا ہے ......جا اٹھا لا پڑ گیا

چھوٹے دادا نے قہقہہ لگا کر کہا واہ کیا بغدہ شیدی لندھور شعر کہا ہے.....وہ ہنسنے لگے۔ اور جب میں نے یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں ردیف مہمل اور گونگی ہو کر رہ گئی ہے تو انہوں نے کہا ردیف نہ مہمل ہے نہ گونگی با معنی ہے اور آواز بھی دے رہی ہے۔ صاحب زادے یہ ڈرامائی شعر ہے اندر چلو میں تخت پر بیٹھ کر اس شعر کو آنکھوں سے دکھا کر سمجھا دوں گا۔ وہ اندر جا کر تخت بیٹھ گئے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کہا دیکھو اس مٹھی میں عاشق کا دل ہے۔ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ لیٹنے لگے ابرار سے کہا تم عاشق بن کر سامنے کھڑے ہو جاؤ اور جب ابرار عاشق بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے تو لیٹتے لیٹتے انہوں نے اپنی مٹھی کھول کر اس کو اس طرح جھٹکا دیا گویا انہوں نے فرش پر ان کا دل پھینک دیا ہے اور دل پھینکتے ہی وہ ابرار کی طرف یہ نگاہ کر کے کہتے ہوئے کہ وہ پڑا ہے جا اٹھا لا دھم سے لیٹ گئے۔ اور کہنے لگے اب بتاؤ پڑ گیا یعنی لیٹ گیا میں ردیف چسپاں ہوئی کہ نہیں؟

اب ان کی سنک کے دو واقعے بھی سن لیجیے میرے باپ کی زندگی کا واقعہ ہے ایک روز وہ خاصہ تناول فرما کر لیٹے اور شرر ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے باپ کے ایک شاگرد شباب لکھنوی اصلاح کے لیے ایک غزل لے کر آئے میرے باپ پر غنودگی طاری تھی انہوں نے فرمایا شرر صاحب آپ اصلاح دے دیجیے انہوں نے

بڑی بے چارگی سے کہا خاں صاحب میں کیوں کر اصلاح دے سکتا ہوں۔ میرے پائنچے میں تو گھٹنے کے اوپر کھونچا لگ گیا ہے ان کا یہ نرالا عذر سن کر میرا باپ نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ اگر مجھ کو اس حادثے کا علم ہوتا و میں آپ سے اصلاح کے لیے ہرگز نہ کہتا۔ اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب کسی شاعر کے پائنچے میں اور بھی وہ گھٹنے کے اوپر کھونچا لگ جاتا ہے تو اس میں اصلاح دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور شرر یہ سمجھ کر کہ میرے باپ ان کا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں۔ بلکہ انکی تائید کر رہے ہیں بے حد خوش ہو گئے۔

جب میں سینٹ پیر کالج میں پڑھتا تھا اور لکھنو میں تعطیل کا زمانہ گزرا کر آگرے جانے والا تھا تو میں نے شرر صاحب سے یہ محکم وعدہ لے لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ آگرے چل کر دو ایک مہینے گزار دیں گے۔

لیکن جب میں ایرار اور رئیس کو ساتھ لے کر تانگے میں لد پھندا اور زیر گنج پہنچا اور ان کے مکان پر دستک دے کر پوچھا کہ شرر صاحب ہیں یا نہیں۔ تو انکی بیگم نے کہا جی ہاں ہیں اور پھر اس جی ہاں کے ایک سیکنڈ کے بعد آواز آئی اچھا نہیں ہیں۔ اس ہیں اور اچھا نہیں ہیں۔ سے میں سمجھ گیا کہ وہ گھر میں چھپے ہیں۔ اور یہ اچھا نہیں ہیں ان کے اشارے پر کہا گیا ہے۔ اتنے میں ان کے دروازے کا پردہ ہوا سے جنبش میں آ گیا اور میں نے دیوار کے قد آدم آئینے میں دیکھ لیا کہ شرر اپنی بیگم سے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں میں نے پکار کر کہا شرر صاحب خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً باہر آ جائیں ورنہ میں ایک دو تین کہہ کر گھر میں گھس پڑوں گا۔ اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو لونڈے پن کا تو زمانہ تھا ہی میں ایک دو تین کہہ کر ان کے گھر میں گھس گیا وہ آئیں آئیں کرتے رہے اور میں ان کو کھینچ کر باہر لے آیا۔ اور ان کی بیگم کی آواز آئی کر و پٹھانوں سے دوستی' اور اندر سے دروازے میں زنجیر لگا لی۔

میں نے کہا آپ نے تو آگرے چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا

ہاں ہاں گلے گلے وعدہ کیا تھا لیکن یکا یک ایک بڑا ضروری کام نکل آیا ہے کل اسے نمٹا کر پرسوں شام تک آگرے آ جاؤں گا۔ میں نے کہا ضروری کام کی ایسی کی تیسی میں تو اسی وقت ساتھ لے جاؤں گا۔ انہوں نے کہا حضرت عباس کی قسم آج نہیں جا سکتا خواہ آپ مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں...... میں نے کہا تو اچھا ہم کو سٹیشن تک تو پہنچا دو گے۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے میں نے تانگے والے سے کہا چلیے چلیے نا۔ انہوں نے کہا خون حسین کی قسم بالکل مجبور ہوں ورنہ ضرور چلتا۔ اب تانگے سے ہمارا سامان اترنے لگا اور ابرار کو روپے دے کر میں نے کہا کہ ہمارے ٹکٹ لے آؤ اور ایک پلیٹ فارم ٹکٹ شر صاحب کے لیے بھی لیتے آنا اور جب ابرار بکنگ آفس کی طرف روانہ ہونے لگے تو حیرت ہوگئی کہ اس بات پر شر صاحب نے پکار کر کہا ابرار پلیٹ فارم کا نہیں ہمارا بھی آگرے کا ٹکٹ ہی لے آؤ دیکھی ہے آپ نے کبھی ایسی تگڑی سنک جے مہا تما شر لکھنوی کی!

آگرے کا ذکر ہے ایک روز شر ابرار رئیس اور میں سب مل کر، میرزا محمد زکریا صاحب **ملک** کے وہاں گئے۔ **ملک** صاحب میرے باپ کے ننھیالی بھائی اور آگرے کے رئیس اعظم و نامور شعر میرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کے بڑے تیکھے اور بانکے فرزند تھے۔ میں نے راستے میں کہا شر صاحب اس قدر عنایت ضرور کیجیے گا کہ کم سے کم پہلی ہی ملاقات میں **ملک** چچا کو اس بات کا پتا نہ چل جائے کہ آپ سنکی ہیں۔ انہوں نے کہا اور آپ بھی اپنی سنک کو ظاہر نہ ہونے دیجیے گا۔ میں نے کہا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا قول مرداں جانے دار داب ہم **ملک** صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے انہوں نے ہم لوگوں کو بڑی شفقت کے ساتھ گلے سے لگایا میں نے شر صاحب کا تعارف کرایا انہوں نے بڑے تپاک سے ان سے ہاتھ ملایا اور صدر مقام پر بٹھا دیا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں **ملک** صاحب نے چونک

کر کہا معاف کیجیے گا شر رصاحب میں چائے بھول گیا ۔ ابھی حاضر کرتا ہوں ۔ یہ کہہ کر انہوں نے ملازم کو آواز دی ۔ شر رنے کہا میرزا صاحب چائے کی قطعی زحمت نہ فرمایئے ملک صاحب نے کہا بھلا جناب والا چائے میں زحمت ہی کیا ہوتی ہے شر رصاحب نے کہا بات یہ ہے میرزا صاحب کہ میں چائے قطعاً پیتا ہی نہیں ہوں اس لیے وہ ضائع ہو جائے گی ۔ ملک صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے ۔ اب شاعری شروع ہو گئی ۔ ملک صاحب نے پہلے اپنا کلام سنایا پھر شر رصاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی ۔ انہوں نے کہا میرزا صاحب مجھ ناچیز کا کلام سننے سے پہلے چائے تو پلا دیجیے ۔ یہ انوکھی بات سنتے ہی میرزا صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اور چائے آ گئی تو انہیں بڑے شوق سے چائے پیتے دیکھ کر وہ ہم سب لوگوں کو بار بار دیکھنے لگے ۔

گھر آتے ہی میں نے ان سے کہا کیوں شر رصاحب آخر آپ سب نے ہم سکی ناک کٹوا دی نا ۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ ظاہر کر دیا کہ آپ معمولی نہیں پرلے درجے کے سنکی ہیں انہوں نے بات کاٹ کر کہا سنکیہوں ہمارے دشمن ہم نے بفضلہٖ کوئی سنلکی بات نہیں کی ہے ۔ میں نے کہا دیکھیے خیریت اسی میں ہے کہ قائل ہو جایئے ۔ انہوں نے کہا قیامت تک قائل نہیں ہوں گا ۔ میں نے پوچھا پرانی قائل کر دینے والی صورت پر عمل کروں انہوں نے کہا سو بار عمل کر دیکھیے بندہ قائل نہیں ہونے کا ۔ میں نے کہا رئیس وہی پرانا عمل یہ سنتے ہی رئیس نے ان کو چارپائی سے گرا کر اپنی پہلوانی گھٹنا ان کے سینے پر رکھ کر پوچھا قائل ہوئے یا نہیں ۔ انہوں نے کہا نہیں ہرگز نہیں ۔ اب اور گھٹنا دبا کر پوچھا اب کہا اب بھی نہیں قطعی نہیں ۔ اور اب سہ بارہ جب رئیس نے اپنا گھٹنا ان کے سینے پر بہت زور سے دبا کر پوچھا اور اب تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے ۔ قائل قائل قائل ۔ اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے ۔ اور لطف یہ کہ تھوڑی دیر میں وہ قہقہے لگانے لگے ۔

اب ایک آخری بات سنا کر جو آج تک فراموش نہیں ہو سکی ہے ۔ ان کی داستان کو

ختم کر رہا ہوں۔

ایک روز آغاز بہاراں کے جادو بھرے گنگنا جمنی دھندلکے میں۔ جب کہ آسماں سے زمین تک منہپر مٹھاس اتر رہی تھی۔ ہم لوگ امرغان سحر کی بانگوں آمادہ سفر ستاروں اور ترانہ خواں جھونکوں میں ڈوبے ہوئے گومتی کے ساحل پر ٹہل رہے تھے کہ ایک دور کے مندر کے چراغ کی سہانی روشنی نے ہمکو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مندر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہم جھومنے لگے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ بڑی آہستگی کے ساتھ جھنکتا ہوا عرش بریں کی جانب اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ اور کائنات بھیرویں میں ڈوب کر یہ رباعی گنگنا رہی ہے۔

آتش   پۓ   مغاں   نے   راگ   گایا   تیرا
ہندو   نے   صنم   میں   جلوہ   پایا   تیرا
دہری   نے   کیا   دہر   سے   تعبیر   تجھے
انکار   کسی   سے   بن   نہ   آیا   تیرا

کہ اتنے میں ایک لالہ رخ طفل برہمن جسکا بھرا بھرا چہرہ پگھلتے ہوئے سونے سے ابل اور اچھل رہا تھا جس کی خواب آلودہ آنکھوں میں شام اودھ کروٹیں لے رہی تھی۔ اور جس کے ماتھے پر قشقے سے صبح بنارس طالع ہو رہی تھی۔ اپنے پھول سے گلے میں خیط ابیض اور قوس قزح کی سی آڑی زنار ڈالے ایسی ننداسی لٹک کے ساتھ مندر سے برآمد ہوا۔ جیسے کہرے کے پیچ در پیچ بھورے نم ناک لچھوں میں کنوار کی شعاع اولیں مچلتی نظر آتی ہے۔ میں نے شفق صبح کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اس طفل نواز کو دیکھا تو یا ہو کا نعرہ لگا کر سر دھننے لگا۔ اور شرر نے کلیجہ تھام کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے میری طرف نظر اٹھا کر دیکھا کہا بیٹے ابھی ابھی اس فتنہ دہر پر ایک شعر کہا ہے۔

کوئی   اس   وقت   برہمن   کی   صباحت   دیکھے

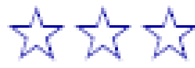
نکلے جب رات کا جاگا ہوا ب خانے سے!

ہائے وہ دھندلکا ہائے وہ بالکا ہائے وہ اثر ہائے وہ سماں؛ اس گھڑی کا ایک ایک لمحہ میرے دل میں آج تک برچھی کی طرح چبھا ہوا ہے۔

رنگ ل سینے میں چبھتا ہے کسے آواز دوں

بوئے گل دل میں کھٹکتی ہے الٰہی کیا کروں!!

؎ اثر صاحب اور میں



شاہ دل گیر اکبر آبادی

رسالہ نقاد کے مدیر‘ خاندان مشائخ کے چشم و چراغ دراز قامت دراز ریش دراس دست‘ کوتاہ ہمت‘ بخل پسند‘ پر کیسہ تہی دست‘ کثیر السواد‘ قلیل الرماد‘ بخوشی میہمان‘ بکراہت میز بان‘ عقاب پنجہ‘ کبوتر مزاج‘ خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب حسینوں کی جناب میں پارہ سیماب کیا کیا خصوصیات بیان کروں شاہ صاحب کے۔

وہ اس قدر تلملا جاتے تھے کہ ماہ جبینوں کو دیکھ کر کہ ان کے حواس بجا نہیں رہتے تھ۔راہ گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا‘ اس لیے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی تھی۔وہ اپنے ساتھی کی پسلی پر اس قدر زور سے کہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔اسی طرح جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے تو زور زور دادو دینے والے کی ران پر اپنا پیاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارتے تھے کہ وہ غریب اچھل جایا کرتا تھا۔

ایک بار وہ ٹونڈلہ جنکشن تک مجھے پہنچانے گئے تھے میری گاڑی کے بالمقابل ایک دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔اس گاڑی میں نہایت قبول صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔شاہ صاحب نے اسے دیکھ لیا وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔اور میری پسلیوں پر برابر کہنیاں مارنے لگے۔میری پسلیاں پھوڑا ہو گئیں۔تو میں نے تو قدم پیچھے ہٹ کر اسے قلی کو ان کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔وہ اس قدر محو تھے کہ انہیں اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ ......اور اب انہوں نے پھر بڑے زور سے کہنی ماری کہنی قلی کی پسلیوں میں لگی۔اس کے سر سے میرا بکس اور بستر گر گیا اس نے ہائے رام کہا اور اپنی پسلیاں پکڑ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا۔اور مجھ دکھتی پسلیوں کے درد رسیدہ سے بد بخت کی گاڑی چھوٹ گئی۔

آگرے کے اثنائے قیام میں ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔فانی و مانی کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کے وہاں پہنچا ان دونوں کو شاہ صاحب کے داہنے بائیں بٹھا کر خود ایک گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی فانی و مانی فوراً

تاڑ گئے میری شرارت کو۔ انہوں نے کہا جوش صاحب اپنی کرسی پر ہم دونوں کے درمیان لے آیئے میں سمجھ گیا کہ ان کی نیت اور اپنی جگہ سے یہ کہہ کر نہیں ہلا کہ ادھر ہوا خوب آ رہی ہے۔ اب شاہ صاحب نے شعر خوانی شروع کر دی۔ فانی و مانی بڑی آہستگی سے داد دینے لگے۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر زور سے داد دیں گے تو شاہ صاحب کا بھاری ہاتھ پڑنے لگے گا ان کی رانوں پر

اتنے میں انہوں نے جب اپنا یہ شعر سنایا

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل جو شہید جفا ہوا

تو ان دونوں کی چالاکی کا توڑ کرنے کے لیے میں نے ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ۔ شاہ صاحب نے بڑے زور سے جھوم کر فانی کی ران پر تڑاق سے ہات مار دیا۔ فانی کانپ اٹھے میں نے کہا شاہ صاحب مکرر ارشاد ہو......اور انہوں نے جھوم کر دوبارہ شعر پڑھا۔

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل جو شہید وفا ہوا

اب انہوں نے مانی کی ران پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ یہ بلبلا کر رہ گئے۔

میں نے کہا شاہ صاحب خدا کے واسطے ایک بار اور فانی اور مانی نے مجھ کو گھور کر دیکھا اور شاہ صاحب نے سہ بارہ......ارے تم کو نہیں ارے تم کو نہیں ارے تم کو نہیں...... مجھے تو ارے مجھے تو نہایت عزیز تھا۔ اب دونوں کی رانوں پر تڑ اتڑ تڑ اتڑ ہاتھ پڑنے لگے۔ اور میں ہنسی چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر جھومنے لگا۔

وہاں سے گھر آئے تو شاہ صاحب کے دونوں مضروب مجھ پر برس پڑے...... دونوں نے اپنی رانیں کھول کر دکھائیں۔ جن میں نیل پڑ چکے تھے۔ اور شاہ صاحب کی موٹی انگلیاں بنی ہوئی تھیں۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حضرت عزیز لکھنوی کے قابل شاگرد مجھ ہیچ مداں کے استاد بھائی علم عروض وفن شاعری کے مرکزی استاذ فارسی وانگریزی ادب کے زبردست نباض' قلزم انسانیت کے منارہ ضو بار' ممبر انتقاد کے خطیب اعظم مسند زبان کے قاضی القضات اور مدینہ تہذیب لکھنو کے طاق زریں کے ہزروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں ایک ایسے آخری وتنہا چراغ تھے جن کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے اور ہر ذرہ کراہ کراہ کر فریاد کر رہا ہے کہ

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!

ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں ایک پوری صدی ایک پورے طرز معاشرت کی موت ہے۔ اور نصیر الدین حیدر سے لے کر حضرت جان عالم کے زریں دور لکھنو کے اولیائے علم وائمہ ادب نے شائستگی' تہذیب' نفاست' لطافت' اور آداب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا۔ اور اس کے دوش بدوش انہوں نے جس وضع داری ایثار پسندی' تواضع شعاری نرم گفتاری شیریں لہجگی اور بلور مزاجی کو فروغ بخشا تھا اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

سنسان مثل وادی غربت ہے لکھنو
شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا

میں نے جب حضرت عزیز کے مکان پر سب سے پہلے انہیں دیکھا تھا تو اس وقت میری جوانی کی پہلی کرن پھوٹی تھی۔ اور وہ جوانی کی دوپہر سے گزر رہے تھے۔ میرے ان کے مابین چھوٹے اور بڑے بھائی کا سا برتاؤ تھا۔ اور چوں کہ وہ شدت ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اس لیے میری آزاد خیالی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے اور اکثر مجھ کو ٹوکا کرتے تھے۔

اور رفتہ رفتہ جب میرے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی تو ایک

www.pdfbooksfree.pk

روز میں نے کہا اثر صاحب اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں انہوں نے کہا شوق سے کہیے۔

میں نے کہا تمام ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لیے فرنگی کے روبرو خم ٹھونک کر میدان میں آ چکا ہے محبان وطن دھڑا دھڑ نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں اور آپ حسین کے پرستار ہونے کے باوجود ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھے عصر حاضر کے یزید فرنگی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس؟ میری یہ بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ ملگجا سا ہو گیا کوئی چیز ان کی پتلیوں میں چبھنے لگی؟ اور انہوں نے آنکھیں جھکا لیں اور میں ان کے چہرے پر اس قدر کرب انگیز شرمندگی دیکھی کہ پھر تمام عمر ان سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ان کی شاعری کا بھی میں کبھی قائل نہیں رہا۔ لیکن ان کے بے پایاں شرافت اور بے کراں زبان دانی کا ہمیشہ لوہا مانتا رہا ان کے تمام بے شمار خوبیاں سر آنکھوں پر لیکن ان کو اپنا کلام سنانے کا اس قدر ہوکا تھا کہ سامعین کی قوت برداشت کی ہڈیاں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ معرض تحریر میں لا رہا ہوں جس کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اور بھی اور بھی سانسیں لینے لگیں گے۔

ایک بار مجاز کو ساتھ لے کر میں کشمیر گیا۔ اس دور میں مہاراجہ کشمیر حکم راں اور اثر صاحب کسی شعبے کے وزیر تھے۔ میں وہاں گیا تو تھا یہ نعرہ لگاتا ہوا کہ

عصیاں کی گھٹا کی چھاؤں میں دم لینے
ممنوع شجر سے لطف پیہم لینے
آواز دو کاشمیر آ پہنچا جوش
اللہ سے انتقام آدم لینے

لیکن وہاں پہنچا وت نواب جعفر علی خاں اثر کے ذوق غزل سرائی کی آہنی پھکی میں بند ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

ہاں تو سنیے کہ ہم کشمیر پہنچے تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں نے کہا مجاز اس وقت تو یہ مناسب معلوم وہ رہا ہے کہ ہم شیخ عبداللہ اور اثر صاحب کو انے آنے کی اطلاع نہ دیں' اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں' ہوٹل میں ہم نے اپنا شغل شروع کر دیا۔ اور جب مجاز نے برآمدے میں کھڑے ہو کر سری نگر پر نگاہ ڈالی تو کہا جوش صاحب یہ شہر تو ایسا ہے گویا ہم مار برے آ گئے ہیں اس لطیفے پر ہنس ہنسا کر ہم سو گئے۔

بہت تڑکے میں نے مجاز کو جگایا انہوں نے لیٹے لیٹے آنکھیں کھول کر کہا معاف کیجیے یہ وقت کووں کے جاگنے کا ہے میں بستر نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر کہا ارے کم بخت دم بھر میں صبح کا گنگا جمنی جلوس گزرے گا۔ اور تو اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر سے اس جلوس کو گزار دے گا۔ یہ کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے ارے کشمیر میں صبح کیوں کر ہوتی ہے یہ تو دیکھ لیے۔ الغرض مجاز کو زبردستی ساتھ لے کر ٹہلنے چلا گیا۔ ابھی مشکل سے دو میل ٹہلا ہوں گا کہ دیکھا کہ ایک کوٹھی کے پھاٹک کے ستون پر نواب جعفر علی خان کا بورڈ لٹکا ہوا ہے ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں پھاٹک کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں انہوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا۔ وہ لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے ہم سے بغل گیر ہوئے۔ پوچھا یہاں کب آئے میں نے کہا شام کو۔ انہوں نے کہا ٹھہرے کہاں ہیں میں نے کہا ہوٹل میں انہوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا میرے وہاں سیدھے کیوں نہیں چلے آئے کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے آواز دی کوئی ہے اردلی دوڑا آیا انہوں نے اس کو حکم دیا کہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے اور بل ادا کر دے۔ میں نے کہا بل میں ادا کروں گا۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس مرحلے کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے۔ اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر فوراً کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر ایک موٹی سی بیاض لے کر باہر آ گئے اور ایک دم سے غزلوں کی گولیاں دنا دن دنا دن دنا دن چلانے لگے۔

www.pdfbooksfree.pk

جب اس طرح ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا۔ کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے۔ تم حمام و ناشتہ ہی کیا ہے۔ میں نے مجاز کو اور مجاز نے مجھے بے کسی کیساتھ دیکھا اسی کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے کہ اتنے میں سیکرٹری نے آ کر کہا کہ سرکار ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ دس بجے مہاراجہ کی ڈیوڑھی میں آپ کو تشریف لے جانا ہے۔ انہوں نے بڑی بے لطفی کے ساتھ بیاض بند کر دی۔ سامنے والے کمرے کی طرف آوازہ کر کے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراجہ کے پیلس چلے گئے۔ اس غزلوں کے دونگڑے کے بعد ہم نے خط بنایا اور حمام و ناشتہ کر کے لیٹ گئے اور مسلسل غزلیں سننے اور پیاپے داد دینے کے تکان کی بنا پر ہم کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹے تک برابر ہم سوتے رہے اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ گھڑی ایک بجا رہی ہے۔ اور حضرت اثر ایک لنبوترا سا رجسٹر بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں میں نے کہا تو اتنا وقت دیجیے کہ ہم دوبارہ نہا دھو کر کپڑے پہن لوں انہوں نے کہا میں آپ کو اسی طرح کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کراؤں گا۔ اور یہ کہتے ہی انہوں نے وہ لنبوترا سا رجسٹر کھول لیا۔ انہوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آ کر کہا۔ سرکار لنچ تیار ہے۔ انہوں نے کہا آیئے لنچ کر لیں۔ لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دہرے مشاغل بیک وقت جاری ہو گئے۔ اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا کہ کانوں میں مناظر کشمیر پر نظمیں منہ میں نوالے اور ہونٹوں پر سبحان اللہ کے جھوٹے نعرے۔ اور اس طرح وہ لنچ ہم دونوں کو تناول فرمانے لگا۔

اور خدا خدا کر کے جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ ہم کو کھا کر ختم ہوا تو۔ ہات دھو کر ہم اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے اور شاید ابھی مشکل سے دو تین کروٹیں ہی لی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لے کر آ گئے۔ اور یہ کہہ کر نظمیں سنانے لگے کہ دیکھیے بدنصیب شاعرہ سیفو کی ناتمام نظموں کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر یہ نظمیں کہی ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

اور جب نظمیں سنتے سنتے پانچ بج گئے تو میرا دماغ سنسنانے لگا۔ میں نے کہا میں دونوں وقت حمام کرتا ہوں۔ آپ اجازت دیں اگر حمام کر کے چائے پی لوں تاکہ تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں میں غسل خانے چلا گیا۔ وہ مجاز کو اپنا کلام سناتے رہے۔ اور مجاز کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی واہ واہ ہوا میں تیرنے لگی۔ واااے اے اے اے واااے ایاے اے میں حمام کر کے نکلا تو انہوں نے کہا یہاں مجاز تم بھی حمام کر آؤ انہوں نے کہا میں تو صبح کو بھی نہیں نہاتا۔ یہ دو فیرا غسل جوش صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اور چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی پی کر وہ سیفو کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں بڑی کراہ کے ساتھ آفتاب ڈوب گیا۔ فضا سانولی سلونی ہو گئی۔ اثر صاحب نے ہم دونوں قربانی کے بکروں کو بڑے شاندار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا بلب روشن کر دیے ہیٹر جلا دیا۔ اعلیٰ درجے کی وسکی کی بوتل نہایت خوبصورت گلاس اور تلے کاجو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت سی اگر بتیاں جلوا دیں۔

اب ہم دن بھر کے جھنجھوڑے بھنبھوڑے اور دوہے ہوئے تھکے ماندے بندوں نے اپنے اپنے پیالے بھرے الحمدللہ کہہ کر دو دو گھونٹ پیے مجاز نے سگریٹ اور میں نے سگار سلگالیا۔ اور وہ یک بغلی کمرے سے نکل آئے۔ ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور میر تقی میر کے رنگ کی غزلیں سنانے لگے اور میدان داد کے ہم دونوں کرائے کے ٹٹو پھر دلکی پولی سگوری قدم اور سرپٹ کے جوہر دکھانے لگے۔

اور جب رات کے گیارہ بج گئے تو مجاز کو ال الا کے قے ہو گئی۔ دو اردلی ان کو پکڑ کر خواب گاہ میں لے گئے۔ دو فرش صاف کرنے لگے۔ اثر نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میر کے رنگ کی غزلیں پھر سنانے لگیں میں نے ان کے ارادے کو بھانپ کر گردن ڈال دی اور محفل برخواست ہو گئی۔

اور صبح کو چار بجے میں نے جب مجاز کو جگایا تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثر صاحب آ گئے ہیں اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہنا شروع کر دیا سبحان اللہ جواب نہیں ہے اس شعر کا۔اس کی اس داد پر میں جب ہنسنے لگا تو اس نے آنکھیں پھاڑے کر مجھے دیکھا اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔جعفر علی کاں نہیں جوش صاحب آپ ہیں۔اور ہم دونوں اس وقت زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔جوش صاحب کیا میری ماں نے مجھ کو صرف اس لیے پیدا کیا تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں تو آپ کے ساتھ کشمیر جاؤں اور کشمیر کی سیر کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔اور آپ میری بات مانیں ابھی سویرا ہے اس وقت یہاں سے چپک چپاتے بھاگ کھڑے ہوں اور کسی دور کے ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو جائیں میں نے کہا یہ تمام سامان کیا ہم اپنے سروں پر لاد کر لے جائیں گے۔ اسنے کہا جس ہوٹل میں ہم نے کل رات بسر کی ہے وہیں ٹیکسیوں کا اڈا ہے۔میں ٹیکسی کے ساتھ مزدور بھی لاؤں گا۔ٹیکسی کو پھاٹک کے باہر ٹھہرا دوں گا۔اور مزدور یہاں سے سامانجانے کر ٹیکسی میں رکھ دیں گے۔مں نے کہا بڑی اچھی تدبیر ہے دیر نہ کرو ابھی جاؤ۔

جب ٹیکسی آ گئی اور سامان رکھ دیا گیا تو میں نے کہا ڈرائیور صاحب ہم کو کسی ایسے ہاؤس بوٹ تک پہنچا دو جو یہاں سے دور ہو۔ڈھونڈنے والے کو آسانی سے نہ مل سکے۔

ٹیکسی والے نے ہم کو غالبًا ہائی کورٹ کی پشت کے ایک ایسے ہاؤس بوٹ میں لے کا کر ٹھہرا دیا جو گزرگاہ عام سے دور تھا۔وہاں پہنچکر ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔میں نے خط بنایا حمام کیا غسل خانے سے نکلکر جب ناشتے کی میز پر بیٹھا تو دیکھا کہ مجاز سو رہا ہے۔میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کو جگاؤں تنہا ناشتہ کیا اور ٹہلنے نکل گیا۔ٹہلنے میں زیادہ لطف نہیں آیا۔اس لیے کہ حضرت اثر کے کلام کی لگاتار بارش سے میرا سر کپوہ چکا تھا۔ہاؤس بوٹ میں جا کر سو گیا۔دن کے ایک بجے آنکھ کھلی

دیکھا کہ مجاز سو رہا ہے۔ اسے جگایا دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا۔ مجاز سے کہا جلدی جلدی خط بنا کر نہا ڈالو مجاز نے کہا کل خط بناؤں گا۔ میں نے کہا اچھا تو پھر حمام ہی کر آؤ اس نے مسکرا کر کہا جوش صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں پنڈت دوارکا پرشاد نہیں کہ اشنان کریں میں نے کہا یوں کہو ہم گندے مشٹنڈے ہیں ہم کو حمام سے کیا کام۔ اور مجاز نے فقط دو چھوٹی کلیاں کر کے ناشتہ شروع کر دیا۔ اور مجھ کو گھن آنے لگی۔

کوئی چار بجے کے قریب میں نے دریا کا لطف اٹھانے کیلیے شکارا بلایا اور شکارے پر اپنا افطار کا سامان رکھوا دیا۔ تو مجاز نے بڑی بھیانک آواز میں کہا۔ جعفر علی خاں کی سی صورت کے کوئی صاحب ہائی کورٹ کی سیڑھیوں سے اترتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا ایسی بھیکا نہ نکالو منہ سے کوئی اور ہو گا۔ مجاز نے کہا ارے جوش صاحب سچ مچ جعفر علی خان چلے آ رہے ہیں آیئے صوفوں کے نیچے لیٹ جائیں میں نے کہا یہ تو شتر مرغ کیسی حرکت کی ہو گی جو طوفان کے وقت ریگ میں اپنا منہ چھپا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ طوفان گزر گیا۔ اتنے میں دو تین وردی پوش آدمیوں کے ساتھ جعفر علی خاں ساحل پر آ گئے' اور ان کے آدمی کشتی بانوں سے ہمارے قیافے بتا کر پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کس ہاؤس بوٹ میں ہیں۔

ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ ہمارے ہاؤس بوٹ کا ملاح جو سامان لینے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ کم بخت ادھر سے گزرا۔ اور جب ہمارے قیافے بتا کر ہمارا پتا پوچھا گیا تو اس نے کہا آیئے میرے ساتھ وہ ہمارے ہی بوٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے ان کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تو ہم اس طرح سراسیمہ ہو گئے جس طرح جیل سے بھاگے ہوئے چور پولیس کو تعاقب میں آتا دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں۔

اتنے میں وہ آ گئے اور چھوٹتے ہی انہوں نے کہا۔ کیوں جوش صاحب دوستوں کے گھر سے کوئی یوں بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر میرے ہاں کوئی تکلیف تھی

www.pdfbooksfree.pk

تو مجھ سے کہہ دیتے۔ میں اسے رفع کر دیتا۔ آپ کو معلوم نہیں۔ صبح جب میں آپ کے کمرے میں چلا گیا اور کمرے کو خالی پایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے آدمی آپ کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیے۔ اور جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے وہاں کے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے جب یہ پتا چلا کہ آپ ہائی کورٹ کی پشت کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں خود آیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔

ان کی شکایت سے میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور کہا اثر صاحب یہ مجز دا مجاز ہے جو مجھے آپ کے دولت کدے سے بھگا یہاں لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کشمیر آنا اور ہاؤس بوٹ میں نہ ٹھہرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ انہوں نے کہا مجھ سے کہتے میں سرکاری ہاؤس بوٹ کا بندوبست کر دیتا۔ میں نے آنکھیں جھکا کر کہا بڑی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میرا مزاج تو دوانہ راہ ہوئے بس است کا سا ہے۔ مجاز نے ہو کہا اور میں دیوانہ بھاگ کھڑا ہوا میں دست بستہ آپ سے معافی کا طالب ہوں آپ کریم ہیں معاف فرما دیں۔

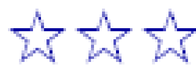
اثر صاحب نے مسکرا کر مجھے گلے لگا لیا۔ مجاز سے کہا تم بڑی بس کی گانٹھ نکلے۔ اس کی آنکھیں رپر پانے لگیں۔ اثر صاحب نے ایک وردی پوش کو آواز دی اور انہوں نے کہا بوتل لاؤ اس نے بوتل سامنے رکھ دی۔ مجاز بوتل کی طرف ہڑبڑا کر جھکے میں نے کہا آفتاب ڈوبنے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی ہیں۔ ٹھہر جاؤ مجاز منہ بنا کر بیٹھ گئیل اور اثر صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ اور ہماری سیر دریا کی تمنا پر پانی پھر گیا۔

دوسرے دن صبح کو ٹہل کر جب میں ہاؤس بوٹ میں آیا تو مجاز نے کہا اب کیا کریں اثر صاحب نے گھر دیکھ لیا ہے کسی اور ہاؤس بوٹ میں چلے جائیں۔ میں نے کہا وہ سمجھ جائیں گیک ہم ان سے منہ چھپا رہے ہیں۔ اس پر مجاز نے کہا تو پھر آج جلدی کھانا کھا کر دو بجے ہی شکارے پر بھاگ کھڑے ہوں اور گھوم گھام کر ہتھری اوک

والے جزیرے جائیں اور وہیں بیٹھ کر شغل کریں۔

اس تجویز پر عمل کر کے ہم لوگ دو بجے ہی شکارا منگا کر نکل گئے اور بہت سے مقامات کی سیر کر کے تھری اوک کے جزیرے میں شام ہوتے ہی پہنچ گئے بساط بادہ خواری بچھا دی گئی۔ور ماہ یک ہفتہ کو سلام کر کے پیالے بھر دیے گئے۔اور آہستہ آہستہ پینے لگے۔اور مجاز نے بڑے ولولے کے ساتھ کہا اب پکڑ لیں ہم کو نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ابھی ان کی آواز گونج ہی رہی تھی کہ دیکھا کہ ایک شکارا دور سے ہماری طرف چلا آ رہا ہے اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہوگئی۔دریا کا پانی جھلکنے اور کڑم کڑم کرنے لگا۔اور شیشوں کی آگ ہمارے جسم میں دوڑنے لگی۔کہ اتنے میں وہ شکارا قریب آ گیا۔مجاز نے شکارا کو غور سے دیکھا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے مجھ سے کہا ارے جعفر علی خاں چلے آ رہے ہیں۔میں نے کہا دیوانے ہو گئے ہو انہوں نے کہا ارے وہی عینک ارے وہی شیین کیپ ارے وہی شیروانی ہائے رام ہائے رام!

اتنے میں شکارا ہمارے جزیرے سے آ کر لگ گیا۔اور اثر صاحب اتر کر ہماری طرف آنے لگے۔ہم کھڑے ہو گئے انہوں نے کہا تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا۔اور یہ مصرع سنا کر انہوں نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔



www.pdfbooksfree.pk

حکیم آزاد انصاری

رقت انگیز حد تک نحیف الجثہ تھے۔ چٹ کی طرح لانبے ٹھڈی پر' سفید فرنچ کٹ داڑھی۔ سر پر بے پھندنے کی ترکی ٹوپی چہرہ لانبا نفاذ آنکھوں پر موٹے تالوں کی عینک سخن سنجوں کے امام' مولانا حالی کے شاگرد اور سہل ممتنع کے وحدہ لاشریک شاعر۔

حیدر آباد دکن میں ان سے تعارف ہوا تھا۔ اور پہلی ملاقات کس قدر پھیکی سی رہی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ جب ان کے جوہر کھلنے لگے تو ہمارے مابین پینگ بڑھتے گئے۔

وہ اوپر سے خشک و بے رنگ نظر آتے تھے لیکن اندر سے بے حد تر و تازہ تھے اور رنگین تھے۔ اور اسی رنگینی کی بنا پر وہ اپنے بیٹے احسان احمد سے ناخوش ہو کر جو کٹھ ملا اور اپنے باپ سے کھنسانے والی بیوی کے اشاروں پر چلتا۔ اور بیوی کو باپ پر ترجیح دیتا تھا۔ مستقل طور پر میرے پاس رہنے لگے تھے۔

ابرار ان کو چھیڑ کر لطف اٹھاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ آزاد صاحب اگر آپ اپنی زبان کو موچ نکالنا چاہتے ہوں وخدارا لکھنو جا کر وہاں سال دو سال قیام کیجیے اور یہ ممکن نہیں تو ایک روز لکھنو کا ٹکٹ لے کر جایئے چار باغ اسٹیشن پر اتر یئے اور وہاں کی کسی دیوار کو چھو کر ہی پلٹ آیئے۔ زبان آجائے گی۔ آپ کو۔ اور آزادہ صاحب آپ کو آپ زبان تو آپ کے استاد حالی کو بھی نہیں آتی تھی۔ اور وہ جو برسے گا پانی تو جائے گا دھل کی حد تک تعیقیہ کے مرض میں گرفتار بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مملکت تعقید کے وہ مطلق العنان بادشاہ تھے۔ اور آزاد صاحب بگڑ جاتے اور دو دو تین تین دن ان سے بات ہی نہ کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی خدیجہ بی کی لوح قبر کے واسطے ایک قطعہ کہہ کر ابرار کو سنایا جس کا قافیہ و ردیف تھا ''عزت خدیجہ بی'' اور ''تربت خدیجہ بی'' اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

دل سے سارے عزیز کرتے ہیں

تو ابرار نے قہقہہ مار کر کہا قرآن مجید کی قسم اب تو آپ گالیاں بھی بکنے لگے ہیں۔

انہوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ بھلا اس میں گالی کی کیا بات ہے ابرار نے کہا پہلے مصرعے ہی میں ایک تگڑی سی گالی بن گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں دل سے سارے عزیز کرتے تھے۔ یعنی بڑے ولولے کے ساتھ مرحومہ کے ایک دو نہیں سارے عزیز ان کے ساتھ کرتے تھے۔ جناب والا اس کرتے تھے۔ سے ذہن جس طرف منتقل ہوتا ہے۔ آپ اس سے واقف نہیں خدیجہ بی کا بیٹا آئے گا۔ تو اس سے کہوں گا کہ بھائی اپنی ماں کی لوح مزار پر یہ قطعہ تاریخ ہرگز نہ کھدوانا ورنہ والدہ مرحومہ کی ناک کٹ کر رہ جائے گی۔

انہوں نے کہا لکھنو والوں کا مذاق متبذل ہے۔ اس لیے آپ کو میرے مصرعے میں ذم کا پہلو نظر آ رہا ہے۔ ابرار نے کہا جی ہاں یہ تو وہی بات ہوئی کہ اگر کسی حبشن کے گردے کے سے موٹے موٹے ہونٹوں کو دیکھ کر ہم قہقہہ ماریں تو افریقہ والے یہ ارشاد فرمانے لگیں گے۔ کہ تمہارا مذاق متبذل ہے۔ حضور والا متبذل چیز کو سن کر یا دیکھ کر اعتراض کرنا تو اس امر کی دلیل ہے کہ اعتراض کرنے والا ابتذال سے کوسوں دور ہے۔ میں آپ کے مصرعے کے خاندان کے چند شعر اور مصرعے سناتا ہوں۔ آپکو خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا اعتراض کس قدر درست ہے سنیے ایک صاحب فرماتے ہیں۔ کھڑا ہے دیر سے در پر ترے۔ عشاق کا مجمع خدا لگتی کہیے گا آزاد صاحب لفظ مجمع سے پہلے ہی ذم کا پہلو نکل آیا ہے کہ نہیں؟ اسی طرح ایک صاحب فرماتے ہیں۔

دل کو ہم اپنے تسلی شب غم دیتے ہیں
جس کو تم دے نہیں سکتے اسے ہم دیتے ہیں

آپ سمجھے لینے دینے کرنے اور کرانے میں کس قدر ذم کے پہلو ہیں؟

ایک اور مصرع سنیے قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر خیال تو کیجیے۔ خبر تک

آتے آتے مبتدا ہی میں ایک فحش بات نکل آئی۔ کہ نہیں؟ یونہیں ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں جو روح کو گرما دے جو قلب کو تڑ...... پادے آپ نے پادے کے ساتھ یہ تڑ کی آواز سنی فرمایئے کیا ارشاد ہے۔لیکن پہلے منہ پر رومال رکھ لیجیے۔ اسی طرح ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں۔ ساقی مجھے......کوثر پہ......کھڑا کر کے دکھا دے۔حضور والا یہ فحش التجا کی جا رہی ہے کس سے؟ حضرت علیؓ کے سے جلیل القدر امام سے استغفر اللہ بس ایک اور شعر سن لیجیے

خدا کے واسطے جلدی سے اب کہیں گردن
کوئی ملول کی اس رہ گزار میں مارے

ارے ڈہائی لاٹ صاحب کی حد کر دی ملول صاحب نے ذرا دیکھیے تو حضرت ملول کس امر قبیح کی التجا فرما رہے ہیں۔اور وہ بھی خدا کا واسطہ دے کر انتہا کر دی بے شرمی و بے ادبی کی۔

اب ان مثالوں کی روشنی میں اپنا مصرع خود ملاحظہ فرمایئے دل سے سارے عزیز کرتے تھے۔ ہائے مر جانے کے بعد خود خدیجہ بی اور ان کے ساتھ ساتھ انکے سارے عزیزوں کے ایک پوشیدہ شرمناک راز کو آپ نے افشا کر دیا۔انہوں نے کہا سمجھ میں آ گئی بات واقعی بیہودہ مصرع ہے۔ بدل دوں گا اسے یہ تھی انصاف پسندی حضرت آزاد کی۔

میں غزل کا مخالف اروہ غزل کے شیدائی تھے۔اس سلسلے میں اکثر میری ان سے دو دو چونچیں ہوا کرتی تھی۔اور میری باتوں سے جل کر انہوں نے میرے خلاف ایک بڑی اچھی رباعی کہی تھی آپ بھی سن لیں

کہتے ہو جچتی نہیں اب شان غزل
ممکن ہو تو ڈھا دیجیے ایوان غزل
سرکار غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر

افسوس ہے اے نمک حراماں غزل

اور میں نے اس قافیہ و ردیف میں ایک جوابی فحش رباعی کہی تھی جس کو اپنی شرمیلی قوم کے گوش گزار نہیں کر سکتا۔ ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اور آزاد اور سید علی اختر اختر حیدر آبادی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خانہ زار سخاوت مینا خاتون اور گلاسوں کو ایک جھلجھلاتی ٹرے میں لے کر آ گیا۔ اگر بتیاں جلا دیں۔ میں نے اپنا گلاس بنانے کے بعد مزاحاً دو گلاس اور بھرے اور اختر و آزاد کے سامنے رکھ دیے۔۔ اختر گلاس سے ہٹ کر اس طرح پیچھے ہٹ گئے کہ اگر نہیں ہٹتے تو وہ انہیں ڈنک مار دے گا۔ لیکن آزاد جمے بیٹھے رہے۔ میں نے اختر کے سامنے کا گلاس یہ کہہ کر اٹھا لیا کہ

مے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب

پیش ایں قوم بشوربہ زمزم نہ رسد

اور آزاد نے کہا بسم اللہ اختر نے کہا خدا کے واسطے یہ ام الخبائث ان کے سامنے سے ہٹا لیجیے۔ میں نے آزاد سے پوچھا کیا آپ بھی اس جوہر ناب کا ام الخبائث سمجھتے ہیں انہوں نے کہا نعوذ باللہ میں تو اس کو عشق را پروردگارے حسن را پیغمبر سمجھتا ہوں اختر نے آزاد صاحب غالباً آپ مزاحاً ایسا کہہ رہے ہیں دل سے ایسا نہیں سمجھتے اس لیے خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔

انہوں نے کہا اختر صاحب میرا لڑکا مسلمان اور کٹھ ملا ہے اور شاید اسی انحطاط پر حشر میں بھی پکڑا جاؤں گا آزاد نے یہ کہہ کر پیانہ منہ کو لگا لیا۔ اختر اس طرح اچھل پڑے جیسے گویا بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہے۔ اور ارے' ارے' ارے' ارے' رے' رے' رے' رے' رے کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس روز کے بعد وہ میرے ساتھ برابر پینے لگے پینے کے بعد وہ کبھی بگڑتے نہیں بشاش سے بشاش تر ہو جایا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات دو پیگ پی کر کھڑے ہو جاتے اور پینے والوں کو چونچ دکھا دکھا کر توں توں توں توں کی آوازیں نکالنے لگتے تھے۔

ایک بار جب وہ میرے ساتھ بمبئی گئے اور اصغری بیگم کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے میں انکو ساتھ لے کر سیر کو نکلا اور دن بھر گھوم گھام کر سہ پہر کو گھر پلٹا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جب باہر جانے لگا تو میں نے کہا آزاد صاحب آپ بوڑھے آدمی ہیں اب میرے ساتھ نہ چلیں گھر ہی میں آرام کر لیں تو نہوں نے کہا بوڑھے ٹھوڑے ہوں گے آ میں تو بہتر سال کا نوجوان ہوں آپ کیساتھ چلوں گا۔اور جب مالا بار کے باغ میں انہوں نے حسینوں کے ایک پرے کو دیکھا تو چیخ ماری ارے مر گئے تمام مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگے ہر شخص ان کی طرف دیکھتا کہ چیخ کی آواز انہیں کی جانب سے بلند ہوئی تھی۔مگر ان کی سفید ڈاڑھی دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا 'اور یہ خیال کہ اس عمر کا شخص جو بڑی سنجیدگی کیساتھ اپنی فرنچ کٹ ڈاڑھی کھجارہا ہے بھال اس طرح چیخ مار سکتا ہے۔

افسوس کہ ہندوستان میں جیسی ہونا چاہیے تھی ان کی قدر نہیں ہوئی۔ ہر چند وہ اپنے عصر کے برے بڑے مشہور شاعروں سے بمراحل بلند تھے۔لیکن گمنام رہے اور آج تک گمنام ہیں۔

وہ الفاظ کی نثری ترتیب کے ساتھ شعر کہتے تھے۔اور اس ترتیب کے باوجود وہ اپنے افکار کی بلندی اور شعریت کی رنگینی کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔نثری ترتیب کی پابندی کے ساتھ کہنے والے اور شعراء بھی گزر چکے ہیں مگر ان کی شاعری کی بولی ٹھولی سے آگے نہیں بڑھ سکی مثلاً

جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب و رکیب سب جانتے ہیں

یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا
آج تو ہم بھی بڑا جی کر گئے

وہ ہلتے لب تمہارے وعدے پر
وہ تمہاری زبان سے انکار

جب کہا ہائے دل زار تو اس نے یہ کہا
جی دل زار دل زار کے ٹکڑے کر دے

ایک ، دو ، تین، چار ، پانچ نہیں
سب خطائیں مری معاف کر دو

کہا خلوت میں مل بیٹھیں کہا خلوت میں مل بیٹھو
کہا ہیجان کا ڈر ہے کہا ہیجان تو ہو گا

میں نے کہا علاج دل درد مند کر
کہنے لگا وہ شوخ کہ بکواس بند کر

آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ ان اشعار میں رکھا ہی کیا ہے۔ لفظوں کے طوطے اڑ گئے ہیں اور بس۔

اب نثری ترتیب میں آزاد صاحب کے اشعار آب دار ملاحظہ ہوں وطرح تھی زماں اور بھی ہیں مکاں اور بھی ہیں۔

کبھی مے درد مے کے علاوہ
مراعات پیر مغاں اور بھی ہیں
فقط وجہ قرب خدا ہی نہ سمجھو

مفادات عشق بتاں اور بھی ہیں

اگر ارشاد حالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں
بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

دیکھنا حضرت آزاد تو محفل میں نہیں
کہ ہمیں بوئے نفوس فقراء آتی ہے

اک پائے مال جور سے امید شکر جور
جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی



فانی بدایونی

تاج باختہ بادشاہوں' روزگار گزیدہ فن کاروں' امید بریدہ مریضوں' شب دریدہ محبوبوں معشوق سوختہ عاشقوں پریدہ رنگ بیوہ نوعروسوں' پرسر مردہ باپوں اور پدر گم کردہ یتیموں کے کیمہ سوگواری میں بیٹھ کر...... مغموم قدرت نے ......غم دوراں اور غم جاناں کے آفات' ورتھر کے مصائب اور شوپن ہار کی نامرادی کے تحت میں...... دیوار گریہ کی مٹی کو...... میر تقی میر کے آنسوؤں میں تر کر کے گوندھا...... اس مٹی سے ایک دبلا پتلا گندمی رنگ کا پتلا بنایا۔ اس پتلے کے دھڑ کتے ہوئے دل میں تمنائے مرگ کی روح پھونک دی۔ اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی ۔ میں سب سے پہلے ان سے لکھنو میں ملا تھا جہاں وہ اس طرح وکالت کرتے تھے کہ ہفتے میں بمشکل دو ایک بار عدالت جاتے زیادہ وقت محبوبہ کے گھر میں کھپاتے ۔ اور فرصت کے اوقات میں مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض مجھ کو اپنی معشوقہ کی تصویریں دکھاتے' اور پہروں اس کی داستانیں سناتے تھے ۔

میں بھی اسی دور میں خیر سے عاشق تھا۔ اس لیے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان کی محبوبہ لکھنو چھوڑ کر آگرے چلی گئی تو وہ بھی وکالت کرنے آگرے چلے گئے ۔ اور میرے حالات نے مجھ کو حیدر آباد دکن پہنچا دیا۔ اور بصرا رفت و من در کوچہ بارسوا شدم! کچھ روز کے بعد وہ غم جاناں اور غم دوراں کے ستائے ہوئے حیدر آباد آئے مہاراجہ سے ملا کر میں نے ان کی ملازمت کی سبیل نکال دی ۔ اور وہ کسی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے ۔ اور قیس عامری نے معلم کا لباس پہن لیا ۔لیکن معلمی زیادہ دن چلی نہیں اور جب وہ ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تو مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ...... اس زمانے میں وہ شاہ زادہ معظم کی سرکار میں بھی جانے لگے لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اور انہوں نے وہاں اپنا وقت مفت ہی گنوایا۔

میرے تمام معاصرین میں وہ سب سے بمراحل بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے ۔

میں ان کے غم پرستی کا قائل نہ سہی لیکن یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ ان کی غزل کا قافی پیائی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان کی ہر غزل ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص فکر کی حامل ہوتی تھی ۔ جس کی آج تک کوئی نقل نہیں کر سکا۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے ان بے چارے کو اس قدر ادھیڑ دیا تھا کہ زندگی کے دور آخر میں ان کو اپنے انتہائی وفادار دوستوں پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اور وہ صورف یہیں تک آ کر ٹھہر گئے تھے بلکہ یہاں تک سمجھنے لگے تھے کہ ان کے تمام دوس ان کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اورتو اور انہیں میری طرف سے یہ بھی بدگمانی پیدا ہوگئی تھی کہ میں بھی ان کے درپے ہوں آزار ہو گیا ہوں ۔ حالانکہ میں ان کا عاشق دوست تھا۔

ان کی بدگمانی اس قدر بڑھ چکی تھیکہ اگر وہ کسی مچھر کو اپنی طرف آتا دیکھ لیتے تو کہتے تھے ہو نہ ہو یہ ملیریا کا مچھر میرے کسی دیرینہ دوست نے اس لیے بھیجا ہے کہ یہ مجھے کاٹ لے اور میں ملیریا میں گرفتار ہو جاؤں وہ طبعا غم دوست اور نشاط دشمن انسان تھے۔ اور معاشقہ و معاش کی پیہم ناکامیوں نے ان کو اس عقیدے پر قائم اور اس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہنسنا یا قہقہہ لگانا ایک نا قابل عفو گناہ ہے۔ اور حیات انسانی ایک بے گوروکفن لاش ہے اور لاش کے سرھانے کھڑے ہو کر ہنسنا سب سے بڑی شقاوت کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ جہاں تک کہ انسان کی دردمندی کا سوال ہے میں ان کا سو فیصد ہم خیال ہوں اور یہ کس کی مجال ہے کہ وہ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں کا انکار کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود میرا یہ خیال ہے کہ دانائی اور ذہن کی تو انا ئیکا یہ فرمان ہے کہ غم دل پر دستک دے ہم اس کے واسطے دروازہ کھول دیں۔ اس کو مہمان ٹھہرائیں...... لیکن دوسرے دن کرن پھوٹنے سے بہت ہی پیش تر ہم اس کو اپنے دل سے رخصت کر دیں۔

اس لیے کہ

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

افسوس کہ میرے دوست فانی کو جینے اور بہر حال خوش رہنے کا یہ گر معلوم نہیں تھا۔ وہ غم کو پالتے پوستے پروان چڑھاتے چھاتی سے لگائے رہتے اور دودھ پلاتے تھے۔ اور اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ وہ ابوالحزن نہیں ام الحزن تھے۔ ان کے تمام احباب میں سے صرف ایک میں تھا کہ انہیں گاہ گاہ وہ مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ورنہ کہاں ہنسنا کہاں فانی۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ کسی داڑھی والے کے ساتھ موٹر میں جا رہے ہیں۔ ہر چند میں سن چکا تھا کہ اکل انکا ورڈھیل بیٹا بدایوں سے آ چکا ہے۔ لیکن شام کو ان کے اپس پہنچا تو انتہائی سنجیدگیسے میں نے پوچھا کہ فانی صاحب کیا آپ کے والد ماجد تشریف لائے ہیں؟ انہوں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ان کے انتقال کو تو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ میں نے پھر کہا یہ آج کس کے ساتھ آپ ریلوے سٹیشن کے سامنے سے موٹر میں بیٹھے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا ارے بھائی وہ میرا بیٹا ہے میں نے کہا مبارک ہو پدر پسر نما اور وہ ہنسنے لگے۔

لیکن ہنسنے کے بعد ان کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا کہ اب اس ہنسنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اور جس قدر ہنسا ہوں' اسی قدر مزید رلایا جاؤں گا۔

ایک بار ہم لوگ شغل کر رہے تھے کہ میں نے کہا ارے فانی کبھی کبھار تو ایک آدھ پیگ پی لیا کرو۔ خدا جانے وہ اس وقت کس موڈ میں تھے۔ انہوں نے ایک گلاس پی لیا۔ لیکن جب میں نے ان کے گلاس میں دوسرا پیگ ڈال دیا تو انہوں نے کہا بس میں نشاطی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ اشارے سے مجھے بلایا اور کہا ذرا سا جھک کر میری بات سنو' اور جب میں اپنے کان ان کے لبوں کے قریب لے کر گیا تو انہوں نے بڑے پیمبرانہ انداز میں بڑی آہستگی سے کہا دیکھو جوش تم شراب پی کر غم غلط کرتے ہو غم اللہ کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی دولت ہے اور ایک گراں قدر امانت ہے۔ اور اس کو غلط کرنا کفران نعمت میں سے

ہے۔حشر کے دن یہاں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ مشرکوں تک کو بخش دے لیکن یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غم غلط کرنے والوں کو بھی معاف فرما دے۔ وہ پلان چٹ کے ذریعے سے روحیں بلایا کرتے اور کچھ دن سے انہوں نے مجھے بھی اسی دھرے پر لگا دیا تھا۔ پلان چٹ لکڑی کا ایک قلب صورت آلہ ہوتا ہے۔ جس کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے پہیے اور ایک طرف پنسل بنانے کا سوراخ ہوتا ہے۔ اور جب کسی کی روح کو بلانے کے واسطے ذہن پر زور ڈالا جاتا ہے تو وہ آلہ خود بخود معرض حرکت میں آجاتا ہے۔ اور کاغذ پر جوابات لکھنے لگتا ہے۔

ایک بار فانی آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی روح کو بلا کر کہا تھا اپنا اسم گرامی لکھ دیجیے لان چٹ نے غالب مغلوب لکھ دیا۔ میں نے کہا یہ مغلوبیت کیسی پلان چٹ نے جواب دیا اہل دنیا کی ناقدرشناسی کے باعث اب تک یہ اپنے کو مغلوب سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا۔ انہوں نے لکھا میرا قیام مزار میں نہیں ہے۔ میں نے پوچھا کہا ہے انہوں نے لکھا اس مقام پر جس کا کوئی نام نہیں۔ میں نے پوچھا شراب کے باب میں کیا ارشاد ہے انہوں نے لکھا ظرف لازم ہے۔ میں نے آزاد انصاری کی طرف سے اشارہ کر کے پوچھا یہ میرے داہنے طرف کون صاحب بیٹھے ہیں انہوں نے لکھا میرا پوتا ہے۔ میں نے کہا آپ مغل ہیں اور یہ انصاری۔ آپ کے پوتے کیسے ہوئے؟ انہوں نے لکھا یہ میرے شاگرد حالی کے شاگرد ہیں۔ اور اسی رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں۔ ایک بار فانی نے ایک طوائف کی روح کو بلا کر مزاج پوچھا اس نے لکھا آپ بے وفا کو میرے مزاج سے کیا سروکار ہے آپ تو مجھ کو چھوڑ کر ایک قطامہ پر مرنے لگے تھے۔ اچھا ہوا کہ اس نے آپ سے دغا کی۔ اور میرا دل باغ باغ ہو گیا ڈاکٹر واگرے نے ایک روح مجھ سے کہا گنگا دھر تلک کی روح کو بلا کر ان سے پوچھیے کہ ہندوستان کب آزاد ہو گا تلک نے ہندی میں جواب لکھا میں نیکہا واگرے صاحب ہندی میں نہیں

جانتا آپ پڑھ کر بتائیں ڈاکٹر نے کہا اس نے کھا ہے اکیس برس بعد ۱

فانی صاحب نے ایک رات کو میر تقی میر کی روح کو بلا کر پوچھا اقبال کیسے شاعر ہیں پلان چٹ نے لکھا میں ان کو آدھا شاعر مانتا ہوں اس لیے کہ وہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کو ذاتی پونجی بالکل اوچھی ہے۔

ایک مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد نے مجھے اور فانی کو پلان چٹ سمیت بلا کر یہ کہا کہ میں نام نہیں

---

۱ وہ سوال غالباً سنہ ۱۹۲۷ء میں کیا گیا تھا۔

بتاؤں گا آپ میری ذات میں ڈوب کر میرے مغلوب بزرگ کی روح کو بلائیں فانی نے کہا یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جوش صاحب آپ کی مشق اب مجھ سے بڑھ چکی ہے۔آپ ہی بلائیں۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ اور خلاف معمول تاخیر کے ساتھ آئے۔آنے میں حرکت پیدا ہوئی مہاراجہ نے کہا میرا سلام کہہ دیجیے۔آلے نے لکھا خوش باش اور مہاراجہ رونے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپکیوں رو پڑے انہوں نے کہا میں نے اپنے باپ کی روح کو بلایا تھا۔اور اب میرے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ وہ میرے سوال کے جواب میں ہمیشہ خوش باش کہا کرتے تھے۔اگر آپ میرے دلکی بات پوچھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک روح کی حقیقت کا مکمل طور سے انکشاف نہیں ہو جائے گا۔اور دو دو چار کی طرح' یہ بات بھی ثابت نہیں ہو جائے گی کہ روح دراصل ایک لافانی شے ہے اور وہ بعض معلوم یا نامعلوم اسباب کی بنا پر خارج سے آ کر انسانی جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا داخل کر دی جاتی ہے۔اور وہاں کچھ روز قیام کر لینے کے بعد جسم سے پرواز کر کے پھر خارج میں چلی جاتی ہے۔ اس وقت تک یہ مسئلہ قطعی طور پر ایک غیر علمی اور نامعتبر بنا رہے گا۔اور پلان چٹ یا

دیگر عملوں یا منتروں کی وساطت سے روحوں کا اس زمین پر ٹپک پڑنا جانا اور ایک ذی شعور کے مانند ان کا باتیں کرنا' سوالوں کے جواب دینا یا معاملات دینا پر متصرف و اثر انداز ہونا ابل تسلیم نہیں سمجھا جائے گا۔

ایک طرف ارباب نقل واور روایت کا گروہ روح کے فانی ہونے اور اس کے تصرفات کا قائل ہے تو دوسری طرف ارباب عقل و روایت کی جماعت ہے۔ جس کا یہ خیال ہے کہ اعضائے انسانی اور ان کے وظائف کے توازن و ہم آہنگی سے جو حرارت عزیزی معرض وجود میں آتی ہے اسی کو روح کہتے ہیں۔ اور انسان کی موت کے بعد دو ٹکرائے ہوئے ریلوے انجنوں کی سٹیم کے مانند ہوا میں منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔

الغرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ارباب نقل کانوں کے سہارے اور ارباب عقل کھوپڑی کے بوتے پر رائے قائم کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کھوپڑی کے مقابلے میں کان کوئی وقعت نہیں رکھتے اس لیے معقول آدمی ارباب عقل کی باتوں کو وزنی سمجھتے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ پلان چٹ پر اگر ارواح کا تصرف نہیں ہوتا تو پھر اس کی جنبش و نویندگی کی علت کیا ہے۔؟ سو میں یہ جواب دوں گا کہ اس کی علت ہے خیال کی مرکوزیت کا دباؤ۔ اور دماغ کے امواج برقی کا تموج وارتعاش اور ی جواب کوئی انوکھا جواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ہم بارہا دیکھ چکے ہین کہ نظر بھر کر دیکھتے ہی پیپر ویٹ معلق ہو جاتا ہے۔ اور کرسی چھت سے جا کر لگ جاتی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خیال مادے پر تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

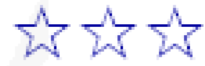
اگر میرا یہ جواب سن کر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اگر یہ سارا کھیل ہمارے دماغ کا ہے تو یہ پلان چٹ کو ہمارے دماغ کے حلقہ معلومات تک محدود ہونا چاہیے تھا لیکن بعض اوقات وہ آلہ ایسی باتیں بھی معرض تحریر میں لے آتا ہے جو ہمارے دائرہ علم سے قطعی خارج ہوتی ہیں۔ اس بنا پر یہ صرف اراوح کے سوا اور کیا علت ہو سکتی ہے؟ و میں یہ

www.pdfbooksfree.pk

عرض کروں گا کہ انسانی دماغ کے گوشوں اور تحت الشعور کے تہ خانوں میں دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو موجود نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ہم کو اب تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

صد حیف کہ ابھی تک نفس انسانی کا غرقہ ایک ربع سے زیادہ نہیں کھلا ہے اس لیے ہم اپنے علم اور اپنی ذات کو محدود سمجھ رہے ہیں۔

لیکن جب لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد غرقہ نفس پورے طور پر کھل جائے گا اور غنچہ انسانیت کھل کر اداب بن جائے گا تو اس کی خوشبو آفاق کا محاصرہ کر لے گی۔ اور ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام کائنات ہمارے نفس کے اندر سانس لے رہی ہے۔ اور یہ پورا نظام شمسی ہمارے ماسہ سر کا طواف کر رہا ہے۔



آغا شاعر قزلباش

داغ کے ممتاز شاگرد دہلی کے نامور استاد۔ روایات کے بندے اوہام کے پتلے بھوتوں چڑیلوں کے تصور سے لرزاں بلند آوازوں سے ترساں حقے کے دشمن سگریٹ بازو سے ان بن آغاز میں زرد اد انجام میں پریشان روزگار جوانی میں یوسف کنعان بڑھاپے میں آئینہ پریشان بہر نفس کراہ تحت اللفظ کے بادشاہ۔ اول اول رند خرابات آخر آخر مبتلائے صوم وصلوۃ پھر بھی پرستار خوباں شیریں حرکات۔ ایک روز وہ میرے دریا گنج (دہلی) کے مکان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ سر پر جرنیلی ٹوپی اور اس پر لٹ پٹی دستار بندھی ہوئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوجی کپتان بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں چھوٹے دادا نے کھیر کھا کر اس کا خالی تھلوا سنگین فرش پر تڑ سے ٹپک دیا۔ وہ اچھل پڑے مجھ سے کان میں کہا ذرا چھوٹے دادا کو سمجھا دیجیے کہ میں یہ کریہہ آوازیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے چھوٹے دادا کو سمجھا دیا۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ دوسرا تھلوا بھی خالی کر کے تڑاق سے فرش پر دے ٹپکا۔ آغا صاحب پھر زور سے اچھل پڑے۔ کہا اب یہاں نہیں بیٹھوں گا میں نے بہت روکا وہ نہیں مانے اور جب تانگے پر بیٹھ کر جانے لگے تو جھک کر مجھ سے کہا اپنے ان گھامڑ چھوٹے دادا سے گھر جا کر پوچھیے گا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں انہوں نے چھوٹے دادا اس طرح دانت پیس کر کہا کہ ہر چند میں نے ضبط کر لیا لیکن قہقہہ نکل ہی گیا اور وہ تا حد نظر مجھے گھورتے چلے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ایک روز میں دوپہر ڈھلے ان کے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں ابھی آ جائیں گے۔ مجھے شرارت سوجھی ان کے بستر سے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئے اور بستر کی طرف دیکھا سمجھے کہ ان کا کوئی بیٹا سو رہا ہے۔ وہ تخت پر آہ آہ کر کے بیٹھ گئے۔ میرے لحاف کے اندر سے بھی آواز آئی آہ آہ وہ چونکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اور یہ سمجھ کر کہ

میرے کان بج رہے ہیں۔انہوں نے موزہ اتارتے وقت حسب عادت دوبارہ آہ آہ کی آواز نکالی اور جب میرے لحاف سے اس کے جواب میں آ

وہ یہ خیال کرکے ہونہ ہوئی کوئی جن یا بھوت ان کی چارپائی پر دراز ہے چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل گئے اور دعائیں پڑھنے اور مولی مشکل کشا مدد کے نعرہ لگانے لگے۔

اور لحاف الٹ کر جب میں نے پوچھا ارے آغا صاحب ہوا کیا وہ میری آواز پہچان کر۔دوبارہ کمرے میں آئے اور کہنے لگےتو ایک دن دہلا کر مجھے مار ڈالے گا۔

ایک روز جھٹپٹے کے وقت بوتل جیب میں رکھ کر میں انکے وہاں پہنچا۔زینے کی زنجیر کھٹکائی۔ایک چھوکرا آیا۔میں نے کہا آغا صاحب سے جا کر کہہ دو کہ ایک شاعر اپ ؛نی غزل پر اصلاح لینے آیا ہے۔س چھوکرے نے آکر جواب دیا کہ آغا صاحب کی طبیعت خراب ہےکل آیئے گا۔میں نے لڑکے سے کہا کاغذ اور پنسل لا دو وہ لے آیا اور میں نے لکھا آغا صاحب قبلہ میرا نام عبدالصمد خاں پشاور کا رہنے والا ہوں آج رات دس بجے مشاعرہ ہے خدا کے واسطے میری غزل بنا دیجیے۔میں اس کا فوری نذرانہ بھی پیش کروں گا۔اور اگر آپ نے مجھے نہیں بلایا تو آپ کی تاک لگائے بیٹھا رہوں گا۔اور جب آپ نیچے اتریں گےتو خدائے بزرگ و برتر کی قسم آپ کو جان سے مار ڈالوں گا سمجھے آپ؟

میرا پرچہ پڑھتے ہی انہوں نے اس خادم زادے سے کہا ابے جلدی سے زینے کے دروازے پر زنجیر لگا دے۔

جب دروازہ دھڑ ام سےبند ہو گیا تو اوپر منہ اٹھا کر اور آواز بدل کر میں نے پکارا آغا صاحب آغا صاحب میری آواز بلند ہوتے ہی بالا خانے کے برآمدے میں کھٹ پٹ ہونے لگی اور یہ دیکھا کہ وہ اس زاویے کے ساتھ چھجے پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر میں گولی ماروں تو انہیں لگ نہ سکے۔

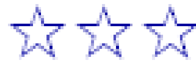
میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا کہ کیا آپ آغا صاحب قبلہ ہیں یہ سنتے ہی وہ فوراً

پیچھے ہٹ گئے ۔اور اپنی باریک آواز میں پوچھا عبدالصمد خاں کیا آپ واقعی مجھ کو مار ڈالیں گے؟ میں نے جواب دیا بے شک ۔آپ ایک آفریدی پٹھان کی بے عزتی کر کے زندہ نہیں رہ سکتے ۔ دو استادوں کو جان سے مار چکا ہوں اب آپ کی باری ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے رندھے ہوئے گلے سے ایں ایں ایں کی صدا کچھ اس بے کسی کے ساتھ نکلی کہ میرا قہقہہ نکل گیا قہقہے سے وہ مجھے پہچان گئے ۔ جب میں انکے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی چارپائی پر دھڑام سے گر گئے ۔ میں دوڑ کر ان سے چمٹ گیا اور وہ اوبھی اوبھی سانسیں لیکر کہنے لگے ذرا میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھ دل کیسا دھڑ دھڑ ہو رہا ہے ۔ تیرا مذاق ایک دن میری جان لے لے گا۔اور تو دل تھام کے رہ جائے گا کہ ہائے میں نے کیوں ایسا مذاق کیا تھا آہ آہ آہ آہ ۔

ایک روز کوئی چار بجے ان کے وہاں پہنچا دیکھا کہ وہ رومال منہ سے ڈھانپے رو رہے ہیں میں نے کہا ارے وہی آٹھ پہر کا رونا دھونا یہ کیا ہو رہا ہے آپکو یہ پورا عالم کون و فساد ایک دیوار گریہ ہے ۔ا آپ اور فانی دو یہودی ہیں ۔ جو اس دیوار کے سایے میں بیٹھے بڑے استقلال کے ساتھ مسلسل رویا کرتے ہیں ۔اور یہ کرہ ارض ایک دائمی یوم عاشور ہے جس میں آپ اور فانی بدایونی عالی الاتصال ماتم فرمایا کرتے ہیں ۔ انہوں نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا میرے رونے کی ہنسی نہ اڑاؤ ۔میرا شباب میں وہ عالم تھا کہ ہزاروں حسین عورتیں میرے چاروں طرف منڈلایا کرتی تھیں ۔اور ایک رات کو تو ایک عورت چھری لے کر آ گئی تھی ۔اگر مجھ سے منہ چراؤ گے تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی ۔اور پھر اسی چھری سے خودکشی کر لوں گی لیکن اب...... یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے ۔ میں نے تسلی دی لیکن وہ روتے ہی رہے اور پھر کہنے گے جوانی میں جی بھر کے ہنسا تھا اب اس کا جرمانہ ادا کر رہا ہوں کیا خوب کہا ہے میر انیس نے روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں ۔

پھر انہوں نے مجھ کو قریب بلا کر نہایت دھیمی آواز میں کہا یہ ہمارے محلے کا گرجا تم

نے دیکھا ہے؟ اس گرجا گھر میں ایک ادھیڑ سیمیم صاحب ہستی ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ چور چوری سے گیا کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا؟ میں آتے جاتے اس امید پر کہ شاید واللہ کی کوئی صورت نکل آئے اور بڑھاپا مزے سے کٹ جائے ان کو گھورا کرتا تھا۔ اور وہ آنکھیں جھکالیا کرتی تھیں۔ لیکن آج یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ میں نے کہا پہلے بات ختم کر لیجیے پھر جی بھر کے رو لیجیے گا۔ انہوں نے آنسو پونچھ کر کہا آج جب میں نے گلی میں کھڑے ہو کر اس میم کی طرف آنکھ اٹھائی تو......ان کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی میں نے کہا آغا صاحب بات پوری تو کیجیے انہوں نے کہا جب نکڑ پر مین نے ان کی طرف آنکھ اٹھائی تو اس نے میری طرف دیکھ کر تھوک دیا۔ ہائے تھوک دیا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس بات پر ہنس پڑتا۔ لیکن مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں نے سوچا قدرت کس قدر سفاک ہے ہم کو پھول سا چہرہ دے کر اسے پھر بٹوے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کوئی حد بھی ہے اس بے کراں شقاوت کی۔



سردار روپ سنگھ

گورے چٹے' بالا بلند' کھرے ناک نقشے کے خوش چشم ہنس مکھ' لطیفہ سنج' سخن شناس' انجمن آراء' مہمان نواز' یار باش' دوست پرور' اور خوباں نشین روپ سنگھ۔

سارنگیوں کی روں روں طبلے کی تھاپ مینا کی قلقل مجیرے کی گھن گھن گھنگھروؤں کی چھم چھم حسینوں کے چم وخم' راگنیوں کے زیر و بم اور یاروں کے ادھم کے رسیا اور اپنے دور کے کنھیا تھے۔

وہ میری ننھیال ڈھول پور کے جاگیردار' مہاراجہ کے پرانے یار' لیکن آگے چل کر مہاراجہ کے معتوب سردار شراب خانہ ساز کے پرستار اور خرابات کے اوتار تھے۔

آفتاب غروب ہوتے ہی ان کی انجمن میں صبح طالع ہو جاتی تھی۔ اور پیانوں سے کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں اور ڈاکٹر سورج مل سردار تاراچرن رن بیر سنگھ محسن سردار پیا کول صاحب' خوش حال چند تگم عرف بغبغا اور رتر پھائی عرف تیری پھائی وغیرہ کے قہقہے اور اختری مشتری[1] اور چھوٹی کے زمزمے گونجتے تھے۔

ہر چند فرنگی کا لگایا ہوا ہندو مسلم منافرت کا پودا تناور ہو چکا تھا۔ لیکن روپ سنگھ پر اس منحوس درخت کی چھاؤں نہیں پڑی تھی۔ ان کے زیادہ تر دوست مسلمان تھے چھوت چھات سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور انہیں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔

---

[1] ان کا سب سے بیشتر باب میں ذکر آ چکا ہے۔ اس لیے اختصار سے کام لوں گا[2] ان کے پاس شراب کا ایسا نایاب نسخہ تھا کہ ان کی شراب کے آگے ولایتی شراب پانی بھرتی تھی۔[3] طوائفیں۔

سردار اجمیر سنگھ انسپکٹر جنرل ان کے چھوٹے بھائی پوجا پاٹ کے اتنے پابند تھے کہ انہوں نے کوٹھی کے ایک کمرے کو بت خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ روپ سنگھ اور میں دونوں ان کا مذاق اڑاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ وہ کون سی ایسی ٹھٹھ گھڑی آئے گی کہ تم

بت خانے سے نکل کر شراب خانے میں داخل ہو جاؤ گے۔

ہر صبح کو اجمیر سنگھ اور ان میں کھانا پکوانے کا اس قدر زبردست ہنگامہ ہوا کرتا تھا کہ اللہ کی پناہ بلا ناغہ اجمیر سنگھ ان سے آ کر پوچھا کرتے تھے کہ بھائی صاحب آج کیا پکے گا اور اس پر دونوں بھائیوں میں درمیان آدھ گھنٹے تک مکالمت ہوا کرتی تھی۔ کہ بکری کا گوشت نہیں، تیتر پکے گا، نہیں نہیں تیتر کے عوض آج بٹیر پکیں گے۔ ترکاریوں میں آلو نہیں نہیں آلو کے عوض گوبھی آئے گی ارے گوبھی بھی نہیں ٹماٹر۔ اور میں اس مکالمت سے تنگ آ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

ان کی صحبت میں ایک رات اب تک یاد ہے۔ جو بلا کی دل کش تھی۔ اور قیامت کی بھیانک بھی۔ غالباً وہ ہولی یا دوالی کے جشن کی رات تھی۔ ڈھول پول کی اختری مشتری اور چھوٹی کے علاوہ آگرے سے بھی چار پانچ حسین اور سریلی طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ اور دو بجے رات تک گانے بجانے پینے پلانے کا سلسلہ قائم رہا تھا۔ اور طوائفوں کے ساتھ تمام بادہ خوران کرام نے بھی رقص فرمایا تھا اور ہر نوعیت کا لطف اٹھایا تھا۔

اس جشن میں گوالیار کے ایک دیو پیکر سردار نے بھی شریک تھے۔ جو صبح سات بجے سے آ جانے رات کے بعد بھی مسلسل پی رہے تھے اور دو بجے رات کے قریب او بھی او بھی سانسیں لے رہے تھے۔ ابھی محفل جمی ہوئی تھی۔ کہ وہ گوالیار کے سردار صاحب اٹھے غسل خانے کی طرف دو قدم لڑکھڑاتے چلے اور دھڑام سے فرش پر گر گئے۔ اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ اللہ اکبر ان کے دم توڑتے ہی وہ جشن جو ابھی ابھی نغموں کے دریا میں پیر رہا تھا اس قدر بھیانک ہو گیا کہ میں نے رئیس احمد سے کہا آؤ اب یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں ہم دونوں بھائی روپ سنگھ کے باڑے سے اپنے نانا کے بارے کی طرف جانے کے لیے جو وہاں سے فقط چند قدم کے فاصلے] پر تھا باہر نکلے باہر آتے ہی جب ہوا لگی اور سڑک کے ہر بلب میں دو دو بلب نظر آنے لگے۔ تو میں سمجھ گیا کہ آج نشہ بیحد تیز ہو گیا ہے۔ اور رئیس کو دیکھا وہ بھی بری طرح لڑکھڑا رہا

تھا۔ میں نے رئیس سے کہا آج بڑا ہاتی پچھاڑ نشہ ہے آؤ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلیں۔ لیکن نشہ اس قدر شدید تھا کہ بار بار ہم بری طرح لڑکھڑاتے اور بار بار ہمارے ہاتھ چھوٹ چھوٹ جاتے تھے رئیس داہنی طرف اور میں سڑک کے بائیں طرف پہنچ جاتا تھا۔ دو تین منٹ کا راستہ دس بارہ منٹ میں طے کر کے جب میں نے حویلی میں قدم رکھا تو میں نے کہا دیکھو رئیس نشہ اس وقت گھٹا ٹوپ اور گھنگھور ہے کہ ہم تم زینے پر چاروں ہاتھ پاؤں سے گھوڑے بن کر چڑھیں گے۔ ورنہ ہمارے سر پاش پاش ہو جائیں گے۔

میری زندگی کا وہ پہلا اور آخری مرد افگن نشہ تھا۔ صبح کو جب پہاڑ سا سر اور را لاؤ کی طرح بھڑکتا ہوا سینا لے کر بیدار ہوا کلیاں اور غرارے کر کے لیموں کا ایک پورا گلاس پیا اور قسم کھالی کہ جب تک جیوں گا چار پیگ سے زیادہ نہیں پیوں گا۔ اور اس قسم پر آج تک قائم ہوں۔ اور مرتے دم تک قائم رہوں گا۔

ایک بار ابرار دھول پور آئے اور روپ سنگھ کی صحبت میں شریک ہوئے اسوقت تک انہوں نے پی کر گالیاں دینا شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن بگڑنے لگے تھے۔

جب محفل برخواست ہوئی تو میں اور رئیس دونوں روپ سنگھ کی خواب گاہ میں لیٹ گئے اور ابرار سے کہا گیا کہ وہ زنانے مکان کے دروازے کے سامنے کی کوٹھی میں جا کر سو رہیں۔

ابھی ہم لوگ کروٹیں بدل ہی رہے تھے کہ ابرار کی انتہائی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز گونج اٹھی کہ ہر شخص اپنا ایڈوانٹیج خوب جانتا ہے۔ روپ سنگھ نے کان کھڑا کر کے مجھ سے پوچھا۔ آدھی رات کو ایڈوانٹیج کی کیا بات ہو رہی ہے۔ ابھی میں اس کا جواب بھی دینے نہیں پایا تھا کہ روپ سنگھ کا پرانا خادم انتا ہانپتا آیا اور کہنے لگا سردار صاحب بڑا غضب ہو گیا اور ہم سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ روپ سنگھ نے پوچھا ارے کیا غضب ہو گیا انتا نے کہا کہ دلاری زنانی ڈیوڑھی میں جا رہی تھی کہ ابار خاں (ابرار خاں) نے

www.pdfbooksfree.pk

دوڑ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ ور جب وہ کلائی چھڑا کر بھا گی تو ابار خاں اس کے پیچھے دوڑے اس نے جب بھاگ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تو ابار خان نے پکار کر کہا ہائے جانی مار ڈالو۔ اور جب میں نے سمجھایا تو انگریزی بولنے لگے۔ یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے ماتھا پیٹ کر پوچھا انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا؟ اب میں گھر میں کیسے منہ دکھاؤں گا۔ انا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔ اس انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔ پر میرا قہقہہ نکل گیا۔

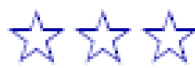
ا موقع سود مندی

میں نے کہا بات تو واقعی بہت بری ہوئی جس کا مجھ کو بے حد افسوس ہے۔ لیکن اسانتا ہمارے سر کی قسم کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کا اضافہ۔ ارے اس پر کون ہنسی ضبط کر سکے۔ روپ سنگھ ہر چند بہت پریشان ہو چکے تھے پھر بھی میری بات پر بے ساختہ ہنسنے لگے۔

اور اب میں نے ان کی یہ چڑ بنالی۔ جب کوئی ایسی ویسی بات پیش آتی تھی میں اپنا ماتھا ٹھوک ٹھوک کر کہتا تھا ک انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا۔

روپ سنگھ تم مجھ سے پہلے چلے گئے۔ یہ بڑی دغا کی تم نے میرے ساتھ۔ تمہارے بعد ایک بار میں دھول پور گیا تھا۔ تمہارے اداس پھاٹک کی طرف میں نے کیوں کر نظر اٹھائی تھی۔ یہ میرا ہی جی جانتا ہے میرے روپ بدمزہ ہو کر رہ گیا جینا تمہارے بعد ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں!!

ا نوجوان ملازمہ



www.pdfbooksfree.pk

وصل بلگرامی

انگریزوں کی طرح گورے بلند پیشانی' متوسط القامت' نورانی چہرے اور گھنی لال ڈاڑھی کے فرشتہ صورت اور نپولین سیرت انسان تھے۔

میری اتنی عمر گزر چکی ہے لیکن میں نے ان کا سا آہنی عزل وشیر دل انسان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب کسی بات پر کمر باندھ لیتے تھے تو وہ تمام امور جو دنیا بھر کے لیے ناممکن ہیں انہیں پل بھر میں ممکن بنا دیا کرتے تھے۔

اگر وہ اس عہد میں پیدا ہوتے جب کہ ایک فرد کی حوصلہ مندی ملکوں کے نقشے بدل دیا کرتی تھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی بنیاد ڈال کر سکندر اعظم سے ٹکر لے سکتے تھے۔

حافظہ بے حد کمزور ہو چکا ہے۔ ان کے صرف چند کارنامے یاد رہ گئے ہیں ان کو پڑھ کر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا تھے۔ اس دور میں جب کہ فرنگی حکومت کا رعب ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ اور اس کا غرور زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ ہم دونوں غالباً بمبئی کے ایک بہت شاندار ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اور بڑی بڑی مونچھوں کا ایک دھم دھوسڑ جغادری سا انگریز ہمارے سامنے کی میز پر شراب پی رہا تھا۔ میں نے وصل صاحب سے کہا جب جانیں کہ آپ اس گڈ امیر انگریز کو پان کھلا دیں وہ گلوری چٹکی میں دبائے اس کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ آپ کی صورت دیکھ کر مجھ کو اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ لیکن دنیا آپ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے میں مسلمانوں کا ہڈ پوپ ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ سر بلند ہو جائیں۔ آپ منہ کھول دیں اس انگریز پر ان کی صورت اور ان کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ بے سوچے سمجھے اس نے اپنا منہ کھول دیا اور انہوں نے اس کے منہ میں گلوری رکھ دی اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا اور خدا آپ کا بھلا کرے کہتے ہوئے میرے پاس آ گئے وہ سٹپٹایا ہوا انگریز ان کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا سر کو جنبش دے کر تھینک یو کہا اور غسل

خانے کی طرف چلا گیا۔

وہ راجہ صاحب کٹھوارا کی قیصر باغ والی کوٹھی کی نچلی منزل میں رہتے تھے اور میں ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز جھٹپٹے کا وقت تھا کہ میری نظر پڑی ایک مرمرے کے تھیلے کیسی بوڑھی میم صاحب پر جو سامنے کی سڑک سے حد سے زیادہ آہستہ خرامی کے ساتھ بارہدری کی طرف چلی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا وصل صاحب کیا آ] پ میں اتنی طاقت ہے کہ آپ ان تھیلاا جان کی سست گامی کو برق خرامی میں تبدیل کر دیں؟

انہوں نے کہا بے شک۔ یہ کہہ کر وہ سامنے کمرے کے سامنے کے کنویں کی جگہ پر جو گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور میم صاحب کا انتظار کرنے لگے جب وہ رنگش رنگش کرتی گھنے درختوں کے نیچے سے گزرنے لگیں تو انہوں نے بڑے زور سے الا اللہ کا نعرہ لگا کر اور اپنے مصنوعی دانتوں کو ذرا سا آگے نکال کر اس طرح کٹ کٹ کٹ کٹ بجانا شروع کر دیا کہ وہ میم صاحب اوہ مائی گاڈ کہتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی سرپٹ اور سڑک لے لونڈے قہقہے مار مار کر تالیاں بجانے لگے۔

ایک روز شام کو وہ ملیح آباد آئے اور کہا دیا نرائن نگم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو صبح کی گاڑی سے کان پور لے جاؤں۔ کل رات کو ان کے وہاں آپ کی دعوت ہے۔ جس میں آپ کے دوست جگت موہن لال رواں تیج بہادر سپر داور جسٹس شاہ سلیمان بھی موجود ہوں گے۔ میں نے بیوی سے اجازت طلب کی مگر وہ بگڑ گئیں اور کہنے لگیں ابھی پرسوں ہی لکھنو سے آئے ہو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں تم کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی میں نے وصل سے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ اور کہا نگم صاحب سے معذرت کر دیجیے گا۔ انہوں نے کہا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ کل جانا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ میری بیوی کے مزاج اور ان کی ہٹ سے

واقف نہیں ہیں۔ وہ مجھے کسی طرح جانے نہیں دیں گی انہوں نے سینہ ٹھونک کر کہا اجازت میں دلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ کوٹھی سے باہر نکل گئے۔ میں نے کہا کدھر انہوں نے کہا پتھر وہ باہر جا کر ایک بہت بڑا نکیلا پتھر اٹھا لائے اور زینے کی آخری بالائی سیڑھی پر کھڑے ہو کر انہوں نے آواز دی میری چھوٹی بھاوج ذرا آپ دروازے کے پٹ کی آڑ سے دیکھ لیں کہ میں کس طرح دم توڑتا ہوں۔ بیوی نے پٹ کی آڑ سے کہا کیا بات ہے وصل صاحب انہوں نے بڑا سا نکیلا پتھر ہاتھ میں بلند کر کے کہا دیکھیے میں اپنا سر پھوڑ کے مر جاؤں گا۔ آپ کو معلوم ہے میں سید ہوں۔ سنتا ہوں پٹھان سادات کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ نے جوش کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی تو میں پتھر اپنے سر پر مار کر خودکشی کر لوں گا۔ اور آل رسول کا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ماتھے کے عین سامنے پتھر کو لے آئے اور رو رو کر کہنے لگے آپ اجازت دیتی ہیں یا نہیں۔ میں ایک دو تین گنوں گا اگر تین سنتے ہی آپ اجازت نہیں دیں گی تو میں سر پھوڑ کر آپ کے زینے پر ابھی ابھی شہید ہو جاؤں گا۔ دیکھیے ایک دیکھیے دو اور دو کہتے ہی وہ جیسے پتھر اٹھا کر اپنے ماتھے پر مارنے والے تھے بیوی نے کہا کہ بہت اچھا آپ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں مگر کل ہی واپس بھیج دیں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے پتھر پھینک دیا سیڑھی پر سجدہ شکر ادا کیا اور مجھے آنکھ مارتے ہوئے نیچے اتر گئے۔

ایک بار ہم لوگ ریل میں سفر کر رہے تھے کہ کسی جنکشن پر ایک دولہا اپنی دلہن اور مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ ہمارے درجے میں آ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

شوکت تھانوی نے مٹھائی کی طرف اشارہ کیا وصل نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے وعدہ کیا اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ دولہا نے دلہن سے چہل بازی شروع کر دی انکو موقع مل گیا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھے دولہا سے جا کر کہا تو شریف گھرانے کا بچہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں تیرے دادا کے برابر ہوں اور تو میرے

سامنے اپنی دلہن سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ اس کا شانہ پکڑ کر انہوں نے دلہن سے جدا کر کے بٹھا دیا۔ وہ نوجوان ادب سے بیٹھ گیا۔ اب انہوں نے متھائی کے ٹوکرے میں ہات ڈال کر دو لڈو نکالے اور دولہا سےکہا بیٹا اسی بات پر لے ایک لڈو تو کھالے اور ایک میری بہو کو کھلا دے اور میں باقی لڈو تیری اور تیری دلہن کیطرف سے تیرے ہم سفروں میں بانٹے دے رہا ہوں۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ انہوں نے ایک دولہا دلہن کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے سارا ٹوکرا ہم سب کو کھلا دیا گڑم دھم۔

وہ تمام شعرائے لکھنو کی دوا اماں تھے۔ جب کہیں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تھا بانیان مشاعرہان کے پاس شعرا کی فہرست اور ان کا کرایہ بھیج دیتے تھے اور وہ سب کے گھروں پر جا کر انہیں مدعو کرتے تھے۔ ایک مرکز پر سب کو جمع کرتے تھے۔ اپنے ساتھ سٹیشن لیجاتے اور ٹکٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا کرتے تھے۔

ایک بار وہ اس قدر تاخیر کے ساتھ سٹیشن پہنچے کہ گاڑی چھوٹ رہی تھی انہوں نے سارے شعراءکو بے ٹکٹ ہی ریل میں سوار کرا دیا۔ اور کہا آگے چل کر کسی بڑے اسٹیشن پر گارڈ کو آگاہ کر دیں گے۔ دو چار سٹیشنوں کیبعد ایک نوجوان ٹکٹ چیکر نے ہمارے درجے میں داخل ہو کر ہم سے ٹکٹ طلب کے ہم سب نے دور بیٹھے ہوئے وصل صاحب کی جانب جو ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی تسبیح پڑھنے لگے تھے اشارہ کر دیا۔ اور سوچنے لگے کہ دیکھیں اب کیا گل کھلے گا۔ ٹکٹ چیکر کو کن انکھیوں سے اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا۔ صورت ان کی خاصاں خدا کی سی تھی۔ وہ ان کے سامنے آ کر کھڑا تو ہو گیا لیکن ٹکٹ مانگنے کی جرات نہیں کر سکا۔

اتنے میں پٹڑی بلدنے سے گاڑی کو جھٹکا لگا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور جب ڑے اشراقی انداز میں انہوں نے ٹکٹ چیکر کی طرف نگاہ اٹھائی اور اس نے کہا ٹکٹ تو انہوں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور پوچھا پہلے اپنے باپ کی خیریت بتا پھر اپنے چچا سے ٹکٹ مانگ میرا نام ہے وصل بلگرامی ٹکٹ چیکر نے بڑی غمناک آواز میں

کہا کوئی ایک مہینہ ہوا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں یہ سنتے ہی وصل صاحب رونے لگے۔
اور اس کو گلے سے لگالیا اور وہ بھی رونے لگا۔

اب ٹکٹ چیکر کی کیا مجال تھی کہ ٹکٹ مانگتا الہ آباد سٹیشن پر اس نے ہم سب کو چائے پلائی اور اپنے ساتھ لے جا کر ہم کو باہر پہنچا دیا۔

جنگ عظیم کے خطرناک دور میں ہم لوگ وصل صاحب کی سرکردگی میں گوالیار سے لکھنو جا رہے تھے۔ اور ہم سیملے ہوئے فرسٹ کلاس کے ریزرو درجے میں ایک بڑا لانبا تڑانگا ادھیڑ انگریز فوجی بھی اسی گاڑی سے سفر کر رہا تھا۔ اور اس کی یہ شان تھی کہ ہر بڑے سٹیشن پر چار پانچ گورے اس کے درجے کے سامنے کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگتے تھے۔ اس فوجی افسر کے ساتھ اس کی نہایت ہی پری پیکر لڑکی بھی سفر کر رہی تھی۔ ہم نے اس کو اس فوجی افسر کی لڑکی اس لیے سمجھا کہ وہ اس سے ڈیڈی کہہ کہہ کر باتیں کر رہی تھی۔

جب کسی جنکشن پر گاڑی رکی تو وہ لڑکی اتری اور وھیلر بک اسٹال پر کتابیں دیکھنے لگی نیاز فتح پوری نے کہا آج ہم آپ کو سورما تسلیم کر لیں گے۔ اگر آپ اس لڑکی کا بوسہ لے لیں۔

وصل نے کہا شرط بدلو اور جب پچاس روپے شرط بدلی گئی۔ تو وہ نیچے اترے اور وھیلر کی دکان پر جا کر اسے گھورنے لگے۔ اور جب اس ماہ جبین نے تیور بدل کر کہا کہ تم کون گستاخ بوڑھے ہو تو انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کو گلے لگا کر چٹ سے اس کا بوسہ لے لیا۔ لڑکی نے چیخ ماری اور اس کا باپ بھرا ہوا پستول لے کر جھپٹ پڑا۔ پہرہ دینے والے گوروں نے بھی بڑھ کر انہیں حلقے میں لے لیا۔ اور وصل صاحب نے رو رو کر کہنا شروع کیا کہ ہائے میری بیٹی ہائے میری جواناں مرگ بیٹی کا چہرہ بالکل اس بچی کا سا تھا۔ ہائے میری بیٹی ہائے وہ بالکل ایسی ہی بالکل ایسی ہی تھی۔ یہ سن کر اس فوجی کا دل پسیج گیا۔ انہیں اپنے درجے میں لے گیا۔ کیک کھلائے چائے پلائی اور اپنی بیٹی کو ان کے پہلو میں بٹھا دیا اور جب تک وہ جیا ان کی دوستی کا دم بھرتا رہا۔

ڈاکٹر کرنل اشرف الحق

متوسط القامت نہ دبلے نہ پتلے نہ موٹے سر اور مونچھوں کے بال بھورے کبھی گورے ہوں گے۔ اب جل کر رنگ مٹیالا سا ہو گیا ہے۔ گول کنڈے حیدر آباد دکن کے سرکاری فوجی اسپتال کے انچارج۔ دہلی کے باشندے مولوی عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے' مولوی نذیر احمد مفسر قرآن کے نواسے۔ اور اس کے باوجود بادہ خوار' فحش نگار اور پھکڑ بازی میں یگانہ روزگار۔

ان کا سا آٹھوں گانٹھ کمیت آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ کسی خانے میں بھی بند نہیں تھے۔ وہ فحشیات کے شاعر تھے۔ اور تخلص تھا عریاں دیوان عریاں کے نام سے ان کا کلام چھپ چکا ہے۔

وہ سونے کا وقت نکال کر ہر وقت آدھے آدھے پیگ کے حساب سے پیتے رہتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک وہ سوتے۔ اور گھسل گھسل کر بڑی سی انگنائی بیٹھے بیٹھے طے کر کے بیت الخلا جاتے اور وہاں سے آ کر پینا شروع کر دیا کرتے تھے۔ لیکن بادہ خوری کے اس تواتر کے باوجود' کیا مجال کہ وہ بہک جائیں' یا لڑکھڑانے لگیں۔

ہر چند اسپتال کے دروازے کے سامنے ہی تھا لیکن وہ ہفتے میں دو ایک دن کے علاوہ کبھی وہاں جاتے ہی نہ تھے انہوں نے اسسٹنٹ ڈاکٹر پر تمام کاروبار چھوڑ رکھا تھا۔

اور جب بھی ان کا اسسٹنٹ ڈاکٹر ان کے مکان پر آ کر کسی مریض کا حال بیان کر کے ان سے اسکی دوا پوچھتا تو وہ ہمیشہ اے ڈی ٹی بتا دیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ہر مرض کی دوا درود شریف قسم کی کون سی دوا ہے تو انہوں نے قہقہہ مار کر کہا میاں اس کے معنی ہیں Any Dam Thing یعنی جو چیز بھی لغو چاہو دے دو۔

www.pdfbooksfree.pk

وحیدالدین صاحب سلیم عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے سید احمد خاں کے سابق سیکرٹری اور بے حد پھکو آدمی تھے ایک دن انہوں نے کہا چلیے سلیم صاحب کے وہاں بڑا فقرہ باز بنتا ہے آج اس کو پیدل کا مات دوں گا۔

سلیم صاحب کے وہاں پہنچتے ہی وہ ان کی طرف تھرکتے دوڑے فوراً ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کو اس طرح ہلا ہلا کر جیسے کسی درخت کو جڑ سے اکھاڑا جاتا ہے بڑے زور سے کہنے لگ کہ ہائے میرا نیچری[1] سانڈ ...... جوش یہ نیچری سانڈ سر سید کے مرتے ہی رسیاں تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا برسوں بعد آج اسے پکڑ پایا ہوں اب نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہتے ہی انہوں نے سلیم کا بوسہ لے لیا اور پھر وہی رٹ لگا دی ہائے میرا دم کٹا نیچری سانڈ۔ اور سلیم صاحب اس قدر حواس باختہ ہو گئے کہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

ایک بار ایک نوجوان غالباً پھول کا مدیر میرے دفتر میں بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ آ گئے۔ میں نے تعارف کرایا اور انہوں نے ہات ملاتے ہوئے اس کی ہتھیلی میں انگلی چبھو دی۔ ان کی اس حرکت پر وہ نوجوان بھر گیا اور آمادہ نبرد ہو کر پوچھا کیا آپ نے مجھ کو آوارہ لونڈا سمجھ رکھا ہے۔ اور انہوں نے مسکرا کر کہا جانی اگر یہ نہ سمجھتے تو یہ بات کرتے ہی کیوں۔

وہ نوجوان لڑنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے شانہ دبا کر اسے بٹھا دیا اور اشارے سے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب پیے ہوئے ہیں۔

---

[1] سید احمد خاں اور ان کے رفقا کو ان کے دور میں ''نیچری'' یعنی خدا کے منکر اور نیچر کے ماننے والے کہا جاتا تھا۔

میرے دفتر دارالترجمہ کے ایک رکن مولوی فدا علی صاحب ان کے بڑے دوستوں میں سے تھے ایک دن وہ میرے پاس آئے تو فدا علی صاحب کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر حسب رسم قدیم انہوں نے فدا علی خاں صاحب کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ جوش صاحب یہ کون جان ور ہے؟ فدا علی صاحب اس وقت بڑے موڈ میں

تھے انہوں نے چھوٹتے ہی کہا میرا نام ہے ڈپٹی نذیر احمد انہوں نے کسی بڑے نکتے کو پا جانے کے انداز میں کہا اچھا آپ میرے نانا ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے انگلیوں کی مثلث بنا کر کہا تو اس کے معنی ہیں یہ خاکسار آپ ہی کی صاحب زادی کی اس چیز سے برآمد ہوا ہے۔اور مولوی فدا علی صاحب کا رنگ اڑ گیا اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک بار مودودی صاحب کو ساتھ لے کر میں ان کے وہاں گیا۔وہ چارپائی اور ران کی بڑی لڑکی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا جوش صاحب اس لڑکی کو لندن بھیج رہا ہوں تعلیم کے واسطے مودودی نہیں چاہتے تھے کہ وہ حیدرآباد سے جائے اس لے انہوں نے کہا ڈاکٹر صاحب جوان بیٹی کو تنہا بھیجنا مناسب نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی کو اپنے بائیں ہاتھ کی ڈھیلی مٹھی میں بار بار داخل و خارج کر کے کہا کیوں مولانا مودودی صاحب زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا۔ ہو جانے دیجیے لڑکی جھینپ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور مودودی صاحب کے پسینے پسینے ہو کر رہ گئے۔

ایک دن شام کے وقت ایک لانبے قد کے وڑھیل مولانا صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے۔انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کر کے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر بڑی عقیدت سے چوم لیے اور کہا میں بھی اجڑی دہلی کا رہنے والا ہوں تفریحاً یہاں آیا ہوا تھا کل جا رہا ہوں میرے دل نے نہیں مانا کہ مولانا عبدالحق محدث کے پوتے' اور مولوی نذیر احمد صاحب کے نواسے کی زیارت کیے بغیر چلا جاؤں' یہ کہہ کر وہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا جوش صاحب بتا دیں؟ میں نے کہا یہ بھی کوئی سرکاری راز ہے اب انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو جوڑ کر ایک حلقہ بنا کر کہا اک تو یہ ہے اور پھر مثلث بنا کر کہا جناب والا اور دو یہ ہیں۔مولانا پر بجلی سی گر گئی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ السلام علیکم کہہ کر فوراً چلے گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

کنور مہندر سنگھ بیدی

ساوٗنلے' سلونے' دراز قامت' وسیع القلب' متناسب الاعضاء' شگفتہ جبیں وضع دار' خوش فکر' بلند حوصلہ' شعراء پرور' دوست پرست' دشمن نواز لہجے کے کھانچوں کے باوصف خوش گفتار' اور داڑھی کے باوجود خوبصورت انسان۔

ان کے جد اعلیٰ تھے حضرت بابا گورونانک جنھوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مسلم کی دوئی کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کر دیں' اور دو کو ایک بنا دیں لیکن تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے۔ اور ان کے تمنا کے علی الرغم سکھوں کے اضافے کے بعد دو کے تین ہو گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

لیکن ان کی وہ تمنا ان کے بچے مہندر سنگھ نے پوری کر دی۔ جن کی ذات میں ہندو مسلم اور سکھ یہ تینوں گروہ مدغم ہو کر یک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل وہ پنجاب کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اور اب صرف ایک معمولی سے قطعہ زمین کے مالک ہیں۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہاتی لاکھ لٹے پھر بھی سوا لاکھ کا ٹکے کا۔ ان کے چشمہ فیض سے ہزاروں انسان بالعموم اور سینکڑوں ادبا و شعراء بالخصوص آج بھی فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔

میرے قیام دہلی کے ابتدائی دور میں وہ مجھ سے اس قدر قریب رہتے تھے کہ میری موٹر انہیں کے بنگلے میں رہا کرتی تھی۔ اور جب میں صبح کو ان کے مکان جاتا تو یہ دیکھتا کہ سینکڑوں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے ان کے گرد ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور وہ سب کے کشود کار میں سرگرم ہیں۔

بیوی ان کو بھی قیامت کی نک چڑھی اور کڑوی ملی تھی۔ اور ہر بھلے آدمی کے واسطے شاید یہ امر مقدر ہو چکا ہے کہ ان کی بیویاں زندگی بھر بھنبھوڑتی ہیں۔

میں نے ان کو کبھی تھکتے نہیں دیکھا۔ دو پچاس سو میل موٹر سے سفر کر کے مشاعرے

جاتے تھے اور تین چار بجے مشاعرے سے فراغت پا کر پھر اسی وقت موٹر چلاتے دہلی آتے اور نہا دھو کر مجسٹریٹی کرنے عدالت پہنچ جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے اعصاب گوشت پوست کے نہیں فولاد کے بنے ہوئے ہیں۔ انکی وضع داری کا استحکام کیا بیان کروں میں جن دنوں ہندوستان جاتا ہوں وہ میرے گرد پروانے کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ اور اس بار جب سنہ ۷۶ء میں دہلی جا کر میں نے آگرہ ہوٹل میں قیام کیا تو ہر چند میں چیختا رہا کہ کنور صاحب میرے پاس کافی روپیہ ہے لیکن وہ کسی طرح نہیں مانے اور میرے کمرے کا کرایہ چودہ سو روپے انہوں نے اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ اور موتی محل ہوٹل سے جو میرا کھانا آیا کرتا تھا۔ اس کا حساب بھی زبردستی بے باق کر دیا۔ اس دور میں ایسا درنہ ستانی بستم می رسد کا برتاؤ کون کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے غزل گو شاعر ہیں بلکہ انکی پوری زندگی غزل ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح غزل مختلف ومتضاد واشعار کا مجموعہ ہوتی ہے اسی طرح کنور صاحب کی ذات بھی مختلف ومتضاد اشغال کا مجموعہ ہے یعنی مشاعروں کی صدارت کے فرائض، فلم سٹاروں کی نمائش کا کام' کلبوں کا انتظام' کرکٹ میچوں کا انصرام' رقص وسرود کا اہتمام' الیکشنوں کی دوڑ دھوپ' مرغوں' تیتروں' اور بٹیروں کی پالیوں کا بندوبست اور دنگلوں کا نظم ونسق یہ تمام مشاغل ان کی ایک ذات میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ ہے کوئی ایسا جامع ضداد شخص اس دنیا میں؟؟

اگر حافظ شیرازی کا یہ قول کہ

برایں رواق زبرجد' نوشتہ اند بزر
کہ جز نکوئی اہل کرم نہ خواہد ماند

صحیح ہے تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہندر سنگھ چوں کہ ان غیر معمولی انسانوں میں سے ہیں جو لوگوں کے ساتھ نیکی کیے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس لیے ان کا نام قیامت تک باقی رہے گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو

وہ اپنی موہنی سی صورت کی جاذبیت اپنے رنگ کی طاقت اپنی آنکھوں کی مروت اپنے لہجے کی غدوبت' اپنے تکلم کی موسیقیت اپنے تبسم کی حلاوت اپنے خاندان کی وجاہت اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت' اپنے مزاج کی بےنظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے جو اس کرہ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ

مت سہل ہمیں سمجھو' پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کا وجود ہندوستان کا افتخار ایشیا کا وقار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا۔ اور وہ اس عالم اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے کہ جس کو شام اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے الہ آباد کے معنی خیز سنگم پر گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔

اس سے پیش تر دو تین مواقع پر ان کا تذکرہ کر چکا ہوں' اس لیے ان کے متعلق جو باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں فقط وہی بیان کروں گا۔

ایک بار یہ سن کر کہ وہ کمبھ میلے میں شریک ہونے کو الہ آباد گئے تھے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں غصے سے بھرا ان کے پاس گیا اور کہا اتو بروٹس؟[1]

[1] شیکسپیر نے اپنے ڈرامے جولیس سیزر میں لکھا ہے کہ جب یہ دیکھا کہ اس کا سب سے بڑا جانثار دوست بروٹس بھی اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کی صف میں کھڑا ہوا ہے۔ تو زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ اور فرط حیرت سے اس نے اتو بروٹس (یعنی تم بھی اے بروٹس) کا نعرہ لگا کر اپنی تلوار پھینک دی۔ اور یہ خیال کر کے کہ جب میرا ایسا جگری دوست اور اس قدر مدبر انسان بھی میرے خلاف ہو گیا ہے تو اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسا زبردست عیب ضرور موجود ہے جس سے میری قوم اور میرے ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہے اپنی گردن

جھکالی اور اپنے قتل ہو جانے کے واسطے پیش کر دیا۔

انہوں نے پوچھا کیوں صاحب میں نے کون سی ایسی خلاف توقع بات کی ہے کہ آپ مجھ کواتو بروٹس کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا پنڈت جی آپ تو بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ دنیا کے کسی مذہب سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے باوجود سنتا ہوں آپ کمبھ میلے میں وہم کے شعلے کو ہوا دینے کی خاطر الہ آباد تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا اگر میں وہاں پجاری کی حیثیت سے جاتا تو آپ کو حق تھا کہ مجھ پر اعتراض کرتے۔ لیکن میں تو وہاں پبلک مائنڈ (مزاج عوام) کے مطالعے کے واسطے گیا تھا۔ میں نے کہا جی نہیں آپ وہاں گئے تھے اپنے ووٹوں کی خاطر رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے ابھی وہ جواب دینے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دے ہی رہے تھے ک ڈاکٹر کاٹجو آ گئے۔ پنڈت جی نے ان سے کہا مسٹر کاٹجو مجھ پر جوش صاحب اعتراض کر رہے ہیں کہ میں کمبھ میلے میں کیوں گیا تھا کاٹجو نے کہا یہ تو خیر میلے کی بات ہے ایک دن مجھے پوجا کرتے دیکھ کر جوش صاحب نے مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ کاٹجو صاحب آپ بالغ ہو جانے کے باوجود پوجا کرتے ہیں اور جب میں نے انہیں پوچھا تھا کہ پوجا کرنا کوئی بری بات ہے؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ ایسی بری بات ہے کہ اسے دیکھ کر بھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب فکر آدمی کے دل پر ایسی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ فوراً تڑپ کر مر جائے یہ سن کر پنڈت جی نے قہقہہ مار کر کہا جہاں تک پوجا کا تعلق ہے میں بھی جوش صاحب کا ہم خیال ہوں اور اس پر کاٹجو کا منہ لٹک گیا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد سردار پٹیل نے اس وقت کے دہلی کے مسلمان چیف کمشنر کو جو علی گڑھ کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے فرزند تھے معطل تو نہیں کیا تھا مگر زبانی احکام کے ذریعے سے ان کے تمام اختیارات سلب کر کے اس وقت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رن دھاوا کے سپرد کر دیے تھے اور بری دھوم دھام کے ساتھ مسلمان لوٹے اور قتل کیے جا رہے تھے۔ اس بھیانک دور میں اگر جواہر لال نہرو کھل کر میدان میں نہ آ

www.pdfbooksfree.pk

جاتے اور خوفناک گلیوں میں گھس گھس کر اور ہندوؤں کے منہ پر تھپڑ مار مار کر وہ اس آگ کو نہ بجھا دیتے تو دہلی میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا۔

اسی زمانہ کا ای واقعہ ہے کہ دہلی کے محلّہ سوئی والان میں ہندو جب ایک مسجد کے دروازے سے باجا بجاتے گزر رہے تھے تو مسلمانوں نے ان کو مار بھگا دیا تھا۔ تو شہر کے ہندو کوتوال نے چوراہے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو ماں بہن کی ننگی گالیاں دیں تھیں۔ اور جب مجھے اس بات کی خبر دی گئی تھی تو میں نے ایک محضر پر لوگوں کے دستخط لے لیے اور ان سے جا کر کہا تھا کہ پنڈت جی اس خطار پر کہ مسلمانوں نے قانون شکنی کی تھی ان پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور ان کی گرفتاریاں بھی عمل میں لائی جا سکتی ہیں مگر کوتوال شہر کو اس بات کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو چوراہے میں کھڑے ہو کر ماں بہن کی گالیاں دیتا۔

انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے میں نے کہا میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں آپ اس محضر کو ملاحظہ کریں جس پر ہندوؤں کے بھی دستخط ہیں۔

محضر پڑھ کر وہ غصے میں کانپنے لگے اور انسپکٹر جنرل پولیس کو اسی وقت فون پر ہدایت کی کہ کوتوال کو فوراً معطل کر کے اس کی تحقیقات کرو اور مجھے اطلاع دو۔

ان کو اردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی۔ انہوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اردو کے بارے میں میرے زاتی رائے اور ہے اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے۔ لیکن میں گورنمن پر اپنی رائے تھرسٹ کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ یہ عمل ڈیماکریسی (جمہوریت) کے خلاف ہے۔

ایک روز لکھنو اسٹیشن پر انہوں نے ریلوے حکام کو بلا کر بہت بری طرح پھٹکار کر کہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھ کو نرا جاہل بنا کر رکھ دیا ہے ہر طرف ہندی کے بورڈ لگے ہوئے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کھانے کا کمرہ ہے یا بوائری ہے۔

---

[1] وہ ادب کے بڑے قدر دان ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ رن بھی ہیں اور دھاوا

www.pdfbooksfree.pk

بھی۔

ایک بار جب پاکستان سے رخصت لے کر جب میں دہلی میں ان سے ملا تو انہوں نے بڑے طنز کیساتھ مجھ سے کہا تھا کہ جوش صاحب پاکستان کو اسلام اسلامی کلچر اور اسلامی زبان یعنی اردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا تھا۔لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا اور وہاں یہ دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔مجھ سے انگریزی بولی جا رہی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس بھی دیا جا رہا ہے۔ مجھے اس صورت حال سے بے حد صدمہ ہوا اور میں سمجھ گیا کہ اردو اردو اردو کے جو نعرے ہندوستان میں لگائے گئے تھے وہ سارے اوپری دل سے اور کھوکھلے تھے۔ اور ایڈریس کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اردو میں جواب دے کر سب کو حیران کر دیا۔اور یہ بات ثابت کر دی کہ مجھ کو اردو سے ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ محبت ہے۔اور جوش صاحب معاف کیجیے آپ نے جس اردو کے واسطے اپنے وطن کو تج کر دیا ہے اس اردو کو پاکستان میں کوئی منہ نہیں لگاتا۔اور جائیے پاکستان میں نے سرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو اردو میں خط لکھا تھا اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو جواب الجواب میں یہ لکھا کہ جناب والا میں نے تو آپ کی اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اب چند واقعات ان کی ادب نوازی ان کی غیر معمولی شرافت اور ان کے بے نظیر نازبرداری کے بھی سن لیجیے۔

جب سینٹرل حکومت کے محکمہ اطلاعات میں میرا تقرر سرکاری رسالے آج کل

میں ہو گیا تو میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے پرچے کے واسطے اپنا پیغام جلد بھیج دیجیے۔ اگر آپ تساہل سے کام لیں گے تو میری آپ کی زبردست جنگ ہو جائے گی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ان کا پیغام آ گیا (جسکو آج کل فائل میں دیکھا جا سکتا ہے) اپنے پیام کے آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں جلدی میں پیام اس لیے بھیج رہا ہوں کہ جوش صاحب نے مجھ کو دھمکی دی ہے کہ اگر دیر ہو گئی تو وہ مجھ سے لڑ پڑیں گے۔ اور جب میں نے ان کے پیغام کے شکریے میں انکو خط لکھا تو دبی زبان سے یہ شکایت بھی کر دی کہ آپ نے میرے خط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھنے کے عوض سیکرٹری سے لکھوایا ہے۔ میرے ساتھ آپ کو یہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے تھا۔

اور ان کی شرافت دیکھیے کہ میری اس شکایت پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے مجھ کو یہ لکھا کہ مشاغل کے اس ہجوم کی بنا پر میں سیکرٹری سے خط لکھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میری اس غلطی کو معاف کر دیں۔

ایک بار میں ان کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازہ پر کھڑے قدوائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور جیسے ہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ایک سیکنڈ کے اندر روپوش ہو گئے۔

میں نے قدوائی صاحب سے کہا میں تو اب یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ آپ پنڈت جی سے کہہ دیجیے گا کہ لیڈری اور پرائم منسٹری کو لیڈری اور پرائم منسٹری تک محدود رکھیں۔ اور اس کو اس قدر نہ بڑھائیں کہ وہ ماتنز کی بادشاہی سے ٹکر لینے لگے۔ قدوائی صاحب نے مسکرا کر پوچھا کس بات پر آپ اس قدر بگڑ گئے ہیں میں نے کہا ارے آپ ابھی تو خود دیکھ چکے ہیں کہ میرے آتے ہی وہ روپوش ہو گئے ہیں اور مزاج پرستی تو بڑی چیز ہ۔ انہوں نے مجھ سے صاحب سلامت تک نہیں کی۔ اتنے میں جواہر لال نہرو آ گئے۔ میں منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا جوش صاحب کیا معاملہ ہے۔ قدوائی صاحب نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ میرے قریب آئے اور مجھ سے کان میں کہا کہ مجھے اس

www.pdfbooksfree.pk

قدر زور کا پیشاب آ گیا تھا کہ اگر ایک منٹ بھی تاخیر ہو جاتی تو پائے جامے میں ہی نکل جاتا۔اور یہ عذر سن کر میں نے انہیں گلے سے لگالیا۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجھ سے کہا میرے وزیر شری سچر نے دہلی میں میرا تبادلہ کر دیا ہے میں نے کہا یہ شری سچر ہیں یا مسٹر خچر وہ ہنسنے لگے۔کہا کیا خوب قافیہ ملایا ہے۔ہاں تو میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اور آپ کی بیگم پٹودی دونوں مل کر پنڈت جی کے پاس جائیں اور میرا تبادلہ رکوا دیں۔

دوسرے ہی دن ہم دونوں پرائم منسٹر ہاؤس پہنچے اپنے آنے کی اطلاع کی بیگم پٹودی کو تو فوراً بلا لیا گیا۔اور میں منہ دیکھتا رہ گیا جواہر لال کی اس بدوضعی پر مجھے تاؤ آ گیا۔اور یہ سوچ کر کہ میں اسی وقت وہاں سے چلا جاؤں کہ ان سے پھر کبھی نہ ملوں میں اٹھا ہی تھا کہ ان کے سیکرٹری صاحب غالباً پیارے لال صاحب گے

اس کے بعد ان کے محکمے کے وزیر سچر بوزن خچر نے بہت زور مارا۔لیکن پنڈت جی اپنی ضد پر قائم رہے۔

ایک مرتبہ میں گرمی کی تعطیل منانے کے لیے شملے گیا ہوا تھا۔تین چار روز بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال بھی آ گئے ہیں میں نے ان کی جائے قیام پر فون کیا بدقسمتی سے رسیور اٹھایا ان کے ایک ایسے نووارد سیکرٹری نے جو لہجے ہی سے مدراسی معلوم ہو رہا تھا۔میں نے اس سے اپنا نام بتا کر کہا میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں اور آپ ان سے وقت مقرر کر کے مجھے اطلاع کر دیں اس گنوار نے کبھی میرا نام سنا ہی نہیں تھا۔اس نے بار بار میرا نام پوچھا میں نے کہا جوش ملیح آبادی لیکن اس کو کچھ سمجھ نہ آیا آخر کار میں نے جھلا کر کہا جے او اس ایچ۔اس نے کہا مسٹر جاش آپ کے پارٹیکلز (خصوصیات) کیا ہیں۔میں نے کہا جو شخص میرے پارٹیکلز نہیں جانتا اس کو یہ حق نہیں کہ وہ ہندوستان میں رہے۔یہ سن کر اس نے کہا اوہ ایسے بولے گا میں نے کہا اس سے زیادہ بولے گا۔اس نے کہا آپ ہولڈ کیے رہیں میں پنڈت جیسے پوچھ کر بتائے گا۔

اور دو منٹ کے بعد اس نے کہا پنڈت جی اب بولتا ہے کہ ہم یہاں مجے (مزے) کرنے آیا ہے آپ ڈلی میں ملو۔

یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ام الشعراء سے کہا وزیر اعظم بنجانے کے بعد پنڈت جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے میں ابھی ان کو ایسا خط لکھوں گا کہ وہ تگنی کا ناچ ناچنے لگیں گے۔ بیوی نے کہا ہمارے سر کی قسم ابھی خط نہ لکھو۔ اس وقت غصے میں بھرے ہوئے ہو۔ نہ جانے کیا کیا لکھ مارو گے۔

پانی پی کر تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ پانی پی کر لیٹ تو گیا مگر دل کی آگ بھڑکتی رہی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لیٹ سکا بستر پر انگارے دہکنے لگے۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور ایسا خط لکھا کہ اگر اس قسم کا خط کسی تھانے دار تک کو لکھ دیتا تو وہ بھی تمام عمر مجھے معاف نہ کرتا۔

خط روانہ کر دینے کے دوسرے دن اندرا گاندھی جی کا فون آیا کہ آپ آج تین بجے سہ پہر کی چائے میرے ساتھ پیجیے۔ میں نے کہا بیٹی وہاں تمہارے والد موجود ہوں گے میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے کہا میں پتا جی کو اپنے کمرے میں بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں تیار ہو گیا۔

شام کو جب برآمدے میں پہنچا تو ایک چپراسی نے اندرا کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور جب میں ان کے کمرے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آ کر پنڈت جی نے میرا ہات پکڑ کر کہا آیئے مرے کمرے میں۔ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میرا ہات کھینچا اور مروت کے دباؤ میں آ کر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔

ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے بزرگوں کے ملنے والے سر مہاراج سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں پنڈت جی نے کہا مہاراج سنگھ یہ وہی جوش صاحب ہیں جنہوں نے مجھے ایسا گرم خط لکھا کہ شملے کی ٹھنڈک میں پسینہ آ گیا۔ مہاراج نے کہا غنیمت سمجھیے کہ یہیں تک نوبت آئی ان کے بزرگوں سے آپ واقف نہیں۔ وہ جس

پر گرم ہو جاتے تھے اسے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے۔ پنڈت جی ہنسنے لگے گھنٹی بجائی اسی مدراسی سیکرٹری کو بلایا اور جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا وہ اس پر برس پڑے کہ تم نے مجھے پوچھے بغیر جوش صاحب کو ایسا جواب کیوں دیا۔ میں ابھی تمہارا ٹرانسفر کیے دے رہا ہوں کہ تم منسٹری آف کامرس چلے جانا۔

ان کا یہ برتاؤ دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔ اور ان کے بے مثال رواداری و شرافت پر نگاہ کر کے میں ان کو گلے لگا کر رونے لگا۔

اب ان کی آخری شرافت و قدر شناسی کا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔

ان کے انتقال سے چند ماہ بیش تر میں ہندوستان گیا اور ان سے درخواست کی تھی کہ آپ کسی دن میری جائے قیام پر آ کر میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہر چند میں ان کا دل توڑ کر پاکستان آ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میری دعوت قبول کر کے وہ میری قیام گاہ پر آئے کھانا کھایا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھے رہے۔ اس دعوت میں ان کی آواز کے ضعف اور ان کے تبسم کے پھیکے پن سے یہ اندازہ کر کے میرا دل بیٹھنے لگا کہ اب وہ انی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا اور میرے پاکستان واپس جانے کے تین ماہ بعد وہ آسمان شرافت کا آفتاب ڈوب گیا۔ اور ہندوستان ہی میں نہیں سارے ایشیاء میں تیرگی پھیل گئی۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

انگلستان کے شاہ شطرنج کو چھوڑ کر اس وقت کرہ ارض پر جس قدر بھی منسٹر پریسیڈنٹ ڈکٹیٹر اور بادشاہ سلامت ہیں وہ سب اپنے اپنے ملکوں میں اس قدر مغضوب و مبغوض ہیں کہ عامتہ الناس کے روبرو جب انکا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس خوف سے ادھر ادھر دیکھ کر کہ کہیں حکومت کا کوئی پٹھو تو قرب و جوار میں نہیں ہے ان کے نام پر بے تحاشہ صلواتیں بھیجنے لگتے ہیں۔ اور یہ ارباب اقتدار جب اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں یا باہر سے اپنے ملک آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے خوشامد خورے

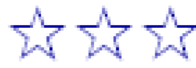
لیڈروں کی دھمکیوں اور بے ضمیر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لوگوں کو لاریوں میں زبردستی بھر بھر کر ریلوے سٹیشنوں کے پلیٹ فارموں اور ہوائی جہازوں کے میدانوں میں لیے جمع کر دیا جاتا ہے۔ کہ وہ ان ارباب اقتدار پر انگار جھے برسانے کی تمنائی باتوں سے جھوٹے پھول برسانے اور در پردہ انہیں کوسنے دینے والی زبانوں سے ان کے حق میں زندہ باد کے کھوکھلے نعرے لگائیں۔ اور مٹھائی کے وعدے سے ایک پھسلا ہوا بچہ ان کی گردن میں ہار ڈال دے۔ اور فروخت شدہ اخباروں میں ان کے شاندار استقبال کی بڑی بڑی تصویریں شائع فرمادی جائیں۔

اور ان میں سے جب کوئی معزول ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو لوگ اس کی معزولی و موت پر مٹھائی بانٹتے اور شکرانے کے سجدے ادا کرتے ہیں۔ اور پھر دو روز کے بعد اس کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں گویا اس کی ماں نے اسے کبھی جنا ہی نہیں تھا۔ لیکن جواہر لال کا معاملہ اس سے قطعی برعکس تھا۔ چند جن سنگھی اندھے لیڈروں کو چھوڑ کر ہندوستان کا بچہ بچہ ان کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد بھی دلوں پر ان کی محبوبیت کا اس قدر سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ جس جگہ وہ جلائے گئے تھے وہاں میں نے خود ان کیا آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صبح دوپہر اور شام کے وقت ہر عمر اور ہر طبقے کے زائرین کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ سڑک رک جایا کرتی تھی۔ اور لوگوں کی آہ و بکار سے فضا کانپتی رہتی تھی۔ اسے کہتے ہیں حقیقی محبوبیت اور اسے کہتے ہیں سچی لیڈری۔ نہرو میں خود کامی و کمینگی نہیں تھی۔ وہ بڑے آدمی بن ہی نہیں سکتے تھے اور اسی خطا پر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاستدان نہیں تھے۔

بات یہ ہے کہ دراصل سیاست پیغمبری کا ایک دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے کہ جو نوع انسان کو پھولوں کی سیج پر لٹانے کے لیے خود غار اشگاف کانٹوں پر چلتی ہے۔ اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست اس قدر مسخ ہو چکی ہے۔ کہ وہ نوع انسانی کو کانٹوں میں

چلا کر خود پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہے۔ اور اللہ کے بندوں کے پیٹوں پر پتھر بندھوا کر فقط اپنا اور اپنے چہیتوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست چوں کہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے میں اسکی تائید کرتا ہوں اس لیے کہ آج کے اچھے سیاستدان کے واسطے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ نا قابل برداشت حد تک برا آدمی ہو

(اے لافانی جواہر لال روح انسانیت کا سجدہ قبول کر)!!



سروجنی نائیڈو

بادہ شاعری سے سرشار گروہ شعرا کی غم گسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی، لہجے میں ارغنوں، باتوں میں افسوں، میدان جنگ میں جھانسی کی رانی، ایوان امن میں قرۃ العین ثانی، تقریر میں نغمہ آب حیواں آواز میں جمال ماہ کنعاں رشتہ صوت ریشمی تاگے کا سامہیں نوائے حرف و حکایت گوکل بن کر گویا مدھر بین چشمہ لولوومرجان بلبل ہندوستان اگر یہ دور مردوں میں جواہر لال اور عورتوں میں سروجنی کی ہستیاں نہ پیدا کرتا تو پورا ہندوستان نابینا ہو کر رہ جاتا۔

میں نے ان کو سب سے پہلے سنہ ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ حیدر آباد میں دیکھا تھا۔ اور ان کی شخصیت کی مقناطیسیت نے میرے دل کو ہمیشہ کے واسطے موہ لیا تھا۔

ان کے گلے میں رنگیں نہیں سارنگی کے کھنکتے ہوئے تار تھے۔ ان کے لہجے میں اس قیامت کا زیر و بم تھا کہ اس کے سامنے راگنیاں سرمہ در گلو ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اور ان کے دل و دماغ کے ایوان شاعری کا وہ زمزمہ پرور تموج تھا کہ ان کے روبرو چاندنی راتوں کا نغمہ بحر پانی پانی ہو کر رہ جاتا تھا۔

ہر چند اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ لیکن حیدر آباد کی اردو آب و ہوا نے ان کو اردو اور فارسی کے مذاق میں ڈھال دیا تھا۔ کہ فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روانی کے ساتھ اردو بولتیں بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ اردو شاعری کو سمجھ لیتیں اور الفاظ پکڑ کر اس طرح داد دیتی تھیں کہ ان کو شعر سنا کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ آج تک یاد ہے کہ مجھ کو وہ رات جب میں ان کو نظم انگیٹھی سنائی تھی تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھیں۔

انہوں نے میں اس نظم اور اسی کے ساتھ میری بھی تیس چالیس نظموں کا انگریزی میں نہایت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ افسوس کہ اس یادگار سرمائے کو میرے لاابالی پن نے گم کر دیا۔

ان کی یو پی کی گورنری کے زمانے میں ایک بار میں لکھنو گیا، اور صبح کے وقت گورنمنٹ

ہاؤس میں جب میں نے فون کیا کہ میں مسز نائیڈو سے بات کرنا چاہتا ہوں تو ان کے سیکرٹری نے مجھ سے کہا کہ آپ پیغام دے دیں۔ میں پہنچادوں گا۔وہ خود بات نہیں کر سکیں۔ میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان یہ رسم نہیں ہے۔ میں رسیور اٹھائے ہوئے ہوں آپ ان سے جا کر یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں سیکرٹری نے کہا آپ اپنا فون نمبر دے دیں تھوڑی دیر میں آپ کو رنگ کروں گا۔

دس منٹ بعد گھنٹی بجی سروجنی کی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی انہوں نے پوچھا آپ کب آئے میں نے جواب دیا ابھی آیا اور سب سے پہلے آپ کو فون کر رہا ہوں۔انہوں نے کہا سب سے پہلے آپ مجھ سے ملنے یہاں آجایئے میں باتھ روم جا رہی ہوں اگر آپ میرے باتھ روم سے نکلنے سے پیشتر یہاں آ جائیں تو دو چار منٹ تک انتظار کریں ایسا نہ ہو کہ منہ بنا کر چلے جائیں۔

یہ تھا سروجنی کا اخلاق اب ان کی شرافتوں کو خوردبین لگا لگا کر ڈھونڈتا پھرتا ہوں لیکن کہیں پتا نہیں چلتا۔ہائے کدھر چلے گئے وہ لوگ۔

زندگی کے آخری دور میں وہ بار بار بیمار پڑنے لگی تھیں۔اور میں بار بار یہ سوچتا تھا کہ اس بار بار بیمار پڑ جانے کی علت کیا ہے وہ ہر بار مختلف اسباب بتا کر ٹال دیا کرتی تھیں۔لیکن جب ایک مرتبہ میں نے زور دے کر بار بار بیمار پڑ جانے کی پھر علت پوچھی تو وہ اداس ہو کر کہنے لگیں جوش صاحب آپ نہیں مانتے تو مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اسکا سبب ہے میرا بڑھاپا عورت کے منہ سے اعتراف شیب سن کر میرا دل غمگین ہو گیا انہوں نے میری افسردگی کو بھانپ کر کہا آپ رنجیدہ نہ ہوں۔میرے بال تو سفید ہو رہے ہیں مگر آپ یقین رکھیں کہ میرا دل ابھی تک سیاہ ہے اور جب تک دل سیاہ ہے جوانی باقی ہے۔

۱؎اس سے قبل اس باب میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لیے اختصار سے کام لوں گا۔

www.pdfbooksfree.pk

میاں محمد صادق

دراز قامت' ژوف نگاہ' شب رنگ صباح طینت لاہور کے باشندے دورفرنگی کے پولیس افسر عقیدے کے لحاظ سے قادیانی' نواہی سے بیزار' اوامر کے پابند نماز پنج گانہ کے بغیر سانس لینے کو گناہ سمجھنے والے سخن سنج شاعر نواز اخلاص شعار مردم شناس عہد کے اعتبار سے شب یلدا اور پاکیزگی طبع وشرافت نفس کے نقطہ نظر سے صبح صادق۔

یہ غالباً سنہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا۔ اس وقت وہ دہلی خفیہ پولیس کے سپیر سپر نٹنڈنٹ تھے۔ ہر چند ہمارے مابین بڑا تضاد تھا وہ شدت کے ساتھ دیں دار تھے میں پابندی کے ساتھ بادہ خوار تھا (اور خدا کے فضل سے اب بھی ہوں) وہ حسینوں کی جانب نگاہ اٹھانے کو گناہ سمجھتے تھے' میں ان کی طرف نگاہ اٹھانے کو عبادت سمجھتا تھا۔ وہ کانگریس کے دشمن تھے میں کانگریس کا دوست تھا۔ وہ حکومت برطانیہ کے وفادار تھے میں اس کا زبردست باغی تھا۔ اور اس تضاد کے باوصف ہم میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے دوست اور جاں نثار دوست تھے۔

اس محبت ومودت کی علت یہ تھی کہ میاں صاحب شاعری کے اس قدر شیدائی تھے کہ میری تمام خطاؤں سے چشم پوشی کر کے مجھ پر جان چھڑ کتے تھے اور میں ان کے اخلاص کا اس قدر پرستار تھا کہ ان کے تمام قصور معاف کر کے ان کا دم بھرتا تھا۔ اور وہ لے یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ جب وہ دینی اعمال میں غرق ہوتے تھے میں ان کو بناتا نہیں تھا۔ اور جب میں ان کو باغیانہ کلام سناتا تھا تو وہ بگڑتے نہیں تھے۔ بلکہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

میاں صاحب اس فکر میں رہتے تھے کہ مجھ کو وہ بنا دیں جسکو ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں مرد صالح کہا جاتا ہے اور یہاں یہ عالم تھا اور اب تک ہے کہ

مرد صالح کے تصور سے ہنسی آتی ہے

اور اسی جذبہ اصطلاح کے تحت وہ میری ٹوہ میں رہا کرتے تھے اور میری بیوی تک

میری بداعمالیوں کی خبریں پہچوایا کرتے تھے۔

ایک بار میری غیر موجودگی میں وہ میرے گھر آ گئے ل سخاوت نے کہا کہ میاں صاحب نواب صاحب سے ملنے رام پور گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا آزاد صاحب کہاں ہیں اس نے کہاوہ بھی ساتھ گئے ہیں یہ سن کر انہوں نے میری تلاش میں خفیہ پولیس والوں کو لگا دیا۔ اور میرے جو اڈے ان کو معلوم تھے۔ ان کا پتا بتا کر ہدایت کر دی کہ وبخاص طور پر مجھ کو وہاں تلاش کریں۔ اور جب اپنے گرگوں کی معرفت ان کو پتا چل گیا کہ میں رام پور میں نہیں گیا بلکہ دہلی کے فلاں محلے میں اپنی محبوبہ کے وہاں جشن کر رہا ہوں تو انہوں نے میری بیوی کو خبر کر دی اور ان کی وہ بری کے واسطے خفیہ پولیس کے آدمی کو ان کے ساتھ کر دیا۔

وہ تو کہیے خدا نے بری خیر کی میری بیوی کو میری قیام گاہ کی اس وقت خبر ہوئی جب میں وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور اپنے مکان کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ابھی میرے تانگے نے آدھی مسافت سے کچھ کم طے کی تھیکہ آزاد صاحب انصاری نے بےحد گھبرا کر کہا جوش صاحب آپ کی بیگم موٹر میں آ رہی ہیں بیوی کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو گیا۔ آزاد نے مجھ سے کہا یہ جو داہنے ہاتھ پر تالاب ہے مجھے اس میں پھینک دیجیے اتنے میں بیوی کی موٹر تانگے کے سامنے آ گئی۔

اور ہم دونوں ان کو اس طرح پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے جیسے چوہے دان میں پھنسا چوہا باہر کے تماشائیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن اللہ نے ہم پر بڑا فضل کیا کہ بیوی نے ہم کو نہایت قہر کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر سر کو بڑی نفرت کے ساتھ جنبش دی اور شوفر کو حکم دیا کہ گاڑی موڑ کر گھر لے چلو اور جب ان کی موٹر اوجھل ہو گئی تو ہم دونوں نے اپنے کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا کہ ہم زندہ ہیں یا انتقال فرما چکے ہیں۔ اگر وہ موٹر روک کر اس وقت پوچھ گچھ کرنے لگتیں تو ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ اور ہم بےہوش ہو کر گر پڑتے۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مر جاتے۔

www.pdfbooksfree.pk

اواخر سنہ ۱۹۶۷ء میں جب ہندوستان کے سفر سے پلٹا تو دو چار روز کے واسطے لاہور میں ٹھہرا تھا۔ اسی اثنا میں ایک روز ان کو ملنے گیا اور خدا جانے کیوں ان کی گلی کے نکڑ پر ہی ٹیکسی رکوا دی اور اپنے رفیق سفر عیش ٹونکی سے کہا اس گلی میں چلے جایئے داہنے ہاتھ پر چوتھا یا پانچواں مکان میاں صاحب کا ہے دریافت کیجیے وہ مکان میں ہیں کہ نہیں عیش کو بھیج کر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا دل کیوں دھڑکنے لگا ہے۔ اور انہوں نے واپس آ کر جب ان کے انتقال کی خبر سنائی تو در و دیوار مجھ کو گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔

میاں صاحب! آپ اکیلے چلے گئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا بگڑ جاتا تھا۔



علامہ حیرت

الگنی پر لیٹے ہوئے مظلر کی طرح دبلے پتلے اور غزل کے س بیمارِ غم کی مانند نحیف و نزار جو ہر آن کراہتا رہتا ہے۔ کہ اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبار بستر کا۔

گورے چٹے' اور بڑھاپے کے باوجود ایسا بھبوکا رنگ رکھنے والے کہ عمر اور ریش دونوں ہی درازی اس کو بجھا نہ سکی۔ اور چہرے کا وہ عالم ہے کہ حضرت مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔

مزاج میں اس قدر ظرافت اور شوخی ہے کہ روتوں کو ہنسا دیں۔ اور مدرسوں کے لڑکے ان کے روبرو اپنی چھلبل بھول جائیں۔ ہر چند قدیم شاعری سے وابستہ ہیں پھر بھی نہایت آب دار شعر کہتے ہیں۔ رہنے والے ہیں بدایوں کے جہاں کے للہ مشہور ہیں مگر حیدرآباد دکن میں رہتے جگ بیت چکا ہے۔ پھر بھی زبان کی شستگی وہی ہے جو پہلے تھی اور جب دکنی اردو بولنے پر اتر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے قدیم باشندے ہیں۔

کئی برس کی بات ہے کہ میں حیدرآباد گیا تھا۔ انہوں نے میری نہاری کی دعوت کی تھی رانی جانسی بھی میرے ہمراہ ان کیہاں گئے تھے۔ نہاری کے واسطے جب تڑکے ان کے وہاں پہنچے تو ان کے ملاقات کے کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے علامہ کی آواز آئی کیا لائی ہو بیوی؟ بیوی نے کہا وضو کے لیے گرم پانی۔ انہوں نے بڑے مزے سے کہا ایک زمانہ تھا کہ جب مجھ پر غسل واجب ہو جاتا تھا تم میرے لیے نہانے کے لیے؛ پانی گرم کر دیا کرتی تھیں۔ کہ آؤ پانی تیار ہے۔ اور اب یہ دور آ چکا ہے کہ وضو کا پانی سامنے لیے کھڑی ہو۔ یہ سن کر میرا قہقہہ نکل گیا اور ان کی بیوی کی آواز آئی بھاڑ میں جائیں ایسی بے غیرتی کی باتیں میرا قہقہہ سنکر وہ ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور زنانے کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا بیوی شرمانا نہیں ہماری تمہاری باتیں جوش صاحب کے کانوں میں نہیں پہنچی ہیں۔

نہاری کے بعد میں نے کہا سنو علامہ صاحب آپ کے گھر آتے آتے موٹر میں ایک قصیدہ ہو گیا ہے آپ کی شان میں جس کے چند مصرعے مانی کے اور باقی اشعار ازیں خاک سار ہیں۔ جس کے قوافی یہاں وہاں ہیں اور ردیف ہے ہیں علامہ حیرت بدایونی انہوں نے کہا اللہ اکبر ایسی شیطان کی آنت سی لامبی ردیف اس قدر دراز قامت ردیف نے اچھے شعر تو کہنے نہیں دیے ہوں گے خیر سنایئے میں نے کہا سنیے۔

مکاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
زماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

انہوں نے کہا واللہ کمال کر دیا۔ میری ایک ذات میں زمان و مکان دونوں کو یک جا کر دیا ہے میں نے کہا اب شعر سنیے

نہایت نیک طینت ہیں، مگر حد سے سوا کچھ بد
گماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہنے لگے بدگماں کے دو ٹکڑے کر کے پہلے مصرع میں بد اور دوسرے میں گماں لانا انتہائی مشاقی کی بات ہے میں نے کہا اور سنیے اور سر دھنیے۔

بڑے سنگین ہیں لیکن قمر چہروں کے جھرمٹ میں
کتاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی
سبک روحی میں ہیں یکتا مگر میزان محشر میں
گراں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
مجسم داد رہے ہیں رات بھر اور صبح کو یک سر
اذاں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
خضاب و خندہ و خوش لہجگی کے فیض سے اب تک
جواں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی

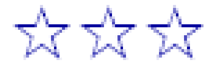
www.pdfbooksfree.pk

جو مسجد میں پکارا مے کدے سے یہ صدا آئی
یہاں ہیں' حضرت علامہ حیرت بدایونی
جھکے سجدے میں اور کعبے میں پہنچے لوگ چیخ اٹھے
کہاں ہیں ' حضرت علامہ حیرت بدایونی

پوچھیے نہیں علامہ کا کیا عالم ہوا۔ یہ اشعار سن کر قہقہے مار کر میرے سینے سے چمٹ گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم دنیا میں کوئی اس ردیف کے ساتھ ایسے شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس قدر مزا آیا کہ غسل واجب ہو گیا۔ بیوی نہانے کے لیے پانی گرم کر دو۔

ہم بچھڑے ہوئے شاید اب کبھی نہیں مل سکیں گے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر کوچ کر جائیں گے۔

کھڑکیاں چھوپی گئیں روزن در بند ہوئے ہم نظر بند ہوئے!!



سردار دیوان سنگھ مفتون

سیر چشم کوتاہ قامت بلند حوصلہ مہمان نواز، شیر دل، دوست پرور، دشمن قاتل، سلطان شکار، گدا نواز بدترین دشمن اور بہترین دوست

جب وہ ریاست نکالتے تھے ہز مجیسٹی کے قلعوں اور ہز ہائینسوں کے ایوانوں میں زلزلے ڈالتے تھے۔ والیان ریاست کی نیندیں حرام کر دی تھیں ان کے قلم نے بڑے بڑے فرمانروا کانپتے تھے ان کے نام سے۔

دہلی کا واقعہ ہے کہ ایک روز سر شام ایک ریاست کے وزیراعظم میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دیوان سنگھ آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی وزیراعظم صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ اور جب گلاس بھر کر میں نے ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے دیوان سنگھ کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ میں ان کے سامنے نہیں پیوں گا۔ دیوان سنگھ نے ان کو اشارہ کرتے دیکھ کر مجھ سے کہا جوش صاحب پرائم منسٹر سے کہہ دیجیے کہ وہ شوق سے پئیں۔ میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔ یہ والئ ملک نہیں ہیں۔ میں تو فقط والیان ملک پر حملہ آور ہوتا ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ میں انسان کا نہیں سور کا شکار کھیلتا ہوں۔

ان کی سلطان شکاری کے واقعات سے تو ہندوستان اب تک گونج رہا ہے اب ان کی گدا نوازی کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے جو ان کے ایک دوست نے مجھے سنایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ کسی والی ریاست کے متعلق ایک ایسی دستاویز ان کے ہاتھ لگ گئی کہ جس میں ان کے حرامی ہونے کا ثبوت موجود تھا۔ اس دستاویز کے زور پر وہ اس والی ریاس سے غالباً ساٹھ ستر ہزار روپیہ حاصل کر کے گھر آئے اور نوٹوں کے بنڈل بڑی بے پروائی کے ساتھ میز کی درز میں ٹھونس کر وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے شکستہ حال دوست آ گئے اور کھڑے کھڑے کہا سردار صاحب میں آپ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آیا ہوں مجھ سے گلے مل لیجیے۔ وہ کھڑے ہو کر ان سے گلے ملے اور انہیں زبردستی بٹھا کر کہا میر صاحب یہ ہمیشہ کے

www.pdfbooksfree.pk

واسطے رخصت ہونے کے کیا معنی ہیں۔ میر صاحب نے کہا میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ بس اتنا کہوں گا کہ کربلائے معلی جا رہا ہوں۔ اور اب جیتے جی واپس نہیں آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ یہ کہہ کر میر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور جیسے ہی زینے کی طرف جانے لگے۔ دیوان سنگھ نے بڑھ کر ان کو روک لیا اور کہا جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے بھگوان کی قسم میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ یہ سن کر میر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کہا سردار صاحب۔ یہ نہ پوچھیے اور مجھے جانے دیجیے دیوان سنگھ ان کو کھینچ کر کمرے میں لے آئے اور کہا جب تک آپ وجہ نہیں بتائیں گے میں قسم کھا چکا ہوں کہ آپ کو یہاں آنے نہیں دوں گا۔ میر اصاحب نے کہا سردار صاحب میں اس قدر مقروض ہو گیا ہوں کہ اب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ میں قرضہ ادا کر سکوں اس لیے جا رہا ہوں کہ کربلائے معلی میں زندگی کے باقی دن گزار دوں اچھا اب جانے دیجیے۔ وقت کم ہے یہ کہہ کر میر صاحب پھر اٹھ کھڑے ہوئے دیوان سنگھ نے ان کا دامن پکڑ کر پوچھا آپ کس پر قدر قرضہ ہے۔ میر صاحب ان کہا پندرہ ہزار روپے۔

دیوان سنگھ نے کہا بس ایک منٹ اور یہ کہہ کر انہوں نے بیس ہزار روپے گن کر میر صاحب کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیے میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ اور دیوان سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے سر جھکا لیا۔ ہے کوئی اس دور میں ایسا دوست پرور اور کیا آج کا کوئی ارب پتی بھی اس دریا دلی کی جرات کر سکتا ہے؟

ریاست کے دور میں انہوں نے بے حد کمایا۔ لیکن کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ کھایا پیا اور کھلا پلا دیا۔

اس لیے ان پر تونگری اور مفلسی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ لیکن اگر مفلسی میں کوئی دوست یا مہمان آ جاتا تھا تو وہ خفیہ طور پر اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر کے اس کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی انکی مفلسی کو بھانپ کر ان کو دعوت کرنے سے روکتا تھا تو وہ لڑ پڑتے تھے۔

مجاز نے آ کر ایک دن مجھ سے کہا کہ کل تو سردار صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ میں شام کو ان کے ہاں پہنچا انہوں نے ملازم سے کہا کہ بارہ درجن سوڈے کی بوتلیں لے آ محلے میں ان کا بڑا بھرم تھا۔ تھوڑی دیر میں بارہ درجن بوتلیں آ گئیں۔ انہوں نے ایک درجن بوتلیں رکھ کر نوکر کو حکم دیا کہ فلاں دکان پر جا کر ان کو فروخت کر دے۔ اور ان کو فروخت کر کے جو روپیہ ہات آئے اسکی ایک وہسکی کی بوتل لے آنا اور کچھ کھان کا سامان لے آئے۔ یہ تھی ان کی مہمان نوازی کی شان۔

یہ غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا۔ اور معاش اور معاشقے کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی اور پریشانی خیالی کا دور تھا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آ چکی تھی۔ کہ وہ ایک روز شام کے وقت میرے گھر آئے برانڈی کی بوتل ساتھ لائے (وہ برانڈی کو وسکی پر ترجیح دیتے تھے)۔

جب دور ختم ہوا تو انہوں نے کہا میں بھابی سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں میں نے سخاوت سے کہا کہ سردار صاحب کو اوپر لے جاؤ میری بیوی اس وقت تک پردے کی پابند تھیں لیکن ان سے کانا پردہ کرتی تھیں۔ جب وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آئے دو منٹ کے اندر رخصت ہو گئے اور جب میں اوپر گیا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا سردار صاحب یہ نوٹوں کا بنڈل دے گئے ہیں وہ کہتے تھے یہ رقم انہوں نے اپنے دوست نواب بھاولپور سے خط لکھ کر منگوائی ہے دیکھی آپ نے دیوان سنگھ کی شرافت اور دوستی!

ایک زمانے میں جب کہ وہ رفیع احمد قدوائی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھ رہے تھے اس وقت انکی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ میں ان کے افلاس کا اندازہ کر کے سیدھا قدوائی صاحب کے پاس گیا اور ان سے کہا قدوائی صاحب آپ منسٹر ہیں حاتم رواں ہیں آپ کی دوست نوازی کے تو ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔ لیکن دوست نوازی کوئی بڑا وصف نہیں ہلاکو چنگیز اور یزید بھی اپنے دوسوں کو نوازتے تھے۔ البتہ

www.pdfbooksfree.pk

دشمن نوازی کرنا ایسا وصف ہے جو انسان کو نبوت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ آپ ہلاکو وغیرہ کی سطح پر قانع رہیں گے یا پیمبری کی سطح تک پہنچنا چاہیں گے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا پہیلیاں کیوں بجھوار ہے ہو آپ جو مدعا ہو اسے کھل کر کہیے۔ میں نے کہا دیوان سنگھ آج کل سخت پریشان ہیں۔

انہوں نے یہ سنتے ہی گھنٹی بجائی سیکرٹری آیا اس کے کان میں انہوں نے کچھ کہا اور چلا گیا اور چار پانچ منٹ بعد وہ چیک لایا چیک پر قدوائی صاحب نے دست خط ثبت کیے اور مہا کہ یہ چیک جا کر دیوان سنگھ کو دے آیئے۔ وہ دس ہزار کا چیک لے کر میں ان کے پاس گیا انہوں نے کہا چلیے ابھی کیش کرالیں چیک کیش ہوگئی تو وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ آدھی رقم آپ لے لیں۔ اور جب میں نے انکار کیا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

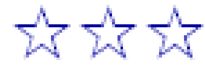
میں کہہ چکا ہوں کہ وہ بدترین دشمن بھی ہیں اس کا بھی واقعہ سن لیجیے میں پاکستان سے دہلی گیا اور ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک صبح کو جب باہر جانے لگا تو انہوں نے پوچھا آپ کہاں جارہے ہیں۔ میں نے جواب دیا ساغر سے ملنے کے لیے۔

ساغر کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑے دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگے آپ کو ایک ایسے منافق کے؛ پاس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ جس کو آپ نے پنڈت جی سے کہہ کر ریڈیو میں نوکر رکھوایا تھا اور اس کا بدلہ اس نے یہ دیا ہے کہ جب سے آپ پاکستان چلے گئے ہیں وہ آپ کے خلاف زہر اگلتا پھر رہا ہے۔ میں نے کہا سردار صاحب میں نے ساغر کو نہیں رکھایا ساغر نے خود پنڈت جی سے اپنی ملازمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے لیکن جب کیسلر نے پنڈت کو دھوکہ دے کر اس کا پتا کاٹ دینا چاہا تھا۔ اس وقت تو وہ آپ ہی تھے جس نے کیسلر کے فریب کا پردہ چاک کر کے اس کو نوکری دلوائی تھی میں نے کہا سردار صاحب ساغر برا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے میری پاکستان جانے کے بعد میرے خلاف آواز بلند کی تھی تو اس کا

مقصد یہ تھا کہ وہ بے چارہ حکومت ہند پر اپنی وفاداری کا سکہ جما رہا تھا اور یہ کوئی ایسی بری بات نہیں کہ میں اتنے پرانے دوست سے قطع تعلق کرلوں یہ سن کر دیوان سنگھ نے مارے غصے کے کانپتے ہوئے کہا آپ آدمی نہیں دیوتا ہیں لفظ دیوتا کو اس قدر دانت پیس کرادا کیا تھا کہ گویا وہ کوئی موٹی سی گالی دے رہے ہیں۔ اور جب میں خاموش ہو گیا تو انہوں نے کہا جوش صاحب میں تو جب تک دشمن کا خون چوس نہ لوں مجھ کو چین نہیں آتا میرے نزدیک دشمن کا مارڈالنا ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

ہزار حیف ہندوستان کی ناقدر شناسی پر کہ وہ اب اپنا رسالہ بند کر کے دہرہ دون چلے گئے ہیں۔ اور دوسو روپلی پنشن پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب ان کی اداسی پر نگاہ دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں ہائے دیوان سنگھ کا سا بے نظیر انسان اور اس قدر پریشان۔ وائے برکوری ہندوستان!



مولانا عبدالسلام

وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شہنشاہ تھے قرآن حدیث منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ تفسیر لغت لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے۔ جید عالم ہونے کے باوجود علما نے سوء کے تشابہ سے بچنے کے لیے انہوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کر دیا تھا۔ وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے تھے۔ اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیائے ہند کے مزرات کے چکر لگاتے اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

لیکن زندگی کے آخری ایام میں وہ اس قدر سختی کے ساتھ خلوت پسند اور خود نشین ہو گئے تھے کہ تقریباً بائیس برس کی مدت میں وہ اپنے دلی کے ترکمان دروازے کی پتلی سی گلی کے بالا خانے سے کبھی ایک بار بھی نیچے نہیں اترے تھے۔

میں اکثر ان کی خدمت میں جاتا اور گھنٹوں ان سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ وہ اس قدر کم آمیز ہو چکے تھے کہ انہوں نے مجھ سے حکم دے رکھا تھا کہ جوش میاں جب تک کوئی شخص حسین یا علم نہ ہو اس کو میرے پاس ہرگز نہ لانا۔ ایک روز میں ساغر کو ان کے پاس لے گیا وہ خوش ہو کر کہنے لگے کہ اچھی چیز لائے ہو۔ باوں باوں میں جبر و قدر کا مسئلہ چھڑ گیا۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ ساغر بھی اس مسئلے پر لب کشائی کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا صاحب زادے آپ خاموش رہیں اچھی صورت کے یہ معنی تو نہیں کہ آدمی خوب رو ہو کر ایسے دقیق مسائل سے بھی آگاہ ہو جائے آپ پر تو وہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ موت کی دھار نہ اسو جھے میرا ہریالا بنا۔

دہلی کی ٹکسالی اردو بولنے والوں میں سے اب صرف وہی باقی رہ گئے تھے۔ وہ جب باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ وہ پہروں یونہی بولتے رہیں۔ اور جب اپنی باتوں میں وہ فحش کی آمیزش کر دیتے تو خدا کی قسم مزا آ جاتا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

ایک روز ایک مولانا صاحب کی کج بحثی سے تنگ آ کر انہوں نے کس مزے کیساتھ یہ کہا تھا مولانا حضرت حق نے مجھ کو وہ طاقت بخشی ہے کہ اگر میں آپ کے حلقہ زیریں پر اپنا عمودی لُچی وار دکردوں تو خون کے فوارے جاری ہو جائیں۔

میں ایک روز ان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ زینے کے دروازے پر دیکھا ایک دڑھیل کھڑے ہوئے ہیں۔اور جیسے ہی ان پر مولوی عبدالسلام کی نگاہ پڑی انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اور اپنا اٹھا ہاتھ ہلا کر کہا آپ کی ریش مبارک نا قابل برداشت ہے جلدی گاڑی بڑھایئے اور وہ اپنا سا منہ لے کر اتر گئے۔ میں نے کہا مولانا آپ کا یہ عمل اخلاق رسول کے خلاف تھا۔انہوں نے فوراً جواب دیا لیکن اس قول خدا کے مطابق تھا کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ریل میں اجمیر شریف جا رہا تھا میرے ساتھ میری جے پوری محبوبہ اور اس کی ماں بھی تھی کہ کسی سٹیشن پر گاڑی رکی تو میرے ایک صوفی دوست بھی میرے حجرے میں آ گئے اور میری محبوبہ کو دیکھ کر انہوں نے جل جلالہ کا نعرہ بلند کر دیا اور میں نے میری محبوبہ کی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جناب ام نوالہ بھی تو ارشاد فرمایئے وہ جھینپ کر رہ گئے۔

ان کی آمدنی صرف تیس روپے ماہانہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر خوددار و قانع تھے کہ

ا یعنی بوڑھے تو اس قدر ہیں کہ پیشاب کرتے وقت ضعف بصارت کی بنا پر خود اپنے پیشاب کی دھار تک نظر نہیں آتی۔پھر بھی دولہا بننے کے تمنائی ہیں۔ دولہا جب دلہن کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو ڈومنیاں گانے لگتی ہیں میرا ہریالا بنا کھے معنی ہیں ہرا بھرا وتازہ اور بنا دولہا کو کہتے ہیں۔

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک وردی پوش نوجوان نے آ کر کہا نیچے ہز ہائی نس...... کھڑے ہوئے ہیں آپ اجازت دیں تو حاضر کروں۔ انہوں نے کہا اگر وہ میرے سامنے آ کر یہ کہہ دیں کہ میرے اج سے عبدالسلام کی جوتی اونچی ہے تو شوق سے آ ئیں ورنہ گاڑی بڑھا دیں۔ ہز ہائنس کی عقیدت دیکھیے کہ وہ اوپر آئے انہوں نے وہ الفاظ بڑے خلوص سے ادا کیے اور دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک بار خواجہ حسن نظامی نے ان کے پاس آ کر کہا مولانا آزاد آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں زحمت نہ ہو تو کل میرے ساتھ ان کے وہاں تشریف لے چلیے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے بگڑ کر کہا خوجہی صاحب اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو میں فوراً اس کو موٹی سی گالی دیتا جایئے اور ابوالکلام سے کہہ دیجیے کہ وہ یہاں تو من تیل لے کر آ ئیں اور میرا...... دو گھنٹے تک مسلسل سہلائیں اور اس کے بعد مجھے اپنے وہاں بلائیں یہ سنکر خواجہ صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ صرف دو منٹ بیٹھے اور چلے گئے۔

ایک دن ان کے پاس پہنچا تو میرے دوست نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات حیدر آباد دکن ان کے کوٹھے سے اترتے ملے۔ صاحب سلامت اور معانقے کے بعد میں نے پوچھا خدانخواستہ کیا مزاج سازگار ہے۔ انہوں نے کہا آپ میرے پاس آ ئیں گے تو بتاؤں گا مجھے افسوس ہے کہ خواجہی حسن نظامی نے مجھ کو مولوی عبدالسلام کے پاس بھیج کر ذلیل کرایا۔ میں اوپر گیا تو دیکھا کہ مولوی عبدالسلام غصے سے بھرے بیٹھے ہیں میں نے کہا مولانا کیا بات ہے انہوں نے کہا ابھی حیدر آباد دکن کے ایک وزیر صاحب جن کا خطاب ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر میرے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ میں ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دوں' میں نے ان سے کہا کہ دنیا کے تمام علوم میں جو علم آپ کو سب سے زیادہ مستحضر ہو اس کا نام بتائے میں اس علم کے مصطلحات میں آپ کو یہ مسئلہ سمجھا دوں گا۔ انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا علم معنی و بیان۔ سو جوش میاں اللہ آپ کا بھلا کرے میں نے علم معنی و بیان ہی کے

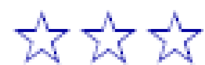
www.pdfbooksfree.pk

مصطلحات میں وہ مسئلہ حضرت حق کے فضل و کرم سے ان کو سمجھا دیا۔

وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے جھک کر میرے ہاتھ چوم لیے اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ حیدر آباد تشریف لے چلیں۔ میں نے کہا اب تو کوٹھے سے نیچے بھی نہیں اترتا ہوں اتنا بڑا سفر کیسے طے کروں گا...... اس پر انہوں نے جب مجھ سے کہا کہ مولانا کو میں وہاں لے جا کر آپ کو حضور نظام دکن سے ملاؤں گا' وہ آپ کا اس قدر وظیفہ مقرر کر دیں گے کہ یہ کمرہ چھوڑ کر آپ دہلی میں ایک کوٹھی تعمیر فرما کے اس میں رہنے لگیں گے۔

تو میرا جوش میرا نا ریل (سر) چٹخ گیا۔ میں نے کہا آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اس جاہل نظام کے سامنے اپنی وجاہت علمی کی کمر میں ذلت کی پیٹی باندھ کر جاؤں اس مسخرے کو خداوند نعمت اور اپنے کو فدوی کہوں۔ نواب مہدی یار آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ میرے موئے زیریں بمراحل بہتر ہیں۔ نظام کی مونچھوں کے بالوں سے۔ اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ میرے موئے زیریں کی پرورش میں خون علم صرف ہوتا ہے اور نظام کی مونچھوں کے بالوں کو خون جہل بڑھاتا ہے جائیے گاڑی بڑھائیے۔

غلام نرگس مست تو تاج دار آنند



www.pdfbooksfree.pk

مولانا عبداللہ عمادی

قد بونا سا، دماغ باؤن گز کا، چہرہ کتابی، داڑھی گھنی، عربی وفارسی کے ہفت قلزم دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظر امور مذہبی، فحش پسند و غیر متقی، بردباری کے ساتھ ظریف، منہ پر، لوگوں کے علم کی تعریف کرنے میں بلند آہنگ، ان کے پیٹ پیچھے ان کے جہل کا اعلان کرنے میں بیباک، مزاح کے موقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے پر مجبور، عقل معاش سے بہرہ مند، نظام دکن کے تصور سے بھی لرزاں وترساں، اور عمل پر اکسانے والے شاعر، ایک بار مودودی اور میں نے سازش کی کہ انہیں طوائف کے کوٹھے پر لے جایا جائے ہم نے جھٹ سے ایک جھوٹا دعوت نامہ لکھا جس میں (مولانا) عبدالقدیر بدایونی نے ان کو دن کے دو بجے گیارہویں شریف میں شریک ہونے کے لئے بلایا تھا وہ ہمارے چکمے میں آ گئے ہم ان کو موٹر میں بٹھا کر "محبوب کی مہندی" لے گئے جو طوائفوں کا محلّہ تھا۔

ابھی موٹر سے اتر کر، ہم طوائف کے کوٹھے کی طرف چند قدم چلے ہی تھے کہ مولانا عمادی کے ایک درباری دشمن، کامل صاحب نے موٹر سے گزرتے ہوئے ہم کو دیکھ لیا کامل صاحب نے موٹر سے سر نکال کر مولانا عمادی کو بڑے غور سے دیکھا اور بڑے معنی خیز انداز سے اپنے سر کو بار بار جنبش دیتے ہوئے گزر گئے۔

مولانا عمادی اپنے دشمن کی نگاہ، اور اس کے سر کی معنی خیز جنبش پیہم کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور مجھے یہ لوگ کسی غیر مستحسن جگہ لئے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور مودودی کو بڑے غور سے دیکھا ہم لوگ بے حد سنجیدہ بنے رہے انہوں نے پوچھا یہ آپ لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں، مودودی نے کہا ارے آپ اس قدر جلد بھول گئے ہم لوگوں کو مولانا عبدالقدیر صاحب نے گیارہویں شریف کی شرکت کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ اب ہم لوگ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے آگے آگے وہ ان کے پیچھے میں اور میرے پیچھے مودودی اور مودودی کے پیچھے جہاں تک مجھے یاد پڑتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے ان کے چھوٹے بھائی سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے۔

یہ سوچ کر مولانا عمادی، دن دہاڑے، رنڈی کے کوٹھے پر چڑھ رہے ہیں مجھے بڑے زور کی ہنسی آ گئی عمادی صاحب نے گھبرا کر پوچھا یہ آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں میں نے کہا مودودی نے گدگدایا ہے۔ اتنے میں ایک بڑھیا کوٹھے سے اترتی نظر آئی عمادی صاحب سنک تو چکے ہی تھے انہوں نے پوچھا مائی یہ کس کا مکان ہے۔ اس بڑھا نے کہا پتریا (طوائف) کا ''پتریا'' سنتے ہی مولانا اچھل پڑے ان کی داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے انہوں نے ہمیں بڑی قہر کی نگاہ سے دیکھا وہ اپنے بڑے بڑے پائنچے ہلاتے اور ہم لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ موٹر میں بیٹھے نہیں بلکہ گر پڑے اور گر کر ہانپنے لگے اور جب موٹر کے قریب آ کر ہم نے قہقہے مارے تو وہ زخمی شیر کے مانند بپھر کر کہنے لگے اپ لوگوں نے میرے ساتھ جو دشمنی کی ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس جو علم ہے، اس کی ہندوستان بھر میں کہیں قدر نہیں اس لئے میں نے دکن میں آ کر پناہ لی ہے اگر کامل نے سرکار تک یہ خبر پہنچا دی تو میں یہاں سے نکال دیا جاؤں گا ہندوستان کی کسی مسجد کے حجرے میں مجھ کو جگہ دی جائے گی، اور جمعرات جمعرات گوشت اور وہ بھی گائے کا گوشت ملے گا یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ کسی کے پیٹ پر لات ماردی جائے ہم نے کہا۔

مولانا آپ مزاح المومنین پر اس قدر بگڑ رہے ہیں انہوں نے کہا آپ مزاح الکافرین کو مزاح المومنین کا خطاب دے رہے ہیں اس واقعہ کے بعد انہوں نے ہم سے ملنا ترک کر دیا اور ہماری دفتری زندگی بے حد بے لطف ہو کر رہ گئی۔

جب ان کے غصے اور ترک تعلق پر کچھ اوپر ایک مہینہ گزر گیا تو مودودی نے مجھ سے کہا پہلے آپ مولانا کے پاس جائیں اور منانے کی سعی کریں وہ نرم ہو جائیں تو مجھے بھی بلا لیجئے گا۔

میں جی کڑا کر کے ان کے کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرے سے

اتر کر ایک نشیبی حلقے کی نالی پر بیٹھے پیشاب کر رہے ہیں میرے ذہن میں فوراً ایک تیر بہدف تدبیر آ گئی میں جوتا اتار کر دبے پاؤں ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر ان کو پیشاب کرتے دیکھنے لگا میرا سایہ پڑتے ہی انہوں نے گھبراہٹ سے مڑ کر دیکھا فوراً کمر بند باندھ کر، کھڑے ہو گئے مجھ سے بگڑ کر کہا یہ کیا حرکت تھی آپ ستر بینی کا بھی ذوق رکھتے ہیں میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا مولانا گستاخی تو ضرور ہوئی مگر اللہ اکبر یہ تماشا تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا انہوں نے منہ جھٹک کر کہا تماشا کیا؟ میں نے کہا مولانا قصور معاف آپ کا پیشاب کرنے والا عضو آپ کے روئے مبارک سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے گویا دو چار مہینے کے مسلسل بخار کے بعد اپ کا منہ بالکل ست ہو کر نیچے لٹک پڑا ہے۔ یہ سنتے ہی ہنسی کے مارے ان کے دونوں شانے ہلنے لگے اور ان کا سینہ اچھلنے لگا اور مجھے کہا بڑا نادر خیال سوجھا ہے آپ کو اگر اس مضمون بکر کو آپ نظم کر دیں تو میں آپ کے تمام ذنوب معاف کر دوں گا۔

دوسرے ہی دن، اسی مضمون کا ایک دس بارہ بند کا مسدس کہہ کر میں ان کے گھر پہنچا، دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کسی قدر بخار ہے معاف کیجئے گا اٹھ نہیں سکتا میں نے کہا آپ آرام فرمائیں میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا میں نے امتثال امر میں ایک مسدس کہا ہے ''تشابہ تام'' کے نام سے انہوں نے کہا فوراً سنایئے اور دوسرے ہی بند پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور جھوم جھوم کر داد دینے لگے اور داد دینے میں اس قدر بار بار ہنسے کہ پسینہ آ گیا، کہنے لگے لیجئے بخار اتر گیا اللہ آپ کو جزائے خیر دے وہ مسدس اس قدر مردانہ، یعنی فحش ہے، جسے میری دیہاتی کنیاؤں کی سی شرمیلی قوم برداشت نہیں کر سکتی صرف اس کا ایک بند اور ایک بیت بڑی حد تک معتدل ہے وہ سن لیجئے:

مشکل ہے، فرق اسفل و اعلیٰ، خدا کی شان
کہسار کا ہے، کاہ میں جلوا، خدا کی شان

www.pdfbooksfree.pk

پنہاں میں، تاب چہرہ پیدا، خدا کی شان
صورت ہے جیسی، ویسا ہی۔۔۔۔ خدا کی شان
دنیائے فتنہ ساز کے، کرتوت دیکھیے
لٹکا ہوا ہے، چاہ میں، ہاروت دیکھیے

اور بیت ملاحظہ ہو:

میانی میں علم و فن کی گرہ کھولتا ہوا
پہنے ہوئے عبا، عربی بولتا ہوا!

میں ان کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ وہ مزاح کے مواقع پر، بے ساختہ قہقہے مارنے لگتے اور نظام دکن سے لرزاں وترساں رہتے تھے اس کا بھی ایک واقعہ سننے کے قابل ہے۔

ایک روز نظام کے وہاں ڈنر تھا ابھی نظام برآمد نہیں ہوئے اور مولانا مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بہت بڑے اور بوڑھے جاگیردار آئے جن کی گردن میں رعشہ اور چہرے پر سفید گل مچھے تھے، مولانا نے بڑے ادب کے ساتھ لپک کر ان سے مصافحہ کیا وہ مصافحہ کر کے، دو قدم پیچھے ہٹے تو میں نے ان کے کان میں کہا آپ دیکھ رہے ہیں جاگیردار صاحب کو یہ تو بالے میاں کی چھڑ اور "پیسے میں" آپ ہی آپ ہیں یہ سنتے ہی وہ ہنسی کے مارے بے قابو ہو گئے پھِیں پھِیں کرتے کھمبے کے پیچھے چلے گئے، اور پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے اور یہ خیال کر کے کہ میں کہیں نظام کے سامنے ان کو ہنسا دوں، وہ کھمبے کے پیچھے سے غائب ہو کر مہمانوں کے غول میں مل گئے اور میں ہاتھ مل کر رہ گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

اتنے میں نظام برآمد ہو گئے دربار جم گیا اور قوالوں نے برتو ایں مسند شاہانہ مبارک باشد گانا شروع کر دیا قوالی ختم ہوئی تو نذریں پیش کرنیوالے تمام غلامان زریں کمر، آقائے میں کرو گار کی جناب میں نذر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کو قطار

1۔ لکھنو میں لچکے تار پر قائم کر کے، ایک روئی کے گالے کا گڈا بنایا جاتا تھا، جس کا سر برابر ہلتا رہتا تھا اور بنانے والا، پیسے میں آپ ہی اپ، یعنی خود کار خود متحرک کی

www.pdfbooksfree.pk

صدا لگا لگا کرا سے ایک پیسے میں بیچا کرتا تھا۔

باندھ کر صف بستہ ہو گئے اور

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے
صید جب خود ہی چلے آتے ہیں گردن ڈالے

کا تماشا ہونے لگا میں عمادی صاحب کے شکار کے لئے ایک گوشے میں، دبک کر کھڑا ہو گیا اور نذروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب آدھی سے زیادہ نذریں پیش ہو چکیں، میں نے دیکھا کہ مولانا، چاروں طرف نظریں دوڑاتے چلے آرہے ہیں میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا، اور مولانا، یہ خیال کر کے کہ میں غالباً آگے کی صف میں ہونگا۔ ایک صاحب کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے اور میں دبے پاؤں جا کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اب میری نذر کی باری آرہی ہے انہوں نے ایک اشرفی اور چار روپے جیب سے نکال کر رومال میں لپیٹ لئے اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھ لئے میں نے ان کا رومال اچک لیا انہوں نے اچھل کر مجھے دیکھا بڑی بے کسی سے کہنے لگے برائے خدا اس وقت مزاح نہ فرمایئے ورنہ مجھ کو ہنسی آجائے گی، اور بھرے دربار سے نکال دیا جاؤں گا اتنے میں ان کی باری آ گئی میں نے ان کا رومال ان کو دے دیا لیکن وہ میرے اس مذاق سے اس قدر بوکھلا چکے تھے کہ نظام کی خدمت میں نذر گزارنے کے بدلے، وہ شہزادیوں کے سامنے جا کر جھک گئے اور نظام نے گرج کر کہا ارے ادھر آؤ مولانا قاموس اللغات، اتنے بڑے بڑے ہنڈاں (ہانڈے) جل رہے ہیں اور تمہاری نظر مجھ پر نہیں پڑ رہی ہے مولانا جھپٹ کر نظام کے روبرو چلے گئے اور نذر پیش کر دی الٹے قدموں پلٹے اور ستون سے ٹکرا کر گر پڑے نظام نے قہقہہ مارا اور میں نے ستون کی آڑ سے کہا آداب عرض ہے مولانا۔

☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

فراق گورکھپوری

مجموعہ اضداد، آمیزہ بلور، وفولاد۔۔۔۔گاہ، نسیم بوستاں، گاہ،صرصر بیاباں گا ہے،
خضر درگاہ گا ہے گم کردہ راہ گاہ شب نم برگ تا ک گاہ شعلہ جوالہ د بے باک گاہ، یزداں،
بآغوش،گاہ، اہرمن بردوش۔

رندقدح خوار، گوہرشاہ دار، آسمان خوش لہجگی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر۔

اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاج دار، جودت پناہ، نقاد
نگاہ،مہبط جبریل، شاعر بزرگ وجلیل۔

اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا،اوران کی اخلاقی کالوہا مانتا ہوں مسائل علم و
ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں تو لفظ و معنی کے لاکھوں موتی رولتے ہیں اوراس
افراط سے کہ سامعین کواپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

وہ بلاکے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں۔اور یہ وہ ذکاوت مخصوص ہے،
جو دنیا کے تمام عظیم فن کاروں میں پائی جاتی ہے کج نہاد صالحین پرآوازے کستے ہیں،
اور وہ ان بےتوفیقوں کے کھوکھلے پن پر دل ہی دل میں ہنستے ہیں لیکن ان کی راتوں
سے ہوشیار، پینے سے پیش تر وہ یار غم گسار ہوتے ہیں اور پینے کے بعد دشمن خوں خوار
بن جایا کرتے ہیں اورنہایت استعجاب آمیز قلقل کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنی
رفیقہ حیات سے جو برتاؤ ہے وہ سینہ انسانیت کا ایک ہولناک گھاؤ ہے اور ان کے
شدائد سے تنگ آکران کا بیٹا خودکشی کر چکا ہے۔

وہ ایک دہری شخصیت کے انسان ہیں کبھی مسیح دوراں ہیں اور کبھی موسی عمراں کبھی
مہکتے گل زار کبھی اپنی تلوار، دہلی کے دوران قیام میں،ایک بار وہ مجھ سے بھی بہت ہی
بری طرح الجھ پڑے تھے اس وقت اگر میں اپنی پٹھنولی کا گلا نہ گھونٹ دیتا تو بڑا خون
خرابہ ہوجاتا اس وقت کی صبح کو میں نے ان پر ایک نظم کہی تھی جس کا صرف ایک شعر یاد
ہے۔

نہ عطا کر، مگر، مجھے معبود

بھول کر بھی شب وصال فراق

پی کر لڑنا اور محفل کو درہم برہم کر دینا اب ان کی گزک بن چکا ہے اس لئے ان کو برا نہ کہئے ان پر ترس کھائیے اور ان کی راتوں سے دامن بچائیے۔

ایک بار کشمیر کے ہاؤس بوٹ میں وہ اور ساغر میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے فضا نہایت خوشگوار اور جھیل کی موجیں نغمہ بار تھیں دور چلنے لگا اور دو جام خالی کر کے انہوں نے ساغر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا یہ سامنے کون بیٹھا ہوا ہے میرا ماتھا ٹھنک گیا میں نے کہا دیکھو فراق، ہم کو اپنی گزک نہ بنانا وہ چپ ہو گئے لیکن چہرے کے بے پناہ کرب سے پتا چلنے لگا کہ رنگ پر آنے کے واسطے ان کا نشہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور اب ان سے رہا نہیں گیا انہوں نے کہا جوش تم خواہ بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے ساغر بیٹھا ہوا ہے، میں نے کہا پھر تم سے کیا غرض انہوں نے اپنی گول گول آنکھوں کو گردش دے کر کہا اس لونڈے سغروا (ساغر کی تصغیر) کو بھی، خدا کی شان یہ دعویٰ ہے کہ میں شاعر ہوں حالانکہ خدا کی قسم میرا بٹلر اس سے کہیں اچھے شعر کہتا ہے اب کیا تھا ان کی آرزو پوری ہوگئی، ساغر یہ سنتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور دونوں میں گتھم گتھا ہوگئی۔

ایک بار علی سردار جعفری کسی مشاعرے میں شریک ہونے الہ آباد گئے اور ان کے وہاں قیام کیا، انہوں نے جی کھول کر ان کی تواضع کی، اور خوب کھلایا پلایا اور جب موٹر میں بیٹھ کر دونوں مشاعرے کی طرف روانہ ہوئے تو مشاعرے کے پھاٹک پر کھڑے ہو کر فراق کا جی چاہا تھوڑی سی گزک کر لیں، یہ خیال آتے ہی بانی مشاعرہ سے انہوں نے کہا سن لیجئے جناب، یا تو فراق مشاعر میں شرکت کرے گا، یا علی سردڑا 1 بانی مشاعر نے لاکھ لاکھ سمجھایا، اور علی سردار نے کہا فراق صاحب میں تو آپ کا مہمان ہوں لیکن وہ نہیں مانے پھاٹک پر یہ تماشائیوں کے ٹھٹ لگ گئے اور وہ علی سر داروا کو برا

بھلا کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے اور صبح کے وقت اسی رات کے سر درواں کی گردن میں بانہیں ڈال کر مسکرانے لگے۔

لیکن اب کی جب میں دہلی گیا تو ان کے مزاج کا تغیر دیکھ کر دنگ ہو گیا وہ دہلی میں کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے آئے اور اپنے شاگرد گرگ کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میں پہنچا تو، دوڑ کر انہوں نے گلے لگا لیا اور ہر چند رات کے بارہ ایک بجے تک وہ میرے ساتھ پیتے رہے لیکن آخر تک وہ قطعی بگڑے نہیں بلکہ لڑائی کا گوشہ نکالنے کے عوض انہوں نے اتنے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ان میں سے ایک لطیفہ آپ بھی سن لیجئے۔

انہوں نے کہا پرسوں ہم سب کو ہمارے ایک ماہر آثار قدیم دوست نے بہت تڑکے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ وہ دہلی کی ایک ایک تاریخی اینٹ سے ہمیں آگاہ کر دیں گے چونکہ یہ جاڑے کا موسم ہے ہم نے خیال کیا کہ انہوں نے صبح کے وقت بلایا ہے اس لئے ناشتے کا انتظام انہیں کے گھر پر ہو گا چنانچہ ہم لوگ تین موٹروں میں بیٹھ کر ان کے وہاں پہنچ گئے اور جب یہ دیکھا کہ وہاں ناشتے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور وہ قطب جانے کی جلدی کر رہے ہیں تو ہم سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ وہاں جا کر ناشتہ کرائیں گے لیکن جب وہاں بھی ناشتہ کا کوئی بندوبست نہیں دیکھا تو ہم پریشان ہو گئے اور وہ ہم کو ایک جگہ سے دوسری، اور دوسری سے تیسری جگہ لئے پھرتے رہے یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا اور بھوک سے ہم سب کا برا حال ہو گیا اس وقت مجھ کو شرارت سوجھی اشارے سے میزبان کو ایک گوشے میں لے جا کر میں نے کہا جناب والا

1۔ سردار کی تحقیر و تصغیر

اب تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے ساتھ۔۔۔۔۔۔ کر دیں ماہر آثار دوست نے بڑی حیرت سے مجھ کو دیکھا اور کہا فراق صاحب آپ اس قدر سنجیدہ

www.pdfbooksfree.pk

آدمی ہوکر مجھ سے ایسی فحش بات کی فرمائش کر رہے ہیں، میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا
جناب بھوک اس قدر لگی ہے کہ میں سوچنے لگا ہوں کہ آخر کار کچھ تو پیٹ میں جائے۔

میں نے قہقہہ مار کر کہا ارے مر جائے اس ''کچھ تو پیٹ میں جائے'' کی بلاغت کا
کوئی ٹھکانہ نہیں، اور تمام لوگ پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔

لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے ہم لوگ احمد آباد بمبئی کے کسی مشاعرے کی
شرکت کے واسطے گئے اور ایک بالا خانے کے بڑے وسیع و تابناک ہال میں فرش پر
بیٹھے شغل کر رہے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان نے آکر کہا کہ میں حضرت فراق گورکھ
پوری سے ملنے آیا ہوں وصل نے کہا یہ ہیں فراق صاحب اس نوجوان نے لپک کر ان
کے ہاتھ چوم لئے اور دوزانو ہوکر بڑے ادب سے بیٹھ گیا فراق نے کہا آپ کا نام؟
اس نے اپنا نام بتانے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا میں آپ کو کل کا ایک واقعہ سنانے
آیا ہوں اجازت ہو تو عرض کروں فراق نے کہا ضرور کہئے آپ تو بڑے نستعلیق نوجوان
معلوم ہوتے ہیں اس نوجوان نے کہا پرسوں میں بازار سے گزر رہا تھا دیکھا کہ برات
کا ایک بہت بڑا جلوس چورا ہے پر رکا ہوا دم بخود کھڑا ہے میں نے پوچھا یہ ماجرا کیا ہے
ایک صاحب نے بتایا کہ دولہا جس ہاتھی پر سوار ہے وہ ہاتھی زمین پکڑ کر، کھڑا ہو گیا ہے
لاکھ لاکھ آنکس مارے جا رہے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا ہے اور چونکہ
دولہا کی سواری کا راستے میں رک جانا فال بد خیال کیا جاتا ہے اس لئے دولہا کے باپ
کے حواس اڑے ہوئے ہیں ابھی وہ آدمی مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا
ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا دوڑا ہوا آیا اور نے دولہا کے باپ سے کہا ہاتھی کو اگر ابھی
ابھی چلا دوں تو کیا آپ مجھے پچاس روپے دے دیں گے؟ دولہا کے باپ نے کہا
ارے پچاس نہیں سو روپے دوں گا یہ سن کر اس لڑکے نے اچک کر ہاتھی کے کان میں
ایک بات ایسی کہی کہ وہ بے ساختہ دم دبا کر بھاگنے لگا فراق نے پوچھا، اس لڑکے نے
کیا کہا تھا اس نوجوان نے بڑی متانت سے کہا کہ اس لڑکے نے اس کے کان میں کہا

تھا کہ ابے سالے تیرے پیچھے فراق آ کر کھڑے ہو گئے ہیں یہ سنتے ہی ہم سب کے خارا شگاف قہقہوں سے ہال کی محراب گونجنے لگی اور وہ نوجوان فوراً بھاگ کھڑا ہوا اور فراق کی آنکھوں کے دونوں ڈھیلے پہیوں کے مانند گھومنے لگے۔

آخر میں نہایت افسوس کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے ابھی تک فراق کی عظمت کو پہچانا نہیں ہے سرکار ہند کو چاہئے کہ وہ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دے اور ان کو بہمہ وجوہ مطمئن کر کے اپنے دامن کو مزید پھولوں سے بھر لے اور نمک حرامی کے داغ سے اپنی پیشانی کو بچالے۔

جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراق کی عظیم شخصیت، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اردو زبان کی آبرو، اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے، وہ خدا کی قسم کور مادرزاد ہے۔

زندہ باد فراق۔۔۔۔۔۔پائندہ باد فراق



وحید الدین سلیم

پانی پت کے باشندے، حالی کے ذی علم ہم وطن حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر سید احمد خاں کے سابق سیکرٹری اردو زبان کے مزاج دان و"قوام" وضع اصطلاحات کے مصنف غیر معمولی ادراک و ذہین بے حد بذلہ سنج نیچریوں کے استاد مبلغ الحاد بڑے جان دار منتشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ والد گرامی لیکن جسم اس قدر بھدا اور صورت ایسی نا قابل برداشت کہ الامان والحفیظ ان کے چہرے کا رنگ اس قدر کٹھنا اور لید ھڑ تھا، گویا بہت پرانا، چکٹا ہوا کڑوا تیل جما ہوا ہے اور ان کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کر دینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اس کی جانب اٹھتی تھی تو ہزاروں گرد دیکھنے والوں کے پپوٹوں پر آ کر بیٹھ جاتے اور بیٹ کرنے لگتے تھے اور ان کے وزن سے آنکھیں جھک جاتی تھیں مگر دماغ اس قدر اخاذ و جان دار تھا کہ بڑھاپے میں بھی جب کہ دماغ نئے نئے خیالات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ ہر بہتر جدید خیال کو آسانی قبول کر لیتے تھے اور گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کی طرح ان کا دماغ ہمیشہ چلتا اور کھٹ کھٹ کرتا رہتا تھا۔"

ہر چند اس پرانے زمانے میں ان کی تنخواہ ایک ہزار تھی جو آج کے دس ہزار کے برابر ہے لیکن انہوں نے کبھی باورچی یا خدمت گار نہیں رکھا وہ دوستوں سے تقاضے کر کر کے اپنی دعوتیں کرایا کرتے تھے اور جس روز دعوت نہیں ہوتی تھی کسی گھٹیا سے ہوٹل میں جا کر دو آنے میں شکم سیر ہو کر آ جایا کرتے تھے ان کو پان کا بے حد شوق تھا مگر دوستوں کے سامنے جب پان دان کھولتے تھے تو کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں ڈال ڈال کر چاٹنے لگتے تھے تا کہ گھن کھا کر کوئی ان سے پان نہ طلب کر لے۔

وہ گھر میں بڑے پائنچوں کا ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنتے تھے تا کہ اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مسک نہ سکے اور آدھے دھڑ سے ننگے رہتے تھے ایک روز انہوں نے پانی سے بھرا ایک بڑا سا مٹکا اٹھایا جس سے اس کی توند دب گئی اور پائے جامہ گھٹنوں پر آ گیا ان کو

بالکل ننگا دیکھ کر میں نے آنکھیں جھکالیں اور انہوں نے قہقہہ مار کر کہا ارے جی بھر کے مجھے ننگا دیکھ لو ایسے مواقع روز روز نہیں آیا کرتے۔

ایک دن صبح چار بجے ایک نعت کا میرے دماغ پر نزول ہوا اور اس قوت کے ساتھ کہ مسلسل تین روز تک وہ مجھ پر نازل ہوتی رہی اور میں کمرے میں بند اور شراب سے مجب ہو کر اسے ٹائپ رائٹر کے مانند لکھتا رہا چوتھے روز جب وہ مکمل ہو گئی میں سیدھا وحیدالدین صاحب کے پاس پہنچا اور بڑے ولولے کے ساتھ انہیں وہ لغت سنانے لگا اور وہ مجھے پانبر نجیر ہنسی کے ساتھ داد دینے لگے مجھ کو چاہئے تھا کہ میں ان کی دبی ہوئی ہنسی میں جھولتی ہوئی داد کو دیکھ کر مزید اشعار سنانے سے انکار کر دیتا مگر اس وقت مجھ پر نعت خوانی کا اس قدر شدید جذبہ طاری تھا کہ میں اس کو محسوس نہیں کر سکا اور شعر سناتا چلا گیا لیکن جب ایک شعر پر ان کے منہ سے ایک خاراشگاف قہقہہ نکل گیا اور پیک سے ان کا سفید سوئٹر لال ہو گیا تو میں اپنی کاپی کو بند کر کے حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا اور میری سراسیمگی کا اندازہ لگا کر جب دوبارہ قہقہہ مارتے مارتے انہوں نے یہ کہا صاحبزادے یہ کیی الوہیت اور کیسی نبوت، کس چکر میں پڑے ہوئے ہو تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور اپنا سا منہ لئے میں وہاں سے اٹھ گیا آج تک یاد ہے مجھ کو وہ پشیمانی۔

زرا زمانے کی یہ ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمایئے کہ ان بے چارے نے زبردستی کی دعوتوں اور گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں تمام عمر کھانا کھایا زندگی بھر باورچی نہیں رکھا ان کے مکان کا چولہا کبھی گرم نہیں ہوا اور کوڑی کوڑی کر کے جب تیس چالیس ہزار روپے جمع کر لئے تو ان کو موت آ گئی وہ تمام دولت ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ تمام روپیہ ان کا مولوی داماد، نمازیں پڑھ پڑھ کر ہضم کر گیا، اور ڈکار تک نہ لی۔

دکھ جھیلیں بی فاختہ، اور کوے انڈے کھائیں۔ ملحد ڈھول بنائے اور اسے ملا بجائے واہ ری دنیا۔



www.pdfbooksfree.pk

سید جالب دہلوی

میں اپنے ذہن کو مبالغے سے پاک کر کے بلا خوف ابطال ڈنکے کی چوٹ پر یہ دعوے کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص معلومات عامہ حاصل کرنے کی دھن میں کامل ساٹھ برس تک اس روئے زمین کے تمام عظیم کتب خانوں کو چاٹ کھنگال چکنے کے بعد فقط ساٹھ منٹ کے واسطے ان کی ہم نشینی کی سعادت سے دو چار ہو جاتا تو اس کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ ایسا ایک اونٹ ہے جو پہاڑ کے نیچے آ کر بلبلا نا بھول چکا ہے۔

ایک روز وہ کسی حلوائی کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے کہ شوکت تھانوی پہنچ گئے انہوں نے پوچھا سید صاحب کیا خرید رہے ہیں انہوں نے کہا حلوہ سوہن اور وہ یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگے حلوؤں کے اقسام انہوں نے حلوؤں کے اتنے اقسام بتائے کہ حلوائی دنگ ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور لکھنو کے بے فکرے ان کے گرد جمع ہو گئے اور جب وہ اقسام گنا چکے تو یہ بتایا کہ حلواہ سوہن کی ایجاد اس مقصد سے ہوئی تھی کہ اس کے جوفوں میں خالص گھی بھر کر امراء کی ضیافت طبع کی جائے اس کے بعد انہوں نے حلوا سوہن کے موجد اور اس کے باپ دادا کے نام بتانا شروع کر دیئے اور جب حلوہ سوہن کی پوری تاریخ بتا چکے تو بچپن سے لے کر آج تک کے تمام حلوہ سوہن بنانے والوں کے نام اور ان کی دکانوں کا محل وقوع بتا دیا حلوائی دکان سے اتر پڑا اور ان کے ہاتھ چومے، اور کہا یہ حلوا سوہن حضور کی نذر ہے میں دام نہیں لوں گا اور گرد و پیش کے لوگ اس طرح داد دینے لگے کہ معلوم ہوا مشاعرہ ہو رہا ہے۔

ایک بار میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک بلی گزری اب کیا تھا انہوں نے بلی نامہ شروع کر دیا تمام دنیا کی بلیوں کے نام، اقسام اور ان کے مزاج و علاج بتائے دنیا میں سب سے پہلے کس نے بلی پالی تھی اور اس کا نام بتایا، اور بیان کرتے کرتے بات حضرت ابو ہریرہ تک آن پہنچی۔

وہ لکھنو کے روزنامہ ''ہم دم'' کے مدیر تھے افیون اور امرد پرستی کے خوگر تھے ایک

روز شام کے وقت وہ افیون گھول رہے تھے، اوران کی چارپائی کے چاروں پایوں پر چار مرد بیٹھے ہوئے تھے کہ حسرت موہانی آ گئے انہوں نے پوچھا سید صاحب یہ لونڈی کیسے بیٹھے ہوئے ہیں انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیا حسرت صاحب کو مقامی خبروں کے لئے لگا رکھا ہے ”مقامی خبروں“ کی بلاغت، الامان والحفیظ۔





روشن علی بھیم جی

وہ غالباً 1941ء کا دور تھا جب کہ ہم دونوں نے عروس البلاد بمبئی میں ایک دوسرے سے رشتہ محبت و اخوت قائم کیا تھا ہماری وہ دوستی آج تک شاداب اور ہمارے خیالات کی وہ ہم آہنگی جس نے ہم کو متحد کر دیا تھا آج کے دن تک قائم ہے نہ وہ بدلے ہیں نہ میں۔

ہر چند کراچی آ کر وہ ایک سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے سب سے زیادہ صاحب اقتدار افسر دبن چکے ہیں لیکن اس حادثے کے باوجود ان کے خون میں وہ زہر سرایت نہیں کر سکا ہے جس کو منحوس دولت کی فراوانی پیدا کر دیتی ہے اور جس کے اثر سے انسان کے منہ میں خنزیر کے نیش نکل آیا کرتے ہیں۔

ذرا غور تو فرمائیے کہ بھیم جی دو چار برس سے نہیں انیس برس سے کراچی کی زہریلی ہوا میں سانس لے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی انسان دوستی شرافت اور خوئے دلنوازی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے اور ان کی یہ استواری سیرت ایک ایسی چیز ہے جس کو معجزے سے کم کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔ میں اس صورت حال کو اس بناء پر معجزہ کہہ رہا ہوں کہ جناب والا یہ کراچی۔۔۔ سیاست و سرمایہ داری ہوس ناکانہ درندگی و ہیمانہ زر بندگی، اور فریب کوشی و احباب فراموشی کی عفونت انگیز غلاظت میں ڈوبا ہوا ایک ایسا نامراد شہر ہے جس کی ہوا کھا کر، اور جس کا پانی پی کر۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ برس کے اندر اندر اولیاء لفنگے ملائک شیطان اور دیوتا راکشش بن جایا کرتے ہیں۔

غور فرمائیے اس ہو نکتے ہوئے طوفانی دور پر جب میرے چند کلمات حق کو سن کر حکومت پاکستان کے ماتھے پر شکن پڑ گئی تھی اور اس وقت کے صدر ''فیلڈ مارشل ایوب خان بہادر'' کی خسروانہ حرمتی ان کے کفش بردار الطاف گوہر کی غلامانہ دراز دستی اور الطاف گوہر کے پرستار شان الحق کی سفیانہ باطل پرستی مجھے اور میرے تمام خاندان کو درماندگی کے بحر ذخار میں دھکیل کر بڑی بے حیائی کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دے رہی تھی اگر اس وقت بھیم جی نوح کی کشتی بن کر مجھے اس طوفانی سمندر سے باہر نہ لے آتے تو میرا کیا حشر ہوتا۔

آغا حسن عابدی

یونا ئیٹڈ بینک کے صدر میرے آسمان لکھنو کے بدر اور میرے محسن ذی قدر ہیں۔۔۔جس وقت حکومت کے عتاب نے مجھ کو سمندر میں گرا دیا تھا، آغا صاحب بھی بھیم جی کے دوش بدوش کشتی لے کر آ گئے تھے انہوں نے بھیم جی کے ساتھ ساتھ مجھ کو غرق ہونے سے بچایا تھا آغا صاحب نے اپنے بینک کو فروغ دینے کے واسطے

ایک جا، رہتے نہیں عاشق ناکام کہیں
دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اندرون و بیرون ملک دوروں پر دورے کیا کرتے ہیں دو روز کراچی میں رہتے ہیں اور انتیس دن باہر اس لئے میں ان سے فقط تین بار مل سکا ہوں۔

ان کو جب میری آنکھوں نے دیکھا نہیں تھا اس وقت ان کے باب میں میرے کانوں نے یہ سنا تھا کہ آغا صاحب ایک بے فیض و بے وفا انسان ہیں اور اس قدر کہ انسان کے آڑے وقت کام آنے کو ایک لایعنی فعل سمجھتے ہیں لیکن جب میں ان سے ملا اور میری نفاذ آنکھیں ان کی طرف اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے خال و خد، اور ان کی آنکھوں کے رنگ میں ایک ایسا انسان جھلک رہا ہے جو خیر مجسم کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور جب میرے کانوں نے ان کے دھیمے لہجے کو گرفت میں لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جھٹپٹے کے وقت میٹھے پانی کی نہر بہہ رہی ہے۔۔۔۔لگے ہاتھوں ایک بات اور بھی کہہ دوں، بعض مسائل پر جب میں نے ان سے تبادلہ خیال کیا تو پتا چلا کہ وہ ایک ذی علم و صاحب فکر انسان بھی ہیں اور اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ ہر چند وہ دنیوی اعتبار سے ایک نہایت کامیاب شخص ہیں لیکن قدرت نے ان کو اس اورنگ علم سے محروم کر کے جس کے وہ مستحق تھے ان کو سونے کی سولی پر چڑھا کر ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے اور وہ اس صورت حال کی افسوس ناک مثال ہیں جس کو عربی میں "ظلم" اور انگریزی میں مس پلیس منٹ (Mis Placement) کہا جاتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

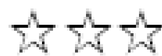
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس ماہ رخسار، نادرہ گفتار، بلند کردار، اخلاص شعار، سعادت مدار اور پر یماوتار، نوجوان بچے کے۔۔۔۔۔پیدائش، سکونت اور جاودانی۔۔۔۔۔تین وطن ہیں الہ آباد پاکستان اور میرا دل (اللہ اکبر میرا دل ہفرش پر عرش کا حامل)

یہ ایک انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے ہر چند قدیم روش کو ترک کر کے یہ جدید دھڑے پر آ گیا ہے لیکن اس کے کلام میں آئمہ ادب کی سی شان پائی جاتی ہے اس کی شاعری، اس قدر بلند تخیل اور اس درجہ نرالے طرز بیان کی حامل ہے کہ بسا اوقات سر دھننے اور اس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا اللہ نظر بد سے بچائے جب وہ لندن چلا گیا تھا میں کہہ رہا تھا۔

سرو سیمینا، بصحرا می روی
سخت بے مہری کہ بے ما می روی

اس بچے کے حالات نا مساعد ہو چکے ہیں یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اقربا و احباب منہ پھیر لیا کرتے ہیں مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ جوش اس کے واسطے جان تک دینے کو تیار ہے مصطفیٰ زیدی اپنا دل نہ ٹوٹنے دو۔ تم ایک دولت بیدار ہو تم کو اپنی قدر اور حفاظت کرنا ہے۔



مجاز

صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ مجاز مر گیا۔

یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجاز کیا تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔۔۔۔مرتے وقت تک اس کا فقط ایک ربع دماغ کھلنے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اس ایک ربع کھلاوٹ کا کرشمہ ہے اگر وہ بڑھاپے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔

مگر افسوس کہ پینا، اس کو کھا گیا۔

میں اس جوانانِ مرگ کو مخاطب کر کے ایک ''پندنامہ'' کہا تھا وہ میری نظم سن کر رو دیا تھا کہ آپ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے مگر اس پر عمل نہیں کر سکا اور عمل کرتا بھی تو کیسے؟

بارہا کہہ چکا ہوں کہ یوں تو دنیا کے ہر کام میں اعتدال برتنا بے حد مشکل ہے لیکن شراب میں اعتدال کا قائم رکھنا تقریباً محال ہے۔

مجاز اعتدال برت نہ سکا اور جوانی ہی میں یہ کہتا گزر گیا۔

ہم مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گئے
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

ایک روز کسی اللہ کے بندے نے اس کو سمجھایا تھا کہ دیکھو جوش صاحب کی طرح شراب کی ایک معینہ مقدار کو گھڑی سامنے رکھ کر ایک معین وقت میں پیا کرو تو اس نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں میرا بس چلے تو میں گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں میں اس کو بار بار سمجھایا کرتا کہ تو نے علم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے یہاں تک کہ اخبار تک نہیں دیکھتا ہے اپنے علم اور مطالعے کو بڑھا، لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ بمبئی کا ذکر ہے میں ایک سمندر کے سامنے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا مجاز و ساغر بھی میرے ہم پیالہ تھے آسمان پر شفق تھی زمین پر سمندر اور میز پر شیشہ و ساغر اور ہوا کم بخت ایسی ملائم چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا ناچنے لگو جب ہمارا کیف خوب گھر گیا تو مجاز

نے اٹھ کر ساغر کے گلے میں باہیں ڈال دیں ساغر بھی اس سے چمٹ گئے مجاز نے کہا میرا ''سغر وا1'' ''ارے میرا ''سغر وا'' ساغر بھی اس کا ماتھا چوم کر'' ارے میرا مجز وا، میرا مجز وا'' کہنے لگے ابھی یہ اختلاط ہو ہی رہا تھا کہ مجاز نے ساغر کا چٹ سے بوسہ لے لیا اور مٹک مٹک کر کہنے لگا۔

''مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے'' ساغر نے کہا کیا بات ہے مجاز نے کہا مگر یہ بات ہے کہ پیارے تو شاعر بالکل نہیں ہے ہنستے ہوئے ساغر نے رونا شروع کر دیا مجاز پھر ان کے گلے لگ گئے پیارے میں تجھ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں تیرا کوئی جواب نہیں ساغر نے رونا بند کر دیا۔

مجاز نے کہا تجھ سے اس قدر محبت کے بعد بھی خدا کی قسم میں تجھ کو شاعر تسلیم کر ہی نہیں سکتا، مگر ایک بات ہے مگر ایک بات ہے اور ساغر پھر رونے لگے۔

جب میں نے دیکھا کہ بار بار مجاز، ساغر کو گلے لگا لگا کر ''مگر ایک بات ہے'' سے رلا رہا ہے تو میں نے کہا مجاز ختم کر اس تکرار کو بیٹھ جا خاموش صوفے پر اور مجاز جب بیٹھ گیا تو ساغر نے بسور کر مجھ سے کہا یہ مجاز بھی عجیب آدمی ہے مجھ سے محبت بھی کرتا ہے اور میرا دل بھی توڑتا ہے یہ سنتے ہی مجاز پھر کھڑا ہو کر ساغر کی بلائیں لے لے کر کہنے لگا پیارے مجھ کو معاف کرو میں تم سے بیحد محبت کرتا ہوں خدا کے لئے ہنسنے لگو نہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جائیگا ساغر ہنسنے اور تھرکنے لگے اور عین اسی عالم میں مجاز نے کہا ''مگر ایک بات ہے'' ساگر نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ہائے رے ان راتوں کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور آتے ہی تخت پر گر کر ہنسنے اور لوٹنے لگا، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا ابھی ایک نیا تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں میں خان صاحب کے وہاں بیٹھا تھا کہ ان کے نوکر نے آ کر باورچی نے یہ کہلا بھیجا ہے کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔

www.pdfbooksfree.pk

خان صاحب نے بگڑ کر کہابلا لاؤ باورچی کے بچے کو

باورچی آیا تو انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا کیا کہلوا بھیجا تھا تو نے مجھ سے اس نے کہا میں نے کہلوا بھیجا تھا کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیں ورنہ۔

خاں صاحب نے اس کی زبان سے ''ورنہ'' سنتے ہی ڈنڈا تان لیا اور کہاہاں کہو'' ورنہ'' کے بعد کیا کرو گے؟ اور باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا'' ورنہ اسی تنخواہ میں نوکری کرتے رہیں گے۔''

میں نے ایک دن پوچھا مجاز تمہارے والدین تو بے حد پابند صوم وصلوۃ ہیں پھر تمہاری بادہ خواری کووہ کیوں کر برداشت کرتے ہیں اس پر اس نے بے ساختہ کہا جوش صاحب بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد نہایت سعادت مند ہوتی ہے اور میں ایک ایسا خوش قسمت بیٹا ہوں جس کے والدین بےحد سعادت مند واقع ہوئے ہیں میں اس کے اس جواب سے پھڑک گیا۔

ایک بار دہلی میں وہ مجھ سے بےحد نا خوش ہوگیا تھاوہ تازہ تازہ دماغی ہسپتال سے بظاہر تندرست ہوکر آیا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر چند اس کوافاقہ ہو چکا ہے لیکن مرض کا ازالہ نہیں ہوا ہے۔

ایک روز اس نے دہلی کے چیف کمشنر کوفون کیا کہ مجھے سو روپے بھیج دیجئے میں نے اس بات پر بہت پھٹکارا اور کہاتو نے اپنی اور پوری شاعروں کی قوم کی عزت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے اس نے میرے منہ پر تو کچھ نہیں کہا لیکن یہ شعر لکھ کر میرے پاس بھیج دیا۔

جو گزرتی ہے قلب شاعر پر

شاعر انقلاب کیا جانیں

حیف دنیا کے کارخانے پر یہاں جو راتیں پل بھر ہنساتی ہیں وہ مرتے دم تک

رلاتی ہیں۔

تار جاں، رشتہ سوزاں ہے یہ معلوم نہ تھا
موت کی لرزش مژگاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
مہلت مختصر صحت یاران شباب
مستقل ماتم یاروں ہے یہ معلوم نہ تھا
گنبد نشہ بالیدہ و محراب سرور
سایہ ابر گریزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
برگ سبزو، ورق نسترن و تختہ گل
چادر قبر بہاراں ہے، یہ معلوم نہ تھا
آب خم خانہ ہستی و شراب ہستی
شب نم گور غریباں ہے، یہ معلوم نہ تھا

☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

میرے دور کی چند عجیب ہستیاں

میر سخاوت حسین

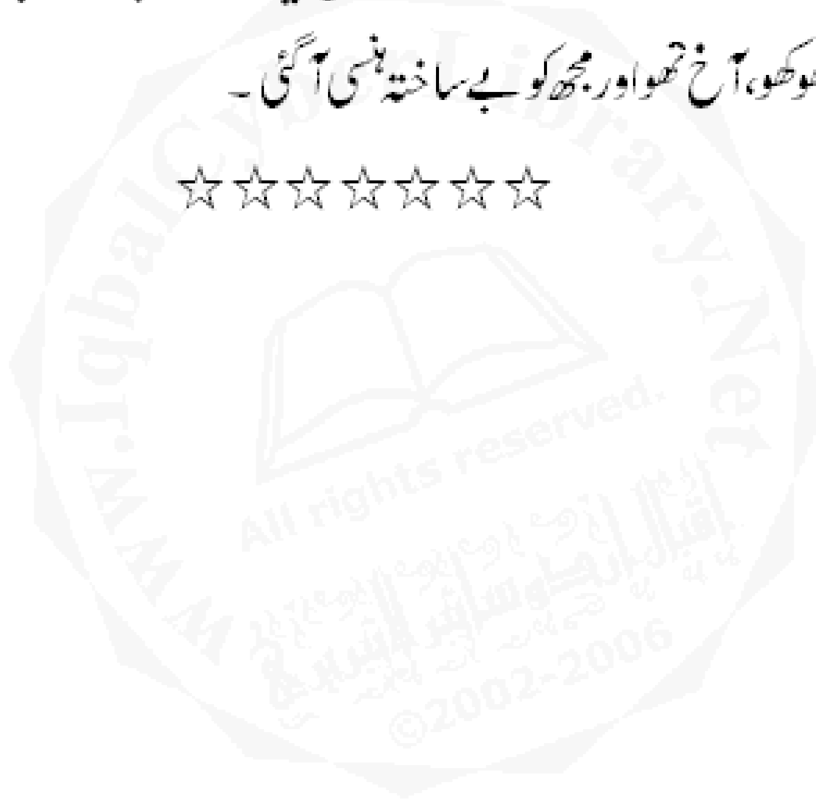
اوہ اودھ کے کسی قصبے کے سادات میں سے ایک نہایت دبلے پتلے پڑھے لکھے ادب دوست، موسیقی پرست اور نہایت مہذب انسان اور میرے یہاں منشی کی حیثیت سے ملازم تھے لیکن کھانسی ان کی چڑھ تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی کھانسے، اور وہ چھوٹتے ہی اس کو گالی نہ دیں۔

اگر مجھ کو ان کی اس نرالی عادت کا علم ہوتا تو انہیں ملازم نہ رکھتا یا کم سے کم اپنی صحبت میں نہ بیٹھنے دیتا۔۔۔۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے پاس لکھنو کے چند اکابر علم وادب بیٹھے ہوئے تھے کہ ان میں کسی کو کھانسی آ گئی اور میر صاحب جامے سے باہر ہو کر ان کو گالیاں دینے لگے میں نے اپنے خدمت گار جگنو سے کہا گدی میں ہاتھ دے کر انہیں محفل سے نکال دو۔۔۔۔ وہ روتے ہوئے چلے گئے۔

جب محفل بھیانک ہو کر برخواست ہو گئی اور میں نے ہزاروں معافیوں کے ساتھ سب کو رخصت کر دیا تو میر صاحب کو بلا کر میں نے بے حد ڈانٹا ڈپٹا۔۔۔۔ میر صاحب بے چارے کانپنے لگے اور کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے لیکن اس کے دوسرے ہی روز جب میں زینے سے اتر کر ملاقات کے کمرے کی طرف جا رہا تھا میں نے ملاقات کے کمرے سے اپنے ایک دوست محمود علی خاں کے کھانسنے اور اسی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کی "دھت تیرے کی، تیری ماں کی۔۔۔۔۔" آواز سنی غصے میں بھرا میں ان کے کمرے میں گیا اور ڈانٹ کر کہا "کیوں میر صاحب۔۔۔۔۔ پھر وہی گالم گلوچ" مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں ان کا یہ عالم دیکھ کر میرا دل پسیج گیا بڑی نرمی سے میں نے کہا آپ تو قسم کھا چکے تھے انہوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا خاں صاحب میری ایک بات سن لیجئے میں نے کہا آپ کو لکھنو کی تہذیب نے کاڑھا ہے کیا آپ گالی کا کوئی

جواز پیش کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا حضور یہ سچ ہے کہ لکھنو نے مجھ کو خراد پر چڑھایا ہے لیکن آپ اس امر پر کیوں غور نہیں فرماتے کہ مجھ کو موسیقی سے بڑی شیفتگی ہے میں نے کہا موسیقی اور گالی میں کیا چولی دامن کا ساتھ ہے انہوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا حضور ہے اور سو فیصد ہے یعنی یہ ایک امر لازمی ہے کہ جب بھی کوئی کھانسے تو سر اور تال میں کھانسے آواز کو راگ میں ڈھال کر کھانسے لیکن یہ سالے تو بالکل بے سرے کھانستے ہیں، کھوکھو، کھوکھو، آخ تھو اور مجھ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

ناظم الدین حسن

مضافات لکھنو کے رہنے والے اور لکھنو میں بیرسٹری کرتے تھے لاٹوش روڈ پر ان کی پیلی کوٹھی موکلوں سے گھری رہتی تھی وہ بھوپال میں صدرالمہام اور حیدر آباد دکن میں چیف جسٹس بھی ہوگئے تھے ان کی ہر سانس خودساختہ انمول میں جکڑی ہوئی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اصول پرستی کے فیل پا میں مبتلا تھے ان کے مکان کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں ایک بڑے سے رجسٹر میں ٹکی ہوئی تھیں اور ہر چیز طاق، مچان یا میز پر ایک خاص زاویئے کے ساتھ رکھی اور جب اٹھائی جاتی تو بالکل اسی زاویئے پر دوبارہ رکھ دی جاتی تھی۔

ایک بار انہوں نے ملازم کو دیا سلائی اٹھالانے کا حکم دیا دیا سلائی سے کام لے کر انہوں نے ڈبیا ملازم کے حوالے کردی اس نے میز کے بیچوں بیچ رکھ دی انہوں نے اس پر دو روپے جرمانہ کردیئے کہ دیا سلائی پہلے میز کے مشرقی گوشے میں رکھی ہوئی تھی اس نے وسط میں کیوں رکھ دی ایک بار لکھنو کے چند نوجوانوں نے اپنے "مسلم کلب" کے افتتاح کی ان سے درخواست کی وہ پہنچے اور بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے افتتاح کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ لفظ "کلب" سے ذہن منتقل ہوتا ہے "کلب" کی جانب اور عربی میں "کلب" کے معنی ہیں "کتا" جب آپ لوگ اس بورڈ پر "مسلم کیلب" درج کرائیں گے تو میں بخوشی افتتاح کروں گا۔

ایک مرتبہ وہ امین آباد پارک میں اپنی گاڑی سے اترے، اترتے ہی فوراً چھتری نکالی اور پھل خریدنے لگے اتنے میں ان کے ایک بے تکلف دوست ادھر آ نکلے۔۔۔۔انہوں نے کہا، سبحان اللہ یہ گرمیوں کی رت اور پھر رات کا وقت اور اس پر آپ کی یہ چھتری جواب نہیں آپ کا انہوں نے کہا اگر عقل موٹی ہو تو آپ کی سی میرے کپڑے نمازی ہیں اگر کسی بدتمیز چیل نے بیٹ کردی تو کیا ہوگا۔

ان کا معمول تھا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک لکھتے پڑھتے تھے ان کا ملازم خاص،

www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک گیارہ بجے ان کے کمرے میں داخل ہو جاتا اور اگر ان کو لکھنے پڑھنے میں مشغول پاتا تھا تو ان کے حسب حکم وہ ان کو زبردستی کرسی سے اٹھاتا انہیں گھسیٹ کر چارپائی پر گراتا اور صبح کو اس اصول پرستی کا انعام پاتا تھا۔

جب انہوں نے اپنے بیٹے ناظر الدین حسن کو تعلیم دلوانے کے واسطے لندن بھیجا تو ایک مولوی صاحب کو بھی ساتھ کر دیا تھا کہ وہ ان کی نگرانی کریں اور ہر ہفتے ان کے تمام اعمال کا کچا چٹھا لکھتے رہیں۔

کوئی چار پانچ مہینے کے بعد انہوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ ناظر کے تمام حالات تو لکھتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں لکھتے کہ اس اثناء میں اس کو کتنے بار بدخوابی ہوئی ہے۔۔۔۔آئندہ سے پوچھ کر بدخوابی کا حال ضرور لکھئے اس لئے کہ اگر بدخوابی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مجھے پتا چل جائے گا کہ ناظر نے بدچلنی شروع کر دی ہے۔

اسی طرح وہ اپنی بہو بیٹیوں کی ''خاموشیوں'' (ایام کی گدیوں) کو بھی اپنی تحویل میں رکھتے تھے تاکہ انہیں ان کی صحت کے اعتدال کا پتا چلتا رہے۔

اپنے دکن کے قیام میں وہ ہر صبح کو باغ عامہ ٹہلنے جایا کرتے اور ایک وقت معین پر گھر واپس آ جاتے تھے ایک روز وہ حسب معمول ٹہل رہے تھے کہ نظام دکن کی سواری آ گئی تمام باغ رعب شاہی سے کانپنے لگا انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور ٹہلتے رہے نظام نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا یہ کون اول جلول آدمی ہے انہوں نے کہا سرکار یہ چیف جسٹس ناظم الدین حسن ہیں جب سے یہ آئے ہیں ہائی کورٹ میں ناانصافی اور رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا ہے نظام نے کہا انہیں بلاؤ وہ جب نظام کے سامنے گئے تو انہوں نے شاہی آداب کے مطابق جھک کر سلام نہیں کیا اور السلام علیکم کہہ کر سیدھے کھڑے ہو گئے مصاحب تھرا گئے کہ دیکھیں اس گستاخی کا نتیجہ کیا ہو گا نظام اچھے موڈ میں تھے، مسکرا کر پوچھا آپ یہاں روز ٹہلنے آتے ہیں انہوں نے کہا جی ہاں اس کے بعد نظام نے ایک اور سوال کیا تو انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا اب ٹہلنے کا

وقت ختم ہو گیا ہے اچھا السلام علیکم، اور جواب دیئے بغیر فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک بار جب وہ بھوپال میں تھے بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی کہ فلاں "کاغذات" لے کر فوراً آ جایئے وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے جب گاڑی پہاڑی کا آدھا راستہ طے کر چکی انہوں نے کوچ بان سے گھبرا کر کہا گاڑی روک دو گاڑی رکتے ہی وہ اتر پڑے اور اپنے مکان کی طرف پیدل چلنے لگے کوچ بان نے کہا حضور گاڑی میں بیٹھ جایئے انہوں نے کہا نہیں میں پیدل جاؤں گا تم یہیں کھڑے رہو اور جب کوچ بان نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے کہا میں "کاغذات" گھر میں بھول آیا ہوں بھول جانا میری خطا ہے خطا کروں میں اور سزا بھگتیں گھوڑے یہ کون سا انصاف ہے۔

ایک بار انہوں نے چند راکابر لکھنو کو کھانے پر مدعو کیا لوگ دیر میں پہنچے وہ تمام مہمانوں کو احاطے کے ایک گوشے میں لے گئے اور کھدی ہوئی زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ حضرات دیر کر کے آئیں ہیں دیکھئے آپ کا کھانا یہاں دفن کر دیا گیا ہے السلام علیکم۔

ان کے ایک قرابت دار، ہر جمعے کو ٹھیک چار بجے ان کے پاس آیا کرتے تھے، اور یہ معمول تھا کہ دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی ان کی خدمت میں ہمیشہ پیش کی جاتی تھی۔

ایک بار وہ ان کی غیبت میں پہنچے، ملازم نے دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی پیش کر دی، چائے پی کر وہ ایک رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگے، اور ایک صفحے پر انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے نام کے نیچے "ہر جمعے کو دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی بمد خیرات"، لکھی ہوئی ہے تو انہوں نے ان کے وہاں آنا جانا ترک کر دیا اور انہوں نے اس صفحے پر لکھ دیا "خیرات بند"

ایک بار وہ انٹرویو لینے بیٹھے اور ساٹھ درخواست گزاروں میں ایک بھی منتخب نہیں کیا گیا اس لئے کہ سو سے لے کر ایک تک کوئی الٹی گنتی نہیں گن سکا۔

جب وہ بھوپال میں صدر المہام تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تمام اکابر شہر تعزیت کے لئے ٹوٹ پڑے، اور جب چپراسی ایک تھال میں صد ہا کارڈ لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا یہ اس قدر آدمی آج کیوں آئے ہیں چپراسی نے کہا سرکار کی والدہ کی تعزیت کے لئے آئے ہوئے ہیں، انہوں نے چپراسی سے بآواز بلند کہا ان لوگوں سے پوچھا ہماری والدہ سے ان کا کیا تعلق تھا کہ وہ تعزیت کے لئے آئے ہیں برآمدے تک ان کی یہ آواز پہنچی تو تمام آنے والے افتاں و خیزاں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆☆☆☆

علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر

وہ اپنے مکان کے چبوترے پر ڈھکی لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر ادھر سے گزرے اور وہ اس کو اپنا کلام سنائیں اور جب کوئی شاعر ان کے ہتے چڑھ جاتا تھا وہ اس کو اپنے کمرے میں لے آتے، بڑی مدارت کرتے، اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے۔

یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی ہزاروں شاعروں کو ہوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا مگر ان میں یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا سدھا ہوا ملازم تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگا دیا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے۔ جب باہر سے دروازے بند ہو جاتے تھے تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے، اور غزلیں سنانا شروع کر دیا کرتے تھے اور سننے والا جب ان کو داد دیتا تھا تو ہر داد پر بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے کھڑے ہو جایئے، اور جب وہ حیرت زدہ ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا تو اس کو اس طرح بھینچ کر گلے لگاتے تھے کہ ان کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھئے کہ گم نام پٹھان شاعر صاحب، اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سننے والا واہ واہ سبحان اللہ کہہ رہا ہے اور اس بیچارے داد دینے والے کو بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے ''کھڑے ہو جایئے کھڑے ہو جایئے اور جب وہ تھکا ماندہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑے زور سے گلے لگایا جا رہا ہے العظمتہ للہ کوئی حد بھی اس عذاب مسلسل کی۔''

اور ایک صاحب تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ جب بار بار کھڑے ہونے اور ہر بار گلے ملنے سے تھک کر انہوں نے یہ کہا تھا کہ اب مجھ میں بار بار کھڑے ہونے کا دم باقی نہیں رہا تو ان پٹھان شاعر صاحب نے اپنے تنبیہہ الغافلین ڈنڈے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، اٹھئے نہیں تو اس سے آپ کا سر توڑ دوں گا۔



www.pdfbooksfree.pk

نبی شیر خاں

ملیح آباد کے محلّہ [1] صدر پور کے زمین دار تھے کڑوے اتنے کہ خدا کی پناہ تمام عمر مقدمہ بازیوں اور فوج داریوں میں گزار دی ان کی داڑھی چڑھی اور مونچھیں کھڑی رہتی تھیں اور ان کے نام کا جزو لاینفک "شیر" تھا اس لئے وہ ہر آن حملے پر آمادہ رہتے تھے اور میرے باپ کے جان نثاروں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا وہ ایک روز میرے باپ کے انتقال کے بعد آئے اور کہا کہ اللہ بخشے خاں صاحب نے میری مصیبت کے وقت مجھ کو دس ہزار روپے دیئے تھے پر وہ نوٹ لکھائے بغیر اب میں وہ روپے واپس کرنے آپ کے پاس آیا ہوں یہ کہہ کر انہوں نے دس ہزار کے نوٹ میری میز پر رکھ دیئے۔

میں نے کہا نبی شیر خاں میرے خیال میں میرے باپ نے یہ روپیہ ایک دوستانہ پیش کش کی صورت سے آپ کو دیا تھا اگر یہ قرض کا معاملہ ہوتا تو وہ آپ سے پرنوٹ ضرور لکھا لیتے اس لئے یہ رقم قبول نہیں کر سکتا۔ میرے انکار سے وہ آزردہ ہو گئے، اور چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے ان کے سر کے ایک بڑے بار کو اترنے نہیں دیا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔

ایک بار، برکھا رت تھی اور وہ اپنے آموں کے باغ میں بیٹھے موسم کا لطف اٹھا رہے تھے کہ بھنگوں نے ان کی ایک آنکھ پر حملہ شروع کر دیا انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر بار بار بھنگوں کو بھگایا لیکن ٹھہر ٹھہر کر وہ ہر [2] بار حملے کرتے رہے اور جب وہ تنگ آ گئے تو انہوں نے جھلا کر اپنی آنکھ پر اس قدر زور سے گھونسا مارا کہ ڈھیلا نکل آیا اور انہوں نے ایک موٹی سی گالی دے کر بھنگوں سے کہا لو سالو اب کس چیز پر حملہ کرو گے آنکھ گئی پیر گئی

یک جاہے، تمام آفرین و توبیخ
دل داری ناہید و جفائے مریخ
آنکھوں میں ہیں یاد این وآں کے آنسو
قطرے، طوفان کی لکھ رہے ہیں تاریخ

---

[1] آم کی فصل میں بھنگے آدمی کی آنکھ میں گھس جانے کی سعی کیا کرتے ہیں [2] گنوارو زبان ہے یعنی اے جلال خاں ہو کہ نہیں، یا اے طلال خاں اگر ہو تو بولو۔

محمد شیر خاں

''کنول ہار'' محلّہ ملیح آباد کے پٹھان، میرے باپ کی ڈیوڑھی کے سپاہی، زبردست وڑھیل کام میں بڑے مریل، اعضاء کے اعتبار سے قوی ہیکل عقلی نقطہ نظر سے گٹھل، اور اعتراف قصور کے معاملے میں رشک جبل آدمی تھے، وہ آئے دن غلطیاں کرتے لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کو سور کا گوشت سمجھتے تھے اور اس وضع میں ان کو اس قدر رسوخ حاصل تھا کہ اگر پیپے پر رکھ کر ان کی ایک ایک بوٹی کاٹی جاتی پھر بھی وہ اعتراف قصور کا ننگ برداشت نہیں کرتے۔

میرے باپ کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ آموں کی فصل میں اپنے تمام احباب کو آموں کے ٹوکرے بھیجا کرتے، اور حریف و ربیع کے زمانے میں اپنے لکھنو کے احباب کے پاس غلہ رسادل، ترکاریاں اور گھی روانہ کیا کرتے تھے ایک بار یہ خدمت محمد شیر خاں کے سپرد ہوئی کہ وہ لکھنو جا کر حضرت جلال کی خدمت میں گھی کا پیپا دے آئیں صبح کو وہ لکھنو گئے اور دوپہر کو منہ پھلائے اور گھی کا پیپا اٹھائے ملیح آباد آ گئے آتے ہی میرے باپ کو جھک کر سلام کیا اور کہنے لگے میں حضور کے حق نمک سے ادا ہو گیا اگر حضور کے حق نمک کا پس نہ ہوتا تو جلال خاں کو اٹھا کر دے مارتا، میرے باپ نے ڈپٹ کر فرمایا محمد شیر زبان بند کرو، اور یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟ انہوں نے کہا جلال خاں نے گھی کا پیپا واپس کر دیا، مجھ کو ڈانٹا، پھٹکارا، گنوار کہا بس حضور کے خیال سے میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا نہیں تو۔۔۔۔۔میرے باپ نے بات کاٹ کر کہا حضرت جلال بہت شائستہ آدمی ہیں تم نے ضرور کوئی ایسی بات کی ہو گی کہ ان کو غصہ آ گیا بتاؤ تم نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں نے تو کوئی بات نہیں کی وہ بے کار خوخیا نے لگے میرے باپ نے کہا محمد شیر تم اور اپنی خطا مانو یہ ہو ہی نہیں سکتا دوسرے دن میرے باپ محمد شیر خاں کو ساتھ لے کر جلال کے وہاں پہنچے میں بھی ساتھ تھا حضرت جلال، محمد شیر خاں کو دیکھتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے خاں

صاحب اس جانگلوش کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے، میرے باپ نے ان کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور جب وہ مارے غصے کے داڑھی کو اپنے منہ میں چباتے ہوئے باہر چلے گئے تو جلال نے میرے باپ سے کہا خاں صاحب میں کل زنانے میں بیٹھا تھا آپ کے اس سپاہی نے اپنے لٹھ کے گولے سے میرا دروازہ اس قدر زور سے کھٹ کھٹایا کہ میری بیگم اچھل پڑیں، اور کہنے لگیں ہے ہے اب لکھنو میں یہ بھی ہونے لگا ہے یہ تو قیامت کے آثار معلوم ہوتے ہیں ابھی میری بیگم نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا، یعنی باہر سے آواز آئی جلال خاں 1ہوت میری بیوی نے کانوں میں انگلیاں دے لیں نادعلی پڑھنے لگیں میں غصے کے مارے کانپنے لگا دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک جناور داڑھا پھنکارے اور ایک پیپا کاندھے پر اٹھائے منہ کھولے کھڑا ہے میں نے کہا تم آدمی ہو یا جناور؟ اس نے آپ کا نام لے کر کہا آپ نے گھی بھیجا ہے میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے میں نے کہا چلے جاؤ میرے سامنے سے خاں صاحب اس شخص نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اہل محلّہ کو منہ دکھا سکوں۔



کنجو خاں

وہ بھی کنول ہار کے رہنے والے، اور ہماری ڈیوڑھی پر، سپاہیوں کے زمرے میں شامل تھے وہ اس قدر سرخ وسفید اور گورے چٹے تھے، آنکھیں اس قدر کنجی تھیں اور داڑھی اس غضب کی بھوری تھی کہ ہو بہو انگریز پادری معلوم ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی داڑھی اس بلا کی جھاڑ جھنکاڑ یا تھی پچھاڑ اور سرد کے درختوں کی طرح سیدھے بالوں کی تھی اور ان کی مونچھوں کے پولے، اس قدر گھنے اور ریش پیوستہ تھے کہ ان کا منہ غور سے دیکھنے کے بعد بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ایک روز وہ کسی گاؤں کی طرف سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ گاؤں کے حاشئے کے کنویں پر گاؤں کی چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں انہوں نے ان لڑکیوں سے پانی مانگا، ان میں سے ایک شوخ لڑکی نے ٹھول کی راہ سے پوچھا'' کھاں 1 صاحب تمرے منہ کہاں ہے کہ پانی مانگت ہو؟'' یہ سنتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی اور مونچھوں کو جدا کر کے کہا، اور یہ منہ نہیں تو کیا تمہارے لہنگے کے اندر کی چیز ہے؟ اور یہ فحش جواب سن کر، ساری لڑکیاں بھاگ کھڑی ہوئیں۔

ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کھیت کے قریب ایک موٹے تازے ہرن کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں پھنسا کھڑا نکلنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نکل نہیں سکتا انہوں نے خوشی سے اچھل کر کہا سالے روز ہمارا کھیت چر جایا کرتے تھے آج پھنسے ہو۔

---

1 خاں صاحب تمہارا منہ کہاں ہے کہ پانی مانگ رہے ہو۔

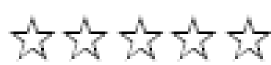
اب تمہارے کباب کھائے جائیں گے یہ کہہ کر انہوں نے اپنی لنگی کے ایک گوشے کو اس کی گردن میں ڈال کر خوب مضبوط گرہ لگا دی اور پورا زور لگا کر اس کو دلدل سے نکال لیا دلدل سے نکلتے ہی ہرن نے زور سے ایک جھٹکا دیا ان کی لنگی کھل گئی وہ لنگی سمیت بھاگ کھڑا ہوا وہ ننگے ہو گئے اور آس پاس کے کھیتوں کے لونڈوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں انہوں نے دوڑ کر ایک لونڈے کو پکڑ لیا اس کی لنگی چھین کر

www.pdfbooksfree.pk

باندھ لی وہ ننگا ہو کر رونے لگا انہوں نے کہا اے اور تالیاں بجا ننگے کنجو خاں پر اسی وقت وہ سیدھے خلیل خاں کے پاس گئے خلیل خاں بڑے دھاوت شکاری تھے ان کی گولی سے جب ایک دن انہوں نے اس ہرن کو ہلاک کروا دیا تو اسے گاڑی میں لدوا کر قصبے میں لے آئے اور اس کی دونوں ٹانگیں چیر چیر کر لوگوں سے کہا اس حرام زادے نے کنجو خاں کو ننگا کر دیا تھا اب دیکھ لو بھائیوں اس سالے کو بالکل ننگا۔

ایک دن وہ اپنی آموں کی بغیا بچا رہے تھے کہ بڑے زور کی کالی آندھی اٹھی، وہ بلبلا کر اپنی جھونپڑی سے نکل آئے اپنی پگڑی آسمان کی طرف باند کر کے گڑ گڑا گڑ گڑا کر دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ، میں بے حد غریب آدمی ہوں میری بغیا کا ایک آم بھی نہ تھا گرنے پائے، نہیں تو سال بھر فاقے ہوں گے اور بیٹی کی شادی بھی نہیں کر سکوں گا اے اللہ میرے منہ میں روزہ ہے کہتے ہیں تو روزہ داروں کی دعا سن لیتا ہے میرے باغ کو بچا لے اللہ نے ان کی دعا نہیں سنی اور آندھی نے ان کی تمام کیریاں زمین پر بچھا دیں اور کئی درخت بھی توڑ ڈالے۔

اب کنجو خاں کو اللہ میاں پر غصہ آ گیا انہوں نے اپنی جھونپڑی کو آگ لگا دی کھٹیا کو، ڈنڈے میں پھنسا کر پیٹھ پر لا دلیا مٹکے میں آب خورہ بھر کر ہاتھ میں لے لیا آسمان کی طرف بگڑ کر آنکھیں اٹھائیں اور کہا جناب ہم نے دانت نکال نکال کر آپ سے دعا کی کہ ہماری بغیا کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے آپ نے ہماری دعا قبول نہیں کی یہ کہہ کر آب خورہ منہ سے لگا لیا پورا آب خورہ پی گئے اور کہا یہ لیجئے ہم نے روزہ توڑ ڈالا اب آپ بڑے پٹھان ہیں تو کل سے روزہ رکھا لیجئے گا (اور پھر مرتے مر گئے لیکن کنجو خاں نے کبھی روزہ نہیں رکھا)



www.pdfbooksfree.pk

امیر احمد خاں

اچھے خاصے، بافراغت، زمیں دار میرے دادا کے مختلف البطن بھائی کے بیٹے تھے۔ نہایت پاک نفس، بڑے فیاض، افیون کے زبردست رسیا اور بے حد گالہندے تھے بندھی ٹکی معروف گالیوں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا، وہ نئی نئی گالیاں ایجاد کیا کرتے تھے اگر میرے قارئین کی اکثریت شرمیلی نہ ہوتی تو میں ان کی تمام نرالی گالیاں درج کر کے یہ دکھادیتا کہ ان میں خلاقی کا جوہر کس قدر تھا۔

ان کے ایک خاص مصاحب تھے محمد اکبر خاں، ایک دن انہوں نے لہر میں آ کر انہیں بالکل نئی تراش کی گالیاں دیں اکبر خاں روٹھ گئے آنا جانا ترک کر دیا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد وہ انہیں منانے ان کے گھر پہنچے اکبر خاں نے کہا خاں صاحب آپ بہت گالیاں دیتے ہیں انہوں نے کہاتم سالے ہو ہی اس قابل کہ تمہیں روز گالیاں دی جائیں اکبر خاں نے کہامیاں اگر ہم اتنے ہی برے ہیں تو آپ ہم کو منانے کیوں آئے ہیں انہوں نے کہا کیا کریں یہ کم بخت چودھویں صدی ایسی ہے کہ اکبر خاں اب تم سے حرامی بھی کہیں ڈھونڈے نہیں ملتے ہیں اس پر اکبر خاں ہنس پڑے اور من گئے۔

ان کے انتقال کا واقعہ بھی سن لیجئے ایسی وضع داری کے ساتھ مرنا کس کے بس کی بات ہے ان پر جب کرب نزع طاری ہوا انہوں نے اپنی بیوی سے کہا خدا کے لئے مجھ کو جلدی اٹھا کر بٹھا دو بیوی نے کہا ارے غضب خدا کا، یہ وقت بیٹھنے کا ہے انہوں نے کہا ارے بیوی جلدی کرو، میری اطاعت تم پر فرض ہو میرا دل چاہتا ہے کہ اس حرام زادی موت کو ایک گالی دے کر تو مروں، بیوی نے رو کر کہا ارے کلمہ پڑھو، انہوں نے ہاتھ جوڑے کہ مجھے بٹھا دو اور جب بیوی نے بٹھا دیا تو انہوں نے مٹھی بند کر کے بایاں ہاتھ بلایا اور کہا ''لے حرامن موت یہ موٹا ساڈاپونا'' اور سدھار گئے۔



ہدایت اللہ خاں[1]

میں نے جب انہیں دیکھا ان کی عمر ستر سے متجاوز ہو چکی تھی، تھے تو کمزور، مگر ذرا ذرا سی بات میں لٹھ پونگے پر آمادہ ہو جاتے اور قوی سے قوی نو جوانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے وہ میرے چچا کے وہاں ملازم تھے اور گھنٹہ بجانے کے سوا ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

ایک روز بیڑے کے سپاہیوں نے ان سے کہا ہدایت اللہ خاں تمہیں کچھ خبر بھی ہے، تمہاری موچھوں پر تو چنگاریاں اڑتی ہیں، اور تمہارے پوتے کو خلیل خاں باغوں باغوں لئے پھرتے ہیں یہ سنتے ہی وہ غصے کے مارے جل کھا گئے داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور کہا اچھا آنے دو کھلیل کھاں کو، ڈیوڑھی پر۔

دوسرے دن وہ دوپہر کا گھنٹہ بجا رہے تھے ابھی پورے بارہ بجانے نہیں پائے تھے کہ خلیل خاں آ گئے۔

انہوں نے گھنٹے کی موگری فوراً پھینک دی، کھڑے ہو گئے، کمر باندھ کر، اور کہا کھلیل کھاں ہم تم سے یہ پوچھت ہیں کہ تمہیں ہمرے کالے پوتے میں کا مجا آوت ہے کہ تم اس سسرے کو باگن باگن لئے پھرا کرت ہو۔

(خلیل خاں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے کہ تم اس بدمعاش کو باغوں باغوں لئے پھرتے ہو)

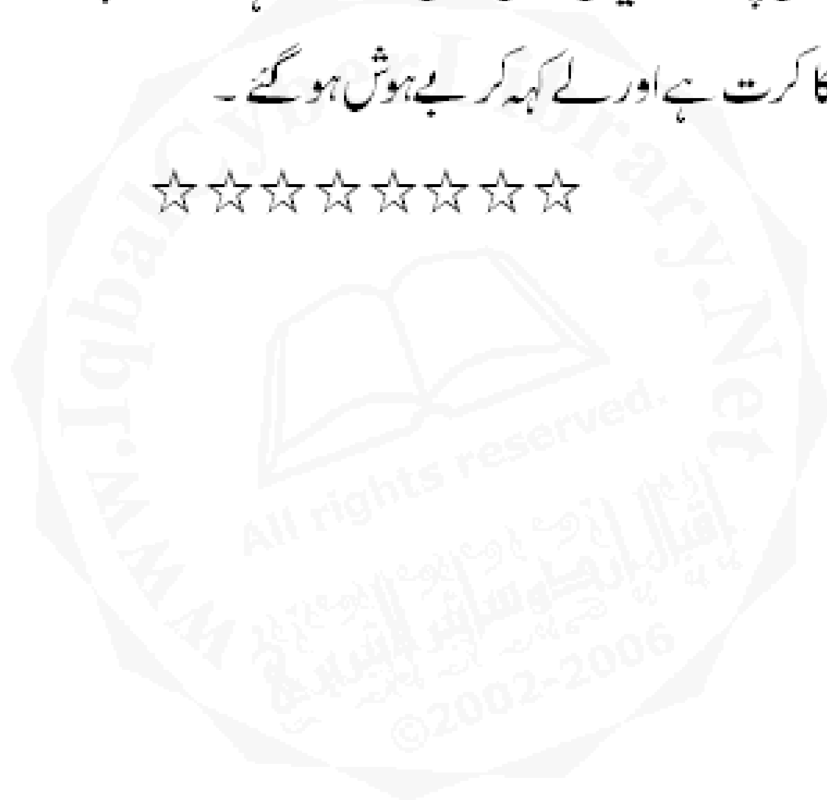
---

[1] وہ قوم کے ٹھاکر تھے اسلام لے آنے کے بعد ان کا نام ہدایت اللہ خاں رکھ دیا گیا تھا۔

آؤ، آج دو دو ہاتھ ہو جائیں خلیل خاں بڑے ظریف تھے انہوں نے کہا ہدایت اللہ خاں یہاں تو لوگ بیچ بچاؤ کر دیں گے، بڑے باغ چلو اور وہاں جا کر اپنا حوصلہ نکال لو خلیل خاں اکڑتے اور ہدایت اللہ خاں ہانپتے کانپتے باغ پہنچ گئے خلیل خاں نے کہا ہدایت اللہ خاں تم بوڑھے آدمی ہو تم پہلے وار کرو انہوں نے کہا اچھا اور لاٹھی اٹھا

کر ان پر حملہ کر دیا خلیل خاں نے ان کی لاٹھی اپنی لاٹھی پر روک کر کہا 'فش'' !ہدایت خاں '' پھس پھس کا کرت ہے، اور لے (فش فش کیا کر رہا ہے اور لے) کہ کر دوسری لاٹھی ماری اس لاٹھی کو بھی اپنی لاٹھی پر روک کر خلیل خاں نے کہا 'فش'' ہدایت اللہ خاں نے '' پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر پھر لاٹھی ماردی الغرض ہدیات اللہ خاں نے ان کے دس پندرہ لاٹھیاں پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر ماریں اور آخر کار پھس پھس کا کرت ہے اور لے کہہ کر بے ہوش ہو گئے ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

محبوب شاہ مجذوب

ذرا سی دھوتی باندھے ننگ دھڑنگ آدمی تھے کبھی کبھی ملیح آباد آتے اور میرے پھپا نواب احمد خاں کی ڈیوڑھی میں ٹھہرا کرتے اور ایک ردی کاغذ لئے گلیوں میں پھرتے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے بھیا اس پر ''دس کت'' (دستخط) کر دو ہمری ہماری سادی (شادی) ٹھہری ہے۔

ان کو روپے پیسے یا کھانے پینے سے کوئی سروکار نہیں تھا جب کوئی ان کو روپیہ دیتا تھا تو وہ ''ارے کو یا ٹھیکرا دیوت ہو'' (ارے یہ کیا ٹھیکرا دیتے ہو) کہہ کر اسے پھینک دیا کرتے تھے البتہ پھپا جب ان کے روبرو کھانا رکھ دیتے تو ذرا سا چکھ کر سر کے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

لوگ جب ان سے اپنے بارے میں کوئی بات پوچھتے تھے تو وہ سیدھا جواب نہیں دیتے اور

''ارے گنے کے کھیت لاگے لگے ہیں کھوب خوب گنے کھاؤ کھجانے خزانے بھرے ہوئے ہیں کھوب بجے مزے اڑاؤ'' کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔

میں ایک زمانے میں ایک لڑکی پر جس کی منگنی ہو چکی تھی بہت بری طرح عاشق ہو گیا تھا پہل اس لڑکی نے کی تھی اس لئے میرا عشق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا کہ محبوب شاہ ملیح آباد آ گئے میں ان کو اپنی نو تعمیر کوٹھی ''قصر سحر'' میں لے گیا میری بیوی مائیکے گئی ہوئی تھیں میں نے محبوب شاہ سے کہا آؤ میرے لحاف میں لیٹ جاؤ وہ لیٹ گئے میں نے ان سے دیکھو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر گنے کے کھیتوں اور خزانوں کا نام لو گے تو یہ تمہاری کچھوداڑھی و نچ کر رکھ دوں گا وہ مسکرائے اور کہا یو کا مرہی باتن کرت ہو (یہ کیا بیہودہ باتیں کرتے ہو) ہم پرائی مہریا کو تمہیں کیسے دلائی دیں۔ (ہم دوسرے کی بیوی کو تمہیں کیوں کر دلا دیں) یہ بات سن کر مجھے حیرت ہو گئی کہ انہیں میرے دل کی بات کا پتا کیسے چل گیا۔

ایک روز میں نے ان کو اپنے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں سلایا، صبح چار بجے ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ جو گدا اور لحاف میں نے ان کو دیا تھا وہ پائنتی لپٹا رکھا ہے، اور آدھے دھڑ سے ننگے چارپائی سے پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں میں نے کہا محبوب شاہ ارے اتنی سخت سردی میں اور ننگے بیٹھے ہو۔

انہوں نے کہا''بھیا سوتے بن نہیں پڑتے ہے، ندیا کنارے ڈگن لگائے بیٹھن ہیں نہ جانے کب کھٹکا ہو جاوے''بھیا سوتے بن نہیں پڑ رہا ہے ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے کی چھڑ لگائے بیٹھے ہیں نہ جانے کب مچھلی کے کانٹا نگل جانے کی کھٹکا رہو جائے۔

میں نے کہا یہ سب بیوقوفی کی باتیں ہیں وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے ابھئی تو ان باتن کو بےوکوفی کہت ہو جب ہم تم کا مکے مدینے اڑائی کے لے جلیھبا تب تم کا پتا چلے گا ابھی تو کھوب مجے کرو کھوب کوٹھن پر چڑھو کھوب گنے کھاؤ ابھی تو ان باتوں کو بےوقوفی کہہ رہے ہو جب ہم تم کو مکے مدینے اڑا کر لے جائیں گے اس وقت تم کو پتا چلے گا ابھی تو خوب مزے کرو خوب کوٹھوں پر چڑھو۔ خوب گنے کھاؤ۔

حیدر آباد جانے سے کوئی ایک سال پہلے جب کہ حیدر آباد جانے کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں تھا وہ میرے پاس آئے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے ہم نے تمرے نام لکھ دینا ہے اکبر پور وہاں کھوب مجے کرنا ہم نے تمہارے نام اکبر پور لکھ دیا ہے وہاں خوب مزے کرنا میں نے کہا اکبر پور تو میری بیوی کے نانا کے گاؤں کا نام ہے انہوں نے کہا تمرا اکبر پور[1] دکھن ماں ہے (تمہارا اکبر پور دکن میں ہے)

اس کے ایک سال کے بعد میں حیدر آباد روانہ ہو گیا اور جب دو چار برس کے بعد

[1] چونکہ حیدر آباد سب سے بڑی ریاست تھی شاید اسی بناء پر اسے اکبر پور کہا تھا

رخصت لے کر وطن آیا تو دیوے کے عرس میں چلا گیا صبح کا وقت تھا دیکھا کہ محبوب شاہ چلے آ رہے ہیں انہوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا میں نے کہا یہاں کیسے

انا ہوا کہنے لگے دعا سلامتی کے لئے میں نے کہا لو محبوب شاہ انگور کھاؤ انہوں نے دو ایک انگور کھا کر مجھے غور سے دیکھا اور ایک شہر کا نام لے کر کہا بھیا وہاں کدم نہ رکھیو نہیں تو کانجی ہوز میں بند کر دیئے جئیو ''بھیا وہاں قدم نہ رکھنا ورنہ کانجی ہوز یعنی مجلس مویشیان آوارہ، میں بند کر دیئے [1] جاؤ گے۔''

---

[1] دو چار روز کے اندر یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی کہ میں اپنی جس معشوقہ سے ملنے جانے والا تھا اس کے شوہر نے میرا خط پکڑ لیا تھا اور میرے پھانس لینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔

اب جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ بعض افراد مستقبل کے واقعات سے کیوں کر آگاہ ہو جاتے ہیں تو اس کے سوا کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض لوگوں کے پاس ایک چھٹا حاسہ ہوتا ہے جو مستقبل کو اپنے انکڑے میں پکڑ لیتا ہے وہ چھٹا ماسہ کلن کیمیاوی تغیرات کا نتیجہ ہوتا ہے ابھی تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے الاماں، یہ کائنات اور یہ انسانی دماغ دونوں ایسے قلزم ہیں کہ ابھی تک کسی کو ان کی تھاہ نہیں مل سکی ہے۔

پیائش	قلزم	پہ	وہ	کیا	قادر	ہو
قطرے	کی	جسے	تھاہ	نہیں	ملتی	ہے

صبر کر اے انسان کے ذوقِ تجسس کہ ابھی تیری آسودگی کا وقت نہیں آیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

الویرو

اس اٹلی کے باشندے سے حیدرآباد دکن میں ملاقات ہوئی تھی چہرہ خوانی میں اسے اس قدر بصیرت حاصل تھی کہ وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کے خیالات معلوم کر لیتا اور پوچھے بغیر اس کے سوالات کے جواب لکھ کر دے دیا کرتا تھا۔

ایک بار سید امین الحسن صاحب بسمل اور نواب اصغر یار جنگ کے ساتھ میں ان سے ملنے جا رہا تھا تو میں نے ان سے موٹر میں یہ کہا کہ میں الویرو سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں فرنگی راج کب ختم ہوگا، میرے دونوں دوستوں نے کہا یہ سوال غلط ہے، ہم لوگ نظام سے وابستہ ہیں اس لئے ہم کو سیاسی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہئے۔

جب ہم اس کے وہاں پہنچے تو ہم لوگوں کے سوالات کے جوابات قلم بند کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ "آپ نے موٹر میں جو سوال ڈراپ (نظر انداز) کر دیا ہے، میں اس سے واقف ہوں لیکن میرا یہ اصول ہے کہ میں سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سیاسی حیثیت سے آپ بڑے خطرناک قسم کے باغی ہیں اور زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن آپ کا مستقبل بہت شاندار ہے۔"

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں انہون نے اکبر حیدری سے کہا سر اکبر حیدری اس وقت آپ کے دل میں جو بات ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں بتا دوں! اکبر حیدری یہ سن کر اچھل پڑے اور کہا "آپ برسر عام میرے دل کی بات نہ بتائیں ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا" اس نے ایک پرچے پر وہ بات لکھ دی اکبر حیدری دنگ ہو کر رہ گئے اس کے کمال کا اعتراف کیا اور پرچہ کو چاک کر کے جیب میں رکھ لیا۔



مشیر احمد خاں رامپوری

ان کے بزرگ رام پور سے آ کر ملیح آباد میں رہنے لگے تھے وہ پستہ قامت گورے چٹے اور ''کچو واڑھی رکھتے تھے ان کے مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ خدا کی پناہ روتوں کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔''

میرے باپ کے بڑے مخلص ورفیق اور نہایت بے تکلف دوست، تصوف کے شیدائی عرسوں کی شرکت کے رسیا، درویشوں، صوفیوں سدا سہاگنوں کے مستقبل میزبان، میرے بچپن کے یار مختار احمد خاں کے باپ، اور میرے چچا نواب محمد علی خان کے بھتیج داماد تھے۔

ان کے وہاں ہمیشہ دس بیس درویش ٹھہرے رہا کرتے، انگنائی میں دیگیں چڑھی رہتیں اور ہندوستان کے ہر عرس میں وہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

ان کی جائیداد تنگ اور حوصلے بے حد وسیع تھے آخر کار چھوٹی جائیداد بڑے حوصلوں کا ساتھ نہیں دے سکی اور وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر رہ گئے اور میرے باپ کے سہارے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی افلاس کو بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ ان کی صاحب جائیداد لا ولد بہن کا انتقال ہو گیا اور ان کی جائیداد انہیں مل گئی۔

جائیداد ملتے ہی ان کے وہاں درویشوں کا میلہ پھر لگ گیا پھر دیگیں چڑھ گئیں پھر قوالیاں ہونے لگیں اور پھر جم غفیر کے ساتھ وہ عرسوں میں شریک ہونے لگے کچھ روز کے بعد وہ جائیداد بھی ختم ہو گئی اور پھر مفلسی کا دور آ گیا دیگیں ٹھنڈی ہو گئیں اور مہمانوں کی چہل پہل سے گھر خالی ہو گیا اور میرے باپ کو ھر ہاتھ بٹانا پڑا۔

کوئی چھ سات مہینے اس تنگی سے گزرے تھے کہ ان کے کسی لا ولد قرابت دار کا انتقال ہو گیا ان کی جائیداد ان کو مل گئی اور پھر وہی اللے تللے شروع ہو گئے۔

وہ جائیداد بھی جب مہمانوں اور عرسوں کی نذر ہو گئی تو ایک اور لاولد قرابت دار سدھار گئے اور ان کی جائیداد بھی انہیں مل گئی اور پھر وہی رنگ رلیاں ہونے لگیں میرے باپ کا اس اڈس اء میں انتقال ہو گیا وہ جائیداد بھی برباد ہو گئی ان کے پاس کچھ نہیں رہا اور وہ اسی عالم افلاس میں بیمار پڑ گئے، اور جب ان کی حالت خراب ہو گئی تو ان کے ایک رئیس دوست مرزا عابد علی بیگ نے چاہا کہ ان کا علاج کرا دیں انہوں نے کہا مرزا اب میرا علاج بے کار ہے اب کوئی قرابت دار ایسا نہیں رہا کہ اس کی جائیداد مجھے مل جائے اس لئے مجھے اب چین سے مر جانے دو بس ہو چکا جینا۔

اور اس کے چوتھے روز اس مرد بے پروا کا انتقال ہو گیا۔

ایسے مست مولی اب کبھی پیدا نہیں ہوں گے

آفریں باد، بر ایں ہمت مردانہ تو!

☆☆☆☆☆☆☆☆

مولوی احمد حسین

میں نے زندگی میں دو ایک کے علاوہ ان کا سا پر اسرار و صاحب کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔

ان کی دنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکار نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ کے ایک معمولی کلرک تھے لیکن ان کی انسانی حیثیت اس قدر ارفع تھی کہ ایک میرا سا بیگانہ یقین و بے عقیدہ شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروڑوں انسانوں میں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے عربی، فارسی، علم کلام اور فلسفے پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی لیکن افتاد مزاج کی بناء پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے پھر بھی وہ کبھی کائنات کے حقائق اور وحدت انفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ ان کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تخت طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے ان کی اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس لئے اس امر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلق تھا ہر اکز لٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی ذات سے۔

یوں تو ہندوستان کی دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرمانروا علم بریدگی جہالت پروردگی گرم و سرد نہ چشیدگی ہمہ وقت آرامیدگی، خوشامد گزیدگی ذہن ژولیدگی اور آمریت پیوستگی کے باعث اس قدر متکبر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تبختر، اور ہامان و شیطان کا غرور ان کو دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔۔۔لیکن نظام اللہ اکبر جس طرح ان کی ریاست ہندوستان کی تمام ریاستوں سے بڑی تھی اسی طرح وہ تمام والیان ریاست سے عجب و غرور میں بھی سب سے زیادہ قد آور انسان تھے اور انسان نہیں خدا معلوم

ہوتے تھے اوران کے روبرو بڑے بڑے ہمالیہ کوب انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں اور بڑے بڑے سورماؤں کے زہرے آب ہوجایا کرتے تھے۔

اور یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شیر افگن تھا، اب سنئے تیس ریلی ماہانہ کے ایک معمولی سے کلرک مولوی احمد حسین کا واقعہ۔۔۔

حیدرآباد کی ایک درگاہ میں جس کا نام ''خواجہ کا چلا'' بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرأت ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن جو قرآن کی جان ہے اس طرح پڑھنا شروع کردی کہ تمام محفل جھومنے لگی:

ابھی تمام ارباب درگاہ، قرأت کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے رعب شاہی سے قاری کے رشتہ آواز میں خفتگی پیدا ہوگئی اور قرأت ہکلانے لگی۔

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا مگر واہ ری جرأت مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین آدمی نے جھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرأت میں باتیں کرنا سوادب ہے آپ خاموش ہوجائیں نظام نے مڑکران کو دیکھا۔۔۔ونکلا راما ریڈی کوتوال شہر جو پولیس کے دستے کے ساتھ نظام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑا تھا ان کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا لیکن نظام نے ''نکو نکو'' (نہیں نہیں) کہہ کر اس کو روک دیا۔

قاری کی رندھی آواز کھل گئی، قرأت پھر پینگ لینے لگی اور لوگ جھومنے لگی لیکن ایک مختصر سے وقفے کے بعد نظام نے مہاراجہ کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کردیا یہ دیکھ کر وہ بپھر گئے پہلے تو انہوں نے سوءادب ہی کہا تھا اس بار انہوں نے با آواز بلند کہا'' اثنائے قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے خاموش ہوجایئے اور مزید بدتمیزی نہ کیجئے''

ان کی یہ آواز سن کر حاضرین تھرا اٹھے قاری کی آواز گلے میں دفن ہوگئی، کوتوال

پھر چھپٹا نظام نکو نکو انہیں گرفتار نہ کرو ان کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آ جاؤ کہ کر کھڑے ہو گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے۔

''تمام حاضرین محفل اس دبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے جس کی بوسیدہ شیروانی کی آستیوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تعریف کرنے لگے۔''

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے اب چونکہ وہ لوگ باقی نہیں رہے اس لئے میں ایک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں اور کوتوال جب ان کا نام اور پتہ پوچھنے آیا تو انہوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد اس سے یہ کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ مجھے گرفتار کرلو، اور پھانسی کے تختے پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ کوتوال ان کو حیرت سے دیکھنے لگا، اور اس کا کوتوالی کا گٹھا ہوا دبدبہ پلپلا ہو کر اس کے کھلے ہوئے منہ پر لٹکنے لگا۔

ابھی درگاہ سے آ کر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے آ کر کہا مہاراجہ کشن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں انہوں نے کہا بلا لو۔۔۔ مہاراجہ نے ان کے سامنے ایک ایک ہزار کے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب یہ دس ہزار روپے سرکار والا تبار نے آپ کی جرأت ایمانی سے خوش ہو کر آپ کی خدمت میں بھیجے انہیں قبول فرمائیے۔

انہوں نے بڑی مسکنت سے کہا سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجئے میں ان کا ایک ادنیٰ سا نمک خوار ہوں یہ ان کی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھ جو جزا دے رہے ہیں لیکن مہاراج سرکار کی خدمت میں جا کر عرض کر دیجئے کہ کلمہ حق فروختنی نہیں ہوا کرتا اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کر سکتا مہاراجہ نے ان کو بڑی حیرت سے دیکھا فرط جذبات سے کچھ بول نہیں سکے ان کے ہاتھ چوم لئے اور سر جھکا کر رخصت ہو گئے۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو نوکری سے سبک دوش کر کے گھر بیٹھے تین سو روپے تا حیات دیئے جائیں اس کو بھی انہوں نے قبول نہیں کیا اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے میں تیس روپے ماہانہ میں اچھی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں مجھ کو تین سو روپے کی ضرورت نہیں۔

دیکھا آپ نے اس ہڈیوں کے مالے کا آہنی کردار؟ اس صدی میں اگر ان کا کوئی ہمسر گزرا ہو تو خدارا مجھے اس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہ اشتراک نہیں تھی وہ تھے مناجاتی اور میں تھا رند خراباتی خدا جانے وہ میری کون سی ادا تھی جس نے ان کا دل موہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا تمام کلام الہامی ہے اور آپ کی شراب نوشی مراقبہ ہے۔

حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہام ہے نہ میری شراب نوشی مراقبہ ہے اب ان کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے جس کی نوعیت پہلے واقع سے بالکل مختلف ہے اور جس کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔

مجھ پر خدا کے فضل و کرم سے جب شاہی عتاب بجلی کی طرح گرا تو وہ ایک دن میرے پاس آئے اور پوچھا آپ کے اخراج مبارک میں اب کتنے دن باقی ہیں میں نے کہا صرف آٹھ دس دن انہوں نے کہا تو پھر ایسا کیجئے کہ اس اثناء میں آپ میرے پاس ہر شام کو دو گھنٹے کے لیے آجایا کیجئے اس لئے کہ مجھے آپ کے کانوں تک چند ایسے نکات پہنچانا ہیں جو فقط آپ تک پہنچا دینے کے واسطے مجھے ودیعت فرمائے گئے ہیں میں نے کہا مولوی صاحب جھٹپٹے کے سانولے رنگ کی چھاؤں میں تو میں کالا 1 پانی پیا کرتا ہوں انہوں نے کہا کوئی پروا نہیں آپ میرے سامنے بیٹھ کر پی سکتے ہیں آپ میری

باتیں سن سن کر جس قدر بھی کالا پانی پئیں گے اسی قدر گورے ہوتے چلے جائیں گے۔

چنانچہ اسی دن شام ہوتے ہی میں ہینڈ بیگ میں بوتل، پیانہ، گلاس، گھڑی اور اگر بتیاں ڈال کر ان کے وہاں پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور کہا آیئے میرے ساتھ میں نے آپ سے باتیں کرنے کے لئے دس دن کے واسطے یہیں پڑوس میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے میں نے کہا شاید اس لئے کہ آپ کے گھر میں بادہ نوشی نہ کی جائے انہوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے میں جو باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ باتیں آپ کے سوا اگر کسی اور کے کان میں پڑ گئیں تو وہ گم راہ ہو کر رہ جائے گا آپ کو معلوم ہے کہ عرق گل جسے گلاب کہا جاتا ہے بیمار کے جسم میں داخل ہو کر بلغم اور تندرست کے جسم میں حیات آفریں ہو جاتا ہے یہی حال بعض خیالات کا ہے کہ وہ نادان کے لئے زہر اور دانا کے لئے تریاق بن جاتے ہیں۔

---

1 شراب

الغرض آٹھ دس دن تک برابر انہوں نے بڑے ٹھوس مسائل مجھ کو سمجھائے یہ بھی بتایا کہ عبادات مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ مقاصد ہیں اور اسی لپیٹ میں الفاظ کے داخلی و خارجی معانی و مفاہیم عوام و خواص کے جداگانہ احکام تنزیہی و تشبیہی نکات اور محرک اول کے مجازی و حقیقی تخیل پر بھی روشنی ڈالی اور اسی کے ساتھ ساتھ تکوین و تخلیق ارتقاء و بقائے اصلح مادہ و روح طریقت و شریعت، جزا و سزا، جہنم و جنت، روح و مادہ، جبر و قدر، اوامر و نواہی، معاش و معاد، حیات و موت، قضاء و قدر، واجب و ممکن اور ذات و صفات کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ ان پر کٹھ ملاؤں کی بارگاہ سے باآسانی کفر کا فتویٰ صادر کیا جا سکتا ہے سب سے زیادہ انہوں نے زور دیا انفس و آفاق کی وحدت پر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم خدا کے تصور سے دست بردار بھی ہو جائیں پھر بھی موجودات کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تمام کائنات عینیت کی

زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے غیر یت کا کہیں وجود ہی نہیں ہے اسماءواشکال کے حجابات ہم کو دھوکا دیتے ہیں اور ان حجابات کو ہٹا دیں تو معلوم ہو جائے گا کہ تمام کائنات کی تکوینی ماہیت ایک ہے خواہ ہم روحانی نقطہ نظر سے دیکھیں خواہ مادی ہم کو وحدت الوجود کا قائل ہونا پڑے گا اس لئے کہ کونین ایک حقیقت واحدہ کثیر الاسماءوالاشکال ہے۔

اسی کے دوش بدوش انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسلام نے جو توحید پر اس قدر زور دیا ہے اس کا منشاء بھی صرف اس قدر ہے کہ لوگ اپنے کو ایک باپ کے بیٹے اور ایک دوسرے کو حقیقی بھائی اور بہن سمجھیں اور اگر خدا میں تعدد ہو جائے گا تو لوگ سگے بھائی بہن نہیں رہیں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی وحدت در حقیقت انسان و آفاق کی وحدت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ان راتوں کی آخری رات بڑی عجیب ہو گئی تھی وہ یکا یک خاموش ہو گئے اور پھر ہاتھ ہلا ہلا کر ارے تو بہ ارے تو بہ کے نعرے لگانے لگے میں ان سے بے تکلف ہو چکا تھا میں نے کہا ارے یہ مجازیب کے سے شندے آپ کیا کر رہے ہیں انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھ سے کہا میر عثمان علی خان کا مال دیکھ رہا ہوں تو بہ تو بہ، یہ خون خرابے، یہ ذلتیں یہ بے چارگیاں میں نے کہا، جناب والا میں ان شعبدوں کا قائل نہیں، انہوں نے کہا میرے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا۔۔۔۔ یہ کہا اور وہ سر جھکا کر پھر خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئے، میں حیران ہو گیا کہ یہ آج انہیں ہو کیا گیا ہے ابھی میں نے اپنا آخری جام ختم کیا تھا کہ انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورنا شروع کر دیا میں نے کہا حضرت یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے انہیں یہ سن کر جھر جھری آئی میں ہنسنے لگا وہ سنجیدہ رہے اور مجھ سے پوچھا احادیث کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے میں نے جواب دیا کہ عہد بنو امیہ میں تسکیک احادیثی کی ایسی زبردست دارالضرب کھول دی گئی تھی اور ایسی ایسی جھوٹی حدیثیں وضع کی گئی تھیں کہ اب جھوٹی سچی حدیثوں

www.pdfbooksfree.pk

میں فرق کرنا بے حد مشکل ہو چکا ہے احادیث کی اب یہ صورت ہوگئی ہے جیسے پلاؤ کی دیگ تو دوں سے اتار کر زمین پر رکھ دی گئی ایک کتے نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا پیشاب کی قطرے ہوا سے اڑ کر دیگ میں پہنچ گئے یہ صحیح ہے کہ ہر چانول ناپاک نہیں ہوا لیکن ہر چاول مشتبہ ضرور ہو کر رہ گیا انہوں نے پوچھا پھر صحت احادیث کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے میں نے کہا لے دے کے صرف یہی ایک معیار ہے کہ جو احادیث قرآن کے آیات و مزاج کے مطابق ہیں ان کو صحیح اور اس صورت حال کے برعکس احادیث کو غلط سمجھا جائے۔

انہوں نے کہا بے شک یہ معیار بہت اچھا ہے لیکن اس سے بھی اچھا معیار آپ کو بتاؤں؟ میں نے کہا ضرور بتایئے انہوں نے کہا اس کا کبھی خطا نہ کرنے والا معیار ہے ذات رسول میں نے کہا ان کی وفات کے بعد اس معیار سے کام لیا ہی نہیں جا سکتا انہوں نے جواب دیا کہ ظاہری وفات سے کچھ نہیں ہوتا رسول آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے کل تھے میں نے کہا یہ آپ کیسی باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں خیریت تو ہے مزاج کیسا ہے وہ مسکرائے اور کہنے لگے میاں جوش یہ دو باتیں آپ کے واسطے مقدر ہو چکی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ اپنی عمر کے دور آخر میں داخل ہو جائیں گے قدرت آپ سے ابلاغ توحید کا کام لے گی آپ انفس و آفاق کی وحدت کا آوازہ بلند کریں گے اور وہ آوازہ وحدت الٰہی تک جائے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ کو کسی حدیث کی صحت میں شک ہوگا آپ براہ راست خود رسولؐ سے جا کر پوچھ لیں گے۔

یہ سن کر میں نے بہت زور سے قہقہہ مارا، اور کہا مولانا یہ آخری رات دیوانگی کی رات ہے نو راتوں تک تو آپ معقول رہے اور آج مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہیں آپ کا وائی قدرت اور مجھ سے کام لے اور رسولؐ کو زندہ فرما کر مجھے ان کی سرکار تک پہنچائے آپ کو میرے تشکک کا بخوبی علم ہے اب رہے میرے اعمال، سو آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہوں یعنی اسلامی نقطہ نظر سے

میرے افکار اور میرا کردار ایسا ہے کہ آپ کا خدا مجھ کو پسند ہی نہیں کرسکتا اور اس حالت میں آپ کی یہ پیش گوئی قطعی طور پر غلط ہے۔

میری یہ بات سن کر وہ اچھل پڑے کہنے لگے تشکک مزد بان معرفت ہے، جو آپ کو بام یقین تک ایک روز پہنچادے گا اب رہی آپ کی بادہ خواری سو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ آپ کا مراقبہ ہے اپنی شراب کو آپ گناہ سمجھ رہے ہیں، ایسا بولنا گناہ ہے۔

میں نے پھر قہقہہ مار کر کہا، آج کی رات تو بڑے مزے کی رات ہے پی میں رہا ہوں اور بہک آپ رہے ہیں وہ ہنسنے لگے اور کہا آپ کے قہقہے قضاوقدر کے دھارے کو نہیں موڑ سکتے، جو کچھ پیش آنے والا ہے آپ خود دیکھ لیں گے میں نے کہا اب میں اجازت چاہتا ہوں آیئے گلے مل لیں، پھر دیکھئے کبھی ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں انہوں نے بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر کہا میں ایک مہینے تک خواب میں آپ کے پاس آتا رہوں گا اور جب آپ مطمئن ہو جائیں گے خواب میں آنا ترک کر دوں گا اور ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ اپنے انتقال سے پورے چھ مہینے پیشتر آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے آپ سے ملنے آؤں گا۔

چنانچہ انہوں نے جو کہا تھا وہی کیا ایک ماہ برابر وہ میرے خواب میں آتے اور ہدایتیں کرتے رہے اور انتقال سے چھ مہینہ پیشتر دہلی میں آکر مجھ سے مل بھی لئے یہ کیا طلسم تھا، میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے یا تو یہ میرے ذہن کی طاقت تھی جو برابر مجھے خواب دکھاتی رہی یا ان کا تصرف تھا کوئی فیصلہ کرے لیکن موت سے ٹھیک چھ مہینے قبل آنا یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں اپنے ذہن کی کارکردگی سے قطعاً منسوب نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا جہل مجھ کو ہلاک کر کے چھوڑے گا۔

نواب زادہ مصطفٰے علی خاں

میرے چچا نواب محمد علی خاں، تعلقہ دار ''سہلامو'' کے فرزند یعنی میرے چچا زاد بھائی لیکن بھائی کم اور دوست بہت زیادہ ہیں اگر وہ فقط بھائی ہوتے تو ان سے ڈر لگتا اس لئے کہ میرے خاندان کے بھائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

وہ جونا ی میں نہایت خوب رو تھے چچا نے ان کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور مسوری کے انگلش اسکول میں داخل کر کے یہ چاہا تھا کہ وہ علم حاصل کر لیں لیکن بدشوتے تھے اسکول سے گھبرا کر گھر آ گئے اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

چچا جان ان کو بہت چاہتے تھے لیکن خلف اکبر نہ ہونے کی بناء پر ان کو تعلقہ دار نہیں بنا سکے تعلقہ داری ان کے بڑے بھائی حامد علی خان کو سونپی، لیکن ان کے نام اس قدر زمینیں، باغ اور گزارہ لکھ دیا کہ اگر وہ جائیداد باقی رہی جاتی تو کئی پشتوں تک چلتی۔۔۔۔ لیکن صد حیف کہ میرے بھائی کی افتادِ طبع نے وہ تمام جائیداد برباد کر ڈالی۔ اور اب وہ لکھنو میں راجہ صاحب سلیم پور کی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بڑی اداسی کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔

آسماں را حق بود، گر خوں ببارد بر زمیں!

اب ان کی داستان بربادی بھی سن لیجئے اور اس امر پر بھی غور کیجئے کہ جذبات کا طوفان انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے خدا بخشے ان کے باپ چونکہ بے حد حسن پرست تھے، حسین عورتوں اور طوائفوں سے ان کا گھر بھرا رہتا تھا اور چونکہ مصطفٰے علی کا لڑکپن ان حسینوں کی زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا اس لئے بچپن ہی سے وہ تماش بینی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کے مرتے ہی وہ ایسے کھل کھیلے کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

سب سے پہلے وہ سندیلے کی ایک طوائف پر اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے کی حد تک ریجھ گئے جب وہ مر گئی کچھ روز اس کا سوگ منانے کے بعد پھر تو انہوں

نے سینکڑوں طوائفوں پر یکے بعد دیگرے مرنا شروع کر دیا اور جائیداد دھڑا دھڑ بکنے لگی۔

خبر کرو، مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو!

ان کو بربادی کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑتے دیکھ کر ان کے قرابت داروں اور بہی خواہوں نے لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھائی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ عیاشی کرو، مگر بجٹ بنا کر اپنے حدود میں رہو لیکن وہ نہیں مانے اور سمجھانے والوں سے جھڑک جھڑک کر کہا کہ خاں صاحب فضول خرچی ہماری عادت میں داخل ہے آئندہ نہ سمجھایئے گا ورنہ قطع تعلق کر لوں گا۔

وہ جب اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتے، اور روپیہ ان کی جیب میں آتا تو دس منٹ ضائع کیے بغیر وہ ریل ٹیکسی بس تانگے یا کے میں بیٹھ کر ''گولڈن نائٹ'' (شب زریں) منانے کے واسطے لکھنو چلے جایا کرتے تھے تاکہ ان کی جیب کے سکوں اور ''گولڈن نائٹ'' کے لمحوں کے مابین کوئی فصل پیدا نہ ہونے پائے۔

اور جب ان کے پاس پانچ سات روپے باقی رہ جاتے تھے تو اعلیٰ سگریٹ کے بدلے بیڑی پیتے ہوئے ملیح آباد آ جاتے اور تقریباً فاقے کرنے لگتے اور اس عالم میں اپنے بچوں کے اترے چہرے دیکھ کر روتے، اور اسراف سے توبہ کیا کرتے تھے لیکن جیسے ہی باغ یا زمین کے کسی دوسرے حصے کے فروخت کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے فاقوں میں اپنے بچوں کے اترے چہروں کو فراموش کر کے وہ بڑی گھبراہٹ کے ساتھ پھر گولڈن نائٹ منانے کے واسطے لکھنو چلے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے جائیداد کے خریداروں نے یہ سوچ کر کہ وہ ہر حالت میں جائیداد بیچ ڈالنے پر بری طرح تلے ہوئے ہیں خریداری سے انکار کر دیا تھا تاکہ وہ دس ہزار کی زمین دو ہزار میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں اس زمانے کے چائے کے سیٹ اور چاندی سونے کے برتن بیچ بیچ کر انہوں نے اپنا اور

اپنے تینوں بچوں کا پیٹ پالا اور ہر آن رویا کرتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ اب روپیہ برباد نہیں کروں گا۔

لیکن ایک روز لکھنو کے چوک کی اس قدر یاد آئی کہ انہوں نے اپنی تمام جائیداد اونے پونے مولی گاجر کی طرح بیچ ڈالی اور روپیہ ہاتھ آتے ہی گولڈن نائٹ منانے کے واسطے فوراً لکھنو چلے گئے اور جب پائی پائی خرچ ہوگئی تو منہ لٹکائے ہوئے ملیح آباد آ گئے تینوں بچوں کو گلے لگا لگا کر اس قدر روئے کہ پڑوسیوں کے مکان گونجنے لگے اور دل دہلنے لگے۔

جائیداد تو ختم ہوگئی تھی اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کھائیں گے کیا معلوم نہیں انہوں نے وہ مصیبت کا دور کیوں کر گزارا اور کھانا کیوں کر کھایا۔۔۔۔اس اثناء میں جب برکھارت آ گئی پانی رم جھم برسنے لگا کوئلیں کوکنے اور پپیے بولنے لگے تو ان کو انگڑائیوں پر انگڑائیاں آنے لگیں انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کئی لاکھ روپے کے محل کو جو باپ نے ان کو عطا فرمایا تھا اور جس کی صرف دو منزلہ ڈیوڑھی کی قیمت دس ہزار تھی صرف تین ہزار ریلیوں میں بیچ ڈالا اور روپیہ جیب میں آتے ہی بلا تاخیر گولڈن نائٹ منانے کے واسطے لکھنو روانہ ہو گئے کڑم دھم کڑم دھم

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے
قربان یک تبسم جاناں نہ کر دیا

☆☆☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

زاہد علی خاں

وہ بھی ہمارے ملیح آباد کے کاہ جسم، کوہ عزم، آہن کردار، آفتاب کوب، خوف نا آشنا، بات کے پکے، دھن کے پورے، ضد کے سچے، طبعاً شب نم خو، غضباً شعلہ مزاج، جھک کر ملو تو شاخ سایہ دار اکڑ و تو اپنی تلوار، بانکے ترچھے، ہٹیلے اور بڑے جیوٹ اور بےحد جھلاہٹ کے پٹھان تھے۔

انہیں اپنے بھائی غالب علی خان سے جو بقید حیات ہیں، بڑی محبت تھی، لیکن باپ کے مرنے کے بعد انہوں نے اپنے اس چہیتے بھائی کو جائیداد سے محروم کر کے اس کے شرعی و قانونی حصے پر قبضہ کر لیا تھا وہ بے ایمان اور بد نیت انسان نہیں تھے پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا، اس کی علت بھی سن لیجئے۔

باپ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نے ان سے کہلا بھیجا کہ بھائی صاحب جائیداد کا بٹوارہ کر کے میرا حصہ مجھے دے دیجئے یہ پیام سن کر وہ جامے سے باہر ہو گئے انہوں نے کہا میں تو باپ کے بعد اس کو اپنا بھائی نہیں بیٹا سمجھتا تھا اور ارادہ کر چکا تھا کہ اس کو آدھے سے زیادہ حصہ دوں گا لیکن اب چونکہ اس نے غیریت برت کر بٹوارے کا پیغام بھیج دیا ہے اس لئے جب تک میں زندہ رہوں گا بٹوارہ نہیں ہونے دوں گا غلبوا (غالب کی تصغیر) سے کہ وہ جو چاہے کر کے دیکھ لے میں اس کے حصے کے باغوں اور زمینوں پر عمر بھر قابض رہوں گا اب اس کی جائیداد ''جائے داد پدر'' نہیں ''جائیداد دگر'' ہو چکی ہے۔

غالب علی خان نے یہ جواب سن کر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا مقدمے میں کوئی پیچیدگی تو تھی ہی نہیں دو چار پیشیوں کے بعد فیصلہ ہو گیا۔ اور جس وقت جج نے یہ حکم سنایا کہ آدھی جائیداد غالب علی خان کے نام کر دی جائے تو انہوں نے کہا جج صاحب آپ کا یہ فیصلہ آپ کے کاغذات تک محدود رہے گا۔ اس سے جائیداد پر، ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑ سکے گا جج نے کہا خان صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں انہوں نے کہا میں یہ

کہہ رہا ہوں کہ جس دن آپ کی طرف سے جائیداد کا بٹوارہ ہو کر، خندقیں کھودیں جائیں گی اور حد بندی کے پتھر نصب کر دیئے جائیں گے اس کے دوسرے ہی دن زاہد علی خان تمام خندقوں کو بھروا کر اور حد بندی کے تمام پتھروں کو دور پھینک کر پھر پوری جائیداد پر قبضہ کر لیں گے اور آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

جج نے کہا خان صاحب آپ عدالت کی توہین کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا آپ کو معلوم ہے؟

انہوں نے انتہائی بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا مجھ کو سب معلوم ہے، لیکن اس سے کچھ ہوگا نہیں غلبوا کو جائیداد نہیں مل سکے گی قبضہ تو زندگی بھر زاہد علی خان ہی کا رہے گا۔

جج نہایت شریف آدمی اور پٹھانوں کا مزاج شناس و ہمدرد تھا اس نے کہا خاں صاحب آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔۔۔۔انہوں نے کہا یہ کام زنخوں کا ہے اور جب مجبور ہو کر، اس نے ان کو تین مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا تو انہوں نے کہا بہت اچھا منظور، لیکن اس میرے خدمت گار "چنوا" کو بھی جو میرے پیچھے کھڑا ہے تین مہینے کی سزا دے دیجئے ورنہ وہاں میرا حقہ کون بھرے گا جج کو ہنسی آ گئی اس نے کہا جو شخص جرم نہ کرے اس کیوں سزا دی جا سکتی ہے، انہوں نے یہ کہہ کر جج صاحب بھلا جرم میں دیر ہی کیا لگتی ہے خدمت گار کو حکم دیا ابے چنوا کھول دے پائجامہ اور کر دے پیشاب۔

چنوا نے فوراً دھل دھل پیشاب کر دیا اس کو بھی تین مہینے کی سزا ہو گئی اور وہ اس کو ساتھ لئے جیل چلے گئے صبح کو جب رول کال کے وقت جیلر نے آواز لگاری، زاہد علی حاضر ہے؟ تو انہوں نے کہا ابے گیدی خر، زاہد علی خان تشریف رکھتے ہیں کہہ کر پکار، ہم کوئی چوری چکاری کر کے تو جیل میں نہیں آئے ہیں، ہم کو تو یہاں انتظاماً بھیجا گیا ہے، جیلر کوئی بھلا آدمی تھا، ان کی پھٹکار سنی، اور پی گیا۔

جیل کاٹ کر جب باہر آئے سیدھے ملیح آباد پہنچے پہنچتے ہی بٹوارے کے تمام آثار

مٹا کر پھر پوری جائیداد پر قابض ہو گئے پھر مقدمہ چلا پھر سزا ہوئی پھر چنوا کو اسی طرح ساتھ لیا اور سزا کاٹ کر جب پھر آئے تو پھر بھائی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا اور جب تک وہ مر نہیں گئے بٹوارہ ہو ہی نہیں سکا۔

میرے نزدیک ''بالک ہٹ راج ہٹ'' اور ''تریا ہٹ'' میں اگر پٹھان ہٹ کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ اضافہ نہایت مناسب رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆



میر بارق لکھنوی

لکھنو کی وضع داری کے مکمل نمونے پچاسی برس کی عمر میں بھی خوبصورت چلتے پھرتے دو چار میل روز ٹہلتے، اوسط درجے کے شاعر، اعلیٰ درجے کے انسان، اور چنداں کہ خدا غسیت، ماحتاجیم کی حد تک نادار اور اس پر بھی صاحب کردار۔

ایک بار میرے باپ نے تخلیئے میں ان سے پوچھا میر صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ میرے پاس روز تشریف لاتے لیکن ایک بار بھی میرے ساتھ کھانا تناول نہیں فرماتے ہیں پہلے تو انہوں نے احترام افلاس کے باعث ٹالنے کی سعی کی لیکن جب میرے باپ نے اصرار کیا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر جواب دیا کہ خاں صاحب آپ کے دستر خوان پر آپ کے جو احباب دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں میرا معاملہ ان سے مختلف ہے میرے باپ نے کہا میں آپ کی بات نہیں سمجھتا تفصیل فرمایئے: انہوں نے کہا شرم کی بات ہے، میں کہنا نہیں چاہتا، میرے باپ نے اپنے سر کی قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے سر جھکا کر کہا خاں صاحب اصولی بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کے پاس دس بار کھانا کھاؤں تو مجھ پر لازم ہے کہ کم از کم ایک بار تو آپ کو بھی مدعو کروں، لیکن میں اس قدر مفلس ہوں کہ کھانا تو در کنار، آپ کو چائے بھی پلا نہیں سکتا، اس لئے کیا منہ لے کر، آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں؟

ان کی یہ بات سن کر میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہا میر صاحب آپ نے مجھ سے غیریت برت کر اب تک مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی، اس کے جواب میں انہوں نے ایک رباعی سنائی۔

آں کس کہ کباب می خورد، می گزرد
آں کس کہ شراب می خورد، می گزرد
سرمد کہ بکاسہ گدائی، ناں را
تر کردہ بآب می خورد، می گزرد

یہ سن کر میرے باپ نے میرے کان میں کہا جاؤ اپنی ماں سے پچیس اشرفیاں لے آؤ لیکن رومال میں لپیٹ کر لانا جب میں اشرفیاں لے آیا میرے باپ نے مجھ سے فرمایا باہر چلے جاؤ میں باہر جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا، میں نے دیکھا کہ میرے باپ کھڑے ہو گئے اور وہ اشرفیاں، رومال پر رکھ کر، اس طرح ان کے سامنے پیش کیں، جیسے کسی بادشاہ کو نذر دی جاتی ہے۔میرے باپ کی اس پیش کش کو دیکھ کر وہ تلملا کر کھڑے ہو گئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے خاں صاحب ہم سادات پر صدقہ حرام ہے، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ برادرانہ پیش کش کو صدقہ کا نام دیتے ہیں خون حسین کا واسطہ اس کو قبول فرما کر مجھ کو عزت بخشیے یہ سن کر وہ رونے لگے اور کہا خون حسین کی قسم میں اسے قبول نہیں کروں گا اور آپ نے اصرار کیا تو آپ کی خدمت میں آنا جانا ترک کر دوں گا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد وہ میرے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ خدمت گار مٹھائی کا تھال لئے آئے تھال احباب میں گردش کرنے لگے، اور جب ان کے سامنے تھال آیا تو چونکہ ان کی وضع میں یہ بات داخل تھی کہ وہ کسی کے وہاں کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے اس لئے انہوں نے خدمت گار کو دوسری طرف تھال لے جانے کا اشارہ کیا، میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ کو معلوم ہے کہ آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے، کیا آپ حضرت امام حسینؓ کی نذر سے بھی انکار فرما دیں گے۔

یہ سن کر انہوں نے برفی کی ایک ڈلی اٹھالی برفی ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھی کہ حامد علی خان بیرسٹر آ گئے اور خلاف وضع ان کے ہاتھ میں برفی کی ڈلی دیکھ کر انہوں نے مزاحیہ انداز میں پکار کر کہا میر بارق صاحب دیکھ لیا یہ سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور برفی کی ڈلی فوراً تھال میں رکھ دی یہ دیکھ کر حامد علی خان کے ہوش اڑ گئے، دوڑ کر، انہوں نے ان کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا میر صاحب یہ تو مزاح المومنین کے زمرے کی بات تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ آزردہ ہو جائیں گے، حضرت

www.pdfbooksfree.pk

عباس کی قسم معاف فرما دیجئے انہوں نے کہا بیرسٹر صاحب آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ آپ کی یہ آواز، کوٹھے سے گری تھالی کی مانند، سڑک تک پہنچ جائے گی، اور سننے والے یہ سوچنے لگیں گے کہ خدا جانے بارق کون ایسا فعل شنیع کر رہا تھا، کہ بیرسٹر صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بارق صاحب دیکھ لیا اب جب تک جھٹپٹا نہیں ہو جائے گا میں نیچے نہیں اتروں گا یہ تھی لکھنو والوں کی تہذیب اور یہ تھا ان کی عزت نفس کا معیار!!

☆☆☆☆☆☆☆☆



www.pdfbooksfree.pk

منشی واحد علی ابر قدوائی

نہایت وجیہہ اور نہایت کلے ٹھلے کے انسان تھے، چہرہ شاداب تھا، سر پر گنجان پٹے تھے، منہ پر گھنی داڑھی تھی، رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تھا، سرکار رام پور میں میر منشی تھے شان دار انگرکھا اور بانکی ٹوپی ان کی خاص دھج تھی۔

ایک بار جب میں رام پور گیا تو چونکہ وہ میرے باپ کے دوست تھے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا بڑی محبت سے پیش آئے کہا میں اس وقت ایک نہایت ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں لیکن میاں کل میرے ساتھ کھانا کھانا۔۔۔۔ دوسرے دن چھوٹے دادا کو لے کر وہاں پہنچا۔۔۔۔ انہوں نے شاہی کھانا کھلایا کھانے کے بعد وہ ہم کو دوسرے کمرے میں لے گئے وہاں یہ دیکھا کہ ہر کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز، اور ہر میز پر سوڈے کی دو دو بوتلیں، اور چورن کی ایک ایک شیشی رکھی ہوئی ہے اور سامنے تختوں کا چوکا لگا ہوا ہے۔۔۔۔

جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وہ تخت پر متمکن ہو کر، مختلف صندوقچوں سے غزلوں کے پرچے نکال نکال کر، تاروں میں لٹکانے لگے۔۔۔۔ ابھی ان کا وہ عمل جاری تھا کہ ان کے چھوٹے بھائی منشی احمد علی شوق ایک بڑی لمبی سی بیاض لئے آ گئے اور چھوٹے بھائی کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنا کلام سنانے لگے اور خدا جھوٹ نہ بلائے، ایک سانس میں ساٹھ ستر غزلیں سنا ڈالیں۔ وہ اور بھی سناتے مگر یہ دیکھ کر کہ چھوٹے بھائی کی غزلوں کے پرچے، چھ سات جھاڑوں کی مانند، تاروں میں لٹک چکے ہیں، اور ان کے ہونٹ فیر کرنے کے لئے بار بار کھل رہے ہیں، انہوں نے بادل نخواستہ اپنی بیاض بند کر دی۔ اور اس کے فوراً بعد ابر صاحب نے جسم کے تین تین جھٹکوں، اور آواز کے چار چار کھٹکوں کے ساتھ گرجنا، برسنا، شروع کر دیا اور ہماری داد کی آوازوں سے چھت گونجنے لگی۔

ہر غزل سنانے سے پیشتر وہ یہ کہتے تھے کہ جوش میاں، یہ دیکھئے میر کے رنگ میں

غزل کہی ہے اور یہ غالب، ناسخ، آتش، مومن اور مصحفی کے رنگ کی غزل ہے اور میں بار بار دل میں کہتا تھا کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو ہمیشہ دوسرے شعراء کے رنگ میں کہتے ہیں اور ان کا ذاتی رنگ ہے ہی نہیں۔

جب رات کے بارہ بج گئے تو چھوٹے دادا کی قوت برداشت نے جواب دے دیا وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں اب تو ہمارا دم نکلا جا رہا ہے، السلام علیکم یہ کہہ کر انہوں نے چک اٹھائی اور باہر نکل گئے۔۔۔۔ان کی اس حرکت سے مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا میں نے کہا ابر صاحب قبلہ چھوٹے دادا بڑے اجڈ پٹھان ہیں، معاف کیجئے کہ میں ان کو ساتھ لے کر یہاں آ گیا انہوں نے جھینپی مسکراہٹ سے کہا مجھ کو حیرت ہے پٹھانوں میں آپ اور آپ کے والد گرامی کیسے پیدا ہو گئے آپ اس کا خیال نہ کریں سوڈے کی بوتلیں اور چورن کھا لیں تا کہ غذا ہضم ہو جائے۔

اب مجھ کو معلوم ہوا کہ چونکہ ہم کو دیر تک جگانا تھا اس لئے سوڈا اور چورن رکھ دیا گیا تھا میں نے چورن کھا کر ابھی سوڈا پیا ہی تھا کہ انہوں نے پھر کلام سنانا شروع کر دیا۔

اب رات کے تین بج گئے، میرے اور حاضرین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں دادا کی آوازوں میں ضعف آ گیا اور ہمارے گلوں سے بقر عید کے تر ساں بکروں کی سی بھائیں بھائیں نکلنے لگی لیکن وہ غزلیں پڑھتے رہے آخر کار جب پو پھٹنے اور اذان کی آوازیں گونجنے لگیں تب انہوں نے ہمارے دادا سے چھلے ہوئے گلوں کی چرمر آوازوں اور شب بیداری کے روندے ہوئے چہروں کا اندازہ لگا کر ارشاد فرمایا شاید آپ لوگوں کو نیند آ رہی ہے اچھا خدا حافظ، لیکن یاد رکھئے کل بھی آپ یہیں کھانا کھائیں گے۔

ہم کھد بداتی کھوپڑیوں اور سنسناتے اعصاب کے ساتھ کمرے سے نکل کر جب

www.pdfbooksfree.pk

سواری کی طرف جانے لگے تو شوق صاحب نے کہا آپ سب حضرات میرے کمرے میں تشریف لے آئیں یہیں منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ فرمالیں پھر جا کر سو رہیں یہ دعوت سن کر ہماری پنڈلیاں کانپنے لگیں لیکن اودھ کی وضع داری ہمارے کان پکڑ کر، ہم کو ان کے کمرے میں لے کر چلی گئی وہاں پہنچ کر ہم نے حوائج ضروری سے فراغت کی اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا ناشتہ ختم کر کے ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ شوق صاحب نے اپنی بیاض کھول دی اور ہم کو غزلوں پر دھر لیا میرا عالم یہ ہو گیا کہ مجھے اس کا پتہ نہیں رہا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر، اور یہ قدوائی صاحب کلام سنا رہے ہیں یا اونٹ بول رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے یہ بات دل میں ٹھان لی کہ مر جاؤں گا لیکن ان دونوں بھائیوں کے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا اب دو دو واقعات اور سن لیجئے میں قاضی خورشید احمد، ابرار حسن خاں، رفیع احمد خاں، مانی اور رفانی کو لے کر علی گڑھ جوبلی میں شریک ہونے گیا ہوا تھا۔۔۔ایک روز ڈائننگ ہال میں ہم لوگ پہنچے تو یہ دیکھ کر دم نکل گیا کہ وہاں ابر صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں ہم نے چاہا الٹے پاؤں نکل جائیں اتنے میں انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہم سب نے انہیں سلام کی انہوں نے ہمیں گلے لگایا اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا مانی صاحب نے میرے کان میں کہا ہم لوگ بہت آہستہ آہستہ کھائیں گے وہ پہلے سے کھا رہے ہیں ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے پہلے اٹھ جائیں۔

ابر صاحب نے مجھے چکھی دینے کے واسطے کہا میاں جوش اب ہم بھی تمہاری طرح چڑیوں اور کھیتوں پر نظمیں کہنے لگے ہیں میں نے کہا کسی وقت حاضر ہو کر سنوں گا انہوں نے کہا ارے کسی وقت کی بات نہیں، اسی وقت آپ سب کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا میں نے کہا بہت اچھا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا ہم لوگوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لئے اتنے میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر ہمارے انتظار میں

پھاٹک پر جا کر کھڑے ہو گئے مانی نے کہا گھبرائیے نہیں ادھر اوٹ کے پیچھے ہاتھ دھونے چلئے تدبیر سمجھ میں آ گئی ہے۔

اوٹ کے پیچھے جا کر مانی نے چاکو سے قنات میں بڑا سا شگاف کر دیا اور ہم لوگ چوروں کی طرح اس شگاف سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بھاگے تو عین پھاٹک کے سامنے سے ابر نے ہم کو بھاگتے دیکھا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور چلا چلا کر انہوں نے کہا ارے میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں مہذب شعراء گیدڑوں کی طرح بھاگے چلے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ ارے ارے ارے۔

اب دوسرا واقعہ بھی ساعت فرمائیے۔۔۔۔۔ لکھنو کا ذکر ہے ایک بار ہم لوگ یعنی مولانا صفی، حضرت عزیز، نواب حسن صاحب بلیغ، منے مرزا صاحب شرر، محمد صاحب بہار، اور حکیم منے آغا صاحب فاضل ایک چھوٹے سے میدان کوٹ کر حامد علی خان بیرسٹر کی عیادت کو جا رہے تھے کہ دیکھا ابر صاحب گھوڑا گاڑی پر اسی طرف چلے آ رہے ہیں مولانا صفی نے ہم سب سے ارشاد فرمایا کہ اے مسیح کی بھیڑوں، اس املی کے تنے کے پیچھے دبک جاؤ، ورنہ یہ آنے والا بھیڑیا سب کو کھا جائے گا ہم سب تنے کی آڑ میں ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے ہو گئے اور جب ان کی سواری درخت سے قریب ہو کر گزرنے لگی اتنے آدمیوں کو ایک درخت کیا چھپا سکتا تھا انہوں نے ہمیں دیکھ لیا گاڑی رکوا دی ہماری طرف آنے لگی ہمارے منہ تہیا کے سے ہو گئے۔

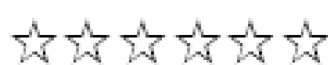
اور جب وہ قریب آ گئے تو ہم لوگ بڑے مداہنت آمیز تبسم کے ساتھ ان کے مقدم کے واسطے بڑے انہوں نے مسکرا کر پوچھا یہ املی کے نیچے کیا ہو رہا تھا؟ صفی صاحب نے کہا ذرا دم لینے کھڑے ہو گئے تھے اب یہاں سے حامد علی کی عیادت کے واسطے جائیں گے ابر صاحب نے کہا اس املی کی چھاؤں کے نیچے میری ایک تازہ غزل تو سن لیجئے یہ سنتے ہی ہم سب بدحواس ہو گئے اور انہوں نے غزل شروع کر دی اور ہم

www.pdfbooksfree.pk

واہ واہ سبحان اللہ پر مجبور ہو گئے لکھنو کا معاملہ تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھیڑ سی لگ گئی اور بھیڑ والے بھی داد دینے لگے اور جب انہوں نے تیسری غزل شروع کر دی اور مجمع سے ایک آواز آئی "ارے املی کے نیچے آم بک رہے ہیں" تو مولانا صفی نے کہا راستے میں کلام سنانا لکھنو کی تہذیب اور آپ کی شان کے خلاف ہے ہم سب در دولت پر حاضر ہو جائیں گے اور خوب جی بھر کر آپ کے کلام سے فیض یاب ہوں گے بدمزا ہو کر، جیب میں غزل رکھتے ہوئے ابر صاحب نے کہا تو پھر آپ تمام حضرات کل غریب خانے ہی پر افطار کریں اور خاصہ بھی تناول فرمائیں بات پکی ہو گئی نا؟ مولانا صفی نے کہا بالکل پکی بات اور ابر صاحب یہ کہہ کر دیکھئے میں آپ کو مولائے کائنات کی قسم دیتا ہوں کہ کل آپ حضرات ضرور تشریف لائیں رخصت ہو گئے۔

جب وہ ہم سے وعدہ لے کر چلے گئے تو صفی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب ہم کو حسب وعدہ ابر صاحب کے وہاں جانا اور اس ماہ رمضان میں سولی پر چڑھنا ہی ہے تو یہ کیجئے کہ کل چار سوا چار بجے آپ سب غریب خانے پر آ جایئے ابر صاحب میرے مکان کے قریب ہی گونگے نواب کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور ہم سب: عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے کی صورت سے ایک ٹولی بنا کر چلیں گے۔

دوسرے دن حسب قرارداد ہم سب مولانا صفی کے وہاں پہنچے انہوں نے کہا آیئے ہم سب آپس میں گلے مل لیں خدا جانے پھر کبھی ملاقات ہو گی بھی کہ نہیں اور جب ہم لوگ گلے مل چکے تو انہوں نے زنانے دروازے کی طرف منہ کر کے بڑے دردناک لہجہ میں کہا "بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا" اور جب اندر سے آواز آئی، ہے ہے، کیا بات ہے، ارے جلدی کہئے، یا مولیٰ مشکل کشا مدد تو مولانا صفی نے کہا "ہم سب منشی واحد علی صاحب ابر کا کلام سننے جا رہے ہیں ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔۔۔۔۔۔اور ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا۔۔۔"



حکیم دانش لکھنوی

جسمانی حیثیت سے بے حد کمزور، اور شعری نقطہ نظر سے بڑے تگڑے تھے پہلے ان کے دو شعر سن لیجئے۔

رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے
اک پرانا واقعہ ہے خانہ ویرانی مری

اپنی رفعت پر بہت عرش بریں کو ناز تھا
مل گئی، سنگ در جاناں کو پیشانی مری

مجھ کو آج تک ان کا آخری مشاعرہ یاد ہے اس مشاعرے سے کوئی ایک مہینہ پیشتر وہ نابینا ہو چکے تھے اور ان کے اس شعر پر

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو، نہ مے خانے کو
آخری دور ہے، بھر دے کوئی پیمانے کو

تمام حاضرین رونے لگے تھے اور مشاعرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا

وہ لکھنوی تہذیب کے مکمل اور آخری نمونے تھے ایک روز وہ حضرت عزیز کے وہاں بیٹھے تھے کہ ظریف صاحب آ گئے اور آتے آتے انہوں نے کہا میری جیب کٹ گئی، اور منی بیگ غائب ہو گیا۔

یہ سنتے ہی دانش صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہا جوتے پہنے، جریب اٹھائی اور اٹھ کر جانے لگے حضرت عزیز نے حیران ہو کر پوچھا حضت (حضرت) خیریت تو ہے انہوں نے کہا عزیز صاحب خیریت ہوتی تو یہاں سے جاتا کیوں عزیز صاحب اور تمام لوگ کھڑے ہو گئے اور پوچھا اللہ کچھ بتایئے کہ ماجرا کیا ہے؟

انہوں نے کہا عزیز صاحب، لکھنو کا سا شہر، اور پھر آپ کی محفل ادب اور وہاں

فحاشی ہونے لگی۔

ظریف نے کہا قبلہ وکعبہ یہ آپ فرما کیا رہے ہیں، انہوں نے ظریف صاحب کی طرف نظر اٹھا کر پوچھا آپ نے یہاں آتے ہی کیا ارشاد فرمایا تھا؟ ظریف نے کہا میں نے آ کر یہ سانحہ بیان کیا تھا کہ میری جیب کٹ گئی اور منی بیگ غائب ہو گیا، ۔ یہ سنتے ہی انہوں نے نعوذ باللہ، نعوذ باللہ عزیز صاحب اس نکتے کو پا گئے انہوں نے کہا حکیم صاحب انگریزی میں روپے کو ''منی'' کہتے ہیں، انہوں نے بات کاٹ کر کہا، حضت انگریزی سے ہمیں کیا غرض، ہماری زبان میں تو یہ لفظ فحش ہے لکھنو میں اور فحاشی، استغفر اللہ، استغفر اللہ، کہتے ہوئے صاحب سلامت لئے بغیرہ فوراً چلے گئے ظریف اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور حضرت عزیز ان کی طہارت زبان پر سر دھننے لگے۔

ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا صاحبزادے آپ کہاں رہتے ہیں میں نے کہا لاٹوش روڈ کی گلی میں انہوں نے لاٹوش روڈ سن کر منہ پیٹ لیا کہنے لگے میاں آپ کا سا شیریں مقال اور رہے ان ثقیل حروف کے اندر جہاں خیر سے ''ٹ'' بھی ہے ''ڑ'' بھی ہے اور ''ڈ'' بھی لاٹھونش روڈ جب تک آپ ان حروف ثقیل کے اندر رہیں گے میں آپ کے پاس ہرگز ہرگز نہیں آؤں گا لاٹھونش روڈ معاذ اللہ لاٹھونس روڈ توبہ توبہ استغفر اللہ!



نواب رستم علی خاں مہر

وہ میری ماں کے بڑے بھائی اور میرے ماموں 1 تھے جب میں نے چاہا کہ ان پر قلم اٹھاؤں، تو میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا آپ ان کے حالات شوق سے لکھیں مگر ان کا نام تحریر نہ کریں، صرف ایک نواب صاحب لکھیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ آپ کے ماموں تھے ورنہ دونوں کی بے عزتی ہو جائے گی۔

لیکن یہ سوچ کر میں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کہ ماموں کے عیب سے بھانجا متاثر نہیں ہو سکتا اور ماموں کا عیب تو ایک قطعی نفسیاتی بیماری کا نتیجہ تھا، اور نفسیاتی بیماری کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں نے ان کا نام اور اپنا رشتہ بیان کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

وہ ریاست ڈھول پور کے سب سے بڑے جاگیر دار تھے ان کی شادی نواب صاحب رامپور کے خاندان کی دلبری بیگم سے ہوئی تھی جو شادی کے کچھ روز کے بعد ماموں سے روٹھ کر رام پور چلی گئی تھیں اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئیں۔

ماموں جان شاعری میں میر نفیس اور درسیات میں مفتی میر محمد عباس کے شاگرد تھے رئیسوں کو بالعموم علم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، مگر وہ علم کے پرستاروں میں

---

1 میرے تین سوتیلے ماموں نواب محمد اکرم علی خان اور نواب محمد احسن علی خان تھے افسوس کہ ان سب کا انتقال ہو چکا ہے ان میں سے میرے بڑے ماموں اکرم علی خان کی شادی ایک ہر ہائی نس کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی وہ ممانی بھی اب دنیا سے سدھار چکی ہیں۔

سے تھے، فارسی، عربی، ہیئت، منطق، حکمت، موسیقی، تاریخ، تفسیر، احادیث، علم کلام، اسماء الرجال، طب اور کیمیا پر ان کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ بڑے بڑے علماء و صوفیاء ان سے فیض حاصل کیا کرتے تھے اسی کے دوش بدوش وہ اس قدر متقی بھی تھے کہ کبھی ان کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی، اور سحری کے بغیر ہمیشہ تیسوں

روزے رکھا کرتے تھے۔

ان کے سر پر پٹے اور منہ پر گھنی داڑھی تھے جسے کبھی ایک بار بھی نہیں منڈایا تھا۔

وہ سنی سے شیعہ ہو گئے تھے تعزیہ داری، مرثیہ گوئی اور عزاداری میں ان کو بیحد غلو تھا عمر کے آخری حصے میں وہ صوفی ہو گئے تھے اور ہندوستان بھر کے عرسوں میں بڑے خشوع وخلوص کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے لیکن علم کی اس جامعیت اور تقشّف کی اس شدت کے باوجود ان کو بیحد شوق تھا دروغ گفتاری کا آغاز تاریخ سے لے کر اس عالم کون وفساد میں جس قدر بھی دروغ گوانسان ہو چکے ہیں وہ ان سب سے قطعی طور پر مختلف تھے ان کی دروغ گوئی کسی مادی فائدے کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ مقصود بالذات تھی، یعنی دروغ ان کا ایک ایسا عجیب گھوڑا تھا جس پر وہ قطع مسافرت کے لئے نہیں بلکہ فقط جلب مسرت کے واسطے سوار ہوتے اور سود کے بجائے زیاں حاصل فرمایا کرتے تھے اور اسی جذبے کے تحت وہ ہر سال بجٹ بناتے اور اس میں مبلغ شش ہزار سالانہ ''برائے پرورش کذب'' کی بھی ایک مد ہوا کرتی تھی، اب میں آپ کو ان کے چند واقعے سناتا ہوں جس سے ''برائے پرورش کذب'' کی بات سمجھ میں آ جائے گی۔

ایک بار وہ ملیح آباد تشریف لائے میں نے اپنے ایک دوست مختار احمد خان کی پریشانی کا حال ان سے کہا۔ انہوں نے فرمایا مختار کو بلاؤ مختار آئے تو انہوں نے بگڑ کر کہا تو بیحد نالائق ہے تو نے آج تک مجھ سے اپنی پریشانی کا حال نہیں کہا تیرا باپ میرا دوست ہے میری زندگی میں اور تو مصیبت اٹھائے یہ ہو نہیں سکتا میں اجمیر شریف سے ہوتا ہوا دسمبر کی سترہویں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا تو اٹھارویں کو دھول پور آ جانا، میں تجھ کو آٹھ دن کے اندر مہاراجہ دھول پور کی سرکار میں نوکری دلا دوں گا، مختار نے ان کی اس بے حد شفقت سے متاثر ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا اور یہ وعدہ کر کے کہ میں اٹھارہویں کو دھول پور پہنچ جاؤں گا چلے گئے ان کے جاتے ہی انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مختار کو دوبارہ بلا بھیجو مختار سامنے آئے تو انہوں نے کہا پہلی نالائقی تو تو نے یہ کی کہ

www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے اپنا حال نہیں بتایا، اور تیری دوسری نالائقی یہ ہے کہ تو نے مجھ سے کرایہ طلب نہیں کیا یہ کہہ کر انہوں نے اپنے خادم خاص محمد کو آواز دی اور اس سے کہا میاں مختار کو دوسو روپے لادو ان کی اس بے کراں سرپرستی سے مختار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور جب مختار اٹھنے لگے تو انہوں نے بطور تاکید کہا دیکھ بیٹا سترہویں کو ضرور دھول پور پہنچ جانا یہ کہتے ہی انہوں نے اپنا منہ پیٹ لیا اور توبہ توبہ کر کے فرمایا، میں نے جلدی میں سترہویں کہہ دیا یہ بات منہ سے غلط نکل گئی اللہ اس غیر ارادی جھوٹ کو معاف فرمائے دیکھ سترہویں کو نہیں اٹھارہویں کو دھول پور پہنچ جانا سمجھ گیا؟ سترہویں کو نہیں اٹھارہویں[1] کو آجانا اور اس یقین کے ساتھ آنا کہ آٹھویں دن تو ضرور نوکر ہو جائے گا۔

مختار ٹھیک اٹھارویں دسمبر کو دھول پور پہنچ گئے کوٹھی کے ایک آراستہ کمرے میں ان کو ٹھہرا دیا گیا دو خدمت گار ان کے واسطے مختص کر دیئے گئے نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا اور ناشتہ آنے لگا اور ایک سواری مختص کر دی گئی ان کی سیر کے واسطے۔۔۔۔اب کیا تھا مختار رئیسانہ زندگی بسر کرنے لگے اور نواب صاحب نے اس بات کا مزہ لینا شروع کر دیا کہ مختار کو یقین ہے کہ میں اس کو آٹھ دن کے اندر ملازمت دلا دوں گا، حالانکہ میں اس کو نوکری دلاؤں گا ہی نہیں۔

جب مختار کو دھول پور آئے ہوئے آٹھواں دن ہو گیا تو وہ صبح ہوتے ہی تیار

---

[1] یہ شدت اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ یہ بات مختار کے دل میں تر ازو ہو جائے کہ وہ کس قدر شدت کے ساتھ راست گفتار آدمی ہیں

ہو کر بیٹھ گئے کہ آج نواب صاحب ضرور نوکری دلا دیں گے لیکن جب شام ہو گئی تو انہیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب آگرے تشریف لے گئے ہیں۔

اور جب اس متواتر شش و پنج میں چار مہینے گزر گئے تو مختار نے جی کڑا کر کے نواب صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا، نواب صاحب نے کہا کیا کروں استخارہ نہیں آ رہا

ہے، جس دن استخارہ آجائے گا اس دن تم نوکر ہو جاؤ گے، مختار نے کہا میں تو آپ کے سائے میں بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن میرے اہل و عیال ۔۔۔۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے چھاتی پیٹ لی، کہا مجھ سے بڑی چوک ہوگئی، یہ کہتے ہی محمد کو حکم دیا کہ جب تک میاں مختار کی نوکری نہیں لگتی دو سو روپے ماہانہ ان کی بیوی کے نام منی آرڈر کرتے رہو۔

مختار کے سر سے بڑا بار اتر گیا، اور نواب صاحب ہر رات کو تکیے پر سر رکھ کر اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ مختار کو اس کا یقین کامل ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو نوکر رکھا دوں گا، حالانکہ میں اس کو کبھی نوکر رکھاؤں گا ہی نہیں۔

الغرض آٹھ آٹھ دن کے وعدوں اور استخارے کی امیدوں پر انہوں نے کچھ اوپر دو برس تک مختار کو اپنے گھر مہمان رکھا اور ہر ماہ ان کے گھر منی آرڈر بھی جاتا رہا۔

اور آخر کار ان کو اس نیم کے نیچے لے جا کر جس کو آخری جھوٹ سینچا کرتا تھا[1] انہوں نے مختار کو ایک ہزار روپے دے کر کہا تم کچھ روز کے لئے اپنے بال بچوں سے مل آؤ، استخارہ آتے ہی میں تم کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دلا دوں گا۔

اور جب مختار چلے گئے تو وہ تکیہ پر سر رکھ کر اس بات کا مزا لینے لگے کہ مختار کو یقین ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجوں گا اور نوکری دلا دوں گا حالانکہ یہ ایک امر طے شدہ ہے کہ میں اس کو نوکری دلاؤں گا ہی نہیں صرف مختار ہی نہیں سینکڑوں آدمی اس طرح ان کے گھر مہمان رہے، اور بعض تو آٹھ

---

[1] ان کے بعد وہ نیم خشک ہو کر رہ گئی۔

آٹھ دن کے وعدوں پر آٹھ آٹھ برس تک امیدواری کر کے اور ایک ایک ہزار روپیہ لے کر رخصت ہو گئے اور وہ "حالاں کہ" کا مزہ لوٹتے رہے۔

ایک بار وہ ملیح آباد تشریف لائے اور شام کو لکھنو جاتے وقت یہ فرما گئے کہ کل رات کو پلٹ آؤں گا میرے لئے گوبھی پکوا رکھنا، میں ان کا مزاج شناس ہو چکا تھا، میں

www.pdfbooksfree.pk

نے گوبھی نہیں پکوائی اور اسٹیشن پر سواری بھی نہیں بھیجی میں سمجھ گیا کہ ماموں لکھنو میں لیٹے اس بات کا مزا لے رہے ہوں گے کہ بھانجے نے سواری بھیجی اور گوبھی پکوائی ہو گی ''حالانکہ'' میں ملیح آباد جاؤں گا ہی نہیں۔

ایک بار انہوں نے لوہے کی نو سلاخوں پر سونا چڑھوا دیا، اور ایک سلاخ ٹھوس سونے کی بنوائی ان سلاخوں کو لے کر وہ اپنے لکھنو کے ایک نواب دوست کے وہاں پہنچے اور فرمایا کہ میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں یہ سونے کی دس سلاخیں اپنے توشہ خانے میں رکھا لیجئے واپسی پر لے لوں گا لیکن اپنے سنار پر مجھے اعتبار نہیں ہے اس لئے کسی معتبر سنار کے پاس بھیج کر جنچوا لیجئے کہ ان میں کھوٹ تو نہیں ہے اور جب لکھنوی دوست اس پر آمادہ ہو گئے تو انہوں نے سونے کی ٹھوس سلاخ ان کے آدمی کے حوالے کر دی اور سنار نے جانچ کر تصدیق کر دی کہ وہ خالص ٹھوس سونے کی ہے۔

اور جب تین ماہ کے بعد وہ کربلا سے پلٹے اور ان دوست سے ملنے گئے تو انہوں نے توشہ خانے سے وہ سلاخیں منگائیں اور کہا نواب صاحب چونکہ آپ نے جنچوا کر یہ سلاخیں رکھی تھیں، مجھے اپنے ملازموں پر اعتبار نہیں اس لئے ایک سلاخ دے دیجئے تا کہ میں اس کو سنار کے وہاں بھیج کر جنچوا لوں نواب صاحب نے لوہے کی پاش شدہ سلاخ ان کے حوالے کر دی اور جب سنار نے یہ کہلا بھیجا کہ یہ لوہے کی سلاخ ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے تو ان کے لکھنوی دوست کے ماتھے سے عرق انفعال ٹپکنے لگا، اور وہ اس بات کا مزا لوٹنے لگے کہ نواب صاحب سمجھ رہے ہیں کہ میں کربلا گیا تھا ''حالانکہ'' میں کربلا گیا ہی نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دوست کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ان کینوکروں نے میری دس ٹھوس سونے کی سلاخیں اڑا کر ان کی جگہ لوہے کی سلاخوں پر سونا پھروا کر رکھ دیا ہے'' حالانکہ ایک کے علاوہ کوئی سلاخ سونے کی تھی ہی نہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

لکھنو کا ذکر ہے ایک بار میں سید نجم الحسن صاحب قبلہ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک منی آرڈر آیا پانچ سو روپے کا روپے گن کر قبلہ و کعبہ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ منی آرڈر آپ کے ماموں صاحب نے بھیجا ہے کوئی پندرہ روز ہوئے کہ وہ لکھنو تشریف لائے تھے اور مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کی جیب کٹ گئی ہے میں ان کو دوسو روپے بطور قرض دے دوں چنانچہ یہ منی آرڈر اسی سلسلہ میں آیا ہے لیکن دوسو روپے کے عوض انہوں نے پانچ سو بھیج دیئے ہیں میں یہ روپیہ واپس کر دوں گا میں نے کہا آج رات کو میں دھول پور جا رہا ہوں، انہوں نے ماموں کے نام خط لکھ کر وہ تین سو روپے میرے حوالے کر دیئے۔۔۔۔ میں دھول پور پہنچا ماموں جان نانا کے پاس بیٹھے تھے میں نے قبلہ و کعبہ کا خط اور یہ کہہ کر وہ تین سو روپے ان کے حوالے کر دیئے کہ آپ نے قبلہ و کعبہ صرف دوسو قرض لئے تھے لیکن پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا اس لئے انہوں نے یہ زائد رقم واپس کر دی ہے نانا جان نے جھڑک کر کہا، کیوں رستم علی تو قرض مانگتا اور مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے انہوں نے کہا میری جیب کٹ گئی تھی اس لئے قرض مانگنا پڑا لیکن میں نے دوسو نہیں ایک سو ننانوے قرض لئے تھے اور یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں اس بات کا مزا لینے لگے کہ حالانکہ میری جیب نہیں کٹی تھی مگر میں نے قبلہ و کعبہ اور والد گرامی دونوں کو جیب کٹنے کا یقین دلایا اور حالانکہ میں نے پورے دوسو لئے تھے مگر بقدر یک روپیہ دھوکہ دیکر ایک سو ننانوے کا یقین دلا دیا۔

ایک بار عرس میں شریک ہونے کے واسطے وہ اجمیر شریف لے گئے وہاں ایک جوان اور گدبدی طوائف حشمت جہاں سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی اور اپنے چشم وابرو سے انہوں نے حشمت جہاں کو یقین دلایا کہ میں تجھ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور انہیں اپنا عاشق صادق سمجھ کر جب وہ معشوقہ ادائیں دکھانے لگی تو وہ اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ یہ بیوقوف مجھ کو اپنا عاشق سمجھ رہی ہے حالانکہ میں اس کا عاشق ہوں ہی نہیں اور پھر اس حالانکہ کا مزید لطف اٹھانے کے لئے انہوں نے اس سے فرضی نکاح

بھی کرلیا اور اس کو اس کے بیٹے بھانجی بھانجے سمیت لے کر ڈھول پور لے آئے اس کو اپنے گھر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا لیکن چونکہ وہ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند تھے انہوں نے اسے کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔

وہ طوائف تادم مرگ کوئی پچیس تیس برس تک ان کے گھر بھر پر مسلط اور ان کے مال و متاع پر قابض رہی اور وہ اس پچیس تیس برس کی طویل مدت تک اس کا مزا لیتے رہے کہ اس طوائف کا بیٹا مجھ کو ابا جان کہہ رہا ہے اور وہ طوائف مجھ کو اپنا شوہر سمجھ رہی ہے حالانکہ میں اس کے لڑکے کا ابا جان ہوں نہ اس طوائف کا شوہر۔

کیا یہ کرہ ارض، اور یہ عالم کون و فساد اپنی تمام حیرت ناکیوں کے باوجود اس نوعیت کے کذب کی کوئی نظیر پیش کرسکتا ہے؟ اور کیا تمام نوع انسانی میں سے ایک فرد بھی آج تک ایسا گزرا ہے جس نے علم و فضل اور تقشّف و طہارت کے باوجود، دروغ بافی سے اس قدر لطف اٹھایا ہے؟ شوم غدائے دروغے کہ راست مانند است!



چھدو خاں

ملیح آباد کے بڑے زمینداروں میں سے تھے، زندگی بھر ریل میں نہیں بیٹھے، جب کبھی مقدمات کی پیروی کے لئے لکھنو یا اپنے موضع کی تحصیل وصول کے واسطے شاہجہاں پور جاتے تو ادھے [1] پر سفر کیا کرتے تھے، آگے آگے ان کا ادھا ہوتا تھا، اس کے پیچھے تین ادھے اور ہوتے تھے، جن پر کھانے کا سامان، بکرے، اور سپاہی لدے ہوا کرتے تھے۔۔۔۔ لاکھ لاکھ لوگوں نے سمجھایا کہ ریل پر سفر کیا کیجئے مگر انہوں نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی اور ہمیشہ یہ کہا کہ خاں صاحب! جو سواری ہمارے اشاروں پر نہیں چل سکتی اس پر بیٹھنا بیکار ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جو شخص ان کے غصے، جھڑکی یا گالی کا فوراً جواب نہیں دیتا تھا اس کو وہ پٹھانوں کے زمرے سے خارج کر کے اس سے قطع تعلق کرلیا کرتے تھے۔

اور تیسری خصوصیت یہ تھی کہ جو ملازم ان کے پکارتے ہی دو سیکنڈ کے اندر اندر حاضر نہ ہو جائے وہ اسے چھڑا دیا کرتے تھے اور اسی بناء پر ''نادر شاہی'' حکم کی طرح ''چھدو خانی'' حکم دور دور تک مشہور تھا۔

---

[1] چھوٹی بیل گاڑی

ان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ جب کوئی پٹھان ان کے پاس، نوکری کیلئے آتا تھا وہ مسکرا کر اس سے پوچھتے تھے کہ آپ خدمت گاروں کے زمرے میں آسکیں گے؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ ہم پٹھان ہیں، خدمت گاری سے تو ہمارے باپ دادا بھی نہیں واقف تو وہ خوش ہو جاتے اس کے متعلقین کے باب میں دریافت کرتے کہ وہ سب کس قدر ہیں اور جب معلوم ہو جاتا تو اس کے بال بچوں کی تعداد پر نگاہ کر کے وہ اس کو اسی قدر تنخواہ مقرر کر دیا کرتے اور چونکہ ''خشک [1]'' تنخواہ کے وہ قائل نہیں تھے اس لئے وہ پوچھتے تھے کہ خاں صاحب آپ کتنی روٹیاں، کتنی دال اور کس قدر گوشت کھائیں گے اور کتنا دودھ پئیں گے؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ میں آٹھ روٹیاں اور

پاؤ بھر گوشت کھاؤں گا، اور آدھ سیر دودھ میں میرا کام چل جائے گا تو وہ اپنے منشی قمر الدین خاں کو حکم دیا کرتے تھے ''قمری دارو'' یعنی اے قمر الدین خاں اس کا نام فہرست ملازمان میں درج کر لو مع خوراک۔

ایک بار ان کی بیوی نے کہا کہ جس سپاہی کی روزانہ آٹھ روٹیاں مقرر کی گئی تھیں، اس کے دستر خوان سے آج ایک روٹی بچ کر آ گئی ہے۔۔۔۔۔وہ یہ سن کر باہر آئے اس سپاہی کو بلایا اور کہا خاں صاحب آج آپ نے ایک روٹی کم کھائی ہے یہ بات ہمارے آپ کے معاہدے کے خلاف ہے سپاہی نے کہا حضور آج میری طبیعت خراب تھی انہوں نے کہا نہیں کھا سکتے تھے تو اپنی بچی روٹی گھر لے جاتے یہ کہہ کر انہوں نے اپنے منشی قمر الدین خاں کو پکارا اور ان سے کہا ''قمری، یہ خاں صاحب نہ دارو'' (یعنی برخواست کر دیے گئے) سپاہی نے بڑی لجاجت سے کہا حضور مجھے ''نہ دارو'' نہ کریں انہوں نے کہا خاں صاحب آپ نے معاہدہ توڑ ڈالا آپ پورے ایک ماہ تک ''نہ دارو'' رہیں گے ایک ماہ بعد پھر ''دارو'' ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ انہوں نے خدمت گار کو پکارا خدمت گار دو تین منٹ کے بعد آیا انہوں نے پوچھا دیر کیوں کی اس نے کہا پانی بھر رہا تھا، انہوں نے کہا میرے پکارتے ہی تم پر یہ بات لازم ہو گئی تھی کہ رسی کو فوراً ہاتھ سے چھوڑ کر دوڑ پڑتے۔ اتنا کہہ کر انہوں نے حکم دیا قمری یہ خدمت گار نہ دارو

---

1 تنخواہ بے خوراک 2 وہ دارو اور نہ دارو کے الف کو پورا کھینچ کر زبان چڑاتے تھے ''دارو'' اور ''نہ دارو''

وہ سال میں تین مرتبہ غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے ایک بار انہوں نے تمسخر کے طور پر کسی غریب آدمی سے پوچھا کبھی ایسا کھانا تمہارے باپ نے بھی کھایا تھا؟ اس نے کہا۔۔۔میرا باپ جو کھانا کھاتا تھا وہ آپ کے باپ نے بھی نہیں کھایا ہو گا، انہوں نے پوچھا تمہارے باپ کیا کھاتے تھے؟ اس نے کہا جوار کی سوکھی روٹی اور چٹنی وہ ہنس پڑے

اور کہا تم سچ کہتے ہو اگر تم مجھ کو پلٹ کر جواب نہ دے دیتے، میں تم کو ابھی ابھی نکلوا دیتا۔

ایک مرتبہ ان کے ایک خدمت گار نے آ کر ان سے کہا کہ حضور آپ کے رحیم الدین خاں سپاہی آج یہ کہہ رہے تھے کہ چھدو خاں کی نادرشاہی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، اب کی تنخواہ مل جائے تو میں ان کی نوکری چھوڑ دوں گا، اور نہ چھوڑوں تو میرے نطفے میں فرق ہے۔۔۔۔ یہ سن کر انہوں نے رحیم الدین خاں کو بلایا اور کہا خاں صاحب! آپ کی مستعدی سے ہم بہت خوش ہیں آج سے آپ کی تنخواہ دگنی کر دی ہے مزے سے رہئے اور پکار کر کہا ''قمری یہ خاں صاحب آج سے دگنے دارو'' سپاہی خوش ہو گیا اور بے حد جی لگا کر کام کرنے لگا اور جب وہ ایک مہینہ کام کر چکا انہوں نے اسے بلا کر دونی تنخواہ دے دی اور قمر الدین خاں سے کہا ''قمری رحیم الدین خاں آج سے نہ دارو'' رحیم الدین خاں نے پوچھا حضور میری کیا خطا ہے تو انہوں نے کہا آپ نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ اب چھدو خاں کی نوکری کروں تو میرے نطفے میں فرق ہے لیکن جب میں نے تنخواہ دونی کر دی تو آپ نے لالچ میں آ کر اپنے پر گالی چڑھالی، بس اب آپ جائیں ''قمری'' نطفے کا فرق ''نہ دارو''

ایک بار ان کے سپاہی نے شکایت کی کہ حضور پرسوں سے میرا دودھ نہیں آ رہا ہے، وہ غصے میں بھرے گھر پہنچے اور اپنی بیوی سے گرجتی آواز میں کہا اشرف 1 کی ماں تم نے حیدر خاں کا دودھ بند کر دیا ہے؟ ان کی بیوی نے کہا کیا کروں، تین بھینسوں نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے، صرف ایک بھینس دودھ دے رہی ہے اس کا دودھ کثرت کے بعد اشرف پی لیتا ہے انہوں نے کہا اشرف خاں دودھ پئیں اور دارو کو دودھ نہ ملے، اچھا ابھی چھٹی کا دودھ یاد دلائے دیتا ہوں باہر آ کر انہوں نے للکار کر کہا قمری چاروں بھینس نہ دارو قمر الدین خاں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے انہوں نے کہا میرا منہ کیوں تک رہے ہو قمر الدین خاں نے کہا بھینسوں کا نہ دارو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے انہوں نے کہا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوراً قصائیوں کو بلاؤ اور چاروں بھینسوں کو

ذبح کرا ڈالو قمر الدین خاں ان کے بڑے پرانے خیر خواہ تھے انہوں نے کہا بھینسوں کو کس خطا میں ذبح کر ڈالا جائے گا انہوں نے کہا اشرف کی ماں نے ہمارے دارو کا دودھ نہ دارو کر دیا ہے اس لئے ساری حرام زادی بھینسیں نہ دارو قمر الدین خاں لاکھ لاکھ چیختے رہے مگر انہوں نے چاروں بھینسیں ذبح کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں کھڑے کھڑے تقسیم کرا دیا۔

ایک دن وہ اپنے باغ میں بیٹھے قمر الدین خاں سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے بیٹے اشرف خاں نے آ کر سلام کیا انہوں نے پوچھا لکھنو ہو آئے بیٹے نے کہا جی ہاں ابھی ابھی لکھنو سے آیا ہوں اور آپ کو سلام کر کے گھر جاؤں گا اتنے میں ان کی نظر بیٹے کی جوتی پر پڑ گئی جامے سے باہر ہو کر پوچھا اس جوتے کا نام کیا ہے بیٹے نے کہا ابا وا اس کا نام ہے ''ڈاسن'' انہوں نے کہا پٹھان کا پوت اور یہ زنخی جوتی، اس جوتی کی ماں کی۔۔۔۔۔قمری نکال چاکو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دے اس چھنال جوتی کے یہ ڈاسن کی جوتی اشرف کی چھٹو لی کو ڈس لے گی اور جوتی کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر جب اشرف خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو انہوں نے کہا اے زنخے جورو کے۔۔۔۔دور ہو جا میری نظروں سے اور جب اشرف خان سر جھکا کر اندر چلے گئے تو انہوں نے کہا'' قمری اشرف نہ دارو'' قمر الدین اچھل پڑے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پوچھا خاں صاحب بہادر بیٹا اور ''نہ دارو'' یہ ہو کیونکر سکتا ہے، انہوں نے کہا وہ نہ دارو ہو سکتا ہے عاق ہو جانے کے بعد،قمر الدین نے کہا اتنی ذرا سی بات پر انہوں نے کہا یہ ذرا سی بات ہے؟ میں نے اسے گالی دی اس نے پلٹ کر جواب نہیں دیا قمر الدین خاں ان کی ضد سے واقف تھے دوڑے ڈیوڑھی پر گئے اور لونڈی سے کہا بڑا غضب ہو گیا خاں صاحب بہادر اشرف خان کو عاق کر دینے پر تل گئے ہیں جلدی بی بی کے پاس جا کر وہ انہیں گھر بلا کر سمجھا دیں۔۔۔۔۔گھر میں کہرام مچ گیا لونڈی نے ڈیوڑھی سے پکار کر کہا میاں آپ کو بیوی بلا رہی ہیں وہ اندر گئے تو بیوی نے سر پیٹ کر کہا ہے ہے یہ

www.pdfbooksfree.pk

کیا اندھیر ہے ایک نگوڑی جوتی پر بچے کو عاق کیئے دے رہو انہوں نے کہا یہ نگوڑی جوتی کی بات نہیں میں نے اس کو گالی دی وہ پی گیا پلٹ کر مجھ کو گالی نہیں دی اگر وہ اصلی پٹھان ہوتا تو فوراً مجھے بھی گالی دیتا۔۔۔ان کی بیوی نے کہا ارے یہ تو سوچو، بیٹا باپ کو گالی کیسے دے سکتا ہے انہوں نے کہا یہی تو تمہاری بھول ہے پٹھان، باپ تو باپ، اللہ کی گالی کو بھی برداشت نہیں کرسکتا اشرف سے کہو مجھے پلٹ کر گالی دے نہیں تو ان کی بیوی نے منہ پیٹ کر بیٹے سے کہا ارے تو بھی گالی دے دے جب بیٹے نے پس وپیش کیا تو انہوں نے کہا دیکھ ایک دو تین کہتا ہوں اگر تین پر گالی نہیں دے گا تو اپنی سات پشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کھڑے کھڑے عاق کر دوں گا یہ کہہ کر انگلی اٹھائی اور کہا ایک بیٹا چپ رہا پھر انہوں نے کہا دو ان کی بیوی نے بیٹے کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا دے دے گالی، نہیں تو دودھ نہیں بخشوں گی اور جب انہوں نے بڑے عزم کے ساتھ انگلیا ور سر اٹھا کر کہا تین تو اشرف نے کہا" ابے زنخے جورو کے۔۔۔۔۔۔" تو انہوں نے دوڑ کر بیٹے کو گلے لگالیا منہ چوما اور پیٹ ٹھونک کر کہا تو پٹھان، تیرا باپ پٹھان، تیرا دادا پٹھان۔۔۔۔اور گھر سے نکل کر بڑی گرجتی آواز میں کہا" قمری اشرف دارو"

---

1. بیٹے کا نام

گویند، ذکر خیرش، در خیل عشق بازاں

ہر جا کہ نام حافظ، در انجمن در آید!

دردا۔۔۔ کہ راز پنہاں، خواہد شد آشکارا!

طالع شہرت رسوائی مجنوں، بیش است

ورنہ، طشت مسن داؤ۔۔۔ ہر دو زیک بام افتاد!

درد عشقے، کشیدہ ام۔۔۔ کہ مپرس

زہرے ہجرے چشیدہ ام۔۔۔۔۔ کہ مپرس

میرے معاشقے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں رند ازلی بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا اور میرے باپ نے مجھ کو اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے۔

اور اسی بناء پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہوگئی تھی۔۔۔۔۔اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہوگیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو دل دھڑ کنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں اور۔۔۔

گوری۔۔۔۔ دھیرے چلو، گگریا چھلک نہ جاوے

کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا

میرے انتہائی شرمیلے پن کے سینکڑوں واقعات میں سے فقط ایک واقعہ سن لیجئے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں نام خدا کس حد تک شرمیلا تھا۔

لکھنو کا ذکر ہے، میرے باپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے کہ ایک روز شام کے وقت میرے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک رنگین مزاج تماش بین قسم کے سپاہی سجان علی خاں، عرف سجن نے مجھ سے کہا منجھلے بھیا چلئے آج آپ کو چوک گھما لائیں۔

میں ان کے ساتھ ہولیا اور وہ مجھ کو لئے ہوئے ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ گئے۔۔۔۔۔۔طوائف پر نظر پڑتے ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا وہ بلا کی حسین تھی میں قیامت کا شرمیلا اس کی جوانی بھرپور، میں شرم سے چکنا چور۔۔۔۔میرے اندر چھپے ہوئے شاعر نے کہا اس کے مکھڑے سے نظریں نہ ہٹاؤ اور میری تربیت نے حکم دیا کہ آنکھیں نہ ملاؤ۔۔۔تربیت کا حکم غالب آیا، اور میں ہڑبڑا کر فرش پر بیٹھ گیا میری لمبی لمبی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور فراوانی شرم سے اس کے کمرے کے قالین کے ریشے نوچنے لگا۔

طوائفوں کے مجرے تو بارہا دیکھ چکا تھا لیکن طوائف کا حجرہ ابھی تک نہیں دیکھا تھا اس لئے بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی۔

طوائف تو چنچل چلبلے، چٹاخ پٹاخ تماش بینوں کی خوگر تھی مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگی جس طرح کوئی سلوتر گھوڑے کو آنکتا ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ مجھے گھورتی رہی لیکن جب میں ٹس سے مس ہی نہیں ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا اور اپنا ماتھا او پر چڑھا کر اس نے کہا اے ہے صاحبزادے میرا تو نگوڑا جی او بھا جا رہا ہے، اے اللہ کچھ تو منہ سے بولئے سر سے کھیلئے۔

اس کے اس کہنے سے میں اور بھی شرما گیا اور میری قالین کے ریشے نوچنے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی۔

سجن نے کہا ''منجھلے بھیا: میں نے ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے انہیں روک دیا اب وہ طوائف میرے قریب آ گئی میری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا ہے ہے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ کر آئے ہیں آپ ارے للہ کچھ تو بولئے میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے۔۔۔'' اس کی اس التجا سے مجبور ہو کر آپ جانتے ہیں میں نے کیا جواب دیا؟ نہیں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے سنئے مجھ سے۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا، اور شیشے کی طرح درکتی آواز میں۔۔۔۔۔۔ رک رک کر اس سے کہا کہ ایک مہینے کے بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے اللہ سے دعا کیجئے کہ میں پاس ہو جاؤں۔

میری یہ التماس سن کر طوائف ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئی اور سجن بھی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔۔۔۔۔ میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔

طوائف نے ہنسی کے دورے سے نجات پائی تو میری طرف بڑی شوخی سے نگاہ اٹھائی اور کہا صاحبزادے یہ طوائف کا کوٹھا ہے خواجہ غریب نواز کی درگاہ نہیں۔۔۔۔۔ اور میرے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

جس طرح ایک چاول کو دیکھ کر پوری دیگ کا پتا چلا لیا جاتا ہے، اسی طرح ۔۔۔۔ مندرجہ بالا ایک واقعے سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ میری اٹھان کیسی تھی۔

جی ہاں، میرے باپ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مجھ کو وہ بنا دینے میں جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں ''جوان صالح'' اور اہل نظر کی زبان میں ''مخنث'' کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے میرے باپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی حکمت وغیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں ۔۔۔۔ مطرب کو چھوڑ کر موذن سے دل لگاؤں مکھڑوں کے تلوں سے نظر پھیر کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں، صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کا استنجوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرہ نسب ملاؤں شراب کے پیانوں میں تیرنے کے بدلے وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں اور کالی زلفوں کی گھنیری چھاؤں سے بھاگ کر سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں کس قدر صادق آتا ہے یہ شعر مجھ پر

کوئی کمی نہ کی تھی، دل بے قرار نے
مجھ کو بچا لیا، مرے پروردگار نے

اب سنئے میر گلشن کیوں کر دور ہوئی اور قوت و حیات کی بے پایاں شفقت نے اندک اندک عشق درکار آورد بیگانہ را کے طور پر مجھے کس حکیمانہ توقف و تدریج کے ساتھ فردوس ادب کی جانب موڑا۔

سب سے پہلے میرے ذوق جمال کو مرتب و مہذب بنانے کی نیت سے اس نے افق کا گریبان پھاڑ کر نازل کر دیا مجھ پر طلوع صبح کا قرآن ۔۔۔۔ اب کیا تھا مشرق کی زریں دھاریوں سے اترنے لگے تیرے ذہن پر آیات ۔۔۔۔ پھولوں کے امواج رنگ و بو سے اڑنے لگے میرے سر پر جبریل ۔۔۔۔۔ مرغان سحر کے

چپچھوں سے گونجنے لگے میری محراب وجود میں نغمات داؤد۔۔۔۔اور آنے لگی ہر طرف سے یہ آواز کہ

ادب سے دیکھ چمن میں بہار پھولوں کی
جھلک رہی ہیں پیشانیاں رسولوں کی

اسی کے دوش بدوش اس نے سیپیوں، قمقموں جھاڑ کے قلموں حریر و پرنیاں کے تھانوں، انگیٹھیوں کے انگاروں، چاندی کی ریز گاریوں، سونے کی اشرفیوں اور تتلیوں کے پروں کی دھاریوں پر جما دیں میری نگاہیں۔

پھر وہ لے آئی میرے سامنے چاندنی راتیں دمکتے ستارے، جھلکتے چاند بھری برساتیں، کالی گھٹائیں کوکو پی ہو کی صدائیں اور رم جھم رم جھم کی بھیگی ہوائیں۔

جب خیر سے بھیگ گئیں میری مسیں تو اس معلّمہ نے موڑ دیئے میری جانب کاکل و رخسار کے گنگا جمنی دھارے۔۔۔۔۔گڑ کا دی میرے سر پر نوخواستہ جوانیوں کی زریں کمانیں۔۔۔۔اور چلانے لگی میرے دل پر شام اودھ اور صبح بنارس میں ڈھلے ہوئے نکیلے مکھڑوں کے بان

اور پھر

حسن جنید زخواب و مژہ برہم زد
فتنہ برپا شدو نشتر برگ آدم زد

کے بعد میری عملی تربیت کا آغاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک پٹاخا سی کم سن اور بلور اندام طوائف مجرے کے لئے آئی اس کے گالوں کی جلد بنارسی ساری کے مانند باریک تھی ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈا کوارا ہے اور اس کے شلوکے میں ہلکا سا جھول پڑنا شروع ہو گیا تھا معاذ اللہ!

جب اس کی نشیلی انکھڑیوں میں کھلا نرت کا باب، میرے اتارو جود پر مچلنے لگی

مضراب۔۔۔۔اور جب ناچتے ناچتے وہ بالکل میرے قریب آئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی شربتی پیش واز کا ملائم سرا میرے ہاتھ کی پشت سے مس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں شیرینی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔۔۔اٹھنے لگی ایک بھاپ سی میرے مسامات سے، ہوا سنکنے اور پوسی پھلنے لگی میرے جسم کے اندر۔

اک دامن حریر کے لمس خفیف سے

لو دے اٹھا ہے خون رگ جاں کبھی کبھی

یہ تھا میرا پہلا آپریشن جو برگ یاسمین کی دھار سے کیا گیا تھا اب سنئے دوسرا واقعہ۔۔۔۔لڑکپن سے لے کر جوانی تک مجھ پر دردِ سر کا دورہ پڑا کرتا تھا، ایک دن جب دردِ سر کا دورہ پڑا تو رجیا میرا سر دبانے لگی وہ کھڑی بیل کی سرو قامت، شہابی رنگ والی چودہ برس کی رجیا ہمارے گھر کے چوکیدار بدلو گدی کی بیٹی تھی۔

سر دبانے میں وہ بار بار جو میرے منہ کی طرف جھکی تو اس کی سانوں کی کچی خوشبو میرے دل میں چبھنے لگی اور اس کی ملائم ملائم ہتھیلیوں کی میٹھی گرمی ایک ایسے جزیرے میں لے گئی مجھ کو جہاں کچے اناروں پر بھونرے منڈلا رہے تھے۔۔۔۔اور سینکڑوں قوسِ قزح کی سی بانہیں میری گردن میں پڑی چلی جا رہی تھیں اور اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد، میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا میری پور پور میں۔۔۔۔۔میں نے رجیا کی طرف نظر اٹھائی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ابھی اس کی آنکھوں کے ڈوروں کی زبان کھلی ہی تھی کہ میری ماں کی مغلانی عباسی خانم آ گئیں اور وہ طلسم پل بھر میں ٹوٹ کر رہ گیا جناب والا یہ طلوع صبح کی جگمگاہٹوں سے لے کر رجیا کی ہتھیلیوں کی گرماہٹوں کے تمام واقعات تو ایسے تھے جیسے ڈھیلے ہاتھوں کی مار۔۔۔۔اب سنئے گھن کا ماجرا۔

ایک دن، جب گلابی جاڑے کی نویلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر، حسب دستور محو خواب، اور میں حسب عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کی ہری

بھری نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب کی کوٹھری میں رہنے والی جونٹی لونڈی ظہورن، میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مجھے گھورنے لگی اور جب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک نا قابل فہم رنگین سی ملگجاہٹ ہے۔۔۔۔اس کے ہونٹوں کے ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضٰی ہے اور اس کا ٹھڈی تک ابھرا سینہ، گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے۔۔۔۔تو میں نے پوچھا ''ظہورن کیا بات ہے'' اس نے کہا ''اے جرنیلی ٹوپی کے منجھلے بھیا میری کوٹھری میں ذری چلے چلو تو بات بتاؤں۔۔۔۔میری کوٹھری بڑی گرم گرم 1 ہے۔''

مروت کے مارے انکار نہیں کر سکا وہ آگے آگے چلی اور میں اس کی گرم گرم سانسوں میں لپٹا ہوا کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری میں قدم رکھتے ہی کڑوے تیل کی خوشبو سے میری سانس بوجھل ہو گئی چراغ کی با مروت روشنی نے میرے کان میں ایک ایسی بات کہی جسے میں سمجھ نہیں سکا۔

ظہورن نے بڑے چاؤ اور بلا کے سبھاؤ کے ساتھ کہا منجھلے بھیا ذری لیٹ جاؤ، میں تمہارے پاؤں داب دوں۔۔۔۔میں بڑی معصومیت کے ساتھ لیٹ گیا اس نے مجھ پر رضائی ڈال دی اور رضائی کے اندر ہاتھ ڈال کر بڑے جچے تلے انداز سے میرے پاؤں دابنے لگی۔۔۔تھوڑی دیر پاؤں دابتی رہی اور اس کے بعد۔۔۔۔۔ میں نے تڑپ کر کہا ارے یہ کیا ظہورن اس نے اپنے سید ھے ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا اور ''ارے اللہ، ارے اللہ، ارے اللہ، کے نعرے لگانے لگی۔

من خدائے بت شوخ کہ بہنگام وصال
بمن آموخت، خود آئین ہم آغوشی را

(مولانا شبلی)

اس گھن یا یوں کہیے کہ اس آپریشن کے بعد میری بے جا حیا کا مادہ فاسد

www.pdfbooksfree.pk

1۔ گرم کی (ر) کو بالفتح کہا تھا

کلیتہً نہ سہی لیکن بڑی حد تک میرے جسم سے نکل گیا اور پھر موڑ دی قدرت نے میری باگ جادہ عشق بازی کی جانب

دوش وقت سحر، از غصہ 1 نجاتم دادند

بندہ پرور ایک بار نہیں میں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں

لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا لیکن مجھے دیکھئے کہ اٹھارہ قیامتیں میرے سر سے گزر چکی ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں اور شاخ حیات پر اونگھا نہیں بیٹھا بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں۔

آفریں باد، برایں ہمت مردانہ ما!!

اپنے معاشقوں کے ذکر سے پہلے، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی اہم باتوں پر روشنی ڈال دوں کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہے۔

1 سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کہ محبوبوں کے دل موہ لینے کا تعلق ہے، میرا ایک معاشقہ بھی ناکام نہیں رہا۔۔۔۔اور یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود مجھ سے عشق کیا اور بعض نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں ناز معشوقانہ پیدا کر دیا آپ میرے ان مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں (جو میرے مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں) تو میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

1920ء

میری پرسش اور تیری بزم ناز
آفریں اے شاہد عاشق نواز
اک مرے دل کی تسلی کے لئے
زلزلے میں آئے، اور تمکین ناز

تیری طبع ناز، اور آشفتگی
تیرا پہلو، اور در جاں گداز

1 گلو گرفتگی

یہ ترا رخ، اور گرد خستگی
یہ ترے لب اور حرف سوز و ساز
آہ سوزاں اور تیرے لعل لب
اشک خونیں اور تیری چشم ناز
جس کے قدموں پہ ہو خود فطرت کا سر
وہ پڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

1930ء

ہنوز یاد ہے وہ رنگ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا
وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں
بساط غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا
وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشم نم تیری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرش خواب ترا
وہ بات بات میں چھالا سا اک چپک اٹھتا
نظر جھکا کے وہ لہجہ دم خطاب ترا
وہ تیری زلف کے خم سے، مری پریشانی
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے اضطراب ترا
مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال
وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

www.pdfbooksfree.pk

1937ء

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو
یاد ہے وہ خلش عہد تمنا تجھ کو
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس، میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھ کو
راستے سے کوئی آواز جب آ جاتی تھی
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھ کو
قہر ڈھاتا تھا، مرا درس تحمل تجھ پر
زہر لگتا تھا مرا وعدہ فردا تجھ کو

☆☆☆☆☆☆

2 دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میرے ناقدین میری عاشقانہ شاعری کے باب میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں میر تقی میر اور رفانی بدایونی کا سا غم نہیں پایا جاتا۔

اگر ناقدین غور سے میری عاشقانہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ عنصر غم کی اس میں کمی نہیں لیکن مرے اور حضرت میر وغیرہ کے غم میں فرق یہ ہے کہ ان کا غم شکستگی دل پر اور میرا غم معشوقوں کی مفارقت پر مبنی تھا میرے کلام میں ہجر کی ہچکیاں تو ضرور گونجی ہوئی ہیں مگر شکست دل کی جھنکار موجود نہیں ہے آپ خود ہی انصاف کریں جس کا دل کبھی توڑا ہی نہیں گیا ہو وہ شکست دل کا رونا کیوں کر رو سکتا ہے۔

جناب عالی، روتے دھوتے تو وہ ہیں جنہیں معشوق منہ نہیں لگاتے، دربانوں سے ان کو ذلیل کراتے، ان کی آنکھوں کے سامنے غیروں کو چھاتی سے لگاتے، اور بڑی بے حیائی کے ساتھ عاشق کی زبان سے کہلاتے ہیں۔

لے، شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اگر نصیب دشمناں میں جوانی میں ایسے شرمناک حادثے کا شکار ہو جاتا تو خدا کی قسم بے حیا معشوق اور سالے رقیب، دونوں کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا۔

2 دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میں اس نکتے سے بخوبی واقف ہوں کہ عاشق پر سان چڑھتی ہے ایک تو معشوق کی بے اعتنائی و کج ادائی دوسرے اس کی جدائی سے۔

آیئے پہلے اس کی بے اعتنائی و کج ادائی پر نگاہ ڈالیں، اور دیکھیں کہ عاشق پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔

الف: اس سے عاشق احساس کم تری کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا ہے اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خارشیتا ٹینی کتا اس کے روبرو کھڑا دم ہلا رہا ہے

ب: احساس کمتری کے گھن سے شیشہ انا ءکے چکنا چور ہو جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بجھ جاتا ہے کہ وہ قرابت داروں اور یاروں کو منہ دکھانے سے جھجکنے اور شرمانے لگتا، اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

ج: جب اس کی غم اور ذلت میں ڈوبی ہوئی گوشہ نشینی پر ایک مدت گزر جاتی ہے تو اس کے دل میں اقربا ءو احباب کی جانب سے یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی میرے معشوق کی مانند سراسر نامہربان اور سراپا ناقابل اعتماد ہیں اور بعض اوقات تو فانی بدایونی کی طرح وہ تمام عالم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معاشرے کے واسطے ایک زہریلا انسان بن جاتا ہے۔

د: اس تمام صورت حال کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر اس کے عشق میں جان کم ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے عشق پر اوس پڑ جاتی ہے اور گاہ گاہ کی ایک آہ سرد کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن اگر عشق قوی اور حوصلہ ضعیف ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ گھل گھل کر مر جاتا ہے اور حوصلہ بھی عشق کے مانند قوی ہو تو خودکشی کر لیتا ہے یا خود معشوق کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے۔

3 آیئے اب دوسری شق یعنی ساز گار وغم گسار معشوق کی جدائی کے اثرات پر نگاہ ڈالیں

جدائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک طویل، ایک مختصر

طویل جدائی میں شعلہ بارو پائیدار جذبات رکھنے والا عاشق یا تو کڑھ کڑھ کر مر جاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے یا عاشق میں اگر زیادہ عدت نہ ہو تو کچھ روز تڑپتے رہنے کے بعد اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور بالآخر صبر آ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ برطول فرقت سے بہت بےتابیاں کم ہو گئیں اور پھر اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں کا عالم طاری ہو جاتا ہے لیکن گاہ گاہ کی جدائی اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے وہ عشق کو فاقوں سے مارتی نہیں اسے غذا دیتی ہے وقت کو ٹھہرا، اور زندگی کو ٹھٹھرا دینے والی یک رنگی سے بچاتی ہے اور تواتر عیش و تسلسل قرب محبوب کے تیخ کدے سے بار بار باہر نکل کر شعلہ عشق کو ہوا دیتی رہتی ہے۔

قدرت کو چونکہ مجھے زندہ اور بشاش رکھنا، اور مجھ سے کام لینا تھا اس لئے اس نے بڑی توسط آمیز دیدہ وری کے ساتھ مجھ کو معشوقوں کی جان لیوا بے اعتنائی اور ولولہ سوز طویل جدائی کے تہلکوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ میری ذہنی پرورش و تربیت کی خاطر یہ انتظام بھی کر دیا کہ مجھ کو بار بار مفارقت سے ڈسوایا، لیکن کسی مفارقت کو اس قدر طویل نہیں ہونے دیا کہ سارا کھیل ہی بگڑ کر رہ جائے۔

اور اس مشفقانہ و مدبرانہ صورت حال نے ایک حکیمانہ توازن قائم کر کے مجھ کو زمزمہ و شیون، کرب و کیف، اور نیش و نوش کے بین بین رکھا اس طرح عشرت وریدگی و حزن گزیدگی دونوں سے بچا لیا۔

طغیان ناز ہیں کہ جگر گوشہ غلیل
آرو بزیر تیغ و شہیدش نہ می کند!

اب رہی یہ بات کہ میں نے قیس وفرہاد کے مانند، ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے

عشق کرنے کے بدلے اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی ایک کا ہو کر رہ جانا، میرے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک، یہ صورت حال معشوقیت کو زوجیت کے سیلے تہ خانے میں قید کر دینے کی بد مذاقی بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی جذبات نو بنو کا اعتباس، قانون تغیرات کی خلاف ورزی ذوق تنوع کی بے حوصلگی تصور کی تہی دستی اور تخیل کا افلاس ہے۔

اس لئے میری طبع رواں نے یہ جمود اختیار نہیں کیا اور بہتا دریا، جوگی چلتا چھا کے جاوے پر ہمیشہ گام زن رہا۔ پروانہ کبھی نہیں بنا کہ

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

کی سی کھوکھلی داستان عبرت بن کر رہ جاتا۔ اس کے برعکس میں نے بھونرے کی زندگی کو اپنایا، ہر کلی نو دمیدہ پر منڈلایا، اس کا گن گایا، اس کی خوش بو پی کا رنگ چکھا، اس پر کالی گھٹاؤں کے سائے میں گایا، گونجا، اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا:

در ہیچ مقام نہ گز ارو بد رنگے
از بوئے، بوئے برد، از رنگ برنگے

مجھ پر جمال نے بار بار جال پھینکے، میں بار بار گرفتار ہوا، اور ہر بار یہ کہتا ہوا جال سے نکل گیا کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے، کرے شکار مجھے

اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف کیجئے اس صورت حال کو عشق نہیں عیاشی کہتے ہیں تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی تجھ کو میرے اس اہتمام کی مطلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز

فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی وجسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ حائل رکھا کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں بھی ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے پائے۔

جی ہاں میں نے جی بھر کے عیاسی کی ہے لیکن اس طرح کہ رات ہوتے ہی اس کی شمع جلائی اور صبح ہوتے ہی بجھادی۔

میں نے کبھی اپنے دل کو عیاشی کا وطن نہیں دیا، بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ بنائے رکھا، اور ایسا مسافر خانہ جس پر صبح کی پہلی کرن کبھی نہیں پھوٹتی۔

میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے کبھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا اور زندگی میں ایک بار بھی ان کے انتظار میں چشم براہ نہ گوش برآواز بن کر نہیں بیٹھا۔

البتہ عشق کو میں نے کلیجے سے لگایا، سر آنکھوں پر بٹھایا، راتیں جلائیں، پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھائیں۔ ہچکیوں سے دل کو ڈسایا، تڑپا، تلملایا، تکیے بھگوئے، پلکوں میں آنسو پروئے۔ تارے گنے، اور تلواروں کی دھاروں پر کروٹیں بدلیں جان لیوا خطروں کو ٹھوکر لگاتی، موت کے سامنے آنکھیں نہیں جھپکائیں اور ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ عین مان سون کے ہیجانی موسم میں اس امر کے باوجود کہ میں تیرنا نہیں جانتا اللہ کہہ کر ہوتے سمندر میں جھم سے کود پڑا۔ بندہ نواز اپنے کو اگر ایسے ہولناک تہلکے میں ڈال دینا عیاشی ہے تو خدا کے واسطے بتایئے کہ پھر عشق نام ہے کس چڑیا کا؟

جی ہاں میں نے عیاشی کی ہے، جی بھر کر لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر عیاشی نے، میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں عیاشی نے لذات حواس سے دوچار کیا عاشقی نے نشاط شعور سے سرشاد کیا۔ عیاشی نے، گردن کو نقرئی بانہوں سے اجالا، عاشقی نے گردن میں قوس قزح کا زریں ہار ڈالا۔

عیاشی نے، موج ہائے رنگار رنگ میں ترایا، عاشقی نے گرداب خون جگر میں گھمایا۔ عیاشی نے فقط مکھڑوں کی چاندنی دکھائی عاشقی نے میرے سامنے نفس و آفاق

کی نقاب اٹھائی۔

عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا۔ عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور قلب گداختہ کی دولت بیدار مرحمت فرما کر مجھ کو شاعری اور حب نوع انسانی کا راستہ دکھایا میرا جسم بھی متمول ہے میری روح بھی مالا مال ہے اب کمی کس چیز کی ہے۔

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہتے کیا ہو پیمبری مل جائے؟

اس قدر طویل لیکن ضروری دیباچہ پڑھ چکنے کے بعد آیئے میرے صحیفہ عاشقی کی سعادت قرأت حاصل فرمایئے۔

لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ اب میرا حافظہ اس قدر گھٹا ٹوپ ہو چکا ہے کہ اپنے پہاڑ سے اٹھارہ معاشقوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ بہت سے واقعات قطعی بھول چکا ہوں اور جو یاد بھی ہیں وہ بھی آدھے کجلا چکے ہیں اس لئے نیم حافظہ نشیں معاشقوں ہی پر روشنی ڈال سکوں گا۔

دہرائی جا سکے گی نہ اب داستان عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں، کہیں سے ہم 1

اے حافظے، ہر قدم پر ساتھ نہ چھوڑنا، اور ہر موڑ پر منہ نہ موڑنا اور اے نظام جبر، اے عظیم و کارفرما، آفاقی توانائی، اور اے شہرہ آفاق و نامعلوم شہریار اے گلوں کو رنگ و بو، بلبلوں کو ہاؤ ہو، گھٹاؤں کو امنگ بھونروں کو ترنگ، برہمنوں کو نیاز، بتوں کو ناز، اور شاعروں کو ولولہ نگاہ اور حسینوں کو جمال مہر وہ عطا فرمانے والے تو نے میری جوانی کو عاشقی پر مامور فرمایا تھا، تیرے حکم سے مجال نہ تھی مجھ کو سرتابی کی۔

اور اب جب کہ میں تیری فرماں برداری کر کے بوڑھا ہو چکا ہوں ارباب منبر و محراب مجھ سے کہتے ہیں اے روسیاہ، تو نے عبادت کے عوض ساری جوانی گنوادی کافر زلفوں کے سائے میں بول اے سیاہ کار کیا جواب دے گا، قیامت کے روز تیار ہو جا

دہکتی آگ کے واسطے۔

میں دراز ریش بچوں سے کیا الجھوں صرف اس قدر کہوں گا کہ اگر مجھ کو دوزخ میں جھونکا گیا تو میں اس کے پھاٹک کی محراب پر، آتشیں حروف میں یہ عبارت کندہ کر دوں گا کہ زمین ہی کی طرح، آسمان پر بھی عدل وانصاف کا کوئی پتا نہیں پایا جاتا۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد، کجا ماند مسلمانی!

چور سے کہو، چوری کر، شاہ سے کہو تا کتا رہ قربان اس معدلت گستری کے

الا، یا ایہاقی، ادر کاسا و ناولہا

کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا

1۔ بسملی سعیدہ ٹونکی وغم کی، ہمر دو والدہ

ہائے میں اپنی داستان محبت کیوں کر لکھوں۔ حافظے کے ایوان میں بڑی تاریکی ہے خدارا، واپس آجاؤ اے میری جوانی کے گونجتے، گرجتے، کھنکتے گنگناتے، چہچہاتے اور بھاؤ بتاتے، رنگین و شاداب لمحو۔۔۔ ٹپک پڑو، میرے برگ حیات سے اے شب نم کے قطرو برس پڑو، میرے دیدۂ خشک سے اے آنسوؤں کی بوندو۔۔۔ ابل پڑو، اے میری ترنگوں کے خشک چشمو۔۔۔ گرج اٹھو میرے سفید سر پر، اے میری برکھا کی کالی گھٹاؤ۔۔۔ لو دینے لگو، اے میرے شبستانوں کی بجھی شمعو۔۔۔ پھوٹ جاؤ اے میرے گلابی جاڑوں کی کرنوں جھڑی لگا دو اے میری کھوئی ہوئی، بھری برساتو۔۔۔ دمک اٹھو اے میری خوابیدہ چاندنی راتو۔ کوک اٹھو اے میری امریوں کی خاموش کوئلو نصب ہو جاؤ دوبارہ، اے میر رامش و رنگ کے خاک آسودہ خیمو۔۔۔ جھنک اٹھو اے میرے ساز شکستہ کے تارو۔۔۔ اور جگمگا اٹھو اے مجھ پر صحیفہ انسانیت نازل کرنے والے، نکیلی اور صبیح مکھڑو۔

ہائے ماہ وسال کی دبیز تاریکیوں کے الجھے ہوئے لچھے ان لچھوں کے پیچ وخم میں اس طرح جھلمل ہو رہے ہیں کچھ واقعات اور چند چہرے جیسے دور کے جنگل کے جگنو

جیسے کہرے میں بھاگتے آہو جس طرح دل سے آنکھوں کی طرف جاتے ہوئے آنسو اور جیسے خواب کے بن میں کوئل کی کوکو سامنے ایک رنگ ربو کا میلہ سا لگا ہوا ہے گویا تاریک جنگل میں دیئے ٹمٹمارہے ہیں۔ کوئی لمحہ، اور کوئی مکھڑا نقاب الٹ کر سامنے نہیں آرہا ہے۔

اچھا اب میں اس میلے، اور دور کی اس لپلپاہٹوں کی ریلے کی جانب خود بڑھوں شاید کچھ نظر آسکے لیجئے میں پچاس قدم آگے بڑھ گیا۔ ہاں اب تو کچھ واقعات اجاگر ہورہے ہیں کچھ مکھڑوں [1] سے نقابیں ہٹ رہی ہیں دوربین نے بڑی مدد کی ارے یہ صف اول میں کون کھڑا مسکرا رہا ہے؟ ہائیں یہ تو ''س ح'' کا مکھڑا ہے ذرا اور قریب آؤ میرے بچھڑے محبوب کہ تم پر قلم اٹھا سکوں بڑی مہربانی کی تم نے کہ میرے پاس آ گئے۔

اب آپ ''س ح'' کے حالات سنیں، بسم اللہ۔

---

[1] ان مکھڑوں کے نام س ح + ع ج + الف الف خ + م ج + ت د + ش، د + الف، ن، ک، د، ع، ج + الف، خ + ر، ب، مس میری + مس گلینی + م، ب + ر، ک + ط، ج + ج، ب + اور ع، خ =

☆☆☆☆☆☆☆☆

س، ح

یہ نام خدا ان جوانی کی راتوں، مرادوں کے دن کا واقعہ ہے، جب کہ میری عمر نے کھیل کود کے میدان سے نکل کر میری بھیگی مسوں کے ساحل پر ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ ایک روز چراغ جلے ایک ببھوکا سا یوروشین لڑکا میرے چچا کے ہاتھی پر سوار میرے گھر کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا۔

وہ گلابی جاڑے کی ٹھنڈی سہانی شام وہ جلسے کی دھوم دھام اور وہ امرو گل فام وہ پھاٹک پر بجتی شہنائی، اور ہاتھی پر وہ اس طفل پری زاد کی رعنائی، دھرتی بولے رام دہائی۔

اگر میر تقی میر، اسے دیکھ لیتے تو ''اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں'' کی رسم ترک فرما دیتے اور انشاء اللہ خاں انشا ارے رے رے رے، ارے رے رے ارے رے کہ کہ زمین پر بیٹھ جاتے۔

ارے ہاتھی کے اوپر اس کا جھلجھلا تا براں چہرہ:

''نیرے پر آنی دمک رہی تھی گویا''

میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے، مانی صاحب جائسی سے (جو اب میرے ٹیوٹر کم اور بے تکلف دوست زیادہ ہو چکے تھے) کہا خدا کے واسطے اس کو میرے پہلو میں لا کر بٹھا دیجئے۔

مانی صاحب جو پہلے ہی سے اس کو دل دے چکے تھے بڑی عجلت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو بڑے ہی چاؤ سے لاکر میرے پہلو میں بٹھا دیا اور اس کے بیٹھتے ہی میرے بائیں پہلو میں گرمی محسوس ہونے لگی اور مانی اس کو اس حسرت کے ساتھ دیکھنے لگے کہ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔

اتنے میں ناچ گانا ہونے لگا اور طوائف، ہر چند خوب رو اور کم سن تھی، مگر ''س ح'' کے مقابل کوب چہرے کے سامنے، ایسی نظر آنے لگی گویا گیس کے سنسناتے ہنڈے

کے سامنے ریوڑی والے کا دیا ٹمٹمار ہا ہے۔

میرے کان مطربہ کی ٹھمریوں کے جھولے میں جھول رہے تھے اور میری آنکھیں اس کے گلابی چہرے سے اٹھتی ہوئی لوؤوں پر رقص کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا عرب کی ''ہزار راتیں'' اس ایک رات میں سمٹ کر آ گئی ہیں۔

میں نے اس پر اس طرح نظریں جما دیں کہ اس کے رخسار کی جلد میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں اس نے مڑ کر مجھے دیکھا ایک ہی نظر میں جان گیا میرے دل کا عالم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ یوں مسکرایا کہ میرے سر پر بنارس کی صبح طالع ہو گئی اور تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے کا غیر ملفوظ پیان ہو گیا اور ہمارے چہروں کے رنگ میں اپنی تلواروں کی دھار مچلنے لگی اور دونوں پر ایسی ربودگی طاری ہو گئی کہ زبانوں سے ایک حرف بھی نہیں نکل سکا۔

اور جب پچھلے پہر، محفل برخواست ہونے لگی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی خیمہ بھائیں بھائیں کرنے لگا ہر گوشے سے ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں اور بجھی ہوئی مشعلوں کا دھواں میری آنکھوں میں لگنے لگا۔

جب مانی بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئے محل سرا میں آ کر میں بستر پر دراز ہو گیا بستر کی شکنوں میں دھار پیدا ہو گئی لاکھ لاکھ کروٹیں بدلیں نیند نہیں آئی میری زندگی میں وہ پہلی عشق کی رات تھی۔

اتنے میں گھڑیال نے چار بجے کا گجر بجایا ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن اور چلنے لگا میرے دل پر گھن۔

یہ سوچ کر کہ اب نیند نہیں آنے کی بستر سے اٹھا پڑھنے کے کمرے میں گیا اور کتاب اٹھالی کہ اس سے جی بہلاؤں۔

کتاب کے ورق پر خیمہ نصب ہو گیا مجرا ہونے لگا حروف کانپے، پھیلے شیشے کی

محراب بن گئے اور اس محراب میں ''س ح'' کا چہرہ دمکنے لگا۔

آپ بھی وہ شعر سن لیں کہ میری عاشقانہ شاعری کی انہیں سے ابتدا ہوئی ہے۔

آئیں اسکول کے احباب سنیں درد مرا
گرم کر دے گا لہو، ہر نفس سرد مرا
ایک تنکا بھی اگر آنکھ میں پڑ جاتا ہے
آدمی ہے کوئی ایسا جسے چین آتا ہے؟
چین لینے دیں بھلا کیا مجھے ایسی آنکھیں
جن کے پردوں میں سمائی ہوں کسی کی آنکھیں
اپنی آنکھوں کی اذیت کو بھلا دیتا ہوں
میز سے بڑھ کے کتاب ایک اٹھا لیتا ہوں
روبرو آنکھ کے جس وقت کتاب آتی ہے
اک جھلک، صفحہ قرطاس پہ پڑ جاتی ہے
دیر تک کچھ نظر آتا نہیں بجلی کے سوا
دفعتہً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا
حرف دب جاتے ہیں کچھ دیر میں رفتہ رفتہ
صاف کھنچ جاتا ہے ہر لفظ پہ چہرہ ان کا

صبح ہوتے ہی مانی صاحب کے وہاں پہنچا وہ دادا میاں کی بارہ دری کے پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں رہتے تھے میں نے زینہ طے کر کے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے روہانسی آواز آئی ''کون؟'' میں نے اپنا نام بتایا دروازہ کھل گیا وہ میرے گلے لگ کر رونے لگے میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا کیا بات ہے انہوں نے کہا کیا پوچھتے ہو، رات کو اس نے میری طرف نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا پرتی رہیں وہ آنکھیں پلکوں کے سائے سائے۔

ان کا دل رکھنے کی خاطر میں نے کہا مانی صاحب یہ بات نہیں ہے اس نے آپ کی طرف کئی بار نگاہ اٹھائی آپ ایسے منہ لٹکائے بیٹھے تھے کہ دیکھ نہیں سکے۔

یہ سن کر ان کا چہرہ بشاش ہو گیا اور کہا ''تری آواز مکے اور مدینے''

انہوں نے پوچھا تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں میں نے کہا پرسوں انہوں نے کہا تو میں ''س، ح'' کو پرسوں تمہارے پاس لے کر آؤں گا لکھنو میں

اس کے تیسرے روز میں لکھنو پہنچ گیا اور میرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن مانی صاحب آ گئے آتے ہی انہوں نے بڑے اہتمام سے خط بنایا، دیر تک غسل کیا، اور ناشتہ کر کے جب باہر جانے لگے تو کہا آج شام کو میں اسے لے کر تمہارے پاس آؤں گا ان کے جاتے ہی میں اپنے مکان کی صفائی و آرائش میں مشغول ہو گیا، ہر گوشے میں جھاڑو دلائی میزیں کرسیاں بچھوائیں گملوں میں پانی ڈلوایا چھت گیری درست کرائی، چھت میں لٹکے ہوئے قمقموں کو دھلوایا، لیمپ صاف کرائے، ایک اور نیا لیمپ خرید لایا جس میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم لٹکے ہوئے تھے ایک موتیوں کی جھلجھلاتی چک خریدی، اسے زینے کے بالائی دروازے پر لٹکا دیا۔

آرائشوں سے فارغ ہو کر، کوئی تین بجے لیٹ گیا تا کہ آرام کرنے سے چہرے پر تازگی آ جائے پانچ بجے بستر سے اٹھا کٹی کورا صابون سے خوب مل مل کر نہایا، چالیس ہزار مارکہ کی چھالٹین کا پائجامہ، اور بنارسی ریشم کا کرتہ پہنا، کرتے میں حنا کا عطر ملا اور ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گیا۔

غلغلہ ہے جو ان کے آنے کا
رنگ دیکھو غریب خانے کا
روح کو آئینہ دکھاتے ہیں
در و دیوار مسکراتے ہیں
آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار

www.pdfbooksfree.pk

دل میں ہے خوش سلیقگی کی بیدار

جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا

خوف، دل میں فریب قسمت کا

سوز قلب کلیم، آنکھوں میں

اشک امید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ شوق کے مارے

چاند کے انتظار میں تارے

جب دن ڈوب گیا، سائے بھاری اور ملگجے سے ہو گئے ٹھنڈی ہوا دبے پاؤں چلنے لگی، وقت کے منہ پر سانولا پن دوڑ گیا مدھ ماتی شام اودھ کی لیں رومانی فضا کے ماتھے پر مچلنے لگیں اور لیمپوں کی روشنی ہمکنے لگی تو خدا خدا کر کے نازک قدموں کی آہٹ سے زینہ بجنے لگا میں چھلانگ لگا کر زینے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دیکھا کہ نام خدا ''س، ح'' چلا آ رہا ہے اور مانی ایک مرید یا مصاحب کے مانند اس کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے، اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوا گویا آفتاب ابھر رہا ہے اور یوسف کی پیشانی کنویں کی جگت سے طلوع ہو رہی ہے اوپر آ کر جب اس نے مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملایا تو میرے وجود کے منارے پر شہنائی سی بجنے لگی۔

مانی صاحب نے شکریہ طلب آنکھوں سے مجھے دیکھا میری پلکوں کی جھپک نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اب ہم جگمگ جگمگ کمرے میں آ گئے ''س، ح'' میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مانی باورچی خانے چلے گئے اور مجھ پر

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں

کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ بڑے بیٹھے ہیں

کا عالم طاری ہو گیا ۔

اتنے میں مانی آ گئے علی شیر خاں سپاہی اور نو روز باورچی نے میز پر مٹھائیوں میووں، پھلوں کی بھری پلیٹیں بالائی کی قابیں اور چائے کا سامان چن دیا۔

جب کھانا پینا ہو چکا تو کمرے پر ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی ۔

میں نے لاکھ لاکھ کوشش کی مگر بولا نہیں گیا الفاظ کو زبان پر کھینچ کر لاتا تھا تو وہ راستے ہی میں گر پڑتے تھے یعنی

کل ان کے آگے شرح تمنا کی آرزو

اتنی بڑھی کہ نطق کو بے کار کر دیا

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی اور جھپکتی پلکیں باتیں کرنے لگیں ۔

اس جمود کو توڑنے کی نیت سے مانی صاحب نے کہا اب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا ہم دونوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں

پھر مانی صاحب نے کہا شبیر اپنی وہ نظم تو سناؤ

دفعتہً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا

میں نے جی کڑا کر کے وہ نظم سنائی ہر چند وہ تھا یورو شئین مگر لکھنو کی ماں کی گود میں پلا ہوا تھا اس نے جی کھول کر مجھے داد دی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ میرے اشعار اس کی آنکھوں کے پردوں میں چبھ رہے ہیں مانی سے رہا نہیں گیا اپنے اظہار عشق کی خاطر انہوں نے کہا میری ایک تازہ غزل بھی سن لیجئے میں نے کہا ارشاد

اور انہوں نے ایسی دردبھری چبھتی ٹھہر ٹھہر کر بہتی اور چھالے کی طرح تپکتی آواز میں اپنی غزل سنائی گویا ایک کلیجہ ہے جو ململ کے دامن کی طرح برابر پھٹتا ہی چلا جا رہا ہے اس کے بعد جی کڑا کر کے میں نے ''س، ح'' سے پوچھا کیسا مزاج ہے اس نے

www.pdfbooksfree.pk

ذرا سا مسکرا کر کہا اچھا ہوں ہائے اس اچھا ہوں کی مٹھاس۔

اب اس نے کہا اجازت ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دوں میں نے گھبرا کر کہا اچھا کیا جائیے گا اس نے بڑی نرمی سے کہا اگر آپ اجازت دیں گے تو میں نے بڑی بے کسی کے ساتھ سر جھکا کر کہا بہت اچھا۔

اور جب وہ گلے لگ کر چلا گیا تو مانی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے میں نے کہا کہئے کیسا مزاج ہے، انہوں نے غصے میں سر اٹھا کر کہا میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا ارے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ معشوق جانے کی اجازت طلب کرے، اور عاشق صاحب بہادر اکھڑین سے ارشاد فرمائیں اچھا کیا جائیے گا اس اچھا کیا جائیے گا کی ایسی تیسی پٹھان لاکھ لکھنو میں پروان چڑھے مگر لٹھ ہی رہتا ہے لٹھ نرا لٹھ۔

عاقبت، گرگ زادہ، گرگ شود

گرچہ آدمی، بزرگ شود

ان کی اس ڈانٹ پھٹکار سے میں کٹ گیا اور دل ہی دل میں لعنت بھیجنے لگا اپنے اجڈ پن پر۔

اور اس بڑھاپے میں بھی "اچھا کیا جائیے گا" کا لٹھ پن جب یاد آجاتا ہے تو اپنے پر نفرین کرنے لگتا ہوں اچھا کیا جائیے گا پر شیطان کی پھٹکار ایک نہیں ہزار بار

☆☆☆☆☆☆☆

ج، ع

سیتاپور برانچ اسکول میں ہم دونوں ہم جماعت تھے پورا کلاس، ایک محمل تھا اور اس کی ذات لیلیٰ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اس کا دوست بن جائے اس کا غرور حسن کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔

صرف لڑکوں ہی کی نہیں، اساتذہ کی نظریں بھی اس کی طرف بار بار اٹھتی تھیں لیکن وہ

بمکتب می رود، طفل پری زاد
مبارک باد، مرگ نو باستاد

کسی کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ غرور حسن کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے خاندان کی وجاہت اور اپنے باپ کے سرکاری عہدے کی جلالت پر بھی بڑا ناز تھا۔

اس کی طرف میری آنکھیں اٹھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے تصور جمال کے سانچے میں ڈھالا گیا اور میری آنکھوں کے مشورے سے اس کے خدو خال تراشے گئے ہیں۔

ہر چند وہ میری آنکھوں کی دعائے مستجاب تھا لیکن اس کے تبختر پر نگاہ کر کے میں اس سے بات نہیں کرتا تھا۔

کئی مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے میں اس کے قریب جانے سے بھاگتا لیکن در پردہ اس کی جانب دوڑتا رہا۔

بڑھتا چلا گیا ہوں، اسی کی طرف کچھ اور
یوں بھی ہوا ہوں اس سے گریزاں کبھی کبھی

ایک دن اسکول جاتے ہوئے میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی میں نے خودداری طلب گاری کی ملی جلی کیفیت سے اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بجتی ہوئی آواز سے پوچھا تمہارا نام شبیر ہے؟

میں نے کہا ہاں میرا نام یہی ہے اس نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو میں نے

www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا ملیح آباد کا اس نے بشاش ہو کر کہا ارے وہ تو ہمارے لکھنو کا ہی ایک محلّہ ہے تم شیعہ ہو کہ سنی؟ میں نے کہا آدھے سے زیادہ شیعہ اس نے کہا پورے شیعہ بن جاؤ، تو میرے تمہارے پینگ بڑھ جائیں میں نے کہا پہلے مجھ سے پینگ بڑھاؤ، پھر پورا شیعہ بناؤ یہ سن کر اس کی سونے کے ورق کی سی چہرے کی باریک جلد کے نیچے ایک رنگ دوڑنے لگا وہ میری طرف دو قدم بڑھا اور میرے قریب آ کر اپنے ماتھے سے میرے ماتھے پر زور سے ٹکر ماردی اس کے ٹکر مارتے ہی میرے بدن میں لہو تیزی سے دوڑنے لگا ٹکر ہر چند زبردست لیکن بلا کی میٹھی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور اس نے بڑے تحکم کے ساتھ اپنی بلوریں انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا آج اسکول کے بعد میرے گھر چلنا ہوگا میری باچھیں کھل گئیں اور کہا ضرور چلوں گا۔

کہتے ہیں ''شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر'' لیکن یہ کہاوت اس موقع پر بالکل الٹی ہو کر رہ گئی۔

اس ٹکراؤ کے بعد میں اس کے گھر جانے لگا محبت دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی اور اس میں اس قدر غلو پیدا ہو گیا کہ جس دن کسی مجبوری کی بناء پر اس کے گھر نہیں جاتا تھا تو منہ کا مزا پھیکا پھیکا سا محسوس ہوتا تھا۔

میں اس کے جمال کی شرح کیوں کر کروں الفاظ پر جب اس کے حسن کا بار ڈالتا ہوں تو ان کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں میرے نزدیک رب جمال نے بڑی کمیاوی دیدہ وری کے ساتھ سب سے پہلے تو وادی کشمیر کی روپہلی چاندنی، اور صبح کوہسار کی سنہری کرنوں کو ہلکی سی بنولے کی آنچ پر رکھ کر پگھلایا، پھر تخت الماس میں نچوڑ دیا پھر چنبیلی اور موتیے کے پتوں کو خوب حل کر کے اس میں گھول دیا اور پھر اوپر سے پگھلا ہوا سونا ٹپکا دیا اس کے بعد کھرل میں کٹے ہوئے موتیوں کا باریک سفوف اس پر چھڑک دیا اور اس کے بعد اس نیم سیال مرکب کو نسیم شمال کی راہ گزار میں رکھ دیا، اور جب وہ جم گیا تو اس سے اس کی موہنی صورت تراش لی۔

ایک روز بڑے دن کی چھٹی منانے کے واسطے ہم دونوں سیتا پور سے لکھنو کی طرف

روانہ ہوئے خوش قسمتی سے ہمارا ڈبا خالی تھا ہم نے بڑے بے تکلفی کے ساتھ سفر کیا۔

ہماری گاڑی جب کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی میرا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا کہ کہیں کوئی مسافر نہ آ دھمکے اور ہمارے طلسم کو توڑ ڈالے مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ آخر تک کوئی مسافر نہیں آیا اور ہم موج کرتے رہے سچ کہا ہے کسی نے السفر وسیلۃ الظفر رات ہوتے ہی وہ میرے زانو پر سر رکھ سو گیا ار چودھویں کی چاندنی اس کے سنہری گالوں میں جذب ہونے لگی اس وقت اس کے چہرے سے جو اثر میں نے قبول کیا تھا آج تک دل پر نقش ہے ہائے وہ جھلکتی چاندنی اور ہائے وہ اس کا دملتا چہرہ۔

ایک روز لکھنو میں اس نے کہا شبیر کل آنا تو دو اشرفیاں لیتے آنا اور جب میں اپنی ماں سے دو اشرفیاں لے کر اس کے پاس گیا اور ریشمی رومال میں رکھ کر میں نے وہ اشرفیاں پیش کیں اس نے کہا اپنے پاس رکھو میں تو تمہیں آزما رہا تھا میں نے غصہ میں آکر وہ اشرفیاں کوٹھے سے نیچے پھینک دیں اس نے گھبرا کر کہا ارے یہ تم نے کیا کیا میں نے کہا تم دو کوڑی کی دو اشرفیوں سے میری محبت کا امتحان لے رہے تھے یہ دیکھو میری محبت یہ کہتے ہی میں نے میز سے چھری اٹھائی اور اپنے سینے میں مار لی ڈھل ڈھل خون بہنے لگا اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے اپنی قمیض کا دامن پھاڑ کر اسے پانی میں تر کیا اور زخم پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔

اتنے میں اس کا گردے کی سی داڑھی والا، منہ بولا ''چچا'' آ گیا وہ ہم دونوں کی یک جائی سے خار کھاتا تھا اس نے مجھ کو لہولہان اور ''ع ح'' کو زار و قطار روتے دیکھا تو کم بخت لال پیلا ہو کر پوچھنے لگا سچ بتاؤ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے ''ع، ح'' نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا شبیر چھری لے کر سیبوں کے ٹوکرے کی طرف بڑھے ٹھوکر لگ گئی گر پڑے، اور چھری سینے میں لگ گئی۔

اس خبیث نے، کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا یہاں تو سیبوں کا کوئی ٹوکرا نظر نہیں آ رہا ہے ''ع، ح'' نے کہا چچا وہ ٹوکرا ابھی ابھی کوئی اٹھا کر اندر لے گیا

www.pdfbooksfree.pk

ہے اس نے کہا کون اٹھا کر لے گیا ہے اس کا نام بتاؤ اس نے کہا جب وہ ٹوکرا اٹھا کر کمرے سے نکل رہا تھا میں نے فقط اس کی گدی دیکھی تھی نام کیا بتاؤں چچا نے دانت پیس کر کہا کل کا چھوکرا، اور مجھے الو بنا رہا ہے ابھی تیرے باپ سے جا کر شکایت کرتا ہوں یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گئے اور ہم دونوں ہراساں ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

''ع، ح'' نے مجھ سے کہا اگر ابا تمہیں بلائیں اور پوچھیں تو کیا جواب دو گے میں نے کہا میں کیا جواب دوں گا یہ فیصلہ کر چکا ہوں اس نے کہا وہ میرے باپ ہیں تم بھی ان کو اپنا باپ سمجھ کر جواب دینا۔ ٹھنڈولی پر نہ اتر آنا کہ اتنے میں داڑھی والا مردود چچا آ گیا اور کہا تم دونوں کو مرزا صاحب (یعنی ''ع، ح'' کے والد ماجد نے بلایا ہے)

ہم دونوں ان کی خدمت میں پہنچے انہوں نے بکمال شفقت نظر اٹھائی اور فرمایا شبیر تم کو نہیں معلوم ہمارے تمہارے خاندان کے کتنے پرانے تعلقات ہیں تمہارے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا اور میرے دادا۔۔۔۔۔۔۔ کے مابین برادرانہ تعلقات تھے، مجھے یقین ہے کہ تم پٹھان، اور عالی خاندان ہو جھوٹ نہیں بولو گے اور جو واقعہ ہو گا سچ سچ بتا دو گے۔

میں نے کہا چچا جس طرح میرے پردادا اور آپ کے دادا کے درمیان برادرانہ تعلقات تھے ویسے ہی میرے اور ''ع، ح'' کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں انہوں نے میری برادرانہ شفقت کو آزمانے کے لئے مجھ سے کہا کل دو اشرفیاں لیتے آنا، میں سمجھا انہیں ضرورت ہے میں لے آیا اور جب میں ان کو وہ اشرفیاں دینے لگا انہوں نے کہا مجھ کو ضرورت نہیں میں تو فقط تمہیں آزما رہا تھا یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا میں نے اشرفیاں نیچے پھینک دیں، اور اپنے سینے پر چھری مار لی۔

مرزا صاحب نے ''ع، ح'' سے کہا آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا آج انہوں نے اپنے چھری ماری ہے کل تمہیں چھری مار دیں گے پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیاء گھڑی میں بھوت۔

اور بیٹے کو سمجھانے کے بعد مرزا صاحب نے اس مردود، چغل خورے ''چچا'' سے

کہا۔۔۔۔خان یہ تو ایک طفلانہ کھیل تھا ایسے واقعات کو بڑھا چڑھا کر اور برا رنگ دے کر پیش کرنا حماقت ہے اور ہم دونوں ''چچا'' کو طعن آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے بالا خانے پر آ گئے ''ع،ح'' نے فرط خوشی سے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں بڑے دن کی چھٹیاں منانے کے بعد اب ہم پھر سیتاپور آ گئے اور زندگی مزے سے گزرنے لگی۔

''ع،ح'' کے ایک اسی پچاس برس کے معلم اس کے گھر میں رہتے تھے انہوں نے ع،ح کے ایماء پر مجھ پر شیعیت کا گہرا رنگ چڑھانا شروع کر دیا اور جب میں پکا شیعہ بن گیا تو اس نے بڑی دھوم دھام سے میری دعوت کی اور کہا اب میں ہمیشہ کے لئے تمہارا ہو گیا اور میری ہڈیوں کے گودے تک اس کی محبت اتر گئی۔

اسی اثناء میں یہ ایک بہت بڑا المناک سانحہ پیش آیا کہ میرے باپ نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں سیتاپور برانچ اسکول سے نام کٹا کر فلاں تاریخ کو لکھنؤ پہنچ جاؤں، وہ مجھے حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کرا دیں گے اور مرزا حبیب حسین صاحب ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں رکھیں گے۔

جب یہ خط پہنچا زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی دل اس زور سے دھڑکا، گویا منہ سے نکل جائے گا اور جب میں نے وہ خط ''ع،ح'' کو دکھایا وہ چارپائی پر گر گیا آنکھوں سے آنسوؤں کا دجلہ بہنے لگا پھول سا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا میں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ کلیجے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

اور آخر کار اس کے چوتھے دن بصد نالہ وفغاں سیتاپور سے رخصت ہو گیا۔

بنومیدی، حزیں، از کوئے اوبار سفر بستم
خدا، صبرے کند روزی، دل امید و ارم دا

☆☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

مس میری رومالڈ

یہ اس دور کا ذکر ہے، جب میں لکھنو چرچ مشن ہائی اسکول میں زیر تعلیم اور راٹوش روڈ کی گلی کے ایک دومنزلہ مکان میں رئیس احمد اور ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔وہ ایک وسیع اور دومنزلہ مکان تھا اس مکان کے ایک حصے میں مس میری رومالڈ اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز روبی رومالڈ کے ساتھ رہتی تھیں زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا اور آتے جاتے ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ہماری خواب گاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا اور جب ہم اپنے بستروں پر لیٹے تھے تو فریقین دیر تک ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنا کرتے تھے۔

ایک روز سر شام ہم دونوں زینے پر چڑھ رہے تھے وہ آگے تھی میں پیچھے اس کے لونڈر کی خوشبو میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یکایک اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ''او گاڈ'' (ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی اور بڑے کرب کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑ لیا میں نے انگریزی میں پوچھا آپ کو کیا تکلیف ہے اس نے کہا میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے آپ مجھ کو سہارا دے کر میری خواب گاہ تک پہنچا دیا او مائی گاڈ، او مائی گاڈ میں نے لپک کر اس کی چھلاسی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور سہارا دے کر اسے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا وہ بستر پر لیٹ کر تڑپنے لگی میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں اس نے کہا نہیں پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر کو بلا لائیں۔میں بڑے انہماک کے ساتھ اس کا پیٹ سہلانے لگا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں مجھے بڑے تشکر سے دیکھا اور کہا اگر تکلیف نہ ہو تو یہ سامنے سوڈے کی بوتل کھول کر مجھے پلا دیجئے۔

میں نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا بھرا اور پیش کر دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کہا آپ پہلے اسے ذرا سا چکھ لیں میں نے ایک گھونٹ پی کر گلاس اس کو دے دیا وہ میری طرف

نگاہیں اٹھا کر اس طرح پینے لگی گویا سوڈے کے ساتھ وہ مجھے بھی پی رہی ہے۔

مجھے اور سوڈے کو پی کر اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے کہا میری ماں باہر گئی ہوئی ہیں اکیلے جی گھبرائے گا تھوڑی دیر اور بیٹھ جایئے میں کرسی پر بیٹھ گیا اس نے کہا نہیں میرے بستر پر بیٹھ جایئے۔

میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر پر جو اس کے سرہانے آویزاں تھی چادر ڈال دی۔

اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے اور ابرار اس کی سوتیلی ماں پر ریجھ گئے اور دونوں میں گاڑی چھننے لگی۔

ایک روز ہم لوگ حضرت گنج کے ایک شاندار ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ دو گورے جو نشے میں دھت تھے وہاں آ گئے میری اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ تم یورپین ہو کر نیٹو آدمیوں کے حلقے میں بیٹھی ہوئی ہو میں نے ان کو ڈانٹا کہ بدتمیزی نہ کرو ہمارا ہی نمک کھاتے اور ہمیں پر غراتے ہو ایک گورے نے میری بات ان سنی کر کے مس میری کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کے سر پر ڈنڈا مار دیا دوسرا گورا بڑھا تو ابرار نے اس کے سر پر اچار کی بھری بوتل مار دی اچار آنکھوں میں پہنچا تو وہ بلبلا گیا اور دونوں گورے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک روز اس کی کتیا دو منزلے سے انگنائی میں گر کر دم توڑنے لگی میری نے چیخ کر مجھ سے کہا ارے وہ سامنے برانڈی کی بوتل رکھی ہوئی ہے جلدی لے آیئے میں نے کہا میں برانڈی کی بوتل نہیں چھو سکتا اس نے مجھے قہر سے دیکھا دوڑ کر بوتل اٹھائی اور نیچے اتر کر دم توڑتی کتیا کے جبڑے چیر کر کوئی آدھی بوتل اس کے منہ میں انڈیل دی اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کتیا کی حالت بہتر ہو گئی اور کلیلیں کرنے لگی۔

اس نے مجھ سے کہا تم نے برانڈی کا معجزہ دیکھا جو چیز مردوں کو جلا سکتی ہے تم اس کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے شرم ہشرم شرم

www.pdfbooksfree.pk

ایک شام کو اس نے مجھ سے کہا تم سہ پہر کو ٹہلنے چلے جاتے ہو تو روز ایک حبشی نوجوان آتا اور میرے کمرے کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر کچھ گاتا اور پھر چلا جاتا ہے کل تم ٹہلنے نہ جانا اور یہیں بیٹھنا اور اس کالے حبشی کا دماغ صحیح کر دینا دوسرے دن میں ٹہلنے نہیں گیا اور ٹھیک پانچ بجے سڑک سے آواز آنے لگی۔

''مارے ہیں جواں لاکھوں اے رشک چمن تو نے اے رشک چمن تو نے، اے رشک چمن تو نے بن بن کے دلہن تو نے''

میں نے جھانک کر دیکھا وہی حبشی نوجوان تھا ڈنڈا لے کر میں نے اس کی ایسی ٹھکائی کر دی کہ پھر اس نے کبھی اس گلی کا رخ بھی نہیں کیا۔ مس میری نے مسکرا کر کہا تم تو بہت بڑے ''نائٹ'' ہو جو گوروں کو بھی پیٹتا ہے اور کالوں کو بھی۔

اڑتے اڑتے میرے معاشقے کی خبر میرے باپ تک پہنچی وہ نہایت دانش مند انسان تھے ابرار کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ وہ فرنگی لڑکی اگر مسلمان ہو جائے اور پردہ نشینی اختیار کر لے تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں کہ شبیر سے اس کا عقد کر دوں جب میں نے میری کے سامنے اپنے باپ کی یہ دونوں شرطیں پیش کیں تو اس نے کہا ڈارلنگ میں تمہاری خاطر پردہ نشینی کی گھٹن تو برداشت کر لوں گی لیکن اسلام کبھی قبول نہیں کروں گی اس لئے کہ یہ گنڈوں کا دین ہے۔

یہ سنتے ہی مجھ کو تاؤ آ گیا عشق کو جذبہ اسلام نے دبوچ لیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سامنے رکھا ہوا ایک بھاری اسٹول اس کو کھینچ کر مار دیا وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اسٹول ایک لکڑی کی الماری پر لگا اس کا پٹ چور چور ہو گیا اور میں اسے اور عیسائی مذہب کو برا بھلا کہتا اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد میں اس کے وہاں پھر کبھی نہیں گیا اور لکھنو کی سکونت ترک کر کے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو گیا اس واقعہ کے کوئی سال بھر کے بعد جب چھٹیوں میں لکھنو آیا تو نہ جانے اسے کیوں کر پتا چل گیا وہ عین دوپہر کے وقت

میرے پاس آئی اور جب میں نے اس کی جانب نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر میرے دل کو بڑا زبردست دھکا لگا کہ صرف ایک سال کی مدت میں اس کا آدھا حسن برباد ہو چکا ہے اور وہ شام کے مرجھائے پھول کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور آواز گلے میں پھنسنے لگی اس نے مجھ سے کہا ڈارلنگ تمہاری محبت مجھ کو کھا گئی مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو، ورنہ وہیں پہنچتی تمہاری جدائی کے ہاتھوں ڈارلنگ مجھ کو دق کا مرض ہو چکا ہے میری سانس سے دور ہٹ کر بیٹھو میں اس وقت تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آج سے ایک سال قبل میں نے جو اسلام کی توہین کی تھی تم اسے معاف کر دو اب میں اس دنیا سے جا رہی ہوں جانے والے کا یہ حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دل سے معاف کر دیا جائے ڈارلنگ جو اسٹول تم نے کھینچ کر مارا تھا کاش وہ میرے لگ جاتا میں اسی وقت مر جاتی لیکن یہ دن نہ دیکھتی۔

میں نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ چمٹا لیا میری آنکھیں پھر برسنے لگیں میں نے کہا پیاری میری میں تمہیں دل سے معاف کر رہا ہوں اور میں تم کو مرنے نہیں دوں گا میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہارے علاج پر نثار کر دوں گا تم گھبراؤ نہیں اس نے کہا شبیر تم میرا علاج نہ کراؤ اب میں بچوں گی نہیں اور ہاں یہ بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پیشتر میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد میرے پیٹ سے تمہاری لڑکی پیدا ہوئی تھی ہو بہو تمہارا نقشہ تھا اور تمہارے سیدھے پاؤں کی انگلی میں جو تل ہے وہ بھی اس نے وراثت میں پایا تھا ہائے وہ مر گئی یہ کہہ کر اس کی آواز رندھ گئی اس کے گورے گورے گالوں پر ملگجا پن سا دوڑنے لگا میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور سہ بارہ آنسو بہنے لگے۔

میں نے اس کے علاج پر اپنی ماں سے لے لے کر ہزاروں روپے صرف کر دیئے ڈاکٹروں پر ڈاکٹر بدلے ان کے بورڈ بٹھائے بڑے بڑے نامی طبیبوں کو بلایا لیکن

www.pdfbooksfree.pk

ہائے وہ بچ نہیں سکی اور مجھے دغا دے کر وہاں چلی گئی جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا۔

اس کا پھول سا چہرہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اور مجھ سخت جان کی پیری اب تک اس زمین پر سانس لے رہی ہے یہ کتنی عبرت انگیز اور شرمناک بات ہے۔

پس از معشوق جینا، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے، مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

ہائے اے میری مس میری صرف ڈھائی یا تین سال کی قلیل مدت کے لئے تیرے گلستان جمال نے مجھ پر پھول برسائے اور اب تیری موت پچاس سال سے مجھ پر انگارے برسا رہی ہے مسرت کی عمر کس قدر قلیل اور غم کی عمر کس قدر طویل ہوتی ہے۔

ہم کو صرف ایک بوند بھر تبسم کی لہروں میں تیرا کر آنسوؤں کے بے شمار گردابوں میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جاتا ہے ارے کیسا یہ کارنامہ ہے؟ اے تازہ واردان بساط ہوائے گل مجھ سے عبرت حاصل کرو اور خوشی کے حصول سے ہاتھ اٹھا لو، مگر تم ایسا نہیں کر سکتے، سفاک قدرت تمہاری جوانی کو تازیانے مار مار کر حصول مسرت کے میدانوں کی جانب ایک ظالم چرواہے کی طرح ہنکائے گی اور پھر مسرور ہونے کے جرم میں تم کو مرتے دم تک رلائے گی ہائے۔

انہیں سے کھائی ہیں خاروں کی لاکھوں برچھیاں میں نے
وہ دو سانسیں، جو لی تھیں، بوئے گل کے درمیاں میں نے
گھمایا جا رہا ہوں اس خطا پر دشت عبرت میں
کیا تھا کیوں طواف حجلہ ہائے دل براں میں نے
در قصر کشائش کیوں نہ مجھ پر بند ہو جاتا
کہ کھولے تھے کبھی، بند قبائے مہ وشاں میں نے
جھکایا جا رہا ہوں، اس لئے پائے گدائی پر
کہ پہنا تھا علی الرغم قضا تاج شہاں میں نے

غبار وقت کی چادر پڑی ہے فرق سیمیں پر
کہ بخشی تھی جوانی کو قبائے کہکشاں میں نے

ٹپکتی ہیں دل سد پارہ سے اب خون کی بوندیں
پیے تھے ہائے کیوں رنگیں لبوں سے گلستاں میں نے

گرایا ہے مجھے قدرت نے خوش چشموں کی نظروں سے
کہ اپنی سمت پھیری تھیں ہزاروں انکھڑیاں میں نے

مرے ہونٹوں پہ قفل، اس جرم میں دنیا نے ڈالا ہے
کہ گونگی ادھ کھلی آنکھوں کو بخشی تھی زباں میں نے

کہوں کس سے کہ بالآخر بجبر قسمت راش
بنی ہے راگ کے ڈوروں سے پوشاک فغاں میں نے

وہاں بیٹھے ہوئے ہیں سسکیوں کے ہر طرف پہرے
جہاں آباد کی تھیں، مرکیوں کی بستیاں میں نے

نظر آتے ہیں کافور و کفن کے اب وہاں ڈیرے
جہاں کھولا تھا، باز ارحریر و پرنیاں میں نے

وہاں، قبروں کی لوحوں کے پڑے ہیں دور تک پتھر
سجائی تھی، جس انگنائی میں، شیشے کی دکاں میں نے

☆☆☆☆☆☆☆

اطراف و جہات کو مرتب کر لے
رو داد حیات کو مرتب کر لے
اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ
یادوں کی برات کو مرتب کر لے

☆☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

مس گلینسی

لکھنو کے ایک ہسپتال کی خوب رو، خوش چشم، اور کم سن لیڈی ڈاکٹر تھی۔

جب میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا تھا اس وقت میرے باپ نے اس کو ملیح آباد بھیجا تھا کہ وہ میری منکوحہ کا معائنہ کر کے اس کے بلوغ کا سرٹیفکیٹ دے دے۔

جب وہ ملیح آباد سے معائنہ کر کے آ گئی تو میرے باپ نے مجھے اس کے پاس بھیجا کہ میں اس سے اپنی منکوحہ کے بلوغ کی سند لے آؤں۔

میرے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے اور گلینسی کے درمیان معاشقہ ہو جائے گا تو وہ کبھی مجھ کو اس کے پاس نہ بھیجتے

میں اس کے وہاں پہنچا ابھی برآمدہ طے کر رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت خوب رو اور کم عمر عورت غسل خانے سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں کھڑی اپنی بھوری زلفیں نچوڑ رہی ہے اور چونکہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے اسے پہچان نہیں سکا اتنے میں اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کا انگریزی میں پوچھا آپ کون ہیں؟ میں نے کہا جوش اس نے بڑی جھانولی کے ساتھ کہا اور " Ebullitiom, aritation heat "(یعنی ولولہ، ہلچل، حرارت) اس کے اس انداز سے میں نے بھانپ لیا کہ تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے میں نے مسکرا کر پوچھا اور آپ کون ہیں اس نے سر کو جنبش دے کر کہا مس گلینسی میں نے کہا صرف ایک Glance (اچٹتی نظر کے واسطے آیا ہوں) وہ آنکھیں جھکا کر تبسم ہوئی اور پوچھا اور کوئی کام؟ میں نے کہا آپ میری منکوحہ کے معائنہ کی خاطر ملیح آباد گئی تھیں میں اس کی رپورٹ لینے آیا ہوں اس نے کہا میری خواب گاہ میں آ جایئے۔

وہ میرے بالکل سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور غسل صبوحی کی تازگی، و بالیدگی اس کے روئے گل گوں پر مچل رہی تھی

اس نے پوچھا آپ نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں، اس نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں، آپ کی بیوی کا رنگ بالکل ہم لوگوں کا سا ہے وہ بے حد خوبصورت ہے میں نے کہا بالکل آپ کی طرح؟ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔

اتنے میں اس کا ملازم تھالی میں ایک کارڈ لے آیا اس نے کارڈ پڑھ کر میز پر رکھ دیا کہا ٹھہرو، اور میری بیوی کے بلوغ کی سند میرے حوالے کر کے کہا آپ غسل خانے کے دروازے سے باہر چلے جائیں جب میں جانے لگا اس نے کہا اب کب آیئے گا میں نے کہا کل صبح کو اس نے کہا صبح کو نہیں شام کو آیئے گا ٹھیک سات بجے۔

جب میں نے جا کر اپنے باپ کو سٹرفکیٹ دیا وہ نہایت دانا تھے انہوں نے میرے چہرے کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا یہ تمہارا چہرہ اس وقت کیسا ہو رہا ہے؟

دل میں چور تھا باپ کی اس دیدہ وری سے گھبرا گیا، اور آنکھیں جھک گئیں میری اس حالت سے میرے باپ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا میں نے تمہیں اس ڈاکٹرنی کے پاس بھیج کر بڑی غلطی کی دیکھو خبردار اب اس کے پاس نہ جانا، ہرگز نہ جانا، میں نے بڑی معصومیت آمیز سعادت سے کہا بہت اچھا اور دل ہی دل میں کہا خدا کی قسم جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔

بابا تو جلوہ رخ جاناں نہ دیدہ!

دوسرے دن ٹھیک سات بجے میں اس کے وہاں پہنچ گیا، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے کھڑی تھی۔۔۔۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی کلی کی طرح چٹک گیا بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ہاتھ کیا تھا دھنکی ہوئی روئی کا گالا اور اس لہجے میں میرا مزاج پوچھا جیسے انگیٹھی میں فرط حرارت سے کوئلہ چٹک جاتا ہے، تڑاق سے۔

مجھ کو وہ بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں لے آئی بوائے خادم کو بلا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں حکم دیا کہ تم برآمدے میں بیٹھ جاؤ اگر کوئی آئے تو کہہ دو مس صاحب گھر پر نہیں

www.pdfbooksfree.pk

ہیں یہ کہہ کر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا مجھے خواب گاہ میں لے گئی کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے اور صوفے پر میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی پوچھا وسکی پیو گے یا برآنڈی یا بیئر؟ میں نے کہا میں پیتا نہیں ہوں، آپ شوق کریں اور میں آپ کی آنکھوں سے پیوں گا وہ بیئر کی بوتل اٹھا لائی اور پینے لگی جب دوسری بوتل آدھی ختم ہو گئی اس کے چہرے پر طلوع صبح کی سی دھاریاں مچلنے لگیں اور آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔

اب اس نے صوفے کی ٹیک پر اپنا سیدھا ہاتھ اس طرح پھیلا کر رکھ دیا کہ وہ میری گردن سے مل گیا مجھ کو جھرجھری سی آ گئی میں نے بھی اپنا ہاتھ اسی طرح پھیلا دیا اور ہمارے پہلوؤں کے درمیان اب ہاتھوں کا وجود باقی نہیں رہا دوسری طرف بوتل ختم کر کے وہ آہستہ سے میری طرف کھسک آئی میرے پہلو میں انگیٹھی سی جلنے لگی اور اعصاب کے اندر دھمال سا ہونے لگا۔

اس کے بعد وہ اٹھی روشنی بند کر دی پھر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی تاریکی میں اس کا مکھڑا اور بھی دمکنے لگا۔

اب اس نے اپنا گال میری طرف بڑھا دیا۔۔۔ میں نے اس کے گالوں کا رنگ اور اس کی جلد کی خوشی ڈغڈغا کر پی لی۔۔۔۔۔ اور پھر ہم دونوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔

اس کے بعد ایک دھیما سا بلب اس نے جلا دیا اور اس کے چہرے پر طوفانی رات کا پچھلا پہر مچلتا نظر آنے لگا۔۔۔ ارے جمال کی دوشیزگی ابھر آئی!

میں نے دیکھا گھڑی پونے نو بجا رہی ہے میں اپنے باپ سے حضرت گنج کی سیر کا بہانہ کر کے آیا تھا اور عرض کر دیا تھا نو بجے تک آ جاؤں گا اس لئے میں نے اجازت طلب کی اس کا منہ اتر گیا "نہیں تمہیں صبح 5 بجے تک یہاں ٹھہرنا ہے" اس نے بڑے تحکم سے کہا عشق اس قدر جلد گھل مل جاتا ہے گویا برسوں کے پرانے تعلقات ہیں

یہاں ماہ وسال کی گردشیں ایک لمحے کے اندر گھومنے لگتی ہیں۔

میں نے بڑی نرمی سے کہا میرے باپ بہت سخت آدمی ہیں میں ان سے نو بجے تک واپس آنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں۔۔۔۔۔وقت پر نہیں پہنچا تو بڑا غضب ہو جائے گا اس نے کہا اچھا کھانا تو کھالو میرے ساتھ، میں نے کہا کھانا کھالوں گا تو باپ پوچھیں گے یہ کھانا کہاں سے کھا کر آیا ہے۔

اس رات کے بعد میرے اس کے پینگ یہاں تک بڑھ گئے کہ ہم دونوں دوسرے تیسرے دن ملنے لگے، اور ہر بار ایک تشنگی سی لے کر جدا ہوئے۔

اس نے بے حد کوشش کی مجھے شراب پلانے کی مگر میں اس قدر کٹر اور احمق تھا کہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔

ایک بار رات کے وقت ہم لوگ تانگے میں ٹھنڈی سڑک سے گزر رہے تھے وہ میرے پہلو میں تھی اور علی شیر خان سپاہی موٹا سا لٹھ کاندھے سے لگائے کوچبان کے پاس بیٹھا تھا کہ چھتر منزل کلب سے ایک کار تیزی کے ساتھ نکلی اس کی روشنی مس گلینسی کے چہرے پر پڑی اس انگریز نے اپنی موٹر آڑی کر کے سڑک پر ٹھہرا دی اور ڈارلنگ کہہ کر پکارنے لگا اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی تانگے والے نے کہا صاحب بہادر راستہ دیجئے اس نے تانگے والے کو گالی دی میں نے کہا علی شیر خاں اس بندر کا دماغ درست کر دو۔

علی شیر خان نے اس کی کھڑی موٹر کے پاس جا کر کہا آپ ہمارا راستہ روکے ہوئے کیوں کھڑے ہیں اس نے گلینسی کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بھیج دو۔شیر علی خان نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا وہ موٹر سے اتر کر ہاتھا پائی کرنے لگا میں تانگے سے کود پڑا اور کوچبان کا ہنٹر اس پر برسانے لگا اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور وہ انگریز موٹر اسٹارٹ کر کے بھاگ کھڑا ہوا گلینسی نے میری پیٹ ٹھونکی اور کہا مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں تمہارے سے بہادر آدمی کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

جب تانگہ آگے بڑھا کھانچوں نے برا حال کر دیا اور وہ کہنے لگی آج ہی تمہاری موٹر کو خراب ہونا تھا یہ بھی کوئی سواری ہے "ٹھیک ،ٹھیک ،ٹھیک"

(لرزندگی ،لرزندگی ،لرزندگی)اس نے "ٹھیک" کو اس طرح ادا کیا کہ میرے تمام بدن میں سنسنی پیدا ہوگئی ۔

ایک رات کو جب میں گلینسی کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے زانو پر بیٹھی بیئر پی رہی تھی کہ اس کی خواب گاہ کا دروازہ یکا یک دھڑام سے کھل گیا اور ایک لمبا تڑنگا، ادھیڑ عمر کا انگریز جو اس کا چچا یا ماموں تھا ہاتھ میں پستول لئے لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا گلینسی اور میں دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑام سے مجھ پر گولی چلا دی گلینسی نے سقف شگاف چیخ ماری اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی نشانہ خطا ہو گیا تھا میں نے جست کر کے اس کی کلائی پکڑ لی اور پستول چھیننے لگا اسی کشمکش میں اس نے دوسری گولی چلا دی جو چھت میں جا کر لگی اور میں نے جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اتنے میں اس کے نوکر چاکر اور پڑوس کے بنگلوں کے دس بیس آدمی خواب گاہ میں آ گئے انہوں نے اس انگریز کو پکڑ لیا اس کے بعد تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی اور ہمارے بیانات قلمبند کرنے کے بعد اس انگریز کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی ۔

اس تھانے کا انچارج میرے باپ سے واقف تھا اس نے صبح ہوتے ہی یہ خبر میرے باپ تک پہنچا دی۔۔۔۔۔میرے باپ نے مجھ کو طلب کیا میں کانپتا ہوا ان کے سامنے گیا انہوں نے بڑی بھاری آواز میں ارشاد فرمایا میں نے منع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹرنی کے وہاں ہرگز نہ جانا لیکن تم نے میری بات نہ مانی یہ کہہ کر میرے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گیا میری ماں ہانپتی کانپتی آئیں اور پوچھا یہ کیا قصہ ہے میرے باپ نے سارا ماجرا بیان فرما دیا، میری ماں نے اپنے زانو پر میرا سر رکھ کر کہا اگر سو سو سمندر پار شیطان کے کان بہرے تیرے گولی لگ جاتی ننھے تو ہائے

میں کیا کرتی میں تو زندہ درگور ہو کر رہ جاتی ہائے ماں اللہ آمین سے پالے اور بچہ اپنے کو آفت میں ڈالے۔

اس کے بعد میں ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا اور در و دیوار کے سناٹے سے گلینسی گلینسی کی آوازیں آنے لگیں۔

میرے باپ نے پولیس کی منہ بھرائی کر کے مقدمے کو تو ختم کرا دیا لیکن مجھ کو قید سے باہر نہیں نکالا۔

ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اپنے زنداں میں اداس بیٹھا ہوا تھا، ایک بڑی مانوس آواز میرے کان میں آئی دل نے کہا ہو نہ ہو یہ تو گلینسی کی آواز ہے میں سلاخوں دار کھڑکی کے پاس گیا اور دیکھا کہ گلینسی میری ماں کے قدموں پر سر رکھے یہ درخواست کر رہی ہے کہ خدارا شبیر کو ایک نظر دکھا دیجئے اور میری رقیق القلب ماں ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میاں میرے باپ باہر گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی تک ٹھہر جاؤ اور گلینسی قدموں سے سر اٹھا کر بڑی بے کسی کے ساتھ میری ماں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا خاندانی آداب کا پاس اور غیرت کا احساس اگر میرے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو میں ایسی چیخ مارتا کہ میرے زنداں کی چھت گر پڑتی۔

میں نے بڑے زور سے اپنے سینے کو دبایا دانتوں پر دانت جما کر اپنی آہوں کو روکا اور دل پر اس قدر دھکا لگا کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا، گرتے ہوئے میز پر پاؤں لگا اور میز پر رکھی ہوئی اچاری پتھر کے فرش پر گر کر تڑاق سے ٹوٹ گئی میری ماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں جھپٹ کر میرے زنداں کا دروازہ کھلوایا اور ہائے میرے بچے کہہ کر زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

گلینسی کو موقع مل گیا وہ میرے کمرے کی طرف جھپٹی ابھی دہلیز تک پہنچی تھی کہ میرے باپ آ گئے انہوں نے یہ خلاف توقع سماں دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے اور ڈانٹ

کر فرمایا ڈاکٹر نی ابھی میرے باپ کچھ اور نہیں کہنے پائے تھے کہ وہ ''پاپا'' کہہ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئی میرے باپ لاکھ تند خو پٹھان سہی مگر شاعر تھے ان کا دل پسیج گیا اسے میرے زنداں میں لے کر آ گئے اور وہ میرا اترا ہوا منہ دیکھ کر رونے لگی۔

میں نے باپ کی موجودگی کے باعث اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی، اور اپنی رسوائی سے میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو گیا۔

میرے باپ نے کہا ڈاکٹر نی اگر تو مسلمان ہونے اور پردہ نشینی اختیار کرنے پر تیار ہے تو میں شبیر سے تیرا نکاح کرا دونگا میں دلوں کو توڑنے کا گناہ نہیں کرسکتا۔

گلینسی میرے باپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی سوالیہ انداز میں اس نے میرے باپ کی طرف نگاہ اٹھائی۔

میرے باپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا شبیر اس کو میری بات انگریزی میں سمجھا دے میں شرم کے مارے بول نہیں سکا تو میرے باپ نے کہا میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ انگریزی میں اس ڈاکٹر نی کو میری بات سمجھا دے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر انگریزی میں اس کو بات سمجھا دی اس نے کہا پاپا سے کہہ دو مجھ کو یہ دونوں شرطیں منظور ہیں۔

میرے باپ نے فرمایا اس سے کہہ دو جمعرات کے روز وہ یہاں آ جائے فرنگی محل چل کر مولانا عبدالباری کے سامنے مشرف بہ اسلام ہو جائے اور نوکری سے استعفٰی دے دے میں جمعہ کے دن اس کا نکاح پڑھوا دوں گا۔

میں نے گلینسی کو یہ بات سمجھا دی اور اس نے خوشی کے ساتھ منظور کر لی بدھ کے دن سر شام اس کے وہاں پہنچا تو اس کے بنگلے پر کچھ اس طرح کی سوگواری دیکھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ خدانخواستہ میں کسی نہایت الم ناک سانحے سے دو چار ہونے والا ہوں۔

جب ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو ایک شخص نے یہ کہہ کر مجھے اس کی خواب گاہ میں

جانے سے روک دیا کہ مس گلینسی پر دل کا بے حد شدید دورہ پڑا ہے ان کو گیس دی جا رہی ہے یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی دل زور زور سے دھڑکنے لگا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تمام بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی۔

اتنے میں وہ آدمی اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے مجھ سے کہا آپ باہر چلے جائیں میں ڈرائنگ روم میں آ گیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ اس کونے سے اس کونے کے درمیان ایک ایسے عالم میں ٹہلنے لگا جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد، جو میری نظروں میں ہزار ہا صدیوں کے برابر تھا ڈاکٹر نے باہر آ کر کہا افسوس کہ وہ مر گئی میں اسے بچا نہیں سکا میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

جب رات گئے ہوش آیا پہلے تو دیر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں اور یہ میری حالت کیا ہے جب تھوڑی دیر میں حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ میں ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں ہوں اور میرے باپ روبرو ننگے سر کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

میرے آنکھ کھولتے میرے باپ میری طرف جھکے اور بڑی مسرت آمیز نرمی سے پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا میاں میں اچھا ہوں میرے باپ سجدہ شکرانہ میں گر گئے میرے سر سے صدقہ اتارا گیا اور تمام ہسپتال میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

گلینسی کی موت نے مجھ کو ادھ موا کر دیا زندگی میری نظر میں بے معنی اور سپاٹ ہو کر رہ گئی مجھ کو ہر روز دو بجے دن کے بعد خفیف بخار آنے لگا اور چہرہ اس قدر اتر گیا کہ میرے باپ کو سخت تشویش پیدا ہوگئی وہ مجھ کو نینی تال لے گئے ابرار اور مختار کو میرا

www.pdfbooksfree.pk

جی بہلانے کے لئے ساتھ لے لیا ،میرے باپ میرے ساتھ نہیں ٹھہرے ایک دوسری کوٹھی میں قیام کیا اور صبح و شام ڈاکٹر کو لے کر آتے رہے۔

جب کوئی چار مہینے کے بعد سہ پہر کے خفیف بخار سے مجھ کو نجات حاصل ہو گئی اور میرا رنگ ٹھہرنے لگا تو ملیح آباد لے آئے اور ایک سال تک لکھنو جانے نہیں دیا۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے یہ بات سچ ہے لیکن سو فیصد صحیح نہیں ہر چند وہ اگلی سی اداسی باقی نہیں رہی لیکن بار بار دل میں برسوں کسک ہوتی رہی اور اب بھی جب اس عمر میں بھی گلنیسی کی موت یاد آجاتی ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔

ہائے وہ اپنا دین بدل رہی تھی ، پردہ نشینی کی گھٹن پر آمادہ ہو گئی تھی مرنے سے ایک روز پیشتر استعفیٰ بھی دے چکی تھی اور جمعے کو دلہن بننے والی تھی بدھ کو ہمیشہ کے واسطے سو گئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا
درد اکہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
کشتی شکستگانیم اے باد شرط بر خیز
باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

☆☆☆☆☆☆

م بیگم

یہ ایک دیسی ریاست کا ذکر ہے میں ایک نواب صاحب کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا چھوٹے دادا اور ابرار میرے ساتھ تھے۔

اس حویلی کے ایک گوشے میں ایک دوسری حویلی تھی جس میں نواب صاحب کے فرزند رہتے تھے ایک دن میری غیر موجودگی میں ابرار اپنا سامان اٹھا کر چھوٹی حویلی میں منتقل ہو گئے اور رہنے لگے اس کے بالا خانے پر میں نے ابرار سے اس انتقال مکانی کا سبب دریافت کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے مجھ کو یقین ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

میں شام ہوتے ہی ان کے پاس پہنچ گیا مجھ کو دیکھ کر ان کے منہ پر کلونچ سی دوڑ گئی میں نے پوچھا ابرار کیا بات ہے انہوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا کیا بتاؤں میری پیٹ میں لو لگ گئی ہے میں نے کہا یہ پیٹ میں لو لگنا کیا ہوتا ہے لو تو پورے جسم کو جھلسا دیتی ہے اور تمہارا بدن چھوڑ کر صرف تمہاری پیٹ پر لو کا اثر ہوا ہے کیا گھانس کھا گئے ہو؟ یا مجھے چندھلا رہے ہو۔

ابرار نے کہا شبیر حسن خان قرآن مجید کی قسم سچ کہہ رہا ہوں ۔۔۔۔ کہ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ۔۔۔ آدھا پٹ کھلا اور اس سے جھانکا م بیگم[1]

---

[1] وہ حسینہ چھوٹے نواب صاحب کے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ تھی جو نہایت بد شکل اور مادر زاد نامراد بھی تھا

نے ۔۔۔۔ اللہ اکبر وہ اس کی اٹھتی جوانی، وہ شہابی رنگ وہ دھانی دوپٹہ اور وہ کتابی مکھڑا بس ایک ہی نظر میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور جب ایک پل کے بعد اس نے پٹ بند کر لیا تو میں نے کہا جناب ابرار حسن خان صاحب اثر ملیح آبادی:

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں

مجھ سے بھی وہ اڑیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

وہ جو آپ کی پشت مبارک میں لو لگ گئی ہے اس کو میں نے دیکھ لیا ہے اور اس کو دیکھ کر میرے سینے میں بھی لو لگ گئی ہے کہئے کیا ارشاد عالی ہے؟

ابرار نے کہا شبیر حسن خان قرآن مجید کی قسم یہ بات نہیں میں تو اس لڑکی سے واحد شاہد ہی نہیں ،قرآن مجید کی قسم آج پہلی بار اس کو دیکھا ہے۔

میں نے کہا خاں صاحب اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو مجھ کو یہ سوچ کر بڑا اطمینان محسوس ہو رہا ہے کہ میرے آپ کے مابین رقابت کا قدم نہیں آنے پائے گا جگنو سے کہئے میر البستر یہیں لے آئے ابرار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں انہوں نے کہا شبیر حسن خاں یہ کمرہ بڑا خطرناک ہے یہاں رات کو بچھو نکلتے ہیں اور ایک دن تو ایک کالا سانپ بھی رینگ کر اس سامنے والی نالی میں داخل ہو گیا تھا۔

میں نے کہا ابرار حسن [1] خان پھر آپ اس خطرناک جگہ کیوں قیام فرما ہیں

انہوں نے کہا میری جان ،قرآن مجید کی قسم آپ کی جان کی سی قیمتی نہیں ہے میں نے کہا بجا ارشاد فرمایا آپ نے جس کی خاطر آپ اپنی جان کو اس قدر خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں میں بھی اسی کی خاطر اس خطرے کو اپنے سر لے رہا ہوں بلایئے جگنو اور منگایئے میر البستر ابرار کا منہ ذرا سا نکل آیا وہ بوڑھوں کی طرح جھکے جھکے اٹھے جگنو کو دھڑکتے دل سے آواز دی جگنو۔

---

1. کبھی کبھی میں ان کو اس نام سے بھی پکارا کرتا تھا

موجود نہیں تھا، اسے تلاش کرنے کے لئے، زینے سے اتر کر، بڑی حویلی چلے گئے

اتنے میں دوبارہ پٹ کھلا اور اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا۔

میں نے اس نچوڑی کی طرف نگاہ اٹھائی دل حسن کی شفق میں ڈوب گیا اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اس کی نظروں نے بات کی میری نگاہوں نے جواب دیا آنکھوں کی زبان اس قدر سلجھی صاف اور دوٹوک ہوتی ہے کہ غلط فہمی کا امکان ہی نہیں

رہتا آنکھوں کی بات چیت ہوا میں نہیں تیرتی، خون کی لہروں میں ڈوب جاتی ہے ایک دل کہتا ہے، دوسرا دل سمجھ لیتا ہے۔

نگاہے معنی وارد کہ در گفتن نمی آید

اور ہم دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا۔

اتنے میں ابرار آ گئے انہوں نے پٹ بند ہوتے اور میرے چہرے پر غرفہ راز و نیاز کھلتے دیکھ لیا سن سے ہو کر رہ گئے ان کے چہرے کی بشاشت کا خیمہ گر گیا وہ میرے سامنے اپنی ذہانت اور طاقت کھو کر خاموش ہو کے بیٹھ گئے اور میرے بچھے ہوئے بستر کو اس طرح دیکھنے لگے گویا ان کی قبر کھود دی گئی ہے۔

میں نے کہا ابرار تم کہو تو اپنا بوریا بدھنا اٹھا کر بڑی حویلی میں چلا جاؤں۔ تھوڑی دیر کچھ سوچ کر انہوں نے جواب دیا آیئے، ہمارے آپ کے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ ہو جائے آپ یہیں رہیں لیکن ہم دونوں اپنے اپنے در بانٹ لیں ایک در کے نیچے انگنائی میں گائے بندھی ہوئی ہے ایک در کے نیچے گھڑونچی رکھی ہوئی ہے آپ جو در چاہیں پسند کر لیں میں نے کہا گھڑونچی والا در مجھے دے دو گائے والا اور تم لے لو میرے در کا تعلق ہوگا پانی سے اور تمہارے در کا دودھ سے ابرار نے یہ تقسیم منظور کر لی اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دروں میں اس پری زاد کی چال پھرت دیکھنے کے لئے اس طرح دن دن بھر بیٹھنے لگے جیسے ماہی گیر دریا میں جال ڈال کر ساحل پر بیٹھے نظر آتے ہیں ارے میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب ہمارے مابین دروں کی تقسیم ہوئی تھی تو ابرار نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھئے ہم دونوں بڑی ایمانداری کا کھیل کھیلیں گے اگر وہ میرے در کے سامنے زیادہ آپ کے در کے سامنے زیادہ آئے گی یا آئے گی ہی نہیں تو آپ اس کے عشق سے دستبردار ہو جائیں گے اور معاملہ اس کے برعکس ہوا تو میں دست بردار ہو جاؤں گا۔

جب ہم ڈھکی لگا کر دروں میں بیٹھنے لگے تو اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس پری زاد نے اد

بدا کر میرے در کے نیچے کی انگنائی میں آنا اور اوپر آنکھیں اٹھانا شروع کر دیا اور ابرار بے چارے کا درسونا ہو کر رہ گیا۔

میں کیا بتاؤں اس کے آنکھیں اٹھانے کے انداز قاعدہ ہے بجلی اوپر سے نیچے گرتی ہے لیکن جب وہ انگنائی سے میرے در کی طرف آنکھیں اٹھاتی تھی تو نیچے سے اوپر بجلی گرنے لگتی تھی۔

اس کی متواتر بے اعتنائی سے ابرار کا دل ڈوبنے لگا مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی میں نے کہا ابرار اب میں کل ہی بڑی حویلی اٹھ جاؤں گا ابرار نے کہا اب آپ کا یہاں سے اٹھ جانا بے کار ہے اس کا دل آپ پر آ گیا ہے میں اس کی نظروں سے گر چکا ہوں قرآن مجید کی قسم ایسی بے وفا عورت پر میں لعنت بھیجتا ہوں اب آپ یہاں رہیں میں بڑی حویلی میں اٹھ جاؤں گا میں نے ابرار کو گلے لگا لیا اور کہا نہیں تم بڑے حویلی میں ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔

ان باتوں میں رات کے نو بج گئے اور ہم دونوں کھانا کھا کر سو گئے۔

غالباً آدھی رات گزر چکی ہو گی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی نہایت ملائم چیز میرے تلوؤں سے مس ہو رہی ہے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔۔۔اور یہ دیکھ کر دنگ ہو گیا کہ وہ آفت روزگار، میرے تلوؤں سے اپنے گال لگائے بیٹھی ہے، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

میں نے اسے کھینچ کر کلیجے سے لگا لیا، اس نے ابرار کی چارپائی کی طرف اشارہ کیا میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

پچھلے پہر جب وہ سینے پر دوپٹہ ڈال کر اور موباف باندھ کر رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا میرے ابا میری اس شادی سے خوش نہیں ہیں وہ کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے طلاق دے کر گوالیار لے جائیں اور میری دوسری شادی کر دیں اب میں آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی کل آپ جا رہے ہیں میں آپ کو مجبور نہیں

کر سکتی اس لئے کہ آپ کی اماں جان نے تار دے کر آپ کو بلایا ہے لیکن میرے سر کی قسم سات دن کے اندر آ جایئے گا اگر آپ نہیں آئیں گے تو ابا مجھ کو گوالیار لے کر چلے جائیں گے مجھے مجبور کریں گے دوسری شادی پر اور میں زہر کھا کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گی۔

میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا سات دن تو بہت ہوتے ہیں میں چوتھے یا پانچویں دن ہی آ جاؤں گا اور تم کو آ کر لے جا کر اپنے ایک قرابت دار کے گھر میں رکھوں گا اور وہاں سے ہم دونوں پھر لکھنو چلے جائیں گے دیکھو بالکل نہ گھبرانا میرا وعدہ پکا ہے وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگی اور میرے آنسو بھی بہنے لگے۔

دوسرے دن جب میں گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن جانے لگا اس نے بالا خانے کے غرفے سے مجھ کو جھانک کر دیکھا اس کی موتیوں کی سی آب دار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور برستی آنکھیں چیخ رہی تھیں کہ وقت پر آ جانا۔

ملیح آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابرار نے میری ماں کو میرا سارا کچا چٹھا لکھ بھیجا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں اس ریاست میں رہا تو میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

ماں سے میں نے شرم کے مارے ابرار کے خط کا کچھ نہیں پوچھا لیکن جب تیسرے دن میں نے اس ریاست کے سفر کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا اگر تو وہاں گیا تو دودھ نہیں بخشوں گی میرے سر کی قسم وہاں قدم نہ رکھنا۔

ماں کی اس شدید تاکید کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ابرار کے خط والی بات صحیح ہے ایک طرف تو ماں کا احترام اور ایک طرف اپنے وعدہ محکم کا پاس میں عجب کش مکش میں پڑ گیا اور دل پر کچھ ایسا دھکا لگا کہ بلبلا کر مجھ پر بخار چڑھ آیا اور ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ گیا گھر بھر میں کہرام مچ گیا دن میں چار چار پانچ پانچ بار ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آنے لگے بار بار میرے سر پر برف رکھی گئی دو دو گھنٹے کے بعد پاؤں میں جھانویں کئے گئے تین تین گھنٹہ میں دوائیں پلائی گئیں منتیں مانی گئیں ہر صبح کو قرآن کی ہوائیں دی

گئیں پھر بھی بیس روز سے پہلے بخار نہیں اترا اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

ابھی میں پورا تندرست ہونے نہیں پایا تھا کہ میرے پاس اس ریاست سے میرے ایک محرم راز کا خط آیا کہ ''م۔ بیگم'' کو اس کا باپ گوالیار لے کر چلا گیا وہاں اس کی شادی ٹھہرائی اور عین اس وقت جب کہ گھر میں شادی کے ڈھول بج رہے تھے اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، جوڑی آ گئی جوڑی کے بعد بخار آ گیا اور ایک دم سے ایک سو تین ڈگری ہو گیا۔

کہاں تک بیان کروں اپنی دردمندی جسم کو بخار جلا رہا تھا اور دل میں اس نامراد کی خودکشی کے شعلے بھڑک رہے تھے اور لہر بن موسے ہائے ہائے کی آوازیں آ رہی تھیں اللہ دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ میں کم بخت مر کیوں نہیں گیا۔

اللہ اکبر یہ تیغ در دست و کفن بر دوش قاتل زندگی

جہاں بسمل گہ درد است، آسائش کہ دید ایں جا؟
بقدر سخت جانی، ہر کسے، برخود طپید ایں جا!

صاحب ''زہر عشق'' نے عشق کے باب میں کتنی سچی بات کہی ہے:

بس میں ڈالے نہ کبریا اس کے
رحم دل میں نہیں ذرا اس کے
مار ڈالا تماش بینوں کو
زہر کھلوا دیا حسینوں کو

☆☆☆☆☆☆☆☆

زندگی، خواب پریشاں ہے کوئی کیا جانے

www.pdfbooksfree.pk

موت کی لرزش مژگاں ہے کوئی کیا جانے

رامش و رنگ کے ایوان میں لیلائے حیات

صرف اک رات کی مہماں ہے کوئی کیا جانے

گلشن زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں

دجلہ خون رگ جاں ہے کوئی کیا جانے

رنگ و آہنگ سے بجتی ہوئی یادوں کی برات

رہ رو جادہ نسیاں ہے کوئی کیا جانے

☆☆☆☆☆☆

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

رنگ کماری

ایک بار مختار احمد خان ملیح آبادی سے ملنے اور سیر کرنے کلکتے جا رہا تھا چھوٹے دادا جگنو اور علی حسین خدمت گار ہم سفر تھے۔

میرے ڈبے میں ایک سیٹ پر ایک بوڑھا انگریز لیٹا ہوا تھا اور ایک سیٹ پر ایک دراز قامت گل چہرہ چھریری لڑکی آدھی لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی میں درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا اس کے نکیلے چہرے کی موج ہائے رنگا رنگ سے نکل نکل کر ایک سنہرا آنکڑا بار بار میری طرف آتا اور میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے لے کر اس کے گالوں کی طرف لے جاتا تھا یہ مشغلہ تا دیر جاری رہا لیکن وہ مطالعے میں اس قدر مستغرق تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میں کب ڈبے میں داخل ہوا اور کیسی ترسی نظروں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اس کی کتاب پر نظر جمائی تو دیکھا کہ وہ شیکسپیئر کو ڈراما ''رومیو جولیٹ'' کا مطالعہ کر رہی ہے میرے دل نے کہا آثار اچھے ہیں نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا انشاءاللہ۔

تھوڑی دیر میں ہوا بہت ہی تند ہو گیا ور وہ اپنے شیشے والی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نازک بدن سے کھڑکی نہیں سنبھل رہی ہے اور اس کی گوری گوری کلائیاں لچکی جا رہی ہیں میں اس قدرت کے عطا کردہ زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے واسطے جلدی سے اس کے قریب گیا اور شیشہ چڑھا دیا اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا گویا اس نے کوئی چیز جلدی سے نگل لی مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا ہاتھ سے کتاب رکھ دی اور ماتھے سے لٹیں ہٹانے لگی اور میں نے دل ہی دل میں کہا مبارک ہو میاں جوش۔

سر شام گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو وہ بوڑھا ہم سفر انگریز اتر گیا اور میں دعائیں مانگنے لگا کہ اب کوئی دوسرا مسافر آخر تک نہ آئے۔

www.pdfbooksfree.pk

جب گاڑی وہاں سے چلی اور کوئی مسافر ہمارے درجے میں نہیں آیا میرا دل باغ باغ ہو گیا اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کے چہرے پر اس صورت حال سے بحالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

اب ہماری نگاہوں کے جلد جلد مبادلے ہونے لگے لیکن ایک دوسرے سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔۔۔۔اور میں سوچنے لگا کہ بچپن کی تربیت انسان کو کس قدر شرمیلا بنا دیتی ہے۔

اب آفتاب ڈوب گیا، اور میں اپنے طلوع کی تیاری کرنے لگا۔۔۔۔بوتل کھولی کاک بولا کھٹاک کچھ سے دیا سلائی سلگائی اگر بتی جلائی گلاس بھرا چمچے سے سوڈے کو گردش دی جھاگ اٹھے چمچہ گلاس سے نکالا گیس کی پتلی سی کمر لچکنے لگی ایک گھونٹ زیر لب بسم اللہ کہہ کر پیا تین منٹ کے اندر طبیعت اجاگر اور امنگ بیدار ہو گئی۔

جب دوسرا جام بھرا اس نے آہستہ سے کہا رام رام میں نے پوچھا کیا بات ہے اس نے کہا اگر کی لپٹیں ہردے میں اترتی چلی جا رہی ہیں میں نے کہا بجھا دوں؟ اس نے کہا نہیں ایک بتی اور جلا دیجئے میں نے دوسری بتی جلا کر پوچھا آپ کہاں جا رہی ہیں اس نے کہا بنارس، اس نے دریافت کیا اور آپ؟ میں نے کہا کلکتے اس کے چہرے پر دھواں سا دوڑ گیا۔

اس نے پوچھا آپ کا نام میں نے کہا جوش میں نے پوچھا آپ کا نام؟ اس نے کہا ''ر۔کماری'' اس نے کچھ ایسی لٹک سے اپنا نام بتایا جیسے کوئی کسی مفلس کو خزانے کا پتا بتاتا ہے۔

میں نے دریافت کیا آپ کرتی کیا ہیں اس نے کہا فرسٹ ائیر میں پڑھتی ہوں تیسرے جام کا ایک گھونٹ پینے کے بعد میں اپنا بستر درست کرنے کے بہانے سے بالقصد لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور یہ ظاہر کیا کہ میرے جسم کا توازن بگڑ گیا ہے اور جب تکیے سیدھے کرنے کو جھکا تو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف اس طرح جھک گیا کہ

www.pdfbooksfree.pk

میرے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جا کر ٹک گئے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی میں معافی طلب کرتا سیدھا ہونے لگا تو اس نے اپنے ملائم ہاتھوں سے میری دونوں کلائیاں پکڑ لیں اور کہا جلدی سے بیٹھ جایئے نہیں تو گر پڑیئے گا یہ کہتے ہی اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے کہا ڈرنک بری چیز ہے یہ آدمی کو گرا دیتی ہے میں نے کہا آپ کو کیا معلوم اس نے کہا ابھی ابھی تو آپ ہی کو گرتے ہوئے دیکھا ہے، اور میرے پتا جی بھی ڈرنک کرتے اور ڈگمگانے لگتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے بال کھول دیئے سدری اتار دی گھڑی کلائی سے نکال کر سرہانے رکھ لی میرے پہلو سے پہلو ملا دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کور کھٹکنے لگی اور میں اس کے چھلکتے ساغر جمال میں ڈوب گیا۔۔۔۔

صبح آنکھ کھلی ایک عجیب شیریں تبسم کا تبادلہ ہوا اور ایسا لگا جیسے ہم ایک ہزار برس سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں اور آپ سے گزر کر تم کی نوبت آ گئی۔

محبت کتنے برسوں کے فاصلے ایک چھلانگ میں طے کر لیتی ہے

وہ ایک جادو کے جزیرے کی پری کی مانند بستر سے اٹھی الجھے بال سلجھائے اور میری سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک شہزادی کی مانند کہا تم اب کلکتے نہیں جاؤ گے بنارس میں اترو گے میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا جو حکم ہو دیوی جی کا۔

پھر اس نے کاہ اب تم جوشی نہیں جوشی ہو اپنا پرانا نام بھول جاؤ میں نے کہا بہت اچھا سرکار۔

اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی اس کا بوڑھا خادم آ گیا غسل کا سامان غسل خانے میں رکھ دیا اور جب وہ نہا کر نکلی فضا پر صبح بنارس طلوع ہو گئی۔

اس نے اپنے کالج اور سڑک کا نام بتایا کہا کہ میرے کالج کے سامنے ایک نہایت عمدہ ہوٹل ہے تم اس میں ٹھہر جانا میں انٹرول میں ملنے آؤں گی۔۔۔۔اور دیکھو بنارس اسٹیشن پر بالکل اجنبی بن جانا۔

میں دوسرے اسٹیشن پر چھوٹے دادا کے کمپارٹ منٹ گیا ان سے کہا اب میں بنارس اتروں گا اس کے بعد کلکتے جاؤں گا چھوٹے دادا نے منہ بنا کر حسب دستور کہا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے آخر بنارس میں کیا کام نکل آیا ہے بھائی شبیر حسن خان یہ اس لڑکی نے شاید نیا گل کھلایا ہے جو آپ کے ڈبے میں سفر کر رہی ہے دیکھئے ہندو مسلم نفرت کا آغاز ہو چکا ہے۔

میں نے کہا چھوٹے دادا آپ اطمینان رکھیں

جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب ورکیب سب جانتے ہیں

چھوٹے دادا نے ملازموں کو خبر کر دی اور جب بنارس کا اسٹیشن آیا میں نے اس لڑکی سے بیگانگی اختیار کر لی سوکھے منہ سے اترا، اور اس کے بتائے ہوئے ہوٹل میں جوشی کے نام سے ایک کمرہ لے کر ٹھہر گیا۔

کمرے میں پہنچ کر چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خان ہم کو آپ کی یہ باتیں پسند نہیں بنارس میں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے میں نے بنارس اسٹیشن سے پہلے ہی تینوں لوٹے چرے کے تھیلے میں بند کر دیئے تھے کہ کوئی یہ نہ بھانپ سکے کہ ہم مسلمان ہیں آپ کہتے ہیں وہ یہاں دوپہر کو آئے گی اگر کسی کو اس کا پتہ چل گیا اور پتہ چلنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے تو ہم سب یہیں قتل کر ڈالے جائیں گے دیکھئے ہم سب پہلے ہی سے کہے دیتے ہیں میں نے کہا چھوٹے دادا پٹھان ہو کر آپ ایسی ڈر جانے والی باتیں کر رہے ہیں انہوں نے کہا پٹھان ہونے سے کیا ہوتا ہے ایک کی دوا دو دو کی دو چار ایک آدمی ایک غول کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے کہ اتنے میں دروازہ کھلا وہ ایک مزدور کو ساتھ لئے کمرے میں در آئی مزدور سے کہا سامان یہاں رکھ دو مزدور نے سامان رکھ دیا اور اجرت لے کر چلا گیا چھوٹے دادا اور دونوں خدمت گار بھی کمرے سے نکل کر برآمدے میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔۔۔اس نے ڈبے کھول کھول کر میز پر مٹھائی اور

پھلوں کا انبار لگا دی اپنی جیب سے نہایت خوبصورت سونے کی گھڑی نکال کر اپنے دست ناز سے میری کلائی پر باندھ دی ایک بنڈل کھول کر دو دھوتیاں اور دو شرٹ جی کرتے میرے سامنے رکھ کر اس نے کہا کل بہت تڑکے گنگا جی کے گھاٹ پر یہ دھوتی باندھ کر اور یہ کرتہ پہن کر آ جانا اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو جانا میں تم کو۔۔۔۔ مندر لے چلوں گی۔

یہ کہہ کر اس نے ایک لپٹا ہوا زنار نکالا اور کہا اسے گلے میں ڈال لینا اس کے بعد ایک ڈبیا سے چندن نکال کر کہا اسے چلتے وقت ماتھے پر لگا لینا۔

میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔۔۔۔۔ کماری چائے پیو گی ، یا آئس کریم کھاؤ گی۔

اس نے بڑے مزے سے کہا تمہارا درشن چائے ہے اور تمہاری باتیں آئس کریم اور میں نے اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد چھوٹے دادا غضب و خوف کو اپنی مونچھوں اور گالوں پر بٹھائے کمرے میں آئے اور میں نے سارا ماجرا ان سے بیان کر دیا ان کے ہوش اڑ گئے ، کہا ارے غضب خدا کا بنارس کے مندر میں ہندو بن کر جاؤ گے اگر خدانخواستہ کسی نے تم کو پہچان کر شور مچا دیا تو کیا کرو گے یہ کلکتے کا سفر تو بڑا خطرناک ثابت ہوا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے میں نے کہا چھوڑیئے بھی ان باتوں کو یہ مٹھائی اور پھل کھائیے اور وہ تمام خطروں کو یکسر بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑے اور خود ان کے بقول کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیئے۔

میں صبح جب گنگا کی طرف پورا ہندو بن کر چلنے لگا تو چھوٹے دادا کانپنے لگے مجھ کو بہت سمجھایا میں نے ان کی بات نہیں مانی پھر جگنو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا منجھلے بھیا اگر جانے ہی کی ٹھان لی ہے تو مجھے اور علی حسین کو ساتھ لے لیجئے ہمارے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور جیب میں چاکو، میں نے کہا جگنو کوئی خطرے کی بات نہیں تمہارا

میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔

یہ کہہ کر میں روانہ ہو گیا اور جب راستے میں مڑ کر دیکھا تو جگنو اور علی حسین نظر آئے

میں نے اشارے سے کہا مجھ سے دور رہو انہوں نے اپنی چال سست کر دی۔

گھاٹ پر پہنچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ہائے وہ دھند لکے کا جادو بھرا

گھاٹ، وہ گنگا مائی کا گنگناتا پاٹ۔۔۔۔وہ الھڑوں کے قدم اٹھانے کا ڈھنگ،

جیسے چلتے پھرتے رنگ گوری نکس چلو مورے سنگ۔

وہ بہکی بہکی جوانیاں وہ حسن کی دھندلی دھندلی گل فشانیاں۔۔۔۔۔۔۔وہ متوالی

ڈبکیاں، وہ نداسی انگھڑیاں۔۔۔۔۔وہ دھند لکے میں الھڑ کنیاؤں کا ریلا گویا خواب

میں پریوں کا میلا وہ بھیگی ململ کی ساریوں کی عریاں سامانی گویا کہرے میں برستا پانی

سنگ مرمر کے قبوں کی تابانی وہ پلکوں کی جھپکوں میں بجتی شہنائیاں وہ لہروں میں ڈوبی

گدرائیاں وہ اشنان کا نکھار وہ مکھڑوں کی چہکار وہ نسیم صبح کی سرسراہٹیں وہ گلابی

مسکراہٹیں وہ کمروں کے لچکاؤ وہ بے ناچ کے بھاؤ وہ دھلے دھلے گال وہ چکنے چکنے

خدوخال لہروں میں وہ ہلکی ہلکی سارنگیاں اور وہ دوپٹوں میں بھیگی بھیگی نارنگیاں۔

خورشید طلوع ہو رہا ہے
افسانہ، شروع ہو رہا ہے

اسی جادو بھری سہانی فضا میں میرے من مندر کی وہ دیوی میرے سامنے آئی گویا

گوکل بن میں صبح مسکرائی۔۔۔۔۔۔اور

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

پھر اس نے مجھے آواز دی جوشی بھیا میرے پیچھے پیچھے آؤ اور میں جوشی بھیا کے

مزے میں ڈوبا ہوا گردن ڈال کر اس کے ساتھ ہولیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد جمال و جلال میں ڈوبا ہوا مندر نظر آیا اس نے اشارہ کیا

اور میں خدا کا نام لے کر بت خانے میں داخل ہو گیا اور بھجن سننے لگا اور بھجوں، گھنٹیوں اور لپٹوں میں ڈوب کر جاری ہو گیا میرے دل کی زبان پر "لاموجود الا اللہ"

اس عالم استغراق میں ایک جانب میری نگاہ اٹھی دیکھا کہ ایک صاحب مجھ کو عجیب کش مکش کے عالم میں گھور رہے ہیں میرا دل سن سے ہو گیا اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہا گر مجھ کو پہچان کر انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ بھائیو ہمارے اس مندر میں ایک ملچھ مسلما بیٹھا ہوا ہے تو میں پل بھر میں دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جاؤں گا چھوٹے دادا نے سچ کہا تھا کہ تم بڑا خطرناک کام کر رہے ہیں۔

دل سے آواز آئی، عشق بازی کرو اور پھر بھی مرنے سے ڈرو، مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ معشوق کے قدموں میں جان دے دو اور با آواز بلند کہو:

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

ارے تیغ و خنجر ــــــ بر پاپوش قلندر را!

یہ سوچ کر میں نے اپنی طرف گھورنے والے کی جانب پھر نظر اٹھائی، اس نے سر کی جنبش سے مجھے سلام کیا میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا، اور اس یقین کے ساتھ کہ مجھ کو پہچان لیا گیا ہے قتل پر آمادہ ہو کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں بھجن ختم ہو گئے مجمع برخواست ہونے لگا وہ بھی کھڑی ہو گئی باہر چلنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے مندر کے باہر آ گیا۔

ابھی ہم دونوں چند قدم ہی چلے تھے کہ پشت سے آواز آئی جوش صاحب آداب عرض ہے میں نے مڑ کر جواب دیا دیکھا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو مجھے گھور رہے تھے انہوں نے قریب آ کر کہا بندے کا نام بدری پرشاد بدر ہے میں نے آپ کو الہ آباد کے مشاعرے میں دیکھا تھا میں نے کہا آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں آپ

کی ادب نوازی اور شرافت کا قائل ہو گیا کہ آپ نے مجھ کو مندر میں دیکھا اور خاموش رہے، انہوں نے کہا بندہ پرور میں کائستھ ہوں ہمارا اور مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے آپ شاعر کی حیثیت سے مندر مسجد اور گرجا سب جگہ جانے کا حق رکھتے ہیں آپ کا قیام کہاں ہے میں جی بھر کے آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ آدمی بہت شریف اور بے خطر تھے لیکن اس خوف سے کہ وہ ہوٹل میں آئیں اور ان سے اس کی مڈبھیڑ ہو جائے میں نے کہا میں آج سہ پہر ہی کو کلکتہ چلا جاؤں گا۔

انہوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور یہ شعر سنا کر چلے گئے۔

میان کعبہ وبت خانہ فرق یک گا میست
میان شیخ و برہمن، ہزار ہا فرسنگ

جب میرے اور بدر صاحب کے مابین بات چیت ہو رہی وہ تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی سن رہی تھی اس کے چہرے کا عجیب عالم تھا اور اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ چہرے پر ایک رنگ آ رہا، اور ایک جا رہا تھا راستے بھر وہ کچھ نہیں بولی اور ہوٹل پہنچتے ہی وہ دھڑام سے بستر پر گر پڑی مجھ سے کہا جلدی پانی لاؤ پانی پی کر وہ اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی جب وہ آدمی تم سے بات چیت کر رہا تھا میری چھاتی دھک دھک ہو رہی تھی کہ ہے رام اب کیا ہو گا میں نے کہا پیاری تمہارے پریم میں مر جانا سو زندگیوں سے بہتر ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آنکھیں پوچھتی کالج چلی گئی۔

اتنے میں چھوٹے دادا کمرے میں داخل ہوئے اور منہ پھلا کر کہنے لگے بھائی شبیر حسن خان اس خطرے میں کب تک پڑے رہو گے میں نے کہا بس دو چار دن اور رہوں گا۔

لیکن رکماری نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں کچھ اوپر ایک مہینہ تک مجھے رو کے دکھا کیا بتاؤں ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات

ایک دن وہ انٹرول میں بے حد گھبرائی ہوئی آئی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں

اس نے جلدی جلدی سانس لے کر کہا تیرے پتا جی کو میرے پریم کا پتہ چل گیا ہے یہ خبر اس ہوٹل کے کسی آدمی نے ان تک پہنچا دیا ہے پتا جی کے تیور بہت برے ہیں میں تو سب کچھ بھگت لوں گی لیکن تم آج ہی بلکہ ابھی ابھی یہاں سے چلے جاؤ میں کرسمس کی چھٹی میں اپنی چاچی سے ملنے لکھنو آؤں گی اپنا پتہ لکھ دو میں نے اپنا پتہ لکھ دیا اس نے کہا اچھا رام رام یہ کہہ کر وہ رک گئی اور چیخ مار کر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور ہم دیر تک چمٹے ہوئے روتے رہے اور اس کے بعد وہ مجھ کو مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی رخصت ہو گئی اور میرے دل پر بجلی گر پڑی اور میں اسی وقت بنارس سے رخصت ہو گیا۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

☆☆☆☆☆☆☆☆

ط،ج

ایک بار میرا قیام تھا ایک بہت بڑے شہر میں اور میرے پڑوسی تھے ایک چالیس سال کے نواب صاحب وہ شعر تو معمولی کہتے تھے لیکن سخن سنجی میں ان کو بڑی دست گاہ حاصل تھی ۔

میں گاہ گاہ ان کے محل میں جایا کرتا تھا اور شاعری کے ساتھ ساتھ گانے بجانے کی صحبتیں بھی گرم ہوا کرتی تھیں ۔

ایک روز کوئی دس بجے میں ان کے وہاں پہنچا دیکھا کہ اطاق پذیرائی ڈرائنگ روم خالی پڑا ہوا تھا میں سوچنے لگا کہ یہ وقت تو ان کے موجود ہونے کا ہے آخر وہ کہاں چلے گئے ۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بغلی کمرے سے ۔۔۔بوا ایک مخملی تھیلی اٹھائے میری طرف بڑھیں میں ٹھٹک گیا بوا نے مجھے سلام کر کے تھیلی میری طرف بڑھا دی میں نے کہا اس میں کیا ہے انہوں نے کہا الائچیاں میں نے پوچھا کس نے بھیجی ہیں بوا نے کہا بی بی[1] جان نے بھیجی ہیں میں نے پوچھا یہ بی بی جان کون ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹخا کر کہا اے میں قربان جاؤں نواب صاحب بہادر کی منجھلی صاحبزادی ہیں میں نے بھونچکا ہو کر کہا بوا میں نے تو آج تک انہیں دیکھا ہی نہیں ہے انہوں نے کہا آپ دیکھتے کیسے وہ تو جم جم پردے

[1] جان کو گھر والے بی بی جان کہتے ہیں

میں رہتی ہیں البتہ وہ آپ کو اس اوپر کے کمرے سے بار بار دیکھ چکی ہیں میاں کہنے کی بات نہیں کیا کہوں یہ ٹانگ کھولوں تو لاج وہ ٹانگ کھولوں تو لاج ۔

میں نے کہا ایسی بھیدکا ی بات ہے کہ کچھ تو بتاؤ بوا انہوں نے اپنا سفید چونڈا کھجلا کر کہا میاں بات یہ ہے کہ انہوں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے بس آپ ہی کا دم بھرتی رہتی ہیں کونوں کھتروں میں بیٹھ بیٹھ کر آپ کے لئے روتی ہیں میں نے بی بی

جان کو ایک عمل بتا دیا ہے وہ ہر جمعرات کو آدھی رات کے وقت پاؤں کنویں میں لٹکا کر آپ سے ملنے کے لئے وہ عمل پڑھا کرتی ہیں یہ بات آپ تک رہے، اگر بی بی جان نے سن لیا تو میرے سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا۔

میں نے پوچھا نواب صاحب کہاں ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ شیر کے شکار کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور بیگم صاحب اپنی امی جان سے ملنے کے لئے میکے تشریف لے گئی ہیں۔

میں نے وہ لچکے پٹھے کی مخملی تھیلی بوا کے ہاتھ سے لے لی اور پوچھا بی بی جان کو دیکھوں کیسے کہ اتنے میں بالا خانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی بوا نے کہا نگاہ روبرو میں نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا کہ ایک بجلی ہے جو ادھ کھلے پٹ میں لپلپا رہی ہے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پٹ بند کر لیا ایک تیر تھا کہ میرے دل میں ترازو ہو کر رہ گیا اور رہال پر اندھیرا چھا گیا۔

بوا نے کہا اوپر چلئے میں قریب سے بی بی جان کا مکھڑا دکھا دوں اور جب میں بوا کے پیچھے پیچھے اوپر گیا اور دو قدم اس کی طرف بڑھائے تو وہ ہائے اللہ کہتی بھاگ گئی۔

رک گئی نبض عاشق جاں باز

اف رے تیرا فرار کا انداز

بوا نے کہا ابھی اللہ رکھے بچی ہیں آپ کو دیکھ کر شرما گئیں میں نے پوچھا اب کیا ہو گا انہوں نے چھاتی ٹھونک کر کہا میں آپ کو ملا کر دم لوں گی۔

دوسرے دن بوا میرے پاس آئیں اور کہا میں نے آپ کا انتظام کر دیا ہے میرا خاوند نواب صاحب کی ڈیوڑھی کا چوکیدار ہے آپ رات کے دو بجے آئیں میں ہال کا دروازہ اندر سے کھلا رکھوں گی میرا خاوند آپ کو زنانے مکان کے دروازے تک پہنچا دے گا وہاں میں کھڑی ملوں گی اور آپ کو بی بی جان کے کمرے میں پہنچا دوں گی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے پائے گی۔

www.pdfbooksfree.pk

میرا تمام دن اس خوشی میں گزر گیا کہ آج رات کو دو بجے بی بی جان کے پاس جانا ہے دل بار بار قلقاریاں مارتا رہا بار بار آسمان کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ خبیث آفتاب کب ڈوبے گا دوپہر کا کھانا بھی خوشی میں نہیں کھایا گیا قیلوٹ کے واسطے لیٹا نواب صاحب کا محل، بوا کا چہرہ، اور بی بی جان کا جلوا آنکھوں کے نیچے پھرنے لگا خیال آیا کہ اگر میرے پہنچتے ہی جگا ہر ہوگئی تو شاید میری جان چلی جائے اپنی جان کی پروا نہیں لیکن اگر اس نازنین کی رسوائی ہوگئی تو ساری زندگی اس کی بیکار ہوکر رہ جائے گی میں بوڑھوں کی طرح سوچنے لگا پھر یہ خیال آیا کہ نہ جاؤں بیوی گھر میں موجود ہے میں اس سے شادی تو کر نہیں سکوں گا کیوں اس کے پاس جاؤں۔

میں اسی ادھیڑ پن میں تھا کہ میری سوئی ہوئی جوانی بیدار ہوگئی اس نے میرے منہ پر طمانچہ اور دل پر گھونسا مارا بی بی جان کے تصور کو میرے دماغ میں ابھارا اور کہا کہ تو نہیں گیا تو بی بی جان کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا میں دیوانی جوانی کے بہکانے میں آ گیا اور رات کے دو بجے جانے کے خیال میں ڈوب گیا۔

خدا خدا کرکے دن ڈوبا میں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ خط بنا کر حمام کیا اچھے اچھے کپڑے پہنے کپڑوں میں عطر لگایا سامنے چنبیلی کے پھولوں کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اس کو منہ کے قریب لا کر بڑی بڑی گہری سانسوں کے ساتھ سونگھا اور بار بار سونگھا تاکہ دماغ میں تازگی اور چہرے پر شگفتگی آ جائے اور جب پونے دو کا وقت ہوگیا کئی کرا صابون سے پھر منہ دھویا پھول پھر سونگھے آئینے میں اپنی صورت دیکھی لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی کرتے کی جیب میں پستول رکھا ہاتھ میں ڈنڈا لیا اور گھر سے دبے پاؤں نکل گیا ویران گلی پر نگاہ ڈالی رونگٹے کھڑے ہوگئے سچ ہے چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔

کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچا بوا کے شوہر نے جھک کر سلام کیا ہال میں سے ہو کر زنانے مکان کے دروازے پر گیا بوا نے میری بلائیں لیں اور مجھے بی بی جان کی

www.pdfbooksfree.pk

خواب گاہ میں پہنچا دیا۔

خواب گاہ کی سجاوٹ، اور خوشبوؤں کی لپیٹ کیا بیان کروں جنت کا تصور اجاگر ہو گیا بی بی جان سر سے لے کر پاؤں تک رضائی اوڑھے لیٹی ہوئی تھی میں نے پٹی کے پاس کھڑے ہو کر اس کے اعضاء کے پیچ و خم دیکھے خون موجیں مارنے لگا آہستہ سے اس کی مسہری پر بیٹھا چپکے سے رضائی کھینچی اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا میں نے اس کی گوری گوری کلائیاں پکڑ کر منہ سے ہاتھ ہٹانا چاہا اس نے زور لگایا میں نے اس سے زیادہ زور لگا کر ہاتھ ہٹا دیئے اور چاند سا مکھڑا جگمگانے لگا اور آرسی مصحف کا مزا آ گیا۔

وہ داہنی پٹی کی طرف ذرا سی سرک گئی اور میں اس کے معطر پہلو میں لیٹ گیا میں نے کہا میری بی بی جان اس نے آنکھیں بند کر لیں میں نے کہا کیا بالکل بولو ہی گی نہیں؟ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں تبسم کی لہریں گلابی ہونٹوں پر دوڑ گئیں میں نے بھینچ کر اس کو سینے سے لگایا اس کا دھڑکتا دل میرے دل پر ضربیں مارنے لگا ہر چند گلابی جاڑے کی رات تھی لیکن میں پسینے میں ڈوب گیا صبح ساڑھے چار بجے جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک ایسے انداز سے میری طرف نگاہ اٹھائی کہ۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

میں نے کہا بی بی جان چلتے وقت تو کچھ بات کر لو اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت نمودار ہوئی اور بڑی آہستگی سے کہا آگ لگے اس دل کو اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی میں نے کہا بی بی جان رخصت کے وقت تو ایسی باتیں نہ کرو تم سلامت رہو ہزار برس اتنے میں بوا آ گئیں انہوں نے روانگی کا اشارہ کیا اور میں اس پر نظر ڈالتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

اب یہ میرا معلوم ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے اس پری وش کے پاس رات کے دو بجے جاتا اور صبح کے چار ساڑھے چار بجے گھر پلٹ آتا تھا۔

اے کہ در کوئے خرابات مقامے داری
جسم وقت خودی، اردست بجامے داری
اے کہ بازلف و رخ یار گزاری شب و روز
فرضت باد کہ خوش صبحی و شامے داری

اب ایک رات کا حال سنئے جو بڑی قیامت کی رات تھی اور داد دیجئے اس جرأت رندانہ، اور ہمت مردانہ کی جو عاشقوں کے دل کے علاوہ اور کہیں پائی نہیں جا سکتی ایک روز حسب معمول میں دو بجے رات کو وہاں پہنچا دیکھا کہ خلاف عادت دربان پڑا سو رہا ہے میں نے آہستہ سے اس کو جگایا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا میں نے پوچھا یہ آج تم سو کیسے رہے ہو اس نے کہا آج ناغے کی رات ہے میری گھر والی اپنی خالہ کے وہاں گئی ہوئی ہے وہ کہہ گئی تھی کہ آپ آج نہ آئیں میں نے کہا تم کو چاہئے تھا کہ مجھ کو آ کر خبر کر جاتے اس نے کہا سرکار کے پاس گیا تھا آپ کوٹھی پر نہیں تھے میں آپ کے خدمت گار جگنو سے کہہ آیا تھا کہ وہ آپ سے کہہ دے۔

میں نے کہا جگنو نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا اس نے کہا حضور اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے کہا اب تو میں آ گیا ہوں اندر جائے بغیر مانوں گا نہیں اس نے حیران ہو کر کہا جائیے گا کیسے اندر سے دروازہ کون کھولے گا اس کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا اور بالآخر ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی میں نے اس سے کہا پائیں باغ جاؤ اور پراہی کی رسی لے آؤ اس نے بھونچکا ہو کر کہا خاں صاحب بہادر آپ نے کیا کہا "رسی؟"

میں نے کہا ہاں رسی اس نے پوچھا رسی کیا کیجئے گا میں نے کہا لے آؤ تو بتاؤں گا

جب وہ رسی لے آیا تو میں نے کہا اس کوٹھی کے پیچھے جو ایک گرے ہوئے محل کی اینٹوں وغیرہ کی پہاڑی سی بنی ہوئی ہے ادھر چلو ہم اس پہاڑی کے ذریعے سے اس کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں گے وہاں پہنچ کر تم میری کمر میں رسی باندھ کر مجھے اس طرح انگنائی میں اتارنا جیسے کنویں میں ڈول ڈالا جاتا ہے میری اس خطرناک تجویز کو

سن کر وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور بار بار اپنا سر کھجانے لگا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا سرکار یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا آپ بڑے آدمی ہیں آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا میں غریب مارڈالا جاؤں گا۔

میں نے کہا میں تمہاری جان کا محافظ ہوں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو گا یہ دیکھو میری جیب میں پستول ہے اگر نواب صاحب نے تم کو چھڑا دیا میں اس سے دگنی تنخواہ پر تم کو ملازم رکھ لوں گا اور کل صبح کو تم کو دو سو روپے بھی دوں گا بالکل خوف نہ کھاؤ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔

اس نے کہا بہت اچھا سرکار مگر یہ کام ہے بڑا جان لیوا میں نے کہا بہت آسان ہے پروانہ کرو۔

ہم دونوں اس گرے ہوئے مکان کے انبار پر گھوڑے بن کر چڑھے اور گھٹنوں کے بل منڈیر کی طرف رینگنے لگے۔

بڑی مصیبت یہ تھی کہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اس کوٹھی کے دائیں جانب کے مکان میں ایک دمے کا مریض برابر کھانس رہا تھا اور داہنے طرف کے مکان میں ایک عابد شب زندہ دار اوراد پڑھ رہا تھا دونوں طرف جگا ہر ہو رہی تھی لیکن میں ہمت نہیں ہارا اور جب رینگتا رانگتا منڈیر کے قریب پہنچ گیا تو ایک کالا سانپ عین میرے منہ کے سامنے کھڑا ہو کر پھنکاریں مارنے لگا العظمۃ اللہ وہ خوف ناک سماں وہ موت کا سامنا۔

میں اس کو کیوں کر مارتا اس لئے کہ اگر اس پر ڈنڈا اچلاتا تو سارا گھر جاگ اٹھتا اس لئے میں نے آنکھیں بند کر لیں دربان دور ہٹ کر بیٹھ گیا اور سانپ کی پھنکاروں کی ہوا میرا ماتھا چھونے لگی اور موت بھیانک موت میرے دل پر دستک دینے لگی میں نے دل میں کہا شوق سے ڈس لیجئے سانپ صاحب۔

میں اسی طرح دو تین منٹ تک یقینی موت کے سامنے بیٹھا رہا اتنے میں پھنکار کی

آواز بند ہوگئی میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر جان میں جان آ گئی کہ ناگ دیوتا رخصت ہو چکے ہیں۔

دربان کو مڑ کر دیکھا تو وہ کانپتے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا تھا کہ اتر چلیے میں نے بڑے تحکمانہ اشارے سے ہدایت کی کہ وہ میری کمر میں رسی باندھ دے اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری کمر میں رسی باندھ دی اور دو زانو ہو کر مجھ کو نیچے اتارنے لگا نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کمر سے کھول دی دربان نے اوپر کھینچ لی اور میں بی بی جان کی کواب گاہ میں پہنچ گیا۔

لیکن جب میں نے یہ سماں دیکھا کہ اس کی مسہری کی پائنتی والی چارپائی پر ایک مرمرے کے تھیلے کی سی بڑی بی بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی ہیں تو زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور اس قدر بدحواس ہوگیا کہ بی بی جان کی مسہری کے نیچے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کون سا جتن کروں کہ اس فتنہ خوابیدہ کی آنکھ کھل جائے اور وہ ان بڑی بی کو وہاں سے چلتا کر دے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا ایک بڑی گھونس میری طرف آ رہی ہے جیسے ہی وہ میرے قریب آئی میں نے اس کی طرف زور سے ہاتھ جھٹک دیا وہ گھبرا کر بھاگی تو میز سے ٹکرا گئی اور میز پر رکھی ہوئی صراحی دھڑ سے زمین پر گر پڑی صراحی کے دھڑاکے سے بڑی بی کی آنکھ کھل گئی اور وہ چور چور کہتی باہر نکل گئیں ان کے جاتے ہی میں اس کے بستر پر آ گیا پہلے تو وہ گھبرا گئی پھر اس نے بستر پر اپنے دونوں پاؤں کھڑے کر کے مجھ کو ان کے جوف میں لے لیا اور اوپر سے رضائی اوڑھ لی۔

بڑی بی کی صدا سن کر بی بی جان کے چچا کمرے میں داخل ہوئے پوچھا بیٹی کیا بات ہے اس نے کہا چچا جان میرا پاؤں لگنے سے صراحی نیچے گر پڑی اور اچھو خانم نے چور چور کا غل مچا دیا چچا نے ہنس کر کہا اچھو خانم تو ہولا حبطا ہے ہی بی بی جان نے کہا چچا اب اس کو میرے کمرے میں نہ بھیجئے گا کم بخت اس زور سے خراٹے لیتی ہے کہ نگوڑی

نیند اچٹ جاتی ہے۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب اس کے چچا اس سے باتیں کر رہے تھے ان کا گھٹنا میرے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا اور ڈرنے کے عوض مجھ کو ہنسی آ رہی تھی۔

چچا کے جاتے ہی اس نے اندر سے کمرہ بند کر لیا اور جب میں نے اس سے پورا سانحہ بیان کیا کہ میں کن کن خطروں سے گزر کر اس تک آیا ہوں وہ دنگ ہو کر رہ گئی کہنے لگی اگر تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو جاتا تو میں زہر کھا کر سو رہتی یہ کہتے ہی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اتنے میں چار بجے کا گجر بجنے لگا وہ مجھ کو گوپھے میں لے کر باہر نکلی اور دبے پاؤں مجھ کو گلے لگا کر رخصت کر دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اس کے بعد نواب صاحب شکار کے اتنے دھتیا تھے کہ پورے خاندان کو لے کر اودھ فارسٹ چلے گئے اور میں ویران ہو کر رہ گیا میری زندگی کے گلستاں میں خاک اڑنے لگی حیات کے منہ کا ذائقہ بدل گیا یاروں کے جمگھٹے اور راتوں کے جلسے کھوکھلے اور سپاٹ ہو کر رہ گئے شامیں ہی نہیں صبحیں تک اداس ہو گئیں اور طلوع کی رنگینیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مرتد ہو چکا ہوں اور اپنے رسول کے سامنے جھینپا جھینپا کھڑا ہوا ہوں

اس کی مفارقت نے مجھ کو وہ بچہ بنا دیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے اور ہڑک ہڑک کر اس کا منہ تتہیا کا سا ہو جاتا ہے۔

اب مجھ سے نہیں رہا گیا میں نے رخت سفر باندھا اور اودھ فارسٹ جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گیا راستے میں کم بخت موٹر خراب ہو گئی اسٹیشن پہنچا تو ریل چھوٹ چکی تھی میں سن سے ہو کر رہ گیا۔ میں نے قلی سے کہا اگر کوئی مال گاڑی ادھر جا رہی ہو تو میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ 1 لے کر اس میں روانہ ہو جاؤں قلی نے کہا ایک مال گاڑی شاید آدھے گھنٹے میں اسی طرف جانے والی ہے میں بکنگ آفس گیا بکنگ بابو نے کہا وہ مال گاڑی نہیں فوجی گاڑی ہے اس میں آپ سفر نہیں کر سکتے میں نے باہر آ کر قلی سے کہا

www.pdfbooksfree.pk

مجھے اس فوجی گاڑی تک پہنچا دے وہ مجھے یارڈ لے گیا دور سے گاڑی بتا دی ہینڈ بیگ میرے حوالے کیا اور اجرت سے دگنا معاوضہ لے کر چلا گیا اور میں گلے میں بیگ ڈال کر گاڑی چھوٹنے کے انتظار میں زمین پر بیٹھ گیا۔

چونکہ وہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور فوجی گاڑیوں تک کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا اس لئے میں بڑے شش و پنج کے عالم میں یہ سوچتا ہوا بیٹھا رہا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو جاسوسی کے جرم میں کھڑے کھڑے گولی ماردی جائے گی یا گرفتار کرلیا جاؤں گا خدا خدا کر کے شاید گیارہ بجے انجن نے سیٹی دی اور میں لپک کر گارڈ کے ڈبے کے پیچھے بمپر پر بیٹھ گیا گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا میں کچاچا کر دونوں ہاتھوں سے بمپر کو پکڑ لیا کہ اتنے میں یورپین گارڈ نے پیچھے کی کھڑکی کھول دی مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ اچھل پڑا پستول جیب سے نکال کر تان لیا اور ڈپٹ کر پوچھا تم کون ہو میں نے بڑی مردانہ آواز میں کہا (خاموش یہ معاملہ عشق ہے میں اپنی معشوق کے وہاں جا رہا ہوں)

گارڈ اگر ہندوستانی ہوتا تو ٹھائیں سے گولی مار دیتا مگر وہ انگریز فوجی منچلا انگریز تھا میرا یہ مردانہ جواب سن کر اس نے کہا بریوو، بریو (شاباش بہادر) اور دونوں ہاتھوں سے مجھ کو اندر کھینچ لیا اس نے لالٹین اٹھا کر غور سے میرا

1۔ ریلوے کا یہ قاعدہ ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر مال گاڑی میں گارڈ کے ڈبے میں سفر کیا جا سکتا ہے۔

منہ دیکھا اور مسکرا کر کہا (ارے بالکل عاشق کا چہرہ) اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ اس نے کہا

(بیٹھ جایئے مسٹر عاشق، میں بھی عاشق ہوں)

میں بیٹھ گیا تو اس نیک مرد نے مجھ کو بیئر پلائی بھنا ہوا گوشت کھلایا، اور جب میرا اسٹیشن آ گیا تو میرے ساتھ آ کر مجھ کو گیٹ سے باہر نکال دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورنا خدا کہئے

اس کے بعد جب ہم نواب صاحب کے ساتھ ان کے وطن ا گئے تو دو تین مہینے کے بعد یہ سننے میں آیا کہ بی بی جان کی شادی ٹھہر چکی ہے یہ خبر توپ کے گولے کی طرح میرے دل پر لگی اور جب حسب دستور رات کے دو بجے اس سے ملاقات ہوئی تو اس خیال سے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہر چند وہ میرا جوانی کا دور تھا لیکن مجھ پر اس وقت پیرانہ ماں اندیشی طاری ہو گئی میں نے سوچا کہ اس سے میرا عقد تو ہو نہیں سکتا اور وہ ہمیشہ بن بیاہی رہے اس کا بھی امکان نہیں اس کی شادی جس سے ٹھہری ہے وہ صحت و شباب کے اعتبار سے ایک کمزور و کم خواندہ رئیس زادہ ہے اس کی صورت میں بھی کوئی دل کشی نہیں عقل کے اعتبار سے بھی نہایت کمزور ہے اس کی اور میری پرانی ملاقات بھی ہے اگر اس کم رو اور کمزور شخص سے اس کی شادی ہو جائے گی تو وہ کسی طرح بھی بی بی جان کے دل کو موہ نہیں سکے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ شادی کے بعد پردے زردے کی یہ سختی بھی باقی نہیں رہے گی میں جب چاہوں گا اس سے با آسانی مل سکوں گا ان تمام باتوں پر غور کر کے میں نے بی بی جان کے دل میں یہ بات اتار دی کہ وہ اپنی شادی سے پریشان نہ ہوں عورت منطقی نہیں جذباتی ہوتی ہے اس لئے لوہے لگ گئے اس کو سمجھانے میں ایک ہفتے تک میں بڑے بڑے لیکچر دیتا رہا تب جا کر اس نے خودکشی کا ارادہ ترک کیا اور اس شدید اصرار سے بھی دست بردار ہو گئی کہ میں اسے لے کر کسی دوسرے شہر میں بھاگ جاؤں۔

لیکن جب شادی کا دن آیا اور صبح کو اس کی کوٹھی سے نوبت بجنے کی آواز آنے لگی تو میرا دم لبوں پر آ گیا ساری منطق بھول گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔

www.pdfbooksfree.pk

میری اس کیفیت کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل نظم 1 سے لگایا جا سکتا ہے

کدھر ہے اے موت؟ آ کہ غم سے لبوں پر اب جاں آ رہی ہے

وہ شمع، جو یادگار شب تھی اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے

دہائی حسن خجستہ خوکی کہ رسم عالم کی فتنہ خیزی

چھٹے ہوؤں کو ملا رہی ہے ملے ہوؤں کو چھڑا رہی ہے

ادھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیام شادی

ادھر نسیم سحر کی جنبش ترانہ غم سنا رہی ہے

ادھر، عروسی لباس زریں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا

ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفنی پہنا 2 رہی ہے

قدیم پیغام بر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے

ادھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، ادھر شگوفے کھلا رہی ہے

ادھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلہ مرگ ناگہانی

ادھر شبستان رنگ و بو میں حیات نو مسکرا رہی ہے

ادھر عرق ہے مری جبیں پر ادھر جھمکتی ہے جوش افشاں

ادھر لبوں پر ہیں سرد آہیں ادھر صبا گنگنا رہی ہے

---

1 مطبوعہ "نقش ونگار" ایسے بے کراں شدید جذبہ غم میں یہ نظم کہی گئی تھی جب شعر کہنا امکان سے خارج تھا۔

---

2 صحیح لفظ "پہنانا" ہے مجھ سے شدت غم کی بدحواسی میں غلطی ہوگئی۔

اور اسی سلسلے کی ایک دوسری نظم بھی سن لیجئے:

کیا وہ بتائے کیا کیا عشوۂ روزگار نے

مارا ہو جس غریب کو حسن وفا شعار نے

اب وہ شہید التفات، دل کی گرہ کسے دکھائے

بند کیا در طرب جس پہ کشود کار نے
سمجھے گا کون نکتہ رس اس کی حدیث خونچکاں
جس کا لہو بہا دیا، تیغ وفائے یار نے
کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا
لوٹ لیا مرا چمن، عربدہ بہار نے
مصحف انبساط نے، آسیہ حزن پیش کی
فتح سے دور کر دیا، نصرت کردگار نے
مجھ کو در نشاط نے، اشک الم عطا کئے
شام شکست نذر کی، صبح ظفر شکار نے
حسن کے جذب عشق نے، دل کو تباہ کر دیا
پھول کی روح کھینچ لی، شب نم اشک بار نے
بھیس میں آ کے عشق کے جوش تجھے مٹاؤں گا
مجھ سے، قسم یہ کھائی تھی، حسن ستم شعار نے

☆☆☆☆☆☆☆

www.pdfbooksfree.pk

ج ب ، ع خ

ایک بار 1 دفتر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھا کہ میری بیوی تخت پر متمکن ہیں اور صوفے پر ایک بیس اکیس برس کی نہایت قبول صورت خاتون بیٹھی ہوئی ہیں میں یہ سمجھ کر کہ کوئی پردہ نشین میری بیوی سے ملنے آئی ہوئی ہیں جب الٹے پاؤں باہر جانے لگا تو میری بیوی نے رکتی سی آواز میں کہا تم سے ملنے کو مدراس سے آئی ہیں۔

میں پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرف بڑے معصومانہ انداز میں دیکھنے لگا کہ وہ اس خاتون کا مجھ سے تعارف کرا دیں۔

جب بیوی کچھ نہیں بولیں اور منہ پھلائے گم سم بیٹھی رہیں تو میں ایک عجیب کش مکش میں پڑ گیا بیوی کی موجودگی میں یہ ہمت تو پڑی نہیں کہ اس آنے والی سے براہ راست بات کروں۔۔۔۔آخر کار تنگ آ کر میں نے بیوی سے پوچھا آپ کون ہیں؟ بیوی نے کہا تم خود پوچھ لو، میں کیا کروں گی بول کے۔

اس آنے والی نے عجیب شش و پنج کے عالم میں نظر اٹھائی اور کہا میں آپ سے ملنے مدراس سے آئی ہوں میرا نام ہے ج ب رہنے والی یو پی کی ہوں مگر قیام ہے مدراس میں۔۔۔۔میرے دل میں تین شخصیتوں یعنی ابوالکلام آزادی، انور پاشا اور آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی انور پاشا کا انتقال ہو گیا مولانا ابوالکلام آزاد سے مل چکی اور آج آپ سے ملنے آئی ہوں مجھے شاعری سے بے حد شوق ہے آپ کی کتاب ''روح ادب'' شروع سے آخر تک مجھے یاد ہے میں آپ کی بے حد عقیدت مند ہوں

1۔ یہ غالباً 1928ء کا واقعہ ہے جب کہ میں حیدر آباد دکن میں تھا

میں نے آج سے کئی برس پہلے آپ کی ایک نظم جنگل کی شہزادی کا یہ آخری شعر جب پڑھا تھا:

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی

پٹڑی چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

www.pdfbooksfree.pk

تو میں رونے لگی تھی، اور ابھی میں رو ہی رہی تھی کہ نانی جان آ گئیں انہوں نے مجھ سے پوچھا اری کیوں رو رہی ہے میں نے کہا جوش صاحب کو آپ جانتی ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں جانتی ہوں میں نے کہا تو جوش صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے، جنگل میں گاڑی رکی، وہ ریل سے اتر کر جنگل کی سیر کرنے لگے اور اس قدر محو ہو گئے کہ گاڑی چھوٹ گئی، اور وہ جنگل میں رہ گئے نانی جان اللہ سے دعا کیجئے کہ ان کی جان بچ جائے میری نانی جان نے قہقہہ مار کر کہا، اری دیوانی تو شاعروں کی بات پر نہ جا، یہ روز مرتے اور روز جیتے ہیں۔

چاہئے تو مجھے یہ تھا کہ یہ ماجرا سن کر، میں اس سے کھل مل کر باتیں کرتا، مگر بیوی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں اس لئے میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کے بےوقوف آدمی کی طرح، اس کی طرف دیکھ کر گدی کھجلانے لگا۔

اس نے مجھ کو غور سے دیکھا معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی اور ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے کہا آپ کا مکان شہر سے دور ہے یہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی میں جس ٹیکسی پر آئی تھی اسے رخصت کر دیا ہے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھ کو میری سہیلی کے مکان تک پہنچا دیجئے، جس کے پاس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔

میں ایک عجیب ادھیڑ بن میں پڑ گیا، جاتا ہوں تو بیوی کو ناگوار گزرے گا نہیں گیا تو اس کو رنج ہو گیا کیا کروں، کیا نہ کروں۔

آخر یہ فیصلہ کر کے کہ اسے اس کی جائے قیام تک پہنچا آؤں، میں اٹھا بیوی کی جانب نگاہ نہیں اٹھائی، اس سے کہا چلئے میں پہنچا آؤں۔

وہ مجھ سے چھ سات میل کے فاصلے پر ٹھہری ہوئی تھی جب میری گاڑی ایک بہت بڑے بند کی سڑک سے گزرنے لگی اس نے مجھ سے کہا جوش صاحب بڑی پیاری شفق پھولی ہوئی ہے پل بھر گاڑی روک لیجئے کہ یہ منظر دیکھ لوں۔

جب گاڑی رک گئی اس نے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا اور اپنی بھری بھری انگیا

سے ایک پرچہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

پرچہ پڑھا تو اسے اظہار عشق سے لبریز پایا میرے ہاتھ کانپنے لگے طرح کی مفارقت کا گھاؤ ابھی مندمل نہیں ہوا تھا اور اس وقت تک میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں میں نے جیب سے قلم نکالا اور اس پرچے کی پشت پر یہ لکھ کر کہ میں آج کل بری طرح زخمی ہوں کسی نئے زخم کی تاب نہیں لا سکتا ایک نہایت طویل بیداری کے بعد اب کوشش کر رہا ہوں کہ سو جاؤں، مجھ جو جگائیے نہیں۔

میرے جواب کو پڑھ کر، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، آنکھوں میں نمی آ گئی اس نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا تو پھر مجھے یہیں اتار دیجیے میری سہیلی کا مکان قریب آ گیا ہے میں پیدل چلی جاؤں گی۔

یہ سن کر میں کانپ گیا اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا کر کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو یہیں اتار دوں آپ کو میرے دل کا حال نہیں معلوم آپ کی طرف میرا دل کھنچ رہا ہے مگر۔۔۔۔۔ اس نے آس ٹوٹ جانے کے بعد آس بندھ جانے کی نظر سے مجھ دیکھا، اور کہا آپ کا شکریہ۔

راستے بھر وہ خاموش رہی اس خاموشی میں ہزاروں باتیں تھیں جنہیں کانوں نے نہیں دل نے سن لیا۔

میں نے دل میں کہا میاں جوش خدارا پھر کسی نئے تہلکے میں نہ پڑ جانا، سنبھالے رہو اپنے کو اب عشق کیا تو مر کر رہ جاؤ گے خاں صاحب۔

اتنے میں اس کی سہیلی کا مکان آ گیا میں نے موٹر سے اتر کر دروازہ کھولا وہ اتری پوچھا تھوڑی دیر بیٹھئے گا بھی نہیں؟ میں نے کہا خود میرا ابھی دل یہی چاہتا ہے کہ بیٹھ جاؤں، اور پہروں بیٹھوں مگر۔۔۔۔۔ میں پھر کسی وقت آؤں گا۔ اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا میں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا حسن مغموم میرے دل کو زخمی نہ کر دے فوراً آنکھیں جھکا لیں، اور جلدی سے روانہ ہو گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

گھر آیا بیوی کو آگ بگولا پایا مجھے دیکھتے ہی برس پڑی اور کہا اور تو اور، اب تو میری آنکھوں کے سامنے تم عشق بازی کرنے لگے ہو، میں نے کہا اشرف جہاں اللہ اللہ کرو، تم میری ایک شرافت اور مروت کی بات کو عشق بازی کہہ رہی ہو میں اور عشق، الٰہی تیری پناہ یہ سن کر انہوں نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے چر سے پھاڑ ڈالا اور کہا جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسو، میں نے کہا خدا کے واسطے بات سمجھنے کی کوشش کرو، اور یہ سوچو کہ کوئی اتنا بڑا سفر طے کرکے میرے گھر آئے اور گھگھیا کر کہے کہ مجھے میری جائے قیام تک پہنچا دو، اور میں اس کو ٹکا سا جواب دے دوں۔ یہ بات شرافت کے خلاف ہے ارے تم شرافت کو بھی عشق بازی سمجھتی ہو، یہ تو بڑا اندھیر ہے۔

بیوی نے کہا، اچھا قسم کھا کر بتاؤ اس چخیدی کے ساتھ، اس کے گھر جا کر بیٹھے تھے کہ نہیں، میں نے کہا، بیٹھنا کیسا، میں نے تو اس کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا۔

بیوی نے کہا تم سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا سکتے ہو؟ سانچ کو آنچ نہیں، لے آؤ قرآن، وہ قرآن لے آئیں، میں نے سر پر قرآن رکھ کر قسم کھالی ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا کہنے لگیں ناحق میں نے تمہارا گریبان پھاڑ ڈالا لاؤ سی دوں۔

اس واقعے کے دو تین دن بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا، چپراسی نے آ کر کہا، کوئی بیگم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں اور ٹیکسی میں بیٹھی انتظار کر رہی ہیں نیچے اترا تو دیکھا وہی ہے، صاحب سلامت کے بعد، اس نے کہا موٹر میں آ جایئے، میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا کہ آپ آنے کا وعدہ کر کے گئے تھے لیکن آئے نہیں۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے شوفر سے کہا باغ ------ لے چلو۔ باغ میں موٹر ٹھہری اس نے کہا آیئے اس کنج میں تھوڑی دیر بیٹھ جائیں۔ کنج میں بیٹھتے ہی اس نے کہا جوش صاحب آپ کا کلام پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے، لیکن دیکھا تو وہ پتھر نکلا، سچ بتایئے شعر آپ خود کہتے ہیں یا کوئی اور آپ کو لکھ کر دے دیتا ہے؟

میں نے کہا میں آپ کے پاس کل آنے والا تھا، آتا اور ضرور آتا، آپ اس قدر بد گمانی سے کام نہ لیں طبیعت کی ناسازگاری کی بناء پر کل پرسوں نہیں آسکا۔ اس نے مسکرا کر کہا، جس کی طبیعت ناساز ہوتی ہے اس کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے؟ اب میں آپ کو چھوڑنے والی نہیں، اسی وقت میرے ساتھ۔۔۔۔نہر کے کنارے چلئے یہ کہتے ہی وہ اٹھ بیٹھی موٹر میں آتے ہی اس نے شوفر سے کہا پہلے مجھ کو جہاں سے لائے ہو وہاں لے چلو اور جب گاڑی اس کی قیام گاہ پر آ کر رکی اس نے کہا جوش صاحب اندر آیئے میں۔۔۔۔۔نہر پر اپنی سہیلی کو بھی لے چلوں گی۔

گھر پہنچے ہی اس نے اپنی سہیلی کو آواز دی کہ ادھر آؤ جوش صاحب کے ساتھ۔۔۔۔نہر پر چلنا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کی سہیلی آ گئی سرمئی دلائی اوڑھے اور اس کا سرا منہ پر ڈالے ہوئے میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تو ایسا معلوم ہوا گویا افق کے گریبان سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور جب اس نے اپنی گوری ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے پان دیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر، مہندی کا ہلال ہوا ہے اور اس ہلال کے اندر مہندی ہی سے لکھا ہوا ہے ''جوش'' میں نے اپنے کو حد سے زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی، پھر بھی میرے تمام بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔۔۔۔۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگر

الغرض کھانے پینے کا سامان لے کر ہم تینوں۔۔۔۔۔نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ بیوی پریشان ہوں گی، اور بدگمان بھی، میں نے ایک موڑ پر گاڑی رکوا دی، اور اپنے ایک دوست سے بیوی کو ٹیلی فون کرا دیا کہ آج میرے گھر جلسہ ہو رہا ہے، اس لئے جوش صاحب کو میں نے روک لیا ہے وہ کل دوپہر تک گھر پہنچ جائیں گے۔

۔۔۔۔۔۔نہر کے کنارے پہنچ کر ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے، میں نے کہا

ہم تھوڑی دیر آرام کرلیں یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے آدھ یا پون گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ''ج۔ب'' نے آکر میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ بھی آکر میرے پاؤں دبانے لگے سہیلی نے کہا باجی میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے لیکن جب اس نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی آکر پاؤں دبانے لگی۔

میں نے کہا ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں برائے خدا ایسا نہ کیجئے میں شرم کے مارے کٹا جا رہا ہوں۔

لیکن وہ نہیں مانیں، اور میں دس پندرہ منٹ کے بعد شرم کی تاب نہ لا کر اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے چلا گیا، میرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی ''ج۔ب'' بھی آ گئی اور ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی سہیلی کو بھی وہیں بلا لیا۔

مجھ سے ان دونوں کی موجودگی کے باعث اچھی طرح منہ نہیں دھویا گیا، اور جب الٹا سیدھا منہ دھوکر، میں تولیا کی طرف بڑھا تو ''ج۔ب'' نے کہا نہیں، تولیہ نہیں میں اپنے دوپٹے سے آپ کا منہ پونچھوں گی میں کیا کرتا اس نے اپنے دوپٹے سے میرا منہ پونچھا پھر اس نے مجھ سے کہا آپ کرسی پر بیٹھ جائیں اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ جگ سے میرے پاؤں دھلا دے اس نے تعمیل کی اور جب میرے پاؤں دھل گئے تو دوپٹے کے عوض اس کی سہیلی نے اپنی زلفیں کھول کر میرے پاؤں پونچھنا شروع کر دیئے میں اس کی وضع سے گھبرا گیا پاؤں کھینچ لئے اور شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔

اب شام ہو گئی، ریسٹ ہاؤس کے بوائے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں ہائے وہ رنگین شام، وہ سامنے وہ گل فام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام۔۔۔۔۔۔وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے لکے وہ لہروں میں ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چار، مدھ بھری انکھڑیوں میں جادو ٹونا۔

www.pdfbooksfree.pk

جب میں نے اس حلقہ جمال میں دو پیگ ختم کر کے تیسرا پیگ بنا کر سامنے رکھ لیا تو ''ج۔ب'' نے مجھ سے پوچھا وہ ''جنگل کی شہزادی'' سچ مچ تھی یا خیالی تو میں نے کہا میں نے آج تک کوئی خیالی اور ہوائی نظم نہیں کہی ہے اس نے کہا آپ نے اپنی اس نظم میں اس جنگل کی لڑکی کا جو حسن و جمال بیان کیا ہے اس میں کوئی مبالغہ تو نہیں اور جب میں نے کہا قطعی کوئی مبالغہ نہیں ہے تو اس نے کہا جب آپ اس کو بھول گئے تو ہمیں بھی بھول جائیں گے میں نے کہا ایسا نہیں ہوگا، میرا دل ایک مرقع ہے جس میں اس کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے، اسی طرح آپ کی تصویر بھی لگی رہے گی اس نے کہا آنکھیں بند کر لیجئے اور میرے سر کی قسم، جب تک میں نہ کہوں میچے ہی رہئے

جب میں نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے میری آنکھ کا بوسہ لے لیا مجھ پر ایک نا قابل شرح کیفیت طاری ہوگئی، پھر اس نے سہیلی سے کہا تو دوسری آنکھ کا بوسہ لے لے اس نے کہا باجی میرا حیاؤ نہیں پڑ رہا ہے میری طرف سے آپ ہی بوسہ لے لیں اس نے چٹ سے میری دوسری آنکھ کا بھی بوسہ لے لیا اور میرا سر ہوا میں اڑنے لگا اس نے کہا اب آنکھیں کھول دیجئے اور مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔

چوتھا پیگ ختم کر کے میں نے کہا اب اندھیرا ہو گیا ہے آیئے ریسٹ ہاؤس چلیں۔

ناہموار ساحل سے جب موٹر کی طرف چلا، ایک بہت نکیلا پتھر میرے گٹے میں چبھ گیا اور خون نکلنے لگا ''ج ب'' نے اپنا پلو پھاڑ کر سوڈے میں تر کیا، اور میرے گٹے پر باندھ لیا۔

اب ہم آ کر موٹر میں بیٹھ گئے، میرے بائیں طرف ''ج۔ب'' اور داہنی طرف اس کی البیلی سہیلی ''ع۔خ'' بیٹھ گئی۔

موٹر نے ابھی بمشکل آدھا فرلانگ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی سہیلی نے مجھ سے کہا ذرا اپنا گٹا دکھا دیجئے میں نے گٹا اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے اپنی کلائی میرے

www.pdfbooksfree.pk

گٹے پر چسپاں کر دی۔

ج۔ب نے پوچھا کیا کر رہی ہے اس نے کہا باجی میں نے اپنی کلائی کو دانتوں سے لہولہان کر کے اس کو جوش صاحب کے گٹے پر اس لئے چسپاں کر دیا ہے کہ جوش صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے۔

یہ سنتے ہی ''ج۔ب'' سہیلی سے بگڑ گئی اور کہنے لگی میں تو یہاں تجھے تفریح کرانے لائی تھی تو تو جوش صاحب سے عشق لڑانے لگی۔

سہیلی نے روہانسی آواز میں کہا باجی آپ انسانی ہمدردی کو عشق لڑانا کہہ رہی ہیں مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی اتنا کہہ کر اس نے پلو سے منہ چھپالیا اور رونے لگی۔

اب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے میں نے دیکھا ''ج۔ب'' کی آنکھوں میں رقابت کی سرخی اور ''ع۔خ'' کی انکھڑیوں میں گھٹن کی ملگجاہٹ پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ ''ج۔ب'' کے مزاج میں نپولین کی سی سختی اور ''ع۔خ'' کے مزاج میں حضرت مسیح کی سی نرمی کارفرما ہے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے ''ع۔خ'' کو حکم دیا کہ تم اس سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ تمہارا کھانا وہیں بھیج دیا جائے گا وہ اداس ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اس کے اس طرح چلے جانے سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

وہ ریسٹ ہاؤس کی رات عجیب رات تھی جس میں شیرینی بھی تھی، تلخی بھی کیف بھی تھا، کرب بھی ''ج۔ب'' کی موجودگی کا نوش بھی تھا اور ''ع۔خ'' کی غیر موجودگی کا نیش بھی۔

میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو میں یہ کہوں کہ ہر چند ''ج ب'' کی بھرپور جوانی، اور اس کے رخساروں کی گل فشانی بے حد نظر فریب تھی، لیکن ہائے اس کی سہیلی ''ع۔خ'' کا مکھڑا اور اس مکھڑے پر اس کی مسکینی کا جمال، میرا دل ٹوٹ کر اس پر آ چکا

www.pdfbooksfree.pk

تھا۔

اب سنئے اللہ کا کرنا کیا ہوا، اس واقعے کے دو ماہ بعد جب میں ''ج، ب'' کا تار پا کر مدراس گیا اور اس کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا اس کے پانچویں دن ''ع۔خ'' بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں[1] پہنچ گئی۔

اس کو دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہو گیا وہ دوڑ کر ''ج۔ب'' سے لپٹ گئی ''ج، ب'' نے اپنے چہرے کی تلخی پر جھٹ سے نقاب ڈال کر، اس کا ماتھا م چوم لیا۔

''ع، خ'' نے اس کے یعنی ''ج، ب'' کے چہرے کی تلخی محسوس کر لی تھی اس لئے

---

[1] اس کے بھائی کو کسی ضروری کام سے مدراس جانا تھا، اس نے یہ سوچ کر کہ میں وہاں موجود ہوں اپنے بھائی سے استدعا کی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو، سمندر کی ہوا سے میری صحت درست ہو جائے گی۔

اس کو اپنے ماتھے کے چوم لئے جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، اور اس کی جھکی ہوئی پلکوں کی چھاؤں میں مومن کا یہ شعر سر پیٹتا نظر آیا۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں، کوچہ رقیب میں بھی، سر کے بل گیا

''ج، ب'' نے ہم دونوں کی طرف بار بار نظر اٹھائی، اور بڑی تلخی کے ساتھ میرے کان میں کہا آگ، دونوں طرف لگ چکی ہے اور میں بیچ میں کھڑی جل رہی ہوں۔

اس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر میں نے کہا تمہارا یہ خیال غلط ہے، مجھ کو محبت تم سے ہے اور ترس اس پہ آتا ہے کہ اس بیچاری کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔

''ج، ب'' نے کہا اچھا قسم کھا کر کہو تم میرے ہو یا اس کے؟ میں قسم کھا کر کہا میں تمہارا اور صرف تمہارا ہوں اس نے کہا عورت سے زیادہ کوئی محبت کی نظر کو پہچان نہیں سکتا، تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس ہڈیوں کے مالے پر دل جان سے فدا ہو چکے

ہو۔

بات تو اس نے سچ کہی تھی، لیکن میں نے دھاندلی اور بے ایمانی سے کام لے کر اس سے کہا تم دھوکا کھا رہی ہو، کہہ چکا ہوں کہ اس کی صحت کی خرابی پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے تم ترس کھانے والی نظر کو محبت کی نظر سمجھ بیٹھی ہو یہ تمہاری بڑی نادانی ہے ارے کہاں تم اور کہاں وہ

چہ نسبت خاک را، با عالم پاک

اس کے چہرے پر بحالی آ گئی اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں صرف اسی کو چاہتا ہوں اس نے ''ع، خ'' کو جو باہر بیٹھی ہوئی تھی بڑے پیار سے آواز دی کہ وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو یہاں چلی آؤ، وہ کبک دری کی طرح قدم اٹھاتی خوش خوش آئی اور میرے سامنے کے صوفے 1 پر بیٹھ گئی۔

---

1 معاف کیجئے ایک بڑی ان بے بی جور بات لکھ رہا ہوں یعنی آج 13 نومبر 1967 کو پونے تین بجے

میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ''ع، خ'' کی جانب نگاہ نہیں اٹھاؤں گا اس لئے کہ ایسا کیا تو پکڑا جاؤں گا میں سختی سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا۔۔۔۔لیکن اسے کیا کرتا کہ میرا چہرہ پھڑپھڑانے اور الف ہونے لگا۔۔۔۔اتنے میں ''ج، ب'' کوئی چیز لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی، میں نے بے حد عجات کے ساتھ ''ع، خ'' کی طرف نگاہ اٹھائی اس نے میری جانب دیکھا نظروں میں دو دو باتیں ہو گئیں اور اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا۔

''ج، ب'' نے پٹ کی آڑ سے یہ ماجرا دیکھ لیا وہ کمرے میں آئی ''ع، خ'' سے کہا آؤ میں تمہارا کمرہ تمہیں دکھا دوں، اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

''ع، خ'' کو اس کے کمرے میں بٹھا کر وہ میرے پاس آئی، اس کا منہ پھولا اور

www.pdfbooksfree.pk

چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔۔۔۔میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے کہا کیوں صاحب یہ نظروں کا ملاؤ اور چھاتی کا کٹاؤ کیسا تھا۔

میں نے کہا تمہارے جاتے ہی دروازہ کھٹ سے بولا میری نظر اٹھ گئی، اتنے

سہ پہر کے وقت جب کہ میں اس سطر کو تمام کر کے آگے بڑھنے والا تھا میری وفادار بیوی یخنی کا پیالہ ہاتھ میں لئے آئیں اور کہا جلدی سے کلی کر کے اسے پی لو اور لگے ہاتھوں وہ سنگھاڑے اور بتاسے بھی کھا لو، جو میں نے تمہارے واسطے منگائے ہیں اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے واسطے آرام کر لو، صبح چار بجے سے لگاتار لکھ رہے ہو اب تین بجے کا عمل ہے بس لکھنا بند کر دو۔

میں نے دل میں سوچا اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ میں اپنے حالات عشق لکھ رہا ہوں تو پیالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور مجھ پر برس پڑیں کہ آج بھی میرے دل میں جوانی کی یادیں مچلتی رہتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ہر چند میں ان کی سرکار جمال کا نمک حرام ہوں، پھر بھی ان کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ جو زریں پروں کی چڑیاں، میری جوانی کے موتی چگنے کے لئے مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں میری جوانی کے ختم ہوتے ہی وہ بھرا مار کر اڑ چکی ہیں اور ہزاروں دل شکنیوں کے با وصف میری بیوی آج تک میری محبت کا دم بھر رہی ہیں۔

اللہ کرے میری محراب پیری کی یہ شمع تاباں کم سے کم اس وقت تک روشن رہے جب تک کہ میرا چراغ حیات گل نہ ہو جائے۔

عشق و محبت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ عشق کا نشہ، جوانی کے بعد اتر جاتا ہے اور محبت کا نشہ، جوانی کے بعد اور بھی چڑھ جاتا اور ہر آن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں تمہاری سہیلی کو کھانسی آ گئی بفرط کرب سے اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا، یہ دونوں عمل فطری تھے، اس میں بدگمانی کی کیا بات۔

www.pdfbooksfree.pk

اس نے بگڑ کر کہا میں ان باتوں میں نہیں آنے کی کان کھول کر سن لیجئے صاحب میں آپ کو اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دوں گی اب مجھے آپ اور اس پر سختی کرنا پڑے گی، میں نے کہا تم شوق سے سختی کرو سر تسلیم خم ہے لیکن وہ سختی ایک بدگمان دل کی بے جا سختی ہو گی۔

اتنے میں ایک نوعمر بے حد گھبرایا ہوا آیا اس نے ''ج، ب'' سے کہا خالہ جان سلام میری ماں پر دل کا دورہ پڑ گیا ہے، جلدی میرے ساتھ چلئے ''ج، ب'' بدحواس ہو گئی، مجھ سے کہا میری بڑی بہن کے دل پر دورہ پڑا ہے میں ان کی تیمارداری کے واسطے جا رہی ہوں اللہ خیر کرے میں رات گئے آ جاؤں گی لیکن نہ آؤں تو آپ پریشان نہ ہو جایئے گا۔ یہ کہتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھی اور تیزی کے ساتھ زینہ طے کر کے مکان سے چلی گئی اور میں زینے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ دبے پاؤں ''ع، خ'' آ گئی پوچھا باجی کہاں گئی ہیں؟ میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا اور اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھیں میری طرف اٹھائیں اور کہا میں یہاں ناحق آئی باجی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے پردہ شروع کر دوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں نے اس کو سینے سے لگا لیا اور کہا تم ان کی سختی کی پروا نہ کرو، وہ میرے دل پر حکومت نہیں کر سکتیں ان کی مجال نہیں کہ تمہاری محبت کو میرے دل سے نکال دیں اس نے پوچھا آپ میرے ہیں؟ میں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا تمہارا نہیں تو اور کس کا ہو سکتا ہوں اس کے لبوں پر تبسم آ گیا اور میں نے اس کو آغوش میں لے لیا۔۔۔۔

صبح ہوتے ہی ''ج۔ب'' آ گئی اس کے چہرے پر شب بیداری کے آثار تھے میں نے پوچھا خیریت تو ہے اس نے کہا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بہن کی جان بچ گئی لیکن یہ تمہارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے کیا رات بھر جاگتے رہے ہو میں نے کہا تمہاری مفارقت نے سونے نہیں دیا۔ جھپکیاں لے لے کر رات گزاری ہے، اور پھر اس خیال

سے بھی پریشان رہا کہ تمہاری بہن پر دل کا دورہ پڑا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے اس نے پوچھا ''ع، خ'' تو اس طرف نہیں آئی تھی میں نے کہا تمہارے جاتے ہی میں نے اپنا کمرہ اندر سے بند کرلیا تھا کوئی نو بجے تمہارا ملازم کھانا لے کر آیا بس اتنی دیر کے لئے دروازہ کھولا کھانا کھایا نہیں گیا، تمہاری جدائی میں درو دیوار سے رونے کی صدائیں آ رہی تھیں دو چار الٹے سیدھے لقمے نگل کر نوکر کو رخصت کردی اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا۔ اللہ نے صبح ہوتے ہی تمہاری چاندسی صورت دکھائی تو جان میں جان آئی۔

میری اس مکمل ایکٹنگ کا اس پر بڑا اثر پڑا مجھے بڑھ کر سینے سے لگالیا، اور کہا آؤ، ہم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں دو گھڑی پڑ کر سو جائیں۔

ہم دونوں کوئی دس بجے سو کر اٹھے نہائے دھوئے ناشتہ کیا اور نوکر سے کہا '' ع، خ'' کے کمرے میں ناشتہ پہنچا آؤ۔

ان مراحل کے بعد اس نے کہا آج سر شام سمندر کے ساحل پر چلیں گے، اور شام ہوتے ہی جب ہم روانہ ہونے لگے ''ع، خ'' کالا برقع اوڑھے آئی اور کہا باجی ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے باجی یہ سن کر چند سیکنڈ کے واسطے خاموش ہوگئیں اور پھر کہا اچھا تم بھی چلی چلو۔

''ج، ب'' نے مجھ کو موٹر کے دروازے کے پاس بٹھایا بیچ میں خود بیٹھی اور ''ع، خ'' کو اپنے پہلو میں بٹھا دیا اور ٹیکسی روانہ ہوگئی، ساحل کی طرف۔

''ع، خ'' نے ''ج، ب'' کی آنکھ بچا کر اور اپنے ہاتھ کو اس کے پیچھے دراز کر کے میرے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا جس کو میں نے جلدی سے شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

''ج، ب'' سنک گئی اس نے موٹر رکوا دی مجھ سے کہا فٹ پاتھ پر آیئے، اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا۔۔۔اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ مرد، مرغوں کی طرح کئی کئی مرغیوں پر حکومت کریں آپ صاف صاف بتا دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں

یا ''ع، خ'' سے میں نے کہا اللہ ری بدگمانی، پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس نے قلم اور کاغذ دے کر مجھ سے کہا یہ بات اس کاغذ پر لکھ دیجئے میں نے بادل ناخواستہ وہ بات لکھ دی اس نے کہا یہ پرچہ اپنے ہاتھ سے ''ع، خ'' کو دے دیجئے میرا ہاتھ کانپنے لگا اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر ''ع، خ'' کے ہاتھ میں دے دیا اس نے پرچہ پڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

اب ہم ساحل پر آ گئے لہریں بجلی کی روشنی میں جگمگ جگمگ چمک رہی تھیں مون سون کا زمانہ تھا سمندر اچھل اچھل کر ہونک رہا تھا اور اس کے سیاہ بخارات لچھوں کی صورت میں پرواز کر رہے تھے۔

''ع، خ'' عین سمندر کے کنارے جا کر کھڑی ہو گئی اس کے اس طرح ہٹ کر کھڑا ہو جانے سے میرے دل پر بڑی چوٹ لگی مگر منہ سے اف تک نہیں کی۔

اتنے میں پاور ہاؤس کی کسی خرابی کی بناء پر روشنیاں گل ہو گئیں ''ج، ب'' نے مجھ سے کہا منظر بھیانک ہو چکا ہے آیئے گھر چلیں یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں طے کرنا شروع کر دیں میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، ''ع، خ'' کہیں نظر نہیں آئی میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دیوانہ وار اس کا نام لے لے کر اسے پکارنے لگا اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اتنے میں بجلی چمکی اور مجھ بد بخت نے یہ دیکھا کہ وہ سمندر کی بپھری موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

ہر چند مجھے تیرنا نہیں آتا اور گہرے ٹب میں بھی ڈوب سکتا ہوں لیکن میں نے پروا نہیں کی اور چھم سے سمندر میں کود پڑا۔

سمندر کی موجیں ساحل کی طرف آ آ کر اسے میری طرف دھکیل رہی تھیں میرا ایک ہاتھ ساحل کے چبوترے پر ٹکا ہوا اور دوسرا ہاتھ اسے پکڑ لینے کے واسطے بڑھا ہوا تھا کہ اتنے میں کسی اللہ کے بندے نے مجھ سے کہا یہ چھتری لیجئے اور اس کی موٹھ اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچ لیجئے۔

www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں سمندر کی موجیں زیادہ تیزی کے ساتھ میری طرف آنے لگیں، میں نے حواس درست رکھتے ہوئے چھتری کے ہینڈل کو اس کے برقعے میں پھنسا کر اسے کھینچنا شروع کر دیا اور دل میں ارادہ کرلیا کہ اگر اسے اوپر نہ لا سکا تو چبوترے پر سے ہاتھ ہٹا کر خود کو سمندر کے حوالے کر دوں گا لیکن قسمت نے میری مدد کی میں نے اس کے برقعے سے الجھے ہینڈل کو زور سے کھینچنا شروع کر دیا اور جب وہ قریب آ گئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور ساحل کی سیڑھیوں کی طرف اسے کھینچنے لگا اس نے چیخ مار کر کہا مجھ کو اب زندگی کی طرف واپس نہ لے جاؤ، یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہوگئی اور میں اس کو کھینچ کر ساحل کی طرف لے آیا اور چبوترے پر لٹا دیا ہزاروں تماشائیوں نے مجھ کو حلقے میں لے لیا ''ج، ب'' نے کہا اب کیا کرو گے میں نے کہا ہسپتال لے جاؤں گا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ٹیکسی لے آیا لوگوں نے میری مدد کی اور پھر اسے ٹیکسی میں ڈال کر ایک یورپین ہسپتال میں لے گیا۔۔۔اور ایک ادھیڑ انگریز نرس کی سرکردگی میں تین چار ہندوستانی نرسیں اس کی تیمارداری میں سرگرم ہو گئیں۔

''ج، ب'' اس کی پٹی کے پاس کھڑی ہوگئی اور میں پاگلوں کی طرح برآمدے میں ٹہلنے لگا اور ہسپتال کا عملہ مجھ کو غور سے دیکھنے لگا۔۔۔ایک جوان یورپین نرس نے مجھ سے کہا آپ گھبرائیں نہیں وہ جلد ہوش میں آ جائے گی۔آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ کو چکر پہ چکر آنا شروع ہو گئے، وہ جوان نرس دوڑی ہوئی کمرے میں گئی اور دوا کا ایک گلاس دے کر کہا اسے فوراً پی لیجئے میں نے دوا پی لی سر کا چکر، تھوڑی دیر میں کم ہو گیا۔

کوئی سوا گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کی نحیف آواز سنائی دی ''جوش، جوش، جوش''

میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑا اور اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ادھیڑ نرس نے اشارے سے کہا کہ میں اس کے ساتھ برآمدے میں چلا چلوں۔
برآمدے میں پہنچ کر اس نے انگریزی میں پوچھا آپ کا نام میں نے بتایا جوش اس نے کہا یہ جوان عورت جو کمرے میں کھڑی ہوئی ہیں یہ اس مریضہ کی کون ہیں میں نے کہا بڑی پرانی سہیلی اس نے پوچھا آپ مریضہ کے قرابت دار ہیں؟ میں نے کہا نہیں پھر اس نے سوال کیا کہ آپ مریضہ کو کب سے جانتے ہیں؟ میں نے کہا دو تین مہینے سے میں تو اس کمرے میں کھڑی ہوئی خاتون کا ملنے والا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا کہ اس پرانی سہیلی پر تو کوئی اثر نہیں تھا، آپ تو مریضہ کو فقط دو ماہ سے جانتے ہیں، آپ اس قدر بے تاب کیوں تھے؟ میں نے جواب دیا کہ میں شاعر ہوں شاعروں کے دل نرم ہوا کرتے ہیں پھر اس نے دریافت کیا کہ مریضہ نے ہوش میں آتے ہی اپنی پرانی سہیلی کے بدلے آپ ایک نئے آدمی کو کیوں پکارا؟ میں نے جواب دیا اس عظیم سانحے کے باعث اس کے حواس میں پراگندگی آ گئی ہے۔

نرس نے میرے چہرے کو بغور دیکھا اندر چلی گئی اور فون کرنے لگی میرا ماتھا ٹھنک گیا ہو نہ ہو یہ پولیس کو بلا رہی ہے اور اس کو یہ شبہ ہو گیا کہ یہ عاشقانہ خودکشی کا واقعہ ہے۔

اس وقت مجھ وہ پرچہ یاد آ گیا جو "ع، خ" نے مجھے موٹر میں دیا تھا اس لئے اسے دیکھنے کے لئے میں غسل خانے چلا گیا پرچہ نکالا وہ بھیگ کر خراب ہو چکا تھا صرف پہلی سطر پڑھ سکا جس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ میری زندگی باجی اور آپ کی بیوی کے واسطے ایک عذاب بن چکی ہے، اس لئے۔۔۔۔۔اس کے آگے پڑھا نہیں گیا، میں نے پرچہ پھاڑ کر نالی میں بہا دیا اور سیدھا "ع، خ" کے پاس جا کر کان میں کہا پولیس اگر بیان لینے آئے تو میرے سر کی قسم تم یہ کہنا کہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہنا۔

اتنے میں پولیس آ گئی اور ایک سارجنٹ نے اس سے پوچھا آپ سمندر میں کیسے

www.pdfbooksfree.pk

گر گئی تھیں اس نے کہا پاؤں پھسل گیا تھا سارجنٹ نے دریافت کیا آپ کو کسی نے دھکا دے دیا تھا اس نے کہا نہیں اس نے سوال کیا کیا آپ کے دل کو کسی نے دھکا دے دیا تھا اس نے زبان سے تو کہا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ تو کہیئے خیر یہ ہو گئی کہ سارجنٹ اس کے سرہانے کے ڈسک پر کہنیاں ٹیکے اس کا بیان لے رہا تھا وہ اس کے آنسو دیکھ نہیں سکا، ورنہ بڑی آفت آ جاتی۔

جب سارجنٹ بیان لے کر چلا گیا تو میرے پیٹ میں سانس آئی۔۔۔۔۔۔

نرس نے مجھ سے کہا چونکہ یہ خاتون بے حد نازک اور کمزور ہے، میں رات بھر اس کو ہسپتال میں رکھوں گی اور اس کی حالت قابل اطمینان ہوئی تو کل دوپہر تک چھٹی دے دوں گی۔۔۔۔اب آپ جائیں اور صبح خبر لینے آئیں۔

''ج،ب'' نے کہا جوش صاحب آیئے اب گھر چلیں۔۔۔۔میں اس کے ساتھ دروازے تک گیا اور اس سے کہا تم جاؤ، میں رات یہیں بسر کروں گا اس نے کہا رہئے گا کہاں میں نے کہا اسی لان پر، اس نے کہا سردی میں اکڑ جایئے گا۔

---

1 پورا مکالمہ یاد نہیں رہا ہے

اور مینہ برسنے لگے گا تو؟ میں نے جواب دیا برآمدے میں چلا جاؤں گا یہ سن کر اس نے بڑے طنز سے کہا افوہ، آپ تو بڑے جاں باز عاشق نکلے میں نے سر جھکا لیا اور وہ سخت بدمزہ ہو کر چلی گئی۔

اب میں نم خوردہ لان پر جا کر بیٹھ گیا اور پان کی ڈبیا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ جیب کٹ چکی اور روپے کا بٹوہ غائب ہو چکا ہے دھک سے ہو کر رہ گیا خیال آیا کہ اب کیا ہو گا صبح کو ہسپتال کا بل کیوں کر ادا کر سکوں گا۔سوچا کہ ''ج،ب'' سے جا کر روپیہ لے آؤں غیرت نے گوارا نہیں کیا اور پھر یہ بھی سوچا کہ وہ یہاں سے آٹھ دس میل دور رہتی ہے ٹیکسی کا کرایہ کہاں سے لاؤں گا اس سے کرایہ بھی دلواؤں قرض بھی مانگوں، یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

حسن اتفاق سے وہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر جس نے مجھے برآمدے کی کرسی پر بٹھا کر دوا پلائی تھی برآمدے سے گزر کر جب کسی کمرے کی طرف مڑنے لگی مجھ پر اس کی نظر پڑ گئی اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دبے پاؤں میرے پاس آ کر پوچھا کیا آپ تمام رات اس لان پر گزار دیں گے میں نے کہا جی ہاں اس نے کہا آپ کو بڑی تکلیف ہو گی میں نے جواب دیا کہ میں جھیل لوں گا اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا آپ میرے کمرے میں چل کر آرام کریں۔۔۔۔۔ میں ساتھ ہو لیا۔۔۔۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ کر، اس نے جلدی جلدی کھڑکیوں کے تمام پردے گرا دیے دروازہ بند کر لیا بڑی مہربانی کے ساتھ مجھے صوفے پر بٹھایا الماری کھولی برانڈی اور بیئر کی بوتل نکالی سامنے کی میز سے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اٹھا لائی برانڈی میرے سامنے رکھ دی اور خود بیئر پینے لگی۔

جب ہم دونوں پی چکے وہ تلے انڈے اور توست لے آئی، اور ایک گدے لگی بید کی بنچ پر تکیے لگا کر مجھے لٹا دیا کمرے کی لائٹ گل کر دی غسل خانے کا دھیما بلب جلا دیا، اور مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔

میں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ سو جاؤں، مگر نیند نہیں آئی، کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگا، اور دیکھا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہے۔

ابھی میں اسی کرب کے عالم میں تھا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مسہری سے اٹھی آہستہ آہستہ میری طرف آئی اور جھک کر میرا منہ دیکھنے لگی اور جب میں نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں اس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟ میں نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا بالکل نہیں اس نے میری کلائی پکڑ کر کہا چلئے میرے بستر پر وہاں نیند آ جائے گی میں اٹھا اور اس کی مسہری پر جا کر لیٹ گیا اور اس نے اپنا ہاتھ تکیے کے طور پر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور میری نیند اور بھی اچٹ گئی۔

صبح جاگتے ہی ہم دونوں نے تبسم کا تبادلہ کیا تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا بل بتا

www.pdfbooksfree.pk

دیجئے تا کہ میں اپنی قیام گاہ پر جا کر روپیہ لے آؤں۔۔۔اس نے آنکھیں جھکا کر کہا، بل میں ادا کر دوں گی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ میرے پاس آتے جاتے رہیں گے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور ہفتے کی شام کو ملنے کا وعدہ کر کے میں ہسپتال سے باہر آ گیا اور گیٹ پر کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ بل تو خیر وہ ادا کر دے گی لیکن نرسوں وغیرہ کو انعام کہاں سے دوں گا اور ''ع، خ'' کو ٹیکسی پر لے جاؤں گا تو کیا ''ج، ب'' سے کرایہ دلاؤں گا اور فرض کیجئے کہ یہ بھی ہو گیا تو میں اس عالم افلاس میں یہاں رہوں گا کیوں کر؟ پھر خیال آیا کہ تار دے کر گھر سے روپیہ منگا لوں، لیکن سوال یہ ہے کہ تار کیسے دوں؟

میرا سر چکرانے لگا اور کبیر کا یہ دوہا یاد آ گیا ''اک دن آن پھنسو گے پیارے جیسے بن کر ہرنا''

اس ادھیڑ بن میں جب گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ریاست دتیا کے دیوان، قاضی سر عزیز الدین صاحب موٹر سے گزر رہے ہیں جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں قاضی صاحب نے موٹر رکوا لی، دوڑ کر میرے گلے مل گئے اور کہا ارے یہ دولت غیر مترقبہ اور مدراس میں آپ کب آئے اور یہاں اس طرح اداس کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟

میں نے کہا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے آپ کو اس وقت میرے پاس بھیج دیا اگر آپ کے سے بے تکلف دوست کے بدلے کوئی اور آتا تو میں اس سے اپنا عالم کیوں کر بیان کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا جلدی کہئے بات کیا ہے میں نے کہا جیب کٹ گئی ہے اور پورے تین ہزار غائب ہو چکے ہیں قاضی صاحب نے کہا کوئی اپنی پوری پونجی بٹوے میں رکھ کر باہر نکلتا ہے آیئے میرے ساتھ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور

پانچ ہزار کے نوٹ، ایک پرس میں بھر کر میرے حوالے کر دیئے میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا میں گھر جا کر یہ رقم واپس کر دوں گا انہوں نے میرا گریبان پکڑ کر کہا مجھ سے اور اس قدر غیریت کی باتیں اب ناشتہ کر کے جایئے گا اور کل رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایئے گا۔

میں غسل اور ناشتہ کر کے جانے لگا، انہوں نے کہا آپ میری گاڑی پر جائیں تاکہ میرا شوفر آپ کا گھر دیکھ لے اور کل آپ کو یہاں لے کر آجائے۔

میں ان کی موٹر پر ہسپتال پہنچا ''ع، خ'' کو بحال پایا، دل کی کلیاں کھل گئیں اس نے پوچھا باجی ساتھ نہیں آئیں میں نے کہا وہ تو رات ہی کو چلی گئی تھیں اس نے پوچھا آپ کہاں رہے ہیں میں نے کہا اسی ہسپتال میں اس کی آنکھوں میں کامیابی اور تشکر کے آنسو آگئے۔

جب اسے لے کر ''ج، ب'' کے وہاں پہنچا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا اگر تم ڈوب جاتیں تو ہم لوگ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرتے میں نے سوچا اللہ اکبر، رقابت بھی بڑی بد بلا ہوتی ہے اس نے یہ نہیں کہا کہ اگر تم خدانخواستہ ڈوب جاتیں تو میرا دل شق ہو جاتا یعنی اس کے نہ ڈوبنے کی اس کو صرف اس لئے خوشی ہوئی کہ وہ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرنے کے عذاب سے بچ گئی۔

اللہ رقابت کی ڈاہ سے بچائے

وہ دونوں سہیلیاں ابھی تک خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں ایک کلکتہ میں رہتی ہے ایک مدراس میں

میں جب ہندوستان جاتا ہوں تو فرض کر کے ان دونوں سے ملتا ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری ہر نظر سینکڑوں افسانے کہنے لگتی ہے تمام مناظر اور تمام واقعات ہمارے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور ہمارے مابین کے تمام رنگین مکالمے، گونجنے لگتے ہیں ہمارے کانوں میں۔

www.pdfbooksfree.pk

ابھی دو ڈھائی برس کی بات ہے کہ میں ہندوستان گیا اور ''ع، خ'' کو تار دے کر دہلی بلا بھیجا تھا۔

مدت کے بعد جب ہماری آنکھیں چار ہوئیں فریقین ڈوب گئے ماضی کے سمندر میں ایک دوسرے سے دیر تک بات نہ کر سکے۔

اس ملاقات سے متاثر ہو کر میں نے اسی زمانے میں جو چند رباعیاں 1 کہی تھیں آپ بھی سن لیں۔

---

1 وہ رباعیاں مندرجہ ذیل تمہید کے ساتھ میرے ایک مجموعے میں شائع ہو چکی ہیں۔

حسن و عشق کا باہمی ارتباط، شباب کے مہکتے خیاباں سے ہوتا ہوا، جب شیب کے دہکتے ریگستان میں قدم رکھتا ہے اور تسلسل عشق و درازی عمر کے گرم و سرد دیا جب آگے بڑھ کر ایک ہو جاتے ہیں تو تھلی ہوئی زندگی کے سامنے، ایک ایسا رندھا رندھا ساحل آ جاتا ہے کہ اس کی بے پناہ اداسیوں پر نگاہ کر کے اگر روتے روتے آنکھیں پھوٹ جائیں اور دھڑکتے دل ڈوب جائیں تو یہ ایک ایسا متوقع حادثہ ہو گا کہ کسی دیکھنے والے کو اس پر تعجب کرنے کی جرأت نہیں ہو سکے گی۔۔۔ کون اس عبرت ناک صورت حال کا اندازہ کر سکتا ہے کہ نامرادو ماہ و سال کا وزن، جب گردن کو سن کر دیتا ہے تو اس وقت ماضی کی طرف مڑ کر دیکھنے سے گردن کے اعصاب اور دل کی رگوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔۔۔۔۔۔ جس پر بپتا کبھی پڑی ہی نہ ہو وہ کیوں کر سمجھ سکتا ہے کہ جب چاہنے والے کا چہرہ ادھڑ اور محبوبہ کا مکھڑا اجڑ جاتا ہے اور راس اتھاہ

مدھم مدھم ہے، ضو فشانی اس کی
سونی سونی ہے راج دھانی اس کی
طالع ہو، مرے دل کے افق پر اے موت
مائل بغروب ہے، جوانی اس کی

☆☆☆☆

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ
پھر، یار قمر جبیں کا اترا چہرہ
شاید مرے چہرے کو منانے کے لئے
اس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

☆☆☆☆☆☆

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی پہ بل کھاتی ہے
پازیب اتارے انہیں جگ بیت چکا
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

☆☆☆☆☆☆☆

بے کسی کے عالم میں فریقین کی خوگر جالی آنکھیں جب ایک دوسرے کا اترا ہوا منہ دیکھتی ہیں،تو وہ لمحہ اس قدر جاں کاہ ہوتا ہے کہ صرف زمین و آسمان ہی نہیں خود سنگ دل موت کراہنے پر مجبور ہو جاتی ہے جوانی کے تلخ و شیریں عشق پر تو ہزاروں دیوان موجود ہیں لیکن وقت گزیدہ عشق و حسن پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے شاید میں پہل کر رہا ہوں لیکن اس شرمندگی کے ساتھ کہ میرے دل پر جو بیت چکی اور بیت رہی ہے اس کا کروڑاں حصہ بھی سپرد قلم نہیں کر سکا ہوں۔

انجام کے آغاز کو دیکھا میں نے
ماضی کے ہر انداز کو دیکھا میں نے
کل نام ترا لیا، جو بوئے گل نے
تا دیر اس آواز کو دیکھا میں نے

☆☆☆☆

بے مانگی نیاز و افلاس گداز
ناداری عشوہ و تہی دستی ناز
کوتاہ نگاہوں کو بتاؤں کیوں کر
کیا حادثہ عظیم ہے عمر دراز

☆☆☆☆☆☆☆

آنسو آنکھوں میں کس لئے ہیں، اے جان
جھوٹا ہے یہ آئینہ مری بات کو مان
میری آنکھوں میں دیکھ اپنا مکھڑا
تو کیوں ہے اداس اداس تیرے قربان

☆☆☆☆☆☆

پانی کی جھڑی، ملہار گاتی تھی کبھی
بدلی ہر آن گھڑگھڑاتی تھی کبھی
میری نگری سے اے گزرنے والے
برکھا اس دیس میں بھی آتی تھی کبھی

☆☆☆☆☆☆☆

چہرے ہیں اداس اداس گم سم طرفین
اچھا ہے کہ اندھی ہی رہے پیت کی رین
لمحوں ہی سے دیکھیں گے ہم اک دوسرے کو
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

☆☆☆☆☆

کاش، اہل چمن، یہ باغ باں کو سمجھائیں
جھونکوں کو یہ حکم دے کر کہ دھومیں نہ مچائیں

تا۔۔۔۔۔ صبح کو غنچوں کے چٹکنے کی صدا
مرجھائے ہوئے پھول نہ سننے پائیں

☆☆☆☆☆☆

تیری زلفوں میں ہے کہانی میری
تیری پلکوں میں پر فشانی میری
یہ جو تری آنکھوں میں ہیں غلطاں ڈورے
گزری تھی یہیں سے کل جوانی میری

☆☆☆☆☆☆☆☆

Iqbal Cyber Library.Net All rights reserved. ©2002-2006

اضافہ شدہ حصہ

''یادوں کی برات'' کی طباعت سے لے کر اب تک میری زندگی کس نہج سے گزری میرا کاروانِ حیات کن کن، شعلہ چکاں و شب نم فشاں وادیوں کی جانب مڑا اور میرا وقت کن کن سرد و گرم ہواؤں میں اڑا۔۔۔۔۔۔ یہ داستان بھی سن لیجئے۔

داستان گو، خاموش ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔داستان بولتی رہے گی سو، بندہ پرور یادوں کی برات کی اشاعت کے بعد بھی ایوب خاں اور ان کے سیاہ پروردہ الطاف گوہر کے مظالم کا سلسلہ قائم رہا۔۔۔۔۔۔ اور ایسی بلائیں نازل رہیں کہ سانس لینا دشوار ہو گیا اور ہر ذرہ پکار پکار کر کہنے لگا اور آپا کستان اے مردود چکھ لیا مزا پاکستان آنے کا؟ اور اے گھامڑ، دیکھ لی چارہ سازی و ادب نوازی، ان مسلمانوں کی؟

ارے میں، اس ملک کے ناقدروں کا رونا کیا روؤں۔۔۔۔۔ خود میرا آبائی وطن بھی کون سا شریف ملک ہے وہ تو ایک اصطبل ہے، جہاں صدیوں سے لیتا ؤ ہو رہا اور جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔۔۔۔ اور خصوصیت کے ساتھ دہلی و لکھنو کے اربابِ ادب تو اس قدر بے ادب خودسرا و خود پرست اور اس بنا پر اس قدر تنگ دل تنگ نظر، تنگ ظرف اور پورس کے ہاتھیوں کے مانند ہیں کہ ہمیشہ اپنوں ہی کو روندتے رہتے ہیں اور ان کو اس بات کا خوف ہے کہ اگر ہم کسی کو بڑھائیں گے تو خود گھٹ جائیں گے۔

اس وجہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ اربابِ پاکستان اہل ہندوستان کے مقابلے میں اس قدر تو ضرور شریف ہیں کہ اپنوں کی برائی کبھی نہیں کرتے (یہ اور بات ہے اپنے صوبوں کی لومڑیوں تک کو شیر اور دوسرے صوبوں کے شیروں کو بھی لومڑیاں ثابت کیا کرتے ہیں) بہر حال وہ اپنوں کو سر پر چڑھاتے، ان کے حوصلے بڑھاتے، ہاتھیوں پر بٹھا کر ان کے جلوس نکالتے، اور نقیبوں کی طرح یہ نعرے لگاتے ہیں کہ ہوشیار و

خبر دار نگاہ روبرو آرہی ہے سواری سلطان الشعراء اور شہنشاہ قرطاس وقلم کی۔

فرنگیوں کے خطاب یافتہ خادم حفیظ جالندھری نے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ

بڑے زوروں سے منوا گیا ہوں

یہ ہے شرافت پنجاب کی کہ اپنے بوقوں کو "بڑے زوروں" سے منوا کر باون گز کر بنا دیتا ہے۔

میرے آبائی ملک اور خصوصاً میرے صوبے کا اس کے برعکس یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کو گدھوں پر بٹھاتا، ان کا منہ کالا کرتا، انہیں گلی گلی پھراتا، اور ان کو لولو بنا کر، ان کے پیچھے تالیاں بجاتا رہتا ہے، ذرا غور تو فرمایئے کہ بیس برس ہو چکے ہیں مجھے ہندوستان چھوڑے مگر اہل ہند کے دلوں میں اب تک میرے خلاف وہ آگ بھری ہوئی ہے کہ ابھی کچھ دن ہوئے کہ امرت سر کے ٹی وی اسٹیشن میں سوتیوں نے ایک رت جگا منایا تھا جس میں ناچنے اور ڈھولک بجانے کے واسطے میرے مرحوم دوست حضرت سیماب اکبرآبادی کے برخود غلط محبوب، اور ایک نامعروف عورت، اور ایک بے اجازت پرائی کتابوں کو چھاپنے والے مجرم کو بھی تال دینے کی غرض سے مدعو کیا گیا تھا۔۔۔۔ان چھچھوروں نے بھی بھر کر میرے خلاف گیت گائے تھے۔

من، از بیگانگاں ہرگز تنالم
کہ بامن، ہرچہ کرد، آشنا کرد

جب اپنے ہی صوبے کے لوگ اس قدر سفیہہ، اور اس غضب کے گھٹیا ہیں تو میں یہاں کے ایک دو کوڑی کے چیتھڑے اخبار "نوائے وقت" کی شکایت کیا کروں

دوستوں سے ہم نے وہ صدمے اٹھائے جان پر
دل سے، دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا

گواہ رہنا، اے روح کائنات کہ میں ان لفنگوں، ان نفروں، ان بھانڈ بھگتیوں اور ان چپڑ قناتیوں کے نرغے میں زندہ رہنے کا عذاب جھیل رہا ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

شاہد رہیو، تو اے شب غم

جھپکی نہیں آنکھ مصحفی نے

ہائے کس سے فریاد کروں جا کر کہ

جوش ان سوتیوں کے حلقے میں

زندہ رہنے سے شرم آتی ہیں

ہاں تو میں رونا رو رہا تھا ایوب کے دور عیوب کا اور خزف باری الطاف گوہر کا۔

اس دور عذاب میں جب سورج ڈوبنے لگتا، اور درختوں کے سائے دراز ہو جاتے تھے تو جاگ اٹھتی تھی یاران ہند کی یاد۔۔۔۔۔اور میں دل کو تھام کر چیخا کرتا تھا کہ ارے تاریکیو اے دشمنوں کی پرچھائیاں دکھانے والی تاریکیو، ارے کہاں ہے میرا عرش ملسیانی، کہاں ہے میرا جگن ناتھ آزاد، کہاں ہے تلوک چند محروم، کہاں ہے میرا پنڈت ہاکسر، کہاں ہے میرا فرقوا (فراق گورکھپوری) کہاں ہے میرا آنند نرائن ملا کہاں ہے میرا اختر علی تلہری کہاں ہے میرا علی عباس حسینی، کہاں ہے میرا فرنگی محلی رضا، کہاں ہے میرا حکیم شمس الدین، کہاں ہے میرا اجمل سعیدی، کہاں ہےمیرا گوپی ناتھ امن، کہاں ہے میرا بشیشور پرشاد منور، کہاں ہے میرا پریم نرائن، کہاں ہے میرا رفیع احمد قدوائی، کہاں ہے میرا گل زاد، کہاں ہے میرا عبدالسلام، کہاں ہے میرا سمیع اللہ، کہاں ہے میرا دیوان سنگھ مفتون، کہاں ہے میرا جواہر لال نہرو، کہاں ہے میرا شنکر پرشاد، کہاں ہے میرا اودیا شنکر، کہاں ہے میرا ابوالکلام آزاد، کہاں ہے میرا اجمل خاں، کہاں ہے میرا کنور مہندر سنگھ بیدی، کہاں ہے میری سروجنی نائڈو اور کہاں ہے میرا فلسفی سری کرشن سکسینہ؟

دنیا میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی

اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی

میری دل کی بات اگر پوچھیں تو میں یہ بھی بتا دوں کہ ان تمام احباب کے ساتھ

ساتھ سغر وادساغر سیمابی بھی اکثر یاد آتا رہتا ہے حالانکہ ساغر کا یاد آنا، انسانی حافظے کی توہین ہے اور بشری ذہن کی فحاشی

میں ابھی تڑپ ہی رہا تھا کہ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ مخالفت عامہ نے ایوب خاں کی حکومت کا جنازہ نکال دیا اور الطاف گوہر کے اقتدار کے جھوٹے موتیوں کو بھی چور چور کر ڈالا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دیدی؟ کہ خون، ناحق پروانہ۔۔۔۔ شمع را

چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ایوب خاں کے غروب ہوتے ہی نام خدا یحییٰ خاں طلوع ہو گئے ایک خان گیا اور دوسرا خان مسلط ہو گیا یحییٰ خان کے برسر اقتدار آتے ہی یہاں کے بے ضمیر اخباروں نے ان کے ڈنکے پیٹنا شروع کر دیئے، اور چڑھتے سورج کے خوشامد خور سے پجاری، جوق در جوق دوڑ پڑے ان کی طرف اور خدا کے فضل و کرم سے مارشل لا، عامۃ الناس کو مار مار کر پھر شل کرنے لگا مارشل لاء قائم ہوتے ہی تمام کرنیلوں جرنیلوں نے مونچھیں کھڑی کر لیں، غرور کے تاج پیشانیوں پر کج فرما لیے جس سے ناخوش ہو گئے اس کو جیل میں ٹھنسوا دیا، جس نے جھک کر سلام نہیں کیا اس کو الٹا لٹکوا دیا کوڑوں سے اس کی کھال کھینچ لی جس شریف کی بہو بیٹی پسند آ گئی اسے پکڑ بلایا اور لہولہان کر دیا اور پولیس کا محکمہ قطعی مفلوج ہو کر رہ گیا۔۔۔۔ اور پاکستان کے معرض وجود میں لانے کی علت سمجھ میں آ گئی جہاں تک کہ میری ذات کا تعلق ہے، میں بے حد شکر گزار ہوں یحییٰ خاں کا کہ انہوں نے میرا ضبط شدہ پاسپورٹ واپس کر دیا، میرے لڑکے کی چھنی ہوئی سیمنٹ ایجنسی کو بحال کر دیا اور مجھ سے وعدہ کر لیا کہ میرا تقرر دوبارہ کر دیا جائے

www.pdfbooksfree.pk

گا۔

لیکن، جہاں تک کہ مفاد عامہ کا تعلق ہے ان کا دور نہایت منحوس ثابت ہوا وہ بادر عنبر چکاں اور انفاس گل رخاں میں اس قدر ڈوب گئے کہ پاکستان کا بیڑا غرق ہو کر رہ گیا اور بنگال ہاتھ سے نکل گیا اگر میری یہ بات سن کر کوئی صاحب یہ ارشاد فرمائیں کہ جوش صاحب قبلہ، آپ کس منہ سے یحییٰ خاں پر اعتراض فرما رہے ہیں جب کہ آپ خود بادہ غیر چکاں و انفاس گل رخاں کے ہمیشہ سے رسیا ہے اور نام خدا آج کے دن تک ہیں

توبہ فرما یاں، چرا خود توبہ کم تری کنند؟

تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ حضرت بادہ خواری اور حسن پرستاری کا حق پہنچتا ہے صرف ان خاصان خدا کو، جو اقطاب حکمت و اولیائے ادب ہیں اور جو عالم سرشادی میں یہ نعرہ لگا سکتے ہیں کہ:

گدائے مے کدہ ام لیک وقت مستی بیں

کہ ناز، بر فلک و حکم، برستارہ کنم

لیکن یہ چیز عوام کے لئے حرام اور مطلق حرام ہے، اور فقط حلالیوں کے واسطے حلال ہے

من، در پیالہ عکس رخ یار، دیدہ ام

اے بے خبرز لذت شرب مدام ما

اگر ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ میں بلوریں جام، اور زلف مشک آشام دے دی جائے گی معاشرے کا نظم درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور اگر خدانخواستہ حکام اس کے خوگر ہو جائیں گے تو پورا ملک تباہی کے کھڈ میں گر کر چکنا چور ہو جائے گا۔

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

ہاں تو سقوط بنگال، ایک ایسا کوہ شکن و مرد افگن سانحہ تھا کہ ہر گھر میں صف ماتم بچھ

www.pdfbooksfree.pk

گئی اور ہر دل سے دھواں اٹھنے لگا۔

چنانچہ اس پاکستان گیر دورشیون و ماتم میں لوگوں کو ڈھارس ہے اور ان کی ہمت بڑھانے کے واسطے میں نے مندرجہ ذیل نظم کہی تھی۔

کہاں تک آتش سوز جگر کی بات کریں
اب آؤ، آب خم و جام زر کی بات کریں

بھڑکتی آگ، کڑکتی کمان کی زد پر
بہکتی چال، لچکتی کمر کی بات کریں

محل کرب میں چھیڑیں رباب کیف و نشاط
جمود برف میں رقص شرر کی بات کریں

بھلائیں دغدغہ ظلمت و نہیب غروب
فروغ شمس و طلوع سحر کی بات کریں

ہوائے بستہ کنج قفس کے حلقے میں
فضا دریدگی بال و پر کی بات کریں

بجائے شکوہ بے سود اختصار حیات
حصول دوت عمر خضر کی بات کریں

حدیث طینت خشت و خزف سے کیا حاصل
سرشت لعل ز مزاج گہر کی بات کریں

ایک عجیب آواز:

سقوط بنگال سے کوئی آٹھ دس برس پیشتر کی بات ہے کہ میں ہوائی جہاز سے ڈھاکے گیا تھا اور آسمان سے اتر کر جیسے ہی وہاں کی زمین پر قدم رکھا تھا تو وہاں کے ذرے ذرے سے آواز آ رہی تھی ''توڑ دو، توڑ دو، ہماری زنجیر غلامی توڑ دو، اب ہم پاکستان کے ساتھ نہیں رہیں گے'' یہ صدائیں سن کر میں کانپ اٹھا تھا اور جب میں

www.pdfbooksfree.pk

نے ڈھاکے کے ایک دوست سے یہ بات کہی تھی کہ بنگال پاکستان سے قطع کرے گا تو
ان کو یقین نہیں آیا تھا۔

ابھی زخم بھرنے بھی نہیں پایا کہ بنگال کا الیکشن کا ہنگامہ برپا ہو گیا اقتدار کے
پجاری لنگر لنگوٹ کس کس کر کود پڑے اکھاڑوں میں ہر پارٹی اپنے اپنے علم اٹھائے
نکل پڑی گھروں سے اور شور کرنے لگی شاہراہوں پر طبل ہائے مسابقت پر دما دم
ضربیں پڑنے لگیں اور فلک شگاف نعروں سے ہوا کے پرخچے اڑ گئے۔

اور خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی کے مابین ہاؤں ہاؤں کی
آوازوں کے ساتھ زبردست رسہ کشی کا آغاز ہو گیا جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی
کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کر کے، ان کو جھنڈوں پر چڑھایا اور ''شوکت اسلامی''
کے نام سے ایک زبردست جلوس نکالنے کی خاطر، شہر بھر کے تمام بہروپیوں بلوائیوں،
بھالوؤں، بھونگڑوں، بنارسی ٹھگوں، بازاریوں، بونوں، بھکاریوں، بوبکوں، بدھوؤں،
بوکڑوں اور بھڑ بھڑیوں کو یکجا کر کے ان سب کو اونٹوں، گھوڑوں، ٹھیلوں اور ٹرکوں پر
لادا، اور ایک چیختا، چلاتا، ہونکتا، الالاتا، گونجتا، گرجتا اور کڑکتا جلوس نکالا کہ دھرتی ماتا
کانپنے لگی، آکاش تھرتھرا اٹھا اور موت کا فرشتہ، فضا پر جبڑا کھولنے اور دانت نکالنے لگا۔

اور جب یہ اٹنگے پائجاموں، گھنے داڑھوں، قصاب چہروں اور قاتل تیوروں کا
ہیبت ناک جلوس، نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، تو سڑکوں پر جس قدر بھی تماشائی تھے وہ
اپنے اپنے جسموں کو ٹٹول ٹٹول کر اس امر کا اندازہ لگانے لگے کہ ہم ابھی تک بقید
حیات ہیں کہ مر چکے ہیں۔

اس جلوس کے سردار، داڑھے پھٹکار پھٹکار کر یہ اعلان کر رہے تھے کہ اے
مسلمانو، اگر ہم کو ووٹ دو گے تو اللہ اور اللہ کا رسولؐ، دونوں، تم پر نعمتوں کے بادل برسا
دیں گے اور تم سب کو فر دافر دا حور، قصور، کھجور، انگور اور طہور کی لذتوں سے ہمکنار فرما
دیں گے۔

اور اس طرف پیپلز پارٹی کا یہ پیان تھا کہ اگر تم ہم کو بر سر اقتدار لے آؤ گے تو ہم تمہارے واسطے روٹی، کپڑے اور مکان کا بندوبست کر دیں گے۔

ادھر تھے حور، انگوڑ اور غلمان ادھر تھا روٹی، کپڑا اور مکان، گمان غالب یہ تھا کہ مسلمان چونکہ دنیا بےزار اور عقبیٰ پرستار ہے، اور صدیوں سے

ما، مقیمان کوئے دل داریم

رو بدنیائے دوں، نہ می آریم

کا نعرہ لگا رہا ہے، اس لئے ٹوٹ پڑے گا ہر فرد، سوئے کوثر و تسنیم و غلمان، اور ٹھکرا دے گا روٹی، کپڑا اور مکان۔

لیکن ووٹوں کا جب شمار کیا گیا، تو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگئی کہ ایماں بدوش جماعت اسلامی کو شکست کے کھڈ میں گرا دیا گیا ہے اور ''کافر'' پیپلز پارٹی کو منارہ فتح پر جگہ دی گئی ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اب مسلمان، نرا جذباتی اور وہم پرست نہیں رہا ہے، اور اس کی کھوپڑی میں عقل کی روشنی پہنچ گئی ہے۔۔۔اور وہ ''علمائے کرام'' کے چوہے دان سے باہر نکل آیا ہے۔

اگر ''حامل کفر'' پیپلز پارٹی ہار اور ''محمل ایمان'' جماعت اسلامی جیت جاتی، تو آپ جانتے ہیں کہ بےچارے پاکستان پر کیا آفت ٹوٹ پڑتی؟

حضور والا، یہاں کہ تمام بینک بند کر دیئے جاتے، درآمد و برآمد کا نظام درہم و برہم ہو کر رہ جاتا، تسخیر ارض وسماوات اور تحقیق اسرار کائنات کے حوصلوں پر زندیقیت کی مہر لگ جاتی۔۔۔فلسفے، منطق اور سائنس کے مکتب ڈھا دیئے جاتے، اقوال اوہام اور اساطیر کی یونیورسٹیاں کھول دی جاتیں۔۔۔عقل کی ناک، جڑ سے کاٹ کر پھینک دی جاتی اور جنون کے ماتھے پر تاج زرکج کر دیا جاتا۔۔۔۔قرآن کے مردود لفظ عشق کی تاج پوشی کے جشن منائے جاتے، اور قرآن کے محبوب لفظ فکر کی

www.pdfbooksfree.pk

کھال کھینچ دی جاتی ۔۔۔ کچھ واڑھیوں کے لم ڈگے محتسب، ہر شام کو گلیوں کے چکر لگاتے اور ارباب دانش کے منہ سونگھتے پھرتے۔

اٹنگے پائجامے پہنوائے جاتے، شانوں پر چوخانے کے رومال، ڈلوائے جاتے اور چہروں پر داڑھیاں اگوا دی جاتیں۔

جو بد بخت کسی حسین چہرے کی طرف، جان بوجھ کر، دوسری بار نگاہ اٹھاتا، درد ناک عذاب میں گھر جاتا۔ اور اگر کوئی الھڑ، ناز و ادا سے کمر لچکاتی، اس پر لعنت کی کمانیں کڑکنے لگتیں ۔۔۔ اور شاعری، موسیقی، مصوری مجسمہ سازی اور رقص کو حرام ٹھہرا دیا جاتا۔

دانش وروں نے، خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے فضل و کرم نے پاکستان کو ان مصائب سے بچا لیا ۔۔۔ اور پیپلز پارٹی کو کامراں بنا کر، بھٹو صاحب کے صاحب کے ہاتھ میں عنان اقتدار دے دی۔

لیکن اس مسرت انگیز تبدیلی کا میری ذات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دور دور تک چاندنی چھٹک گئی لیکن میری انگنائی میں اندھیرا ہی رہا۔ اس بے اعتنائی کو دیکھ کر میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

عمر تاں، بادا دراز، اے ساقیان بزم جم

ساغر ما، گونہ شد، پر مے، بدوران شما

اس زمانے کی بات ہے کہ میں ایک روز شام کے ہنگام، اپنے مکان کی بالائی منزل کے چھجے پر بیٹھا، شغل کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے نواسے کے پیچھے پیچھے ایک سرو قامت و صبیح طلعت نوجوان عورت چلی آ رہی ہے۔ برآمدے میں آتے ہی اس نے کہا، آداب عرض، اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے پہلو کی آرام کرسی پر لچک کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی جوش صاحب میرا نام ہے کنیز فاطمہ، میرے باپ انجینئر ہیں ریلوے میں آپ کا کلام تیرہ برس کی عمر سے پڑھ رہی ہوں، جس کی بہت سی نظمیں از

بر ہیں، اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ''یادوں کی برات'' بھی امی سے چھپا کر پڑھ چکی ہوں، یہ سب میں نے اس نے بتا دیا کہ آپ مجھ کو پہچان لیں، میں تو پیدا یہیں کراچی میں ہوئی ہوں، لیکن باپ دادا کا وطن ہے لکھنو، ٹوریا گنج میں ہمارا مکان تھا (لکھنو (اے) وکٹوریا گنج کو ٹوریا گنج کہتے تھے، اس حسینہ کی زبان سے ٹوریا گنج سنا، لکھنو کی یاد دل پر تیر چلانے لگی) میں نے کہا تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تم پیدا تو یہیں ہوئی ہو، مگر حیرت ہے کہ تمہاری زبان اور تمہارا لہجہ خالص لکھنو کا ہے۔ اس نے مسکرا کر کہا یہ امی اور ابا جان کی جوتیوں کی برکت ہے وہ بے حد محتاط ہیں زبان کے معاملے میں، کسی سے ذرا سی بھی غلطی ہو سختی کے ساتھ اس کو ٹوک دیتے ہیں اب آپ پوچھیں میں آپ کے پاس کیوں آئی ہوں میں نے کہا بتاؤ اس نے کہا چھوٹا منہ بڑی بات میں حاضر ہوئی ہوں آپ کو ایک مشورہ دینے کو میں نے کہا بیان کرو اس نے کہا مجھ کو آپ کی پریشانیوں کا علم ہے اس ایوب نے آپ کے ساتھ کیا کیا اس سے بھی واقف ہوں میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ مولانا کوثر صاحب نیازی سے مل لیں، میں نے بات کاٹ کر کہا، تمہارے رائے سر آنکھوں پر، لیکن میرا ان کا کیا جوڑ، وہ ملا ہیں، میں رند، میں تو سمجھتا ہوں وہ مجھے برداشت نہیں کر سکیں گے، اس نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا ارے ایسا نہیں ہے جوش صاحب نیازی صاحب ملا نہیں، ادیب و شاعر ہیں وہ ضرور آپ کی قدر کریں گے بس مل لینے کی دیر ہے آپ کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی میں نے کہا اچھا۔۔۔۔۔اس نے اپنے بدن کو جھٹکا دے کر کہا اللہ اس بے دلی سے اچھا نہ کہئے مجھ ناچیز کا یہ مشورہ ہے آپ کو حضرت عباس کی قسم ان سے ملیے اور ضرور ملیے میں نے کہا تم نے قسم دی ہے تو ملوں، اور ضرور ملوں گا، یہ سن کر وہ خوش ہو گئی، میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی زلفوں کی مہک میرے حوالے کر کے چلی گئی۔

اس کے تیسرے یا چوتھے دن، میں برآمدے میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اٹھا کر ''ہلو'' کہا اس طرف سے آواز آئی آداب عرض کرتی ہوں

جوش صاحب، میں کنیز فاطمہ بول رہی ہوں، میں نے کہا ''کہو کنیز فاطمہ کیسا مزاج ہے'' اس نے شکریہ ادا کر کے کہا جوش صاحب مولانا کوثر آج کل کراچی آئے ہوئے ہیں، ان کا قیام ہے ''قصر ناز'' میں اللہ، آپ ان سے آج ہی مل لیں، میں نے کہا تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے بتا دیا، میں ابھی فون کر کے، وقت مقرر کر لوں گا، جب میں نے فون رکھ دیا بیوی نے تیکھے تیوروں سے پوچھا یہ موئی کنیز فاطمہ کون ہے، کیا اپنے پیچھے پھر کوئی لسر کا لگا لیا ہے؟

میں نے کہا توبہ کرو، اشرف جہاں، یہ کنیز فاطمہ تو ایک بوڑھی عورت ہیں، نانی دادی بھی بن چکی ہیں جس دن تم سجاد سے ملنے گئی تھیں، انہوں نے میرے پاس آ کر، یہ مشورہ دیا تھا کہ میں کوثر صاحب سے مل لوں، یہ سنا تو بیوی کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں۔

دوسرے دن، کوثر صاحب سے ملا، وہ اس قدر تپاک اور شگفتگی سے ملے کہ جی خوش ہو گیا، اور میری ساری بدگمانیاں دور ہو گئیں۔

میں نے دل میں کہا اس چہرے اور اس مزاج کے آدمی کو لوگ ''مولانا'' کہہ کر پکارتے ہیں کوئی حد بھی ہے اس بدمذاقی کی۔

حضرت کوثر سے میں نے مختصر الفاظ میں اپنی روداد کہی، وہ بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا آپ پنڈی تشریف لے آئیں، میں ایک ہفتے کے اندر، اپنے ہی محکمے میں آپ کا تقرر کر دوں گا۔

اور جب میں ان کا شکریہ ادا کر کے، رخصت ہونے لگا، تو وہ کچھ اس طرح مسکرائے کہ میرا دل موہ لیا۔

اور جب میں پنڈی پہنچا، تو انہوں نے حسب وعدہ میرا تقرر فرما دیا، وعدہ ہو تو ایسا اور ادب نوازی ہو تو ایسی۔

جزاک اللہ، فی الدارین خیرا!

میرے تقرر کے وقت ممتاز صاحب علوی وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے کس طرح گناؤں ممتاز صاحب کے محامد و محاسن اس شخص کے سینے میں شرافت سانس لیتی ہے، اور اس کے لہجے میں وہ زیرو بم ہے جو اعلےٰ درجے کے خاندانی افراد کے گلے میں پایا جاتا ہے لیکن صد حیف کہ وہ ''دولت مستعجل'' کی طرح سفیر بنا کر چین بھیج دیئے گئے اور میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

ان کے بعد ان کی جگہ نسیم احمد صاحب سیکرٹری بنا دیئے گئے، اور دوسری ملاقات ہی میں برہم ہو گئے مجھ سے۔۔۔۔یا یوں کہئے کہ میری ایک عادت قبیح، اور میری ایک سنت جاریہ نے ان کو برہم کر دیا مجھ سے۔

میں کیا کروں کہ میرے سامنے جب کوئی غلط زبان استعمال کرتا ہے، میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا، اور پھٹ سے ٹوک دیا کرتا ہوں اور یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ٹوک رہا ہوں، وہ سلطان ہے یا گدا۔

میں پنڈت جواہر لال نہرو، ابو الکلام آزاد، اور آمر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں تک کو ٹوک چکا ہوں۔

چنانچہ نسیم احمد صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا کہ جب انہوں نے اثنائے گفتگو میں ''رہائش گاہ[1]'' کہا تو میں نے پھٹ سے ٹوک دیا کہ لفظ غلط اور بدنسلا ہے اور میرے ٹوکتے ہی نسیم صاحب کے چہرے سے اس طرح پل بھر میں تبسم غائب ہو گیا۔ جس طرح بجلی کا رشتہ منقطع ہوتے ہی بلب کی روشنی اڑ جایا کرتی ہے۔

میری اس ''گستاخی'' سے چراغ پا ہو کر انہوں نے میرے خلاف، نہایت سخت الفاظ میں ایک نوٹ لکھا، اور اس پر ''ٹاپ سیکرٹ'' کا لیبل لگا کر، اس کو وزیر اعظم بھٹو صاحب کے پاس بھیج دیا۔

وہ نوٹ تھا تو ایسا کہ مجھے فوراً برطرف کر دیا جاتا، لیکن بھٹو صاحب نے یہ شرافت برتی کہ مجھ کو برطرف تو نہیں کیا، مگر وزارت اطلاعات سے ہٹا کر تعلیمات کی وزارت

کو اشارہ کر دیا گیا کہ وہاں میرا تقرر کر دیا جائے۔ جب نسیم صاحب کے اس نوٹ، اور اپنے تبادلے کی خبر مجھ تک پہنچی، تو میں تعلیمات کے سیکرٹری، اور ملک کے نام ور ادیب قدرت اللہ صاحب شہاب سے ملا۔

کیا بتاؤں کہ وہ کتنی بے نظیر سعادت مندی سے پیش آئے، اور اپنے چہرے کی ومیدگی سے انہوں نے میرے دل پر کس طرح اپنی شرافت وقدر دانی کا سکہ بٹھا دیا۔

انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا جوش صاحب آپ کا ہماری وزارت سے منسلک ہونا ہماری بڑی عزت افزائی کا باعث ہے آپ مطمئن رہیں کہ ایک ہفتے کے

1۔ یہ دراصل ہندی کے لفظ ''رہنے سے بنایا گیا ہے، اگر اسے مان لیا تو پھر ''کھانے'' سے ''کھلائش'' اور ''لیٹنے'' سے ''لٹائش'' کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔''

اندر آپ کو مسئلہ طے ہو جائے گا، اور میں آپ کا تقرر نامہ لے کر خود آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گا۔

شہاب صاحب کی ادبیت کا تو میں ایک مدت سے مداح تھا، اور اس ملاقات کے بعد اب ان کی آدمیت پر بھی ایمان لے آیا۔

لیکن میں، چونکہ خدا کے فضل و کرم سے قلیل الاحباب و کثیر الاعدا ہوں اس بناء پر لوہے لگ گئے میرے تقرر میں۔

میری مسل، نام خدا جس کے بھی سامنے گئی، اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس پر اعتراضات وارد کر کے، اس کو پلٹا دیا گیا۔

کسی نے تو اس تعصب کی بناء پر میرے مسئلے کو الجھا دیا کہ یہ کم بخت یوپی کا باشندہ ہے کسی نے اس بات پر نگاہ کر کے روڑے اٹکائے کہ یہ ناپاک رافضی ہے اور کسی نے اس بنا پر مجھے نقصان پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ روسیاہ ملحد ہے۔ اس کے علاوہ میری ذات میں جو پانچ عدد عیوب ہیں، انہوں نے بھی لوگوں کو مجھ سے برافروختہ کر رکھا ہے آپ میرے ان کالے عیبوں کو بھی سن لیں۔

1 میں، ابلہانہ مدنی ضوابط کو ٹھکراتا اور احمق پنچوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہوں۔

2 میں اپنے معاشرے کے علی الرغم دروغ گفتاری اور ریا کاری پر عمل نہیں کرتا، اور اپنے جلوت وخلوت کے تمام مشاغل کو ڈنکے کی چوٹ پر بیان کر دیتا ہوں۔

3 میں اوہام اقوال اور اساطیر کے روبرو سر خم نہیں کرتا اور برہان منطقی فہ صداقت ریاضی کے بغیر ''بزرگان دین'' کی کسی بات کو تسلیم کر لینے پر، کسی شرط کے ساتھ بھی آمادہ نہیں ہوتا۔

4 یاران طریقت اپنی بنیادی خامی کو نظروں سے چھپا دینے کی خاطر، ایک مدت دراز سے عقل کی توہین اور جنوں کی تبلیغ فرما رہے ہیں، اور ہنکار ہے ہیں انسانی ذہن کو برہان کے کھلے میدان سے وجدان کے تنگ حجرے کی جانب، اور میں خانہ خراب، نصف صدی سے عقل وفکر کے گن گا اور عشق وجنوں کو ٹھکرا رہا ہوں۔

5 لوگ، زبان، اوطان، ادیان اور الوان کے اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے سے نفرت کرتے اور ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ اور میں اس دھرتی ماتا پر بسنے والے تمام انسانوں سے محبت کرتا، وحدت انسانی کی تبلیغ میں سرگرم رہتا اور رحمتہ للعالمین سے رشتہ قائم کئے ہوئے ہوں۔

ذرا غور تو فرمایئے، صرف ایک عیب انسان کو نکو بنا دیتا ہے اور میں تو بفضلہٖ پنج عیبی ہوں مجھ سے کون محبت کا ارتکاب کر سکتا ہے؟

سو، جناب والا، میرے ان عیوب پنجگانہ کی بناء پر میرے تقرر کے مسئلے کو پورے چھ مہینے تک مسلسل گھمایا جاتا رہا۔ اور چونکہ میں خدا کے بے نہایت فضل و کرم سے دولت مند انسان نہیں ہوں چھ ماہ تک مشاہرہ نہ ملنے سے بلبلا اٹھا اور جب یہ دیکھا کہ اب دروازے پر فاقے دستک دینے والے ہیں، میں نے گھبرا کر اپنے دو دوستوں کو اپنی پریشانی سے خط لکھ کر آگاہ کیا۔

ان دوستوں میں سے ایک تو ہیں روشناس عالم پیر خانقاہ اور دوسرے ہیں سات

پردوں میں چھپے ہوئے ملحد عقل آ گاہ۔

حضرت پیر خانقاہ، میرا خط پی گئے، اور میرا ملحد یار، لبیک کہتا ہوا دوڑ پڑا میری طرف۔۔۔۔۔۔اللہ اللہ، انسانیت کا درد، اور ملحد کے سینے میں

در خرابات مغاں، نور خدامی بینم

ویں عجب بیں کہ چہ نور سے زکجامی بینم

آخر کار جب خیر سے چھٹا مہینہ بھی گزرنے لگا تو آخر "تنگ آمد بجنگ آمد" پر عمل کر کے میں نے بھٹو صاحب کو ایک تلخ و ترش خط لکھ مارا خط کی نقل میرے پاس نہیں ہے لیکن اس قدر ضرور یاد ہے کہ میں نے اس خط میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب آپ کی حکومت، مجھ کو دیر اثر زہر (Slow Poison) کے ذریعے سے آہستہ آہستہ ہلاک کرنے میں سرگرم ہے اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ایک ایسا ہول ناک جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکے گی اور یہ کلنک کا ٹیکا، قیامت تک چھڑائے نہیں چھوٹے گا۔

میں کس زبان سے بھٹو صاحب کا شکریہ ادا کروں کہ وہ میرے لہجے کی تلخی پی گئے اور وزیر تعلیم کے نام اسی وقت حکم جاری کر دیا میرے فوری تقرر اور میرے چھ مہینے کے چڑھے ہوئے مشاہرے کے فوراً ادا کر دیئے جانے کا۔

چنانچہ اس حکم کے دوسرے ہی روز میرا تقرر کر دیا گیا اور میری پوری چھ ماہ کی رقم بھی ادا کر دی گئی اور میرے تمام یاران ہوا خواہ کے منہ اتر کر رہ گئے۔

دشمن اگر قویست، نگہ باں قوی تراست

تعلیمات کے محکمے میں آ کر، ابھی اطمینان کی چند سانسیں ہی لینے پایا تھا کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا شہاب صاحب کے تبادلے کا، اور میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا اور جب ان کو لندن بھیج دیا گیا تو میں بڑے خوف سے یہ سوچنے لگا کہ دیکھئے اب کس سے سابقہ پڑنے والا ہے۔

میں اپنی طبع کی نازکی سے بے حد خائف رہتا ہوں میں سوچنے لگا کہ اگر ان کی جگہ کوئی آئی سی ایس قسم کا گڈا میر صاحب آ گئے،تو میرا نباہ ناممکن ہو جائے گا۔

لیکن جب میں نئے سیکرٹری ڈاکٹر اجمل صاحب سے ملا،تو میرا وہ خوف باطل ہو گیا۔اور یہ سمجھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اجمل صاحب بھی علمیت،شرافت اور ادب نوازی کا ایسا مجموعہ ہیں کہ میرا ان سے باحسن الوجوہ نباہ ہو جائے گا۔

لیکن بے شمار خوبیوں کے باوجود،ان کی یہ بات دل کو بہت کھٹکتی ہے کہ وہ خون سے خون ملنے کا وقت مقرر کرتے ہیں،اور خود ہی کہلا بھیجتے ہیں کہ ایک ناگہانی میٹنگ نکل آئی ہے،اس لئے کل تشریف لے آیئے۔

میری موجودہ زندگی:

ہر چند بھٹو صاحب نے،میری معاش کا معقول انتظام کر دیا ہے،لیکن میرا خرچ میری آمدنی سے زائد ہے،اس لئے زندگی آرام سے بسر نہیں ہوتی ہر ماہ بیمار بیٹے کو چار سو روپے اور بیوہ بیٹی کو تین سو روپے بھیجتا ہوں۔۔۔۔گرانی،اور پھر بادہ ناب کی گرانی نے کمر توڑ رکھی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو اس قدر معقول مشاہرہ ملتا ہے،پھر بھی آپ غیر مطمئن رہتے ہیں،انہیں کیا معلوم کہ افلاس و امارت کا انحصار،آمدنی کے سکوں کی عددیت پر نہیں،بلکہ ذاتی اور خاندانی معیار زندگی پر ہوتا ہے۔

اس لشتم پشتم زندگی گزارنے کے باوجود،مضطرب کر دینے والے غم کو اپنے پاس ہر کنے بھی نہیں دیتا،جب دیو غم،کندے کھول اور خم ٹھونک کر،حملہ کرتا ہے،ایک ایسا نچا تلا مکا مارتا ہوں اس کے منہ پر کہ اس کی نکسیر پھوٹ جاتی ہے۔

ہر چند گرز روز گار سے،میرے سر کو محفوظ کر دیا گیا ہے،لیکن ایک نگاہ نازکی ایسی برچھی مجھ پر مسلط فرما دی گئی،جو اس عمر میں بھی میری رگ جاں کو چھیڑتی رہتی ہے۔

میں،ہر آن،اپنے شہر حکمت کی طرف بھاگ جانا چاہتا ہوں،لیکن میرے گردو

پیش رخ و گیسو کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں کہ بھاگ نہیں سکتا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

در، نہ ستانی، بستم می رسد

یہ ماجرا، آگے چل کر، بیان کروں گا۔

جی ہاں، اسلام آباد کی آب و ہوا، بے حد روح افزا ہے، لیکن تنہائی مارے ڈال رہی ہے مجھے۔

دن بھر تو اس تنہائی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کوئی آ کر میرے لکھنے پڑھنے میں خلل نہیں ڈالتا۔

لیکن آفتاب کے غروب ہو جانے کے بعد، جب میرے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے، تو اس سبھ گھڑی میں، دل سے آواز آنے لگتی ہے، کاش اس وقت چند فلسفی یا شاعر، یا ادیب میرے ہم نشیں ہوتے اور گل افشانی گفتار سے میرا شغل سہانا ہو جاتا۔ بار بار گھبرا گھبرا کر، ہر طرف دیکھتا ہوں اور جب کوئی ہم زبان و ہم سخن، دور دور تک نظر نہیں آتا، تو چیخ اٹھتا ہوں کہ اے میرے اللہ بھیج دے معقول آدمیوں کو۔۔۔ اگر تیرے خزانے میں کوئی معقول آدمی نہیں ہے تو بھیج دے کسی گنگوہ شریف کے مولانا عبدالقدوس ہی کو۔

اللہ اکبر، میری شاموں کی ڈائن تنہائی، اندھی، گونگی، لنگڑی، لولی اور بسورتی تنہائی۔

اس گاڑھی، دبیز، گھن گرج، گھنگور، گھپ اور گھور تنہائی سے جب میری سانس رکنے لگتی ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر چلاتا ہوں کہ:

کوئی آج کو ہی ناصح لائے، میلا

ہیں رہے گھبرا میں غم شب اکیلے،

گاہ گاہ اس تنہائی کے مذاہب سے نجات دلانے کے لئے چند احباب و اقارب

ادھر نکل آتے ہیں اور میرے شغل میں جان پڑ جاتی ہے۔

ان رحمت کے فرشتوں کے نام اور ان کے مختصر خصوصیات آپ کو بھی سنائے دیتا ہوں۔

کلام خاں:

یہ میرا دوست نہیں بھانجا ہے، بڑا جواں مرد و جفا کش انسان ہے آڑے وقت میں میرے کئی بار کام آچکا ہے۔

پہلے ڈھاکے میں تھا وہاں کی آب و ہوا سے اس کو بہت پہلے سے بوے فساد آئی پشاور چلا گیا پشاور جا کر مکان بھی بنا لیا حالات نے پلٹا کھایا پشاور کو تج کر پنڈی آ گیا اپنی پرانی تمباکو کی تجارت سے دست بردار ہو کر یہاں اس نے ایک زرائتی اور ایک پولٹری فارم کھولا آج کل اس کا کام بگڑا ہوا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا ہر چند مرغی خانہ کھول کر گلی گلی بانگ دیتا پھرتا ہے، لیکن چہرے سے حزن کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔

وہ بے حد گورا چٹا، اور خوب رو انسان ہے، خلوص کا تو بس پتلا ہے، اور جب ولولے میں آ کر باتیں کرتا ہے تو ہکلانے لگتا ہے، اور اس کے ہکلانے پر مجھ کو پیار آنے لگتا ہے خدا اس کی عمر دراز کرے، اور اس کی معاشی تنگی دور فرمادے۔

جمال خاں:

یہ بھی میرا بھانجا، اور کمال کا چھوٹا بھائی ہے از راہ سعادت مندی کبھی کبھار ادھر آ نکلتا ہے پہلے یہ لندن میں رہتا تھا اب یہاں کسی دفتر میں چارٹرڈ اکاؤنٹ ہے۔

لندن میں ایک جرمن نژاد لڑکی سے آنکھ لڑ گئی تھی، عاشقی کے خوب پینگ بڑھے اور اس لڑکی نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

مگر اب صاحبزادے نے عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اس لڑکی سے شادی اور ایک عدد بچی کے باپ بھی بن گئے۔

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے جو معشوقہ لیلیٰ کی طرح محمل میں جلوہ گر تھی، وہ زوجہ

بنا کر، ان کی انگنائی میں گائے کی طرح کھڑی جگالی کر رہی ہے سچ کہا ہے حضرت اکبر الہ آبادی نے کہا:

عاشقی، دام شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

عزیز ہاشمی:

جس اسکول کے پہلے بانی تھے اب وہاں حکومت کے تصرف کے بعد ہیڈ ماسٹری کر رہے ہیں کبھی کبھی منہ کا مزا بدلنے کے لئے شعر بھی کہہ لیتے ہیں میرے ساتھ نہایت خلوص سے پیش آتے اور کبھی کبھی اصلی شہد بھی کھلاتے ہیں حسن پرست بھی ہیں اور رنگین مزاج بھی لیکن اس راز کے افشا سے گھبراتے ہیں اللہ ان کو جرأت بخشے۔

سید عزادار حسین کاظمی:

جب میں یہاں تازہ تازہ آیا تھا، وہ ریلوے کے محکمے میں افسر تھے، اور میرے مقدم میں انہوں نے ایک ایسا شاندار جلسہ کیا تھا جو ابھی تک یاد ہے۔

اس جلسے میں انہوں نے مجھے چاندی کے فریم میں ایک سپاس نامہ دیا تھا اور دو نہایت آب دار کیس بھی بطور تحفہ عنایت فرمائے تھے۔

اس کے بعد پنڈی کو سونا کر کے، لاہور چلے گئے تھے لیکن اب، خدا کے فضل سے پھر ان کا یہیں تبادلہ ہو گیا ہے اور تیل کے محکمے کے افسر مقرر کر دیئے گئے ہیں بڑی دھیمی آواز اور بڑی شور انگیز محبت کے انسان ہیں۔

ملتے جلتے کم ہیں، مگر جب فون کر کے بلاتا ہوں، محبت کی زنجیر میں بندھے فوراً آ جاتے ہیں ہر چند نہایت سنجیدہ اور مذہبی آدمی ہیں مگر رندوں پر مہربانی فرماتے رہتے ہیں، اور چونکہ تیل کے محکمے سے ان کا تعلق ہے، اس لئے چہرے پر بڑی چکناہٹ پائی جاتی ہے، اللہ خوش رکھے۔

سید ارتضی حسین زیدی:

www.pdfbooksfree.pk

یہ دوستوں میں نہیں میرے بچوں میں شامل ہے، میرے محبوب و مقتول مصطفےٰ زیدی کا چھوٹا بھائی ہے خاموش، با ادب اور معصوم آدمی ہے میں جب اس کو گلے لگاتا ہوں اپنے بیٹے سجاد حیدر کا مزا آجاتا ہے کس قدر پیارا ہے یہ نوجوان۔

اس کا ماشاءاللہ ایک چھوٹا بچہ ہے جس کو میں ''دوست'' کہہ کر پکارتا ہوں خدا نظر بد سے بچائے، اس قدر ذہین ہے کہ حیرت ہوتی ہے وہ اس عمر میں میری ایک نظم آہا آہا برکھا آئی الاپتا رہتا ہے۔

مصطفےٰ کی بیوی بھی نہایت شائستہ اور تعلیم یافتہ ہے، میرے لکھنو شریف کی رہنے والی ہے اس لئے سخن سنج بھی ہے۔

اس کی بڑی بیٹی شعر کہتی ہے، اور اس نے ایک جاسوسی ناول بھی لکھا ہے جس کو پڑھ کر میں نے اسے رائے دی ہے کہ بیٹی جب تم پڑھ چکنا، تو خفیہ پولیس میں داخل ہو جانا۔

جب ارتضیٰ میاں اور ان کی والدہ معظمہ کو دیکھتا ہوں اپنے مصطفےٰ کی یاد میرے سینے کی ہار ہو جاتی ہے۔

ہائے کس قدر قابل ناز شاعر، مل گیا خاک میں ہائے کس آسمان کو کھا گئی یہ ڈائن زمین۔

ہائے میرے مصطفےٰ تم اکیلے چلے گئے، مجھے ساتھ نہیں لیا۔

عون محمد رضوی:

یہ بھی میرے برخورداروں میں شامل ہے، بہت با ادب اور نہایت مخلص نوجوان ہے ٹیلی ویژن کے محکمے سے وابستہ ہے اور بہت ہی پیارا لڑکا ہے لیکن وعدے کو کبھی ایفا نہیں کرتا، اور اس کے ساتھ ساتھ اس قدر بھولا بھالا ہے کہ ایک بار اس نے فرمائش کر دی میاں احمد فراز کے سے نابالغ انسان سے کہ وہ ٹیلی ویژن پر میرے کلام کے باب میں اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔

اللہ اللہ غاروں کا نشیب، اور پیائش کرے کوہ ساروں کے فراز کی، ارے ذرا سانیولا اور میدان میں آئے تلوار باندھ کر!

تفو، برتو، اے چرخ گرداں تفو!

محمد رمضان:

حسن ابدال میں رہتے ہیں، نام تو ہے خشک رمضان، لیکن شخصیت ہے، عید کا شاداب گلستان اس شخص کا دل اس قدر گداختہ ہے کہ اس پر قربان ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔

اختر و منظور کو دعوت میں جب آتے ہیں تو اس قدر لطیفے سناتے ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں ایسے باغ و بہار آدمی ہیں کہ انہیں دیکھ کر دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

نام تو ہے رمضان، مگر ہیں رندوں کے سلطان۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے نام کے مہینے میں بے آب و گیاہ دشت بن جاتے ہیں سچ کہا ہے میر نے۔

دیر سے اٹھ کے، کعبے آیا میر

جس کو چاہے، خدا خراب کرے

ڈاکٹر صفدر حسین:

محکمہ تعلیمات میں ڈائریکٹر اور نہایت فاضل انسان ہیں اور بڑے نپے تلے، چست گفتار اور سنجیدہ لہجے کے شاعر ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ مرثیے پر ان کو بڑی دست گاہ حاصل ہے، ہنستے کم ہیں، سنجیدہ زیادہ رہتے ہیں، وضع داری اور بردباری کے قابل تقلید نمونے ہیں۔

شعر بہت اچھے کہتے ہیں لیکن ان کو سناتے ہیں اس برے انداز سے کہ ان کا سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ کبھی خوب رو انسان تھے مگر حد سے زیادہ کنایت شعاری کی پرچھائیوں نے ان کے حسن کو گہنا دیا ہے۔

صفدر صاحب بحیثیت مجموعی، اس قدر وضع دار، مہذب، شائستہ اور صاحب علم و فضل انسان ہیں کہ آدمی ان سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

سیفی نوگانوی:

میرے نئے احباب میں سے ہیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ملاقات ہے مگر خیالات کے اشتراک کی بناء پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کئی ہزار سال کی پرانی دوست ہے۔

یہ رہتے تو ہیں پاکستان میں، لیکن ان کا دماغ پاکستانی یا ایشیائی نہیں بلکہ یونانی ہے۔

آبائی عقائد کے آہنی حصار کو توڑ کر باہر آ جانا، انسان کا نہیں دیو کا کام ہے، اور اسی وجہ سےمیں ان کو دیو، اور نہایت قوی ہیکل دیو کا خطاب دوں گا۔

انہوں نے گرز فکر کے ضربات مسلسل سے اقوال، اوہام، افکار اور اساطیر کے وقت نوزائیدہ سنگین قلعے کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے اور اپنے سارے خاندان سے جدا ہو کر منطق و حکمت کی ہم نشینی میں، زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں نے ان کے دو فکری و تحقیقی مسودوں کو غور سے پڑھا ہے اور ان کی اس سے زیادہ تعریف نہیں ہو سکتی کہ اگر یہ پختگی سے بھرے ہوئے مسودے، چھاپ دیئے جائیں تو ناپختہ ذہن رکھنے والے حضرات کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور تمام شہر کے جلا بے چھریاں لے لے کر ان پر جھپٹ پڑیں اور قتل کر کے ان کی لاش پر گھوڑے دوڑا دیں۔

گفتار صدق، مایہ آزار می شود
چوں، حرف حق، بلند شود، داری شود

ڈاکٹر سبط حسن:

یہاں کسی کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں، انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری

تہران سے حاصل کی ہے۔

یہ ٹھوس، گمبھیر سنجیدہ اور سخن سنج انسان ہیں مگر مزاج میں اقوال پرستی کا عنصر غالب ہے گہری بات سن کر چونک پڑتے اور آنکھیں کھول کھول کر غور کرنے کی سعی فرماتے ہیں لیکن عین اس وقت، ان کے آباء آتے، اور ان پر لاٹھی چارج کرنے لگتے ہیں اور یہ بیچارے گھبرا کر اس طرح آنکھیں میچ لیا کرتے ہیں، جیسے کسی ننگی تصویر پر نظر پڑتے ہی کوئی دوشیزہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔

بہر حال آدمی اس قدر ذی علم و صاحب اخلاص ہیں کہ ان سے محبت کی جائے اور جی بھر کے کی جائے یہ میرے پاس بہت ہی کم آتے ہیں، اور انہیں خبر نہیں کہ میں ان کو اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

سید محمد واقف:

نام محمد واقف لیکن عظمت فکر محمد سے ناواقف ہیں اور ضمیر محمد تک رسائی کا شرف و مجد حاصل نہیں ہے وہ منسٹری آف ورکس میں ڈپٹی سیکرٹری، اور میری اقلیم دل کے شہزادے ہیں، ان کا وطن ہے کعبہ ہندوستاں یعنی لکھنو باتیں کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور خال و خط سے نور برستا ہے شوخی مزاج میں اس قدر ہے کہ بعض اوقات، بھری محفل میں، اپنی بیگم پر بھی فقرے کس جاتے ہیں، اور وہ بیچاری چڑ مرا کر رہ جاتی ہیں۔ میں ان کی بیگم کو بھی تعریف نہیں کرسکتا۔ سراپا مہر و اخلاص ہیں، اور بھولے پن کی یہ انتہا ہے کہ مجھ رند نامہ سیاہ کو چھپا ہوا درویش سمجھتی ہیں لیکن بہاری کباب کھلانے کا وعدہ کرتی، اور رہر بار بھول جاتی ہیں۔

واقف صاحب کے اعمال دینی دیکھ کر، جب میں ان کو چھیڑتا ہوں تو وہ اپنے چہرے پر عالمانہ سنجیدگی طاری کر کے ایسے غیر منطقی جواب دینے لگتی ہیں کہ ان کے منہ سے دودھ کی خوشبو آنے لگتی ہے اور بے ساختہ جی چاہنے لگتا ہے کہ ان کو گود میں اٹھا کر منہ چوم لوں۔

www.pdfbooksfree.pk

نظم اکبر آبادی:

دبلے پتلے ہنس مکھ آدمی ہیں، پہلے ریلوے میں تھے اب پنشن پاتے ہیں ان کی شاعرانہ حیثیت بلند ہے، غزل کہتے ہیں اور بہت اچھی کہتے ہیں اور پڑھنے کے انداز میں بھی بڑی کشش ہے۔

محبت کا یہ عالم ہے کہ جب کسی جلسے میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، دوڑ کر گلے لگ جاتے ہیں لیکن اس محبت کے باوجود انمل اس قدر ہیں کہ مہینوں صورت نہیں دکھاتے ہیں کاش ان کو معلوم ہو جائے کہ میں ان کو اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔

سید اولاد باقر رضوی:

پہلے فوج میں ونگ کمانڈر تھے، پھر فوجی فاؤنڈیشن میں کام کرنے لگے، اور اب یہ غضب کیا کہ پنڈی کو ویران کر کے کراچی چلے گئے ان کا گھریلو نام ہے" دلارے میاں" اور، واقعی وہ دوستوں کی آنکھوں کے تارے اور یاروں کے دلارے ہیں بھی اور شعر بھی خوب کہتے ہیں ماشاءاللہ۔

ان کے گھر پر اکثر دعوتیں ہوا کرتیں تھیں اور یہ خصوصیت تھی ان کی دعوتوں کی کہ ان میں خاصان جام وسبو اور صاحبان سجادہ وضو دونوں کو مدعو کیا جاتا تھا اور مے کدے اور صومعے ایک ہی حلقے میں تعمیر کر دیئے جاتے تھے اور عرصہ رندی کے غازی اور گوشہ تقوی کے نمازی، دوش بدوش بیٹھ کر، اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔

اور جب آفتاب غروب ہو جاتا تھا تو ایک طرف تو مصلے دراز ہو جاتے، اور دوسری طرف بساط بادہ نوشی بچھا دی جاتی تھی اور اذانوں کی آوازوں کے سائے میں قلقل مینا تھر کنے لگتی تھی، اور پھر مصلوں پر نمازی غروب، اور بساط رنگ پر غازی طلوع ہو جایا کرتے تھے اور دلارے میاں کی طرف روزگار، انگلی اٹھا کر کہا کرتا تھا۔

آب و آتش، بہم آمیختہ از لب لعل
چشم بد دور، عجب شعبدہ باز آمدئی

www.pdfbooksfree.pk

کوثر نیازی:

وزارت اطلاعات ونشریات حج واوقات کے مرکزی وزیر ہیں عالم دین ہیں پھر بھی دنیا کے دردمندوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں اوران کے ناز اٹھاتے ہیں اورمولانا ہونے کے باوصف شیریں مقال شاعر بھی ہیں اور چہرے پرخشکی کے عوض شادابی کھیلتی رہتی ہے۔

جناب والا، اقتدار کا نشہ، وہ بلائے بد ہے کہ اس کو برداشت کرنا آدمی کا نہیں اوتاروں کا کام ہے۔

اورمسلمان تو اس نشے سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ فقط ہیڈ کانسٹیبل بن کر، ہوش میں نہیں رہتا اور کلنا ہاتی کی طرح جھومنے لگتا ہے لیکن آفریں باد برحضرت کوثر نیازی کہ تخت وزارت پر جلوہ گر ہو کر بھی ان کے ہوش وحواس بجا ہیں اورفروتنی کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔

تواضع، زگردن فرازاں نکو، ست
گدا گر تواضع کند، خوئے اوست

صفیہ شمیم:

میری سگی بھانجی ہے اس کا ذوق سخن اس قدر اعلیٰ پائے کا ہے کہ عورتیں تو کیا، مردوں میں بھی اس کی ٹکر کے شاعر کم ملیں گے۔

اس کے دوش بدوش اس میں تحمل کا اس قدر غیر معمولی مادہ ہے کہ وہ اپنے اس شوہر کو جسے کوئی پل بھر کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتا، نوجوانی سے لے کر آج تک برداشت کرتی چلی آرہی ہے اوراسی خوئے تحمل سے اپنے کو جنت کا مستحق بنا چکی ہے۔

لیکن اب نماز روزے کی طرف اس قدر ڈھل گئی ہے کہ اولاد کی تربیت اور گھر کے کام کاج سے قطعاً منہ پھیر لیا ہے کیسی گھر گرستی اور کیسی اولاد، اب تو وہ ہے اور مصلے ہے۔۔۔۔اسے یہ نکتہ کون بتائے کہ اس قدر نمازیں پڑھنا اوراس شدت کے ساتھ ہر

آن جانماز پر بیٹھے رہنا کہ گھر تباہ ہو کر رہ جائے خود شریعت کی نظر میں بھی معیوب ہےمیں اس کو لاکھ لاکھ سمجھاتا ہوں کہ یہ روش خود اسلامی اعتدال کے خلاف ہے، لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ مجھ کو سپاٹ آنکھوں سے دیکھ کر سر جھکا لیتی ہے اس لئے میں نے اس کا نام ''جنت بوا'' رکھ دیا ہے اور یہی لیل و نہار رہے تو مجھے اس امر کا شدید خوف ہے کہ اس کا ذوق شعری ٹھٹھر کر رہ جائے گا اور وہ آخر کار ''نور نامے'' اور ''راہ نجات'' کی سی چندھی چپڑی پچپچی چمڑودھی اور چوپٹ شاعری کے علاوہ اور کچھ کر ہی نہیں سکے گی اللہ خیر کرے۔

حفیظ الرحمٰن:

ان کی تعریف کے واسطے کہاں سے الفاظ لاؤں اخلاص ان کے سینے میں سانس لیتا ہے یہ پاکستانی معلوم ہی نہیں ہوتے اس لئے کہ پاکستانی ہوس زر میں اس قدر بوکھلا چکے ہیں کہ انہوں نے خلوص و وضع داری کو اپنے پر حرام کر لیا ہے۔

حد یہ ہے کہ ایک پاکستانی بزرگ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا روز چچا جان کے گھر کیوں جاتا ہے ارے کم بخت وہاں جا جہاں دو پیسے مل سکیں حیرت ہے کہ حفیظ صاحب پر اس ماحول کا کوئی اثر نہیں پڑا اور ان کی اودھی آن بان، اخلاص مندی اور وضع داری اپنی جگہ قائم رہی۔

حفیظ صاحب پندرہ میل کا سفر طے کر کے میرے پاس آتے ہیں حالانکہ ان کی کوئی غرض مجھ سے وابستہ نہیں ہے۔

قیامت ہے کہ سن، لیلیٰ کا آنا، دشت مجنوں میں

کہا، حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

فیض احمد فیض:

کیا کہنا میاں فیض کا ڈنکے پٹے ہوئے ہیں پورے پاکستان میں اور کیوں نہ ڈنکے پٹیں کہ یہ اس کے بہمہ وجوہ مستحق ہیں میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب

www.pdfbooksfree.pk

کوئی انہیں جانتا ہی نہ تھا اور اس دور میں جب کبھی میرا لاہور آنا ہوتا تھا تو یہ شام کے وقت میرے پاس بلا ناغہ آیا کرتے تھے اب میرے پاس کم آنے لگے ہیں اور میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ میاں فیض:

حریف بزم تو بودم، چو ماہ نو بودی
کنوں کہ ماہ تمامی، نظر دریغ مدار

فیض صرف اچھے شاعر ہی نہیں اچھے آدمی بھی ہیں اور میرے اس قول کے مصدق ہیں کہ حقیقی شاعر، کبھی برا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔

ہرچند نہایت آب دار شعر کہتے ہیں لیکن اس قدر بری طرح پڑھتے ہیں کہ سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔

حدیث متواتر کے طور پر سن رہا ہوں کہ جالندھر کے حفیظ صاحب، فیض کی شہرت و مقبولیت سے بے حد چراغ پا ہیں اور کہتے ہیں ارے یہ کل کا لونڈا اس قدر مقبول ہو گیا کہ لوگ مجھ ''ابو الاثر'' کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

ایں طفل یک شبہ، رہ صد سالہ می زند

ارے یہ فیض پڑھتا نہیں گھانس کاٹتا ہے، اور میں گا گا کر، مرکیاں لے لے کر نرت کر کر کے اور انگشت شہادت کے سرے کو انگوٹھے کی نوک پر جما کر، گھومتے چھلے بناتا، بار بار گردن لچکاتا رہتا ہوں، پھر بھی لوگ اس قدر بدمذاق ہیں کہ مجھ کو ٹھینگا دکھا رہے ہیں ارے غضب خدا کا میں پکا مسلمان اور شاہ نامہ اسلام کا مصنف ہو کر فردوسی کو نیچا دکھا چکا ہوں اور اس کے برعکس فیض ملحد ہے غدار وطن ہے اور پھر بھی دنیا اس کی طرف ڈھلتی چلی جا رہی ہے۔

اور میں ان خیاگر شاعر صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ:

طمع چہ می بری، اے سست نظم، بر حافظ
قبول خاطر و حسن سخن، خدا داد است

www.pdfbooksfree.pk

فیضی:

یہ زبان اردو کے فیضی ہیں شیریں مقال و مداح اہل بیت ہیں اور ایسے کھٹکے سے شعر سناتے ہیں کہ لوگ جھومنے لگتے ہیں ان میں اخلاص و محبت کا جوہر ایسا ہے جو اس دور میں کہیں نظر نہیں آتا ان کے چہرے پر نمک اور ایسا نمک ہے کہ اس کے دائرے میں سینکڑوں سانولی سلونیاں مسکراتی نظر آتی ہیں۔

اردو شاعروں میں بالعموم یہ گھٹیا پن پایا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا کرتے ہیں اور میرے نزدیک یہ پہلے شاعر ہیں جو اپنے ہم عصروں کی جی بھر کر داد دیتے اور ان کی مدح میں رباعیاں کہہ کر بھری محفلوں میں سنایا کرتے ہیں ذرا اندازہ تو فرمائیے کہ اس شاعر کا سینہ کس قدر چوڑا ہے۔

اعظمیٰ:

یہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ حضرت شبلی کے ہم وطن، قدردان سخن، نازک بدن اور چمن اندر چمن انسان ہیں جب آتے ہیں تو شمعیں جل اٹھتی ہیں طاق دل میں۔

اس دور سیاست و ہوس دولت اور پرستارئی جہالت میں ارباب نظر کا وہ قحط ہے کہ شعر خوانی کا ولولہ، اور عرض ہنر کا حوصلہ ہی باقی نہیں رہا ہے اور جب کوئی شعر سنانے کی استدعا کرتا ہے تو سن سے ہو کر رہا جاتا ہوں اور کسی صورت سے بھی شعر سنانے پر آمادہ نہیں ہوتا لیکن اعظمیٰ صاحب آ نکلتے ہیں تو وہ کہیں یہ نہ کہیں میں بے ساختہ شعر سنانے لگتا ہوں حیف بر جان سخن گر بسخنداں ترسد

اور وہ میرزا غالب کی طرح بجا طور سے کہہ سکتے ہیں کہ:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

دانش:

کسی کالج میں پروفیسر تھے اب پنشن پا رہے ہیں دانش فقط تخلص ہی نہیں بلکہ دانش مند ہیں بھی

شائستگی، خوش فکری اور شیرینی کلام سے مالا مال ہیں ان کا کلام اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کسی نظر کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ آج ملا بنے بیٹھے ہیں، کل کسی گلی کے چکر لگانے والے عاشق زار ہوں گے۔ (کہیں ان کی بیگم یہ عبارت نہ پڑھ لیں ورنہ اودھم مچا دیں گی۔) فیض صاحب کی مانند یہ بھی اپنے ہم عصر شعراء کی علی روس الاشہاد مدح سرائی فرماتے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کو بھی انشراح صدر کی دولت بے دار حاصل ہو چکی ہے۔

آرزش:

ہائے مر گیا عین جوانی میں کیا کہوں وہ کس قدر نکتہ رس بلند ہیں۔ اور پختگی مائل شاعر تھا۔ اس جوان مرگ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی مل جاتا، خوشی کے مارے کھل اٹھتا اور لذت فروتنی سے گردن جھکا لیا کرتا تھا۔

وہ جوانی میں جب اس قدر اچھے شعر کہتا تھا تو بوڑھا ہو کر نہ جانے کیا ہو جاتا۔ ہائے اس کا ایک مطلع سنیئے، اور اس کی قبل از وقت دقیقہ سنجی پر سر دھنیئے۔

تشبیہ شاخ گل کو نہ دوں کیوں صلیب سے
دیکھا ہے میں نے جشن بہاراں قریب سے

محمد عظیم

اٹک آئل کمپنی میں چیف انجینئر ہیں۔ اور پھر بھی شاعری کے قدر دان ہیں۔ وہ جب ہماری صحبتوں میں شرمائے شرمائے سے آتے ہیں اور دبک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں تو ان کی یہ شرمیلی الھڑوں کی سی وضع دیکھ کر مجھ کو تو بہت ہی پیار آنے لگتا ہے ان پر۔ لیکن ان کہ دبکاہٹ اور شرماہٹ پر نہ جایئے۔ بندہ نواز وہ بڑے سخن شناس اور نکتہ سنج انسان ہیں اور فکری مسائل پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ اور اس قدر کہ وہ باسی معاشرے کے سیلے ہوئے تہہ خانے سے باہر نکل آئے اور فکر کے صحت بخش میدان میں سانس لے رہے ہیں۔

لیکن ان کی بیگم الامان والحفیظ۔وہ تو اس قدر کٹر قسم کی ملانی ہیں کہ ہر آن اذان دیتا رہتا ہے۔ان کا چہرہ اور ایسا لگتا ہے گویا مولانا عتیق الرحمان، داڑھی منڈا کر زنانے لباس میں آ گئے ہیں۔

سنتے ہیں اے محمد عظیم صاحب، اگر اپنے بچوں کو تباہی سے بچانا ہے تو للہ ان کو ان کی اماں جان سے دور دور رکھیے۔ورنہ وہ مرغوں کی طرح بانگیں دیتے پھریں گے گلی گلی میں۔

یونس منصور

ٹیلی ویژن سے وابستہ ہیں۔اگر زمانہ انہیں فرصت و فراغت دیتا تو وہ اس وقت ملک کے بہت بڑے فلسفی کی حیثیت سے میدان میں آ چکے ہوتے۔

لیکن اس قدر بے پایاں اور نامطبوع مشغولیت کے باوجود، ان کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔اور وہ جو بات بھی کہتے ہیں وہ باون تولے پاؤ رتی سے کم کی نہیں ہوتی۔

شروع شروع میں بڑی گرم جوشی سے ملا کرتے تھے اور بار بار آتے تھے۔اب نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ نہ آتے ہیں اور نہ فون پر ہی اپنی آواز سناتے ہیں۔

ہو نہ ہو "وہ یونس اندر دہان ماہی شد" کے چکر میں آ گئے ہیں۔اللہ ان کو مچھلی کے پیٹ سے باہر لائے۔اور بحر آشنائی میں شناوری کی دوبارہ توفیق عطا فرمائے۔

علی اختر زیدی

پہلے حسن ابدال کے فوجی کالج میں پروفیسر تھے۔اب کہیں باہر چلے گئے ہیں پروفیسر بن کر۔دبلے پتلے نازک اندام انسان ہیں۔لیکن ان کی محبت اس قدر قوی الجثہ ہے کہ آدمی کو جب پکڑ لیتی ہے تو وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتا۔چنانچہ یہ خاکسار بھی ان کے دام میں گرفتار ہے۔یہ ہر چند مطلق رند نہیں، پھر بھی رندوں اور رندی سے محبت کرتے ہیں۔

ان کے چلے جانے سے حسن ابدال کا منہ اتر گیا ہے۔اور ہر ذرہ سے آواز آ رہی

ہے، زیدی، زیدی، زیدی۔ جب وہاں جاتا ہوں ڈھونڈتی رہتی ہیں میری آنکھیں ان کے چہرے کو۔ جب سے باہر گئے ہیں، بڑی حیرت ہے کہ مجھ کو ایک سطر بھی نہیں لکھی ہے اور میں بے چارہ چیخ رہا ہوں کہ:

پھری ہیں کل سے نگاہیں وہ ہیل میل نہیں
میں دیکھتا ہوں کہ اب ان تلوں میں تیل نہیں



www.pdfbooksfree.pk

اظہار حیدر زیدی

ہر چند ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان کے مالک ہیں۔ پھر بھی ان کی زندگی تنگی بچی پھرا کرتی ہے۔ اور دولت مند ہونے کے باوجود نہ جانے کس عاقبت اندیشی کی بنا پر افلاس کا رونا روتے رہتے ہیں۔

یہ بھی علی اختر زیدی کی طرح مطلق رند نہیں۔ پھر بھی ہماری صحبتوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اپنا حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ عقل ان کی رسا ہے۔ لیکن دین کا انگرکھا پہنے ہوئے ہیں۔ آدمی اس قدر شگفتہ رو اور شگفتہ مزاج ہیں کہ صحبت میں بیٹھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

شیخ منظور الٰہی

جب میں کراچی میں تھا تو یہ حکومت سندھ کے چیف سیکرٹری تھے۔ یہ بڑے طمطراق کا عہدہ ہے جو لوگوں کی گردن کے اعصاب کو اکڑا دیتا ہے۔ لیکن آفرین شیخ صاحب کی خاندانی شرافت پر کہ وہ ایسے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی نرمی گفتار اور اپنی خوئے انکسار پر قائم رہے۔ اب وہ ریٹائر ہو کر خاموش، مطمئن اور بشاش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا بتاؤں کن خوبیوں کا سنگم ہے ان کی ذات۔ یہ اس بلا کے سخن سنج اور اس قیامت کے نکتہ رس انسان ہیں۔ کہ ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور حافظہ اس قدر قوی ہے کہ میری بہت سی نظمیں ان کو یاد ہیں، اور اس فراٹے سے سناتے ہیں کہ حیرت ہو جاتی ہے۔ ہر چند وہ دینی ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ پھر بھی رندوں پر مہربان اور دکھیا انسانیت پر کڑھنے والے انسان ہیں۔

جس ماحول میں وہ پلے بڑھے ہیں۔ اس کا کچا پن ان میں رسا بسا ہوا ہے۔ اور جب وہ کچی باتیں کرتے ہیں۔ میری پختگی تڑپ اٹھتی ہے۔ ان کو کلیجے سے لگا لینے کے واسطے۔ اور جب میں اس مجموعہ محاسن شیخ کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہوں۔ میرا سر اس کی عظمت کے آگے جھک جاتا ہے۔ حالانکہ:

سر فن کار تو پیش خدا بھی خم نہیں ہوتا۔

مختار مسعود

غالباً وزارات صحت میں اب سیکرٹری ہیں، کراچی میں ڈبلیو، پی، آئی، ڈی، سی کے چیرمین تھے۔

سب سے پہلے میں ان کو دیکھتا تھا۔ اپنے محبوب و مقتول دوست مصطفےٰ زیدی کی کوٹھی پر۔ ہر چند وہ میرے مشغلے کا وقت تھا۔ ایسا وقت جب کہ در پر جبرائیل امین آتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر پلٹا دیے جاتے ہیں کہ:

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی

توہین خرابات نہیں ہو سکتی
جبریل امین آئے ہیں مجرے کے لئے
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

پھر بھی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری نگاہ ان کی جانب اٹھتی تو ان کے چہرے کی شعائیں دیکھ کر چونک سا اٹھتا کہ یہ کیسا چہرہ ہے۔ جو مجھ کو اس عالم سرور میں بھی اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

اور اس واقعہ کے کئی سال کے بعد جب ان کی کتاب ''آواز دوست''میری نظر سے گزری۔اور اس کے معنوی اور صوری جمال نے میرے سامنے جب نقاب الٹی ،تو یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ زیدی کی صحبت میں مختار صاحب کے چہرے نے کیوں میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

میں نے اردو کے نثر نگاروں کو بھی بغور دیکھا ہے۔اور ان کے محاسن کو پرکھا ہے۔ اور حضرت حالی ،محمد حسین آزاد، اور ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سید احمد خاں اور عبدالماجد دریا آبادی کو پڑھنے کی طرح پڑھا ہے۔اور اس بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ''آواز دوست'' کی انشاء پردازی کا رچاؤ ،طرز ،بیان کی شگفتگی ،الفاظ کا جڑاؤ، فقروں کی استخوان بندی اور اس کے لہجے کی موسیقی کا یہ تقاضا ہے کہ مختار صاحب کو درجہ اول کے انشاء پردازوں میں ایک ممتاز مقام عطا کیا جائے۔اور محمد حسین آزاد اور حالی کے دوش بدوش بٹھا دیا جائے۔

ہاں اتنی بات ضرور کھٹکتی ہے کہ ''آواز دوست''میں اس کے مصنف کا توسن قلم بار بار پھٹتا اور مڑتا ہے۔میدان قدامت وجادہ روایت کی طرف ،لیکن جب اس کے حسن بیان پر مجموعی نگاہ ڈالتا ہوں تو معاف کر دیتا ہوں اس کھٹک کو اور کہنا پڑتا ہے کہ:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اگر مختار مسعود صاحب کسی دانا و بینا ملک میں پیدا ہوئے ہوتے۔تو آج آپ کو

اپنے عہدے کی اس آب رویا فتہ کلر کی سے مجروح نہ ہونا پڑتا۔

سید مہدی نواب: فوج میں جرنل یا کرنل ہیں۔ سائنس کے شعبے میں پتھر یلے ماحول میں رہتے۔ لیکن بے حد ملائم اور ہنس مکھ انسان ہیں۔ سائنس سے تعلق رکھنے کے باوجود ادب کی نوک پلک سے واقف ہیں۔

یہ اس قدر شگفتہ مزاج ہیں کہ ایک بات کہتے ہیں اور دس بار قہقہے لگا تے ہیں۔ ان کی طبیعت میں فکر کی صلاحیت بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کو پروان چڑھانے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے باوجود یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کہ وہ قدامت کی سینکڑوں زنجیروں کو توڑ کر عقل سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ ان کی بیگم بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ جن کا وطن تہذیب کا آخرہ گہوارہ حیدر آباد دکن ہے۔ اور بریانی تو اس مزے کی پکاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ڈھائی من کھا جاؤں۔

راز مراد آبادی

ارے کس قدر پیارا آدمی ہے راز مراد آبادی۔ جب بھی وہ آجاتے ہیں۔ خون بڑھ جاتا ہے۔ اور دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ اس بلا کی محبوبیت ہے اس شخص کی ذات میں کہ بیان نہیں کرسکتا۔ جسمانی اعتبار سے تو یہ گبد، تو ندیل اور بھونپو قسم کا انسان ہے، لیکن مزاج کے اعتبار سے دھان پان ہے۔ چھمی جان ہیں۔ کیا بتاؤں کہ وہ دوستوں کو کس کھلکے اور کس مزے کے ساتھ ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں، اور کس قدر محبت کی مٹھاس ہوتی ہے ان کی گالیوں میں کہ کوئی گالیاں کھا کر جز بز نہیں ہوتا۔ شاید ان ہی کے متعلق غالب نے کہا تھا:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بد مزہ نہ ہوا۔

مگر ان کی بیگم اللہ اکبر، ان کی بیگم دس ہزار چنگیز و ہلا کو ایک طرف اور یہ تن تنہا ایک طرف۔

بے چارے راز نے ایک ہزار سال بعد ایک نرس سے دل لگالیا، اور غزلوں میں خون دل دوڑایا تھا کہ بدقسمتی سے ان کی چھری مار بیگم کو پتا چل گیا۔ پتا چلتے ہی آنکھوں میں خون اتر آیا۔اور انہوں نے اس بے چاری نرس کو اپنے گھر بلا کر اس قدر دھمکایا، اس قدر دھمکایا کہ بے چاری کی پھونک نکل گئی، اور نبضیں چھوٹ کر رہ گئیں۔ اور وہ اس قدر وحشت زدہ ہوگئی کہ اس نے میاں راز کی طرف آنکھ اٹھانا بھی چھوڑ دیا۔ اور پھر نے لگے میاں راز لغلان لغلان اور بن گئے لنڈورے اور گدگدا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عاشقانہ غزل گوئی کے میدان سے اور ان کو گرا دیا دل کے دورے نے، اور پڑ گئے جان کے لالے۔

بیوی کو اس سے کیا غرض کہ مرتا ہے شوہر مر جائے، مگر کسی اور کو پہلو میں بٹھا نے نہ پائے کیا بیاہتا عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ پیڑھی اور پلنگ کی طرح ہم اپنے شوہروں کو بھی اپنے باپ کے گھر سے جہیز کے ساتھ لائے ہیں!

اور کرو شادیاں اے آدم کے بھگوے بیٹو!

اختر و منظور

ارے کیا بتاؤں کس قدر پیارے و شیریں ہیں۔ یہ دونوں سنو لیے۔ میں نے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ایسے جڑواں بچے ہیں کہ ان کو آپریشن کر کے ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ تو پل بھر میں یہ دونوں تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ یہ دونوں وہ ہیں کہ جن کو یک جان دو قالب کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی پیشہ کرتے ہیں۔ ایک ہی روش پر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی کوٹھیاں بھی ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں کا یہ قول ہے کہ:

یارینہ حدیسیت، بتسلیم یزُ ،زد
گویند کہ ریں پیش، وفا ہم اثرے داشت

www.pdfbooksfree.pk

وہ آئیں اور منظور و اختر کو دیکھ لیں کہ اس دور میں بھی عہد عتیق کی سی داستانیں ہو سکتی ہیں۔

اختر بلا کے ذہین اور نکتہ سنج انسان ہیں۔اشارہ پاتے ہی بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔لیکن منظور بھولا بھالا ہے۔بچوں کی طرح معصوم ہے۔اللہ اس جوڑی کو قائم رکھے۔اور ان دونوں کے دیدار سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا رہے۔

میری زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ

میری طلوع ہوتی ہوئی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ تھا۔میرے باپ کا ناوقت انتقال اور میری غروب ہوتی ہوئی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے میری بیوی کا دماغی اختلال۔

لوگ مر کر بچھڑ جاتے ہیں تو کچھ دن بعد رو پیٹ کر صبر آ جاتا ہے۔مگر قیامت تو یہ ہے کہ میری بیوی جیتے جی مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔اب صبر آئے تو کیوں کر۔

ہائے۔جب میں نامرادان کے سامنے جا کر بیٹھ جاتا ہوں اور ان کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دور بہت دور، کسی گھنے جنگل کے گھپ اندھیرے میں، ایک ویران سی کٹیا ہے۔اور اس اجاڑ کٹیا میں دھندلا سا چراغ، ہوا کے جھونکوں میں جھلملا رہا ہے۔الاماں قرب میں اور اس قدر فصل۔

اس حادثہ جانکاہ نے ایک طرف تو میرے دل کی دنیا اجاڑ دی۔اور دوسری طرف میری خانگی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

بیوی کا سگھڑ پن گھر کی مشین چلا رہا تھا۔اور وہ پائی پائی کا حساب رکھتی تھیں۔ناپ تول کر باورچی کو جنس دیتی تھی اور مجال نہ تھی کہ کوئی تنکا ادھر سے ادھر ہو جائے۔

اب یہ آسمان مجھ پھوہڑ کے سر پر ٹوٹ چکا ہے۔جس کو خانہ داری تو بڑی چیز ہے۔نئے پیسے تک گننا نہیں آتا۔اور صرف دس روپلی کا حساب لیتا ہوں تو لوہے لگ جاتے ہیں،اور میزان ٹھیک نہیں بیٹھتی۔

روپیہ پیسہ میں اپنے پاس کبھی نہیں رکھتا تھا۔اوراب بٹوے میں ڈالے ڈالے پھرا کرتا ہوں، بٹوا نکال کر بار بار رقم گنتا ہوں اور پھر بھول جاتا ہوں۔

بٹوا میری جیب میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔گویا شیطان کے گلے میں لعنت کا طوق پڑا ہو۔یا گدھے کی دم میں نمدا بندھا ہو۔

ہائے میری بیوی کس چاؤ سے میں لایا تھا تمہارا ڈولا اپنے گھر۔اوراب یہ عالم ہے کہ میں پکارتا ہوں اورتم جواب نہیں دیتیں۔اورآنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھتی رہتی ہو۔

ہائے وہ بھی ایک دورتھا کہ تم پل بھر میری جدائی برداشت نہیں کرسکتی تھیں یعنی۔

میں کسی بات پر دم بھر بھی اگر غور کروں
اتنی دوری بھی نہ ہوتی تھی گوارا تم کو

اور، جب میں کسی مسئلے پر غورکرنے لگتا تھا، میری وہ ذرا سی خاموشی تمہاری طبع نازک پرگراں گزرتی، اورتم پوچھ بیٹھا کرتی تھیں۔کس کو یاد کررہے ہو؟۔اور میں فریاد کیا کرتا تھا کہ:

وہ مجھے سوچنے نہیں دیتیں
کوئی حد بھی ہے بد گمانی کی

بولو، بولو اے میری کھوئی ہوئی بیوی بولو۔

دل نے بخشا تھا، تقاضائے زلیخا تم کو
یاد ہے وہ خلش عہد تمنا، تم کو

اورحیف صد حیف کہ تم اپنی بیٹی کے ساتھ کراچی میں رہتی ہواور میں تم سے کالے کوسوں دوراسلام آباد میں رہتا ہوں۔اورکراچی جا کر جب میں تم سے ملتا ہوں، تم مجھ کو اس طرح دیکھتی ہو، جیسے یاد آرہی کوئی کھوئی ہوئی چیز۔

نہ جانے کون سی کھوئی ہوئی شے یاد آتی ہے
ہوا جب سرد چلتی ہے کلیجہ تھام لیتے ہیں

سنتا ہوں میری یاد کبھی کبھی تمہارے دل میں جاگ اٹھتی ہے۔اور تم راتوں کو اٹھ اٹھ کر، سارے گھر میں مجھ کو ڈھونڈ تی پھرتی ہو۔اور تمہارا عالم یہ ہو جاتا ہے کہ:

خلوت کدے میں اپنے، کبھی کے جو ہم گئے
آنسو ٹپک پڑے در ودیوار دیکھ کر

ہائے میری اشرف جہان، میں قربان تمہاری اس اداسی پر۔ہائے تمہاری یہ تصویر جو نواسے کی شادی پر کھینچی گئی تھی۔ میں نے دیکھی، خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں میرے دل سے۔

ہائے ہائے تم کیسی کھوئی کھوئی سی بیٹھی ہو، میری پیاری اشرف جہاں۔

ارے میری اشرف جہاں، تمہاری اس زبودگی کو دیکھ کر کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔اے موت، اے موت، آ، اور مجھ کو اندھیری قبر میں سلا دے۔

میری زندگی کا ناقابل یقین حد تک حیرت ناک واقعہ:

اگر یہ واقعہ خود مجھ پر نہ بیت چکا ہوتا، تو روئے زمین کے تمام اولیائے نکوکار اور اقطاب راست گفتار بھی، اگر اپنی اپنی آسمانی کتابوں کو سروں پر رکھ رکھ کر، مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ اس عجیب دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی دوشیزہ، کسی عمر رسیدہ سے محبت کرنے لگے، پھر بھی مجھ کو یقین نہ آتا، ہرگز یقین نہ آتا۔اور میں یہی کہتا رہتا کہ ہر چیز فطرت انسانی کے خلاف اور سراسر خلاف ہے۔

لیکن اس خرق عادت قسم کے واقعے کے معرض تحریر میں لانے سے پیشتر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کا پس منظر بیان کر دوں تا کہ آپ کی سمجھ میں آ جائے۔کہ اس وقت میرا ذہن کس منزل کی طرف سفر کر رہا تھا اور کس غیر معمول حملے کی وساطت سے میری کایا پلٹ دی گئی ہے۔

سو، بندہ پرور، اس وقت میرا یہ عالم تھا کہ عشق سے توبہ کر کے میں سقراط کے مکتب میں داخل ہو چکا تھا، اور اپنے دیرینہ معاشقوں کو یاد کر کے ان پر قہقہے مارا کرتا تھا۔

میرے طاق وجود میں ذہنی تقویٰ کی شمع روشن ہو چکی تھی ۔اور میں عشق بیزار و حسن پرستار۔زندگی بسر کر رہا تھا۔علم اوڑھنا تھا اور تفکر بچھونا۔

وائے قسمت کہ میری شاعری دیوی نے جب میری یہ سنجیدگی اور میری یہ ٹھنڈک سیلک دیکھی تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگی ۔اور مجھ کو فکر کے پانی میں تا کمر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اف یہ شاعری یہ بلائے بے درماں شاعری۔الامان والحفیظ۔یہ اچھال چھکا ،اودھ ماتی ، بلبلاتی ، یہ تتلیوں کے پیچھے دوڑنے والی۔ یہ چندریوں اور مندریوں کی شیدائی ۔یہ چمپا کے ہاروں اور چنچل تاروں کی تمنائی ،یہ نرم بانہوں اور گرم بوسوں پر جان چھڑکنے والی شاعری۔

اس چٹاخ ،پٹاخ ،چٹوری ،چنچل ،چلبلی ،چت چور ،چھلاوا ،چھم چھماتی ،چونچلے باز ،چھچھتیسی اور چربانک چھوکری کو میری یہ خاموشی اور سنجیدگی ایک آنکھ بھی نہ بھائی اور ناک پر انگلی رکھ کر اس نے مجھ سے کہا۔اٹھ بڑا مگڈ ڈمبر بنا بیٹھا ہے۔۔افوہ ۔اوئی ،اس طرح ،آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھنے سے شرم نہیں آتی ؟۔۔اے گم سم جوش ،میری طرف دیکھ ،تجھ کو نو برس کی عمر سے گود لے کر میں نے پالا ،پوسا اور پروان چڑھایا ،اور شہرت کی اس بلندی تک پہنچا دیا کہ آج دنیا کی آنکھیں پڑ رہی ہیں تجھ پر ۔لیکن تو نے میرے خدمات بھلا دیئے ،اے نمک حرام کلموئی کتابوں سے رشتہ جوڑ لیا اور چاند سے مکھڑوں سے منہ موڑ لیا۔

تو سہی ، بچا جی ،اب ایسی ہنستی بولتی ،مدھو ماتی گڑیا ،اٹھا کر تیرے سر پر ماروں گی کہ بھیجا نکل کر رہ جائے گا تیرا۔اور تگنی کا ناچ ناچتا پھرے گا گلی گلی ۔مو ہے گروا لگا لے۔

۔۔۔میں جانتی ہوں کہ تو عقل کا رسیا ہے ۔اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر میں تجھ پر ایسی گڑیا نازل کر دوں گی ،جو حسن کے ساتھ ساتھ مجسم عقل بھی ہو گی ۔مجھے معلوم ہے

کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔اس کی پہلی نظر ہی تجھ کو کاٹ کر رکھ دے گی۔دھڑام سے گر پڑے گا تیری عقل کا قلعہ۔اور چھوٹ کر رہ جائیں گی نبضیں تیری دانش مندی کی۔

۱میرا دل گواہی دے رہا ہے۔وہ دل جو جھوٹی گواہی کبھی نہیں دیتا کہ مدبر الص وآفاق نے (خواہ وہ کوئی بھی ہو، یا کچھ بھی ہو) مجھ کو اس عذاب جمیل میں اس نیت سے مبتلا کر دیا ہے کہ بیوی کے دماغی اختلال کا بے پایاں قلق، مجھ کو قبل از وقت موت کے گھاٹ نہ اتار سکے۔

اور کچھ مشق ستم کی ہے تمنا شاید
ہم کو اے موت کی مشکل سے بچانے والے

شاعری کی یہ دھمکی سن کر زمین نکل گئی میرے پاؤں کے نیچے سے۔اور کچھ ایسا ہول سمایا کہ بھاگ کھڑا ہوا کوہ مری کی طرف اور اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مری کوئی ایسا محفوظ اور رکیلا ہوا قلعہ نہیں ہے۔جہاں شاعری کی ناگن پہنچ نہیں سکتی ہے۔

مری پہنچے ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ میرا تعاقب کرنے والی شعر دیوی اپنی گڑیا اٹھائے وہاں پہنچ گئی۔اور میں تھرا کر چیخنے لگا کہ:

بدور گردی من۔ از غرور می خندد
حریف سخت کمانے۔کہ در کمین دارم

اب سن لیجئے کہ کہ یہ ہوا کیوں کر؟۔

میرے مری پہنچنے کے تیسرے روز چند ادب پرست نوجوان آئے اور کہا کہ ہم آپ کے ساتھ،ایک شام مع کلام وجام ،منانا چاہتے ہیں۔آپ ہماری دوخواست قبول فرمالیں۔مرتا کیا نہ کرتا۔قبول کر لی میں نے وہ درخواست اور دوسرے دن پہنچ گیا اس بزم سخن میں،وہ مختصری نشست (چالیس پچاس افراد پر مشتمل تھی۔) جس میں تین لڑکیاں بھی ایک گوشے میں دبکی بیٹھی تھیں۔اوران میں سے بیچ والی لڑکی الامان والحفیظ،خطرناک حد تک حسین تھی اور جمال کے ساتھ ساتھ اس کے خدوخال سے غیر

www.pdfbooksfree.pk

معمولی ذہانت کی شعائیں بھی پھوٹ رہی تھیں۔

میں نے دل ہی دل میں کہا، وہ مارا اور بیٹھ گیا تیر نشانے پر۔ اتنے میں میری عقل آنکھیں نکال کر میرے سامنے آ گئی۔ اور کہنے لگی، جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ اے جوش اس خون خوار لڑکی سے ہوشیار۔ اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جا۔ اگر جان پیاری ہے تو اب دوبارہ اس کی جانب نظر نہ اٹھا۔ تو اب کوئی لونڈ الڈیا نہیں کہ حسن کے چٹوں بٹوں سے کھیلنے بیٹھ جائے۔ دیکھ اگر میری بات نہ مانی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

چنانچہ اس ڈاکو لونڈیا کی طرف پشت کر کے بیٹھ گیا۔ اور دل میں قسم کھالی کہ اب اسکی طرف نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ مر جاؤں گا مگر اس کو دیکھنے کا ارتکاب نہیں کروں گا۔

ابھی شعر خوانی کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ کسی صاحب نے جبر وقدر کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اور گرما گرم بحث ہونے لگی۔ اسی اثناء میں ایسا محسوس ہوا کہ میری پشت پر چاندی کی سی گھنٹی بجنے لگی، اور جب میں نے یکا یک مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی خطرناک لڑکی یہ کہہ رہی ہے کہ آپ لوگ جو کچھ چاہیں کہیں میں تو انسان کو بالکل مجبور سمجھتی ہوں، بالکل مجبور" کچھ ایسے جھٹکے اور کھٹکے سے کہا کہ اس کا لہجہ میرے سینے میں چبھ کر ٹوٹ گیا۔

ایک صاحب نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا، ہم قطعی مجبور نہیں بلکہ ہم کو اس قدر اختیار حاصل ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر اس لڑکی نے کہا، میں بھی یہی کہتی ہوں کہ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ چاہنا اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ تو وہی چاہے گا جو اس کی فطرت کا حکم ہوگا۔ اور ہماری یہ مجال نہیں کہ ہم اپنی فطرت اور تانے بانے کے خلاف کوئی چیز چاہ سکیں۔

اس لونڈیا کی ذہانت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے دل میں کہا، اس قدر کم سنی اور اتنی گہری نظر، اور معاً یاد آ گئی شعر دیوی کی یہ بات کہ" میں تجھ پر ایسی گڑیا نازل کروں گی کہ جو حسن کے ساتھ ساتھ مجسم عقل بھی ہوگی۔ خوف کے مارے میرے بدن

کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اس نا تمام مباحثہ کے بعد چائے آ گئی۔اور چائے کے بعد شعر خوانی کا آغاز ہو گیا۔اور جب ایک ایک کر کے تمام شعراء پڑھ چکے تو میری باری آئی اور میری باری آتے ہی،وہ لڑکی جس کو اب میں ''فتنہ آخرالزمان'' کے نام سے یاد کروں گا،اپنی جگہ سے اٹھی اور عین میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔اور میرے کان میں آواز آئی،اب کہاں بھاگ کر جاؤ گے حضرت جوش۔۔اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آنکھیں نیچی کر لیں۔

ہر چند کہ میرے اشعار سن کر اس نے بلند آواز سے مجھ کو داد نہیں دی۔لیکن وہ ایسی نرمی کے ساتھ جھومتی رہی کہ جیسے جھٹپٹے کے وقت ندی ٹھہر ٹھہر کر بہتی ہے۔اور ساحل سے کسی کی آواز آتی ہے۔

''مورا،سیاں،اترے گا اس پار،ندیا دھیرے بہو''

اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے اشعار اس کی انکھڑیوں میں جھولے کھا رہے تھے۔اور جب میں کلام سنا چکا تو وہ کھسک کر اور بھی میرے قریب آ گئی۔انار سے چھوٹنے لگے میرے خون میں اور اترنے لگی اس کی سانس کی برچھی میرے سینے میں۔اور جب اس نے میرے ہوٹل اور میرے کمرے کا نمبر پوچھا تو میرے دماغ نے حکم دیا کہ اس سے کہہ دے کہ میں صبح چار بجے پنڈی جا رہا ہوں۔اس لئے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتانا بے سود ہے۔لیکن اس آن میرے دل نے چلا کر کہا،جھوٹ نہ بولنا۔جھوٹے کا منہ کالا۔

میں نے دل کی بات مان لی،اور نام اور نمبر بتا دیا۔نام اور نمبر سن کر وہ آداب کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔اور ایک خوف ناک ویراں مہک عطا کرتی گئی۔اس کے چلے جانے کے بعد میرے دماغ نے بھنا کر میرے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا۔اور میرے دل نے مسکرا کر چٹاخ سے میرا منہ چوم لیا۔اور میں ہوٹل پہنچ کر دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔اور شور انگیز آندھیاں چلنے لگیں،اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح

اڑنے لگے۔ جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔ اس کے دوسرے دن قیلولہ کرنے کو لیٹا ہوا تھا۔ کہ کسی نے آہستگی کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا۔ جھن سے ہو کر رہ گئے میرے تمام رونگٹے، میں نے کہا آجایئے اندر، اتنے میں چر سے دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ وہی فتنہ آخر الزمان، بڑے جنچے تلے قدموں کے ساتھ میری طرف بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اور ایسے تیوروں سے کہ گویا محمود فتح سومنات پر تل کر آگیا ہے۔ اور کچھار میں پڑے بے کس شیر کی طرف شکاری بندوق چھتیا رہا ہے۔ آتے ہی اس نے کہا آداب عرض۔ (ہائے کلائی کا لوچ لکھنویا دآ گیا) میں نے اشارہ کیا صوفے کی طرف، لیکن میرے اشارے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ آئی اور آکر میرے پائینتی بیٹھ گئی اور جیسے ہی میں نے چاہا کہ پاؤں کھینچ لوں، اس نے اپنی ملائم اور گرم ہتھیلیوں سے میرے دونوں گھٹنے پکڑ کر کہا نہیں نہیں، آپ آرام سے لیٹے رہیئے۔ اور اسکی گرم ہتھیلیوں کا رس میرے خون میں کھدبدانے لگا۔

اس نے بڑی شکایت کے لہجے میں کہا، اللہ جوش صاحب آپ کس قدر بے نیاز ہیں کہ اب تک مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا۔ لیجیے میں بے غیرت بن کر بتاتی ہوں کہ میرا نام ــــــ اور میرے باپ کا نام ــــــ ہے۔ میرے ابا پشاور میں بیرسٹری کرتے ہیں، اور میری اماں جان اللہ اللہ کرتی رہتی ہیں۔ اپنی ایک سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے آپ کا سارا کلام یاد ہے۔ ''یادوں کی بارات'' بھی پڑھی ہے۔ تھرڈ ایر میں پڑھتی ہوں اور میرا مضمون ہے فلسفہ اور فارسی ادب۔ پیدا ہوئی ہوں ملتان میں، مگر آبائی وطن ہے لکھنو۔

اس نے یہ کہہ کر کہ لیجیے میں نے اپنا سارا حال، ایک سانس میں بیان کر دیا۔ میری طرف اس انداز سے آنکھیں اٹھائیں، جس طرح کوئی خریدار مال کو آنکتا ہے۔ اور میں نے ڈر کر آنکھیں میچ لیں، میری اس ادائے تحمل کو دیکھ کر اس نے کہا۔ جوش صاحب آنکھیں اٹھایئے۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں۔ اس نے غمگین ہو کر گردن جھکا

www.pdfbooksfree.pk

لی اور کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

میں نے ذرا ٹھہر کر کہا، صاحب زادی گردن جھکا کر چپ کیوں سادھ لی۔سر سے کھیلو، منہ سے بولو۔ یہ سنا تو بڑے ہی غمگین و شکوہ آمیز لہجے میں اس نے کہا اللہ، اتنا فلسفی بھی ہو کر نہ رہ جائے کوئی، میں آپ کے پاس اس شوق سے آئی اور آپ نے شاعر کی نظر سے میری طرف نگاہ نہیں اٹھائی، کس کام کی ایسی رکھائی۔حالانکہ مجھ کو آپ سے بہت۔۔۔آپ سے بہت۔۔۔سنا تو میں نے بے ساختہ اس کی بات کاٹ کر کہا، صاحب زادی کیا تم کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ میری اور تمہاری عمر میں فرق ہے زمین و آسمان کا۔تم نام خدا طلوع ہو رہی ہو۔اور میں غروب ہونے کے قریب ہوں۔تم مجھ سے عقیدت تو رکھ سکتی ہو۔مگر محبت نہیں کر سکتی۔کیا تم میری بگڑی صورت اور گلے کی، بیل کی سی لٹکی ہوئی کھال نہیں دیکھ رہی ہو۔اس نے پھریری لے کر کہا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی صورت قطعی بگڑی ہوئی نہیں ہے۔بلکہ آپ کے چہرے پر کمال کا پیدا کردہ حسن دمک رہا ہے۔دوسرے یہ کہ میں محبت کے معاملے میں آنکھوں کو دخل نہیں دینے دیتی۔میں حسین صورت کو نہیں، حسین ذہن کو پوجتی ہوں۔اور آپ کے پاس وہ حسین ذہن ہے جس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔

اس کی مدلل باتیں سن کر میں چکرا گیا۔اور دل ہی دل میں کہنے لگا، جوش صاحب ہوشیار، حملہ بے حد شدید ہے۔دیکھ عقل کی ناک کہیں جڑ سے کٹ کر نہ رہ جائے۔اور ذہنی تقویٰ کی یہ شمع گل ہو کر دھواں نہ دینے لگے۔یہ سوچ کر میرا سر جھک گیا اور زمین میرے پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی۔کہ اتنے میں ہچکیوں کی آواز نے مجھ کو چونکا دیا، بلکہ بوکھلا دیا۔میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور ایسی نگاہ جس میں دل دھڑک رہا تھا اور آنکھیں چار ہوتے ہی اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔

تری طرح کوئی تیغ نظر کو تاب تو دے

www.pdfbooksfree.pk

یہ تلاطم دیکھ کر، میرا فلسفی مر گیا اور میرا شاعر جی اٹھا۔ میں نے پھر تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کو خوب بھینچ کر کلیجے سے لگا لیا۔ اور ڈھل ڈھل بہنے لگے میرے آنسو بھی۔

میرے آنسو دیکھے تو اس فتنۂ آخر الزمان کے مکھڑے پر شادابی آ گئی۔ اور گونجنے لگیں شعر دیوی کے شادیانوں کی صدائیں آسمانوں پر۔۔ اور اٹھ گیا میری حکمت کا جنازہ۔

بلند و بالا، ماہ رخے، سرو ناز من
کوتاہ کرد، قصہ زہد دراز من۔۔ انا

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

بندہ پرور، سن لی آپ نے میری بپتا؟۔ اور دیکھ لیا انجام آپ نے میرے تفکر کا؟۔ ایک مرد خرافات کی طرح مجھ پر قہقہے لگائیں یا ایک ماہر نفسیات کی مانند مجھ پر آنسو بہائیں۔ بہر حال جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ شاعری جیتی اور فکر ہار گئی۔

اب تو یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کاش میں دنیا کا خبیث ترین اور ملعون ترین آدمی ہوتا۔ مگر شاعر نہ ہوتا۔ میرے سوا کسی کو اس پورے کرہ ارض پر اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ عقل کی خوابیدگی، عشق کی بیداری، اضطراب کی خلعت پوشی، تمکین کی برہنگی، قلم کی نوحہ گری، تیشے کی نغمہ سرائی، دماغ کی شکست اور دل کی فتح مندی، کس قدر ہولناک و عبرت انگیز سانحہ ہے۔ اقلیم تامل کا۔

ارے کس سے جا کر فریاد کروں میں سوختہ بخت کہ:

دل کا طوفان دماغ تک پہنچا
گھپ اندھیرا چراغ تک پہنچا

ہاں اے فرشتو، اے دیوتاؤ، اور اے دھرتی کے داناؤ

دوڑو کہ سر جوش نگوں سار ہوا ہے
نقاش جہاں نقش بدبودار ہوا ہے

فریاد کہ خورشید کا ممدوح گرامی

ذروں کی ملامت کا سزاوار ہوا ہے

افسوس کہ اک ناقد سیار وثوابت

خال وکد وافشاں میں گرفتار ہوا ہے

فریاد کہ خود وارث لقمان ومسیحا

اک نرگس شب رنگ کا بیمار ہوا ہے

ہیہات کہ اک مشتری سدرہ وطوبیٰ

جنس قد وگیسو کا خریدار ہوا ہے

صد حیف کہ اک دین تفکر کا پیمبر

آلودہ کفر لب و رخسار ہوا ہے

اے وائے کہ دل کے افق عید پہ اے جوش

پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے

اور کچھ ادھر کا حال بھی سن لیجیے

حسن افسردہ وحیران ہے خدا خیر کرے

نوک مژگاں پہ چراغاں ہے خدا خیر کرے

سطح عارض کی، دھڑکتی ہوئی رنگینی سے

دل کی مہر ضرب نمایاں ہے خدا خیر کرے

خیمہ زمزمہ و حجلہ عود ونے میں

گریہء گوشہ نشیناں ہے خدا خیر کرے

بے نیازی سے میری ناز شباب نو خیز

بیعت عشوہ کا خواہاں ہے خدا خیر کرے

ایک گل طبع وگہر طینت وشب نم اندام

www.pdfbooksfree.pk

سرخ شعلوں پہ خراماں ہے خدا خیر کرے

کل فقط دامن بلبل تھا، ہوا پر غلطاں

آج گل چاک گریباں ہے خدا خیر کرے

اور میری اس نظم سے اندازہ لگایئے کہ کم بخت شاعر کی ناقابل اعتماد فطرت کا (اللہ آدمی کو لولو بنا کر گدھے پر چڑھائے، لیکن شاعر نہ بنائے۔)

اکیس برس کے بعد بارے

پلکوں پہ دمک رہے ہیں تارے

یخ میں ہے تپ شرر فشانی

انیسویں ہے یہ نوحہ خوانی

غلطاں ہے جگر میں پھر کٹاری

نیندیں ہلکی ہیں، رات بھاری

کل، غرق مآل جہاں تھا

گرم تحقیق ایں و آں تھا

اندیشہ تھا اوڑھنا بچھونا

عورت کا وجود تھا کھلونا

منطق کا حصار پیش و پس تھا

برہان بدوش ہر نفس تھا

تطہیر قیاس ہو رہی تھی

تہذیب حواس ہو رہی تھی

ہر ذرہ نکھر ابھر رہا تھا

قرآن شعور اتر رہا تھا

لرزاں تھی صفات کی عماری

زد پر تھا وجود ذات باری

اور آج شکستہ حال ہوں میں

دیوانہ خد وخال ہوں میں

دل کی ہے دماغ پر حکومت

ظلمت کی چراغ پر حکومت

اس سے پیشتر اٹھارہ معاشقے ہو چکے ہیں۔

مجھ سے یہ دماغ کہہ رہا ہے

حضرت کیوں چپ ہیں بات کیا ہے؟

دل کیوں ہے لہو لہان صاحب

کیسا ہے مزاج خان صاحب

مولی کس سے کہوں یہ دکھڑا

کس کا پیش نظر ہے مکھڑا

اک عمر کے بعد پھر جگر میں

کس نے اتار دی ہیں یہ آنکھیں

کس نے مجھ کو ڈبو دیا ہے

مکھڑا دل میں چبھو دیا ہے

حکمت ششدر کھڑی ہوئی ہے

پتھر میں انی گڑی ہوئی ہے

سن لو اے داوران عالم

اے خیل مفکران اعظم

شاعر کتنا ہی منطقی ہو

www.pdfbooksfree.pk

کتنا ہی عظیم فلسفی ہو
جب بھی پرواہ چلے گی سن سن
اس کا پلٹ آئے گا لڑکپن
آمادہ صد فساد ہے یہ
ناقابل اعتماد ہے یہ
پاتا ہے جو حسن میں تغافل
جھکتا ہے یہ جانب تامل
پاتا نہیں جب یہ زلف کی چھاؤں
بڑھتا ہے سوئے خرد دبے پاؤں
لیکن کوئی گل رخ و سمن، بر
کرتی ہے جب التفات اس پر
پھر توڑ کے فلسفے سے ناتا
پھرتا ہے یہ سیٹیاں بجاتا
رہتا ہے یہ عمر بھر کھلنڈرا
اس کو پچتا نہیں بڑھاپا
شاعر ہے جمال کا پجاری
اے عقل غلط ہے اس سے یاری
گنج گیسو چمن ہے اس کا
روئے خوباں وطن ہے اس کا
جذبات کا ہے یہ گماشتہ
حکمت فقط اس کی داشتہ
اے عقل نہ خود کو خوار کرنا

www.pdfbooksfree.pk

شاعر پہ نہ اعتبار کرنا
جب حسن کرے گا عشوہ کاری
اس وقت بصد ہزار خواری
تجھ سے اے مادر گرامی
کر جائے گا یہ نمک حرامی

اب میں اپنی انوکھی نظم پیش کر رہا ہوں، جس کی دنیائے شاعری میں کوئی نظیر ہی نہیں ملتی اور میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جب سے اس کرہ ارض پر شاعری کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج کی تاریخ تک کا ایک مصرع بھی دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں بھی نہیں کہا گیا تھا۔ یقین فرمایئے کہ میں اس دعویٰ کے پردے میں تمام شعراء عالم پر اپنی فوقیت اور افضلیت کا اظہار نہیں کر رہا ہوں۔ اور اس کے برخلاف میرا خیال ہے کہ اگر ان شعرائے کرام کو بھی میری ہی طرح اس پختگی عمر میں حسن کے ایسے شدید حملے سے دو چار ہونا پڑتا تو وہ میری اس نظم سے بمراحل بلند تر نظمیں کہتے۔ اور اس نوعیت کی نظموں کے ہر طرف انبار لگے ہوتے۔

سنتا ہوں عظیم شاعر گوئٹے اسی برس کی عمر میں اس طوفان سے دو چار رہا تھا۔ لیکن صد حیف کہ کوئی نظم نہ کہہ سکا۔ ہاں تو ملاحظہ فرمایئے۔

تقاضائے سردمہری

مجھے آزاد کر کے، پر کشائی کیوں نہیں کرتیں
جو دل کو توڑ دے وہ کج ادائی کیوں نہیں کرتیں
بچھا دوں بوریا پھر جا کے اپنے شہر حکمت میں
کبھی مجھ سے تم ایسی بے وفائی کیوں نہیں کرتیں
قلم ہو جائے سر ہیجان وصل وسعی قربت کا
رواں یوں خنجر طول جدائی کیوں نہیں کرتیں

www.pdfbooksfree.pk

مری رخصت کے حسرت کیز لمحوں کے تلاطم میں
جدا آنکھوں سے تم اپنی ولائی کیوں نہیں کرتیں
شکن جوڑال دے میرے غرور فن کے ماتھے پر
کبھی اتنی اہانت سے رکھائی کیوں نہیں کرتیں
حسینوں سے بغاوت کا جو دل کو درس دیتی ہے
مری سرکار وہ بے اعتنائی کیوں نہیں کرتیں
جکڑ رکھا ہے مرا دل وفاؤں کے شکنجے میں
جفا کر کے میری مشکل کشائی کیوں نہیں کرتیں
مری دانائی ہے شرک محبت کی تمنائی
مری دانائی کی حاجت روائی کیوں نہیں کرتیں
برائی میں تمہاری جوش کے دل کی بھلائی ہے
بھلائی ترک فرما کر برائی کیوں نہیں کرتیں

اب لگے ہاتھوں چند رباعیاں، فتنۂ آخر الزمان کے لب ہائے شیریں سے بھی سن لیجیے۔

روتی ہوئی راتوں کو ہنساؤں کیوں کر
روٹھی ہوئی نیندوں کو مناؤں کیوں کر
کل کیا تھی، اور آج بن چکی ہوں کیسی
یہ گھاؤ کلیجے کا دکھاؤں کیوں کر

چھلنی طعنوں سے پھر کلیجہ ہوگا
منہ پھر میرا تھپڑوں سے نیلا ہوگا
اس پوچھنے پر ''اداس کیوں ہے بیٹی''

www.pdfbooksfree.pk

میری آنکھیں بھر آئیں اب کیا ہوگا

ہر بات نہ جانے کیوں بری لگتی ہے
مخمل کی بھی سیج کھردری لگتی ہے
اب سانس بھی لیتی ہوں جو گھری سرشام
تو کچھ سے کلیجے پہ چھری لگتی ہے

کس کو سمجھاؤں روگ اپنے جی کا
ماتھے کا بجھا پڑا ہے ٹیکا
اب تو چھاتی سلگ رہی ہے ایسی
پنڈا رہنے لگا ہے میرا پھیکا

ماں کہتی ہے کس غم میں گھلا کرتی ہے
کس آگ میں دن رات تپا کرتی ہے
یہ دن تو ہیں کھیل کود کے نام خدا
اور تو ہے کہ گم سم سی رہا کرتی ہے

سارے گھر کی ہے مجھ نگوڑی پہ نگاہ
صبحیں ویران ہیں تو شامیں ہیں تباہ
اف پیت مسافر کی بری ہوتی ہے
گم سم نہ رہوں تو کیا کروں، اللہ

بے چین کو چاند رات بھا جائے کیسے
روتی ہوئی رات گنگنائے کیسے
کھدبد کھدبد جو پک رہی ہو چھاتی میں
آنکھوں میں، نگوڑی نیند آئے کیسے

پھر دل کو مرے توڑ کر نکلے گی کراہ
پاپی تاروں میں ڈوب جائے گی نگاہ
جس کے ڈر سے لگے تھے ہنکھے دل میں
وہ کلموئی رات آگئی پھر سے، اللہ

کیا میں نے، ارے حرام خوری کی ہے؟
ڈاکا ڈالا ہے، سینہ زوری کی ہے؟
میں پوچھ رہا ہوں۔ دل دیا ہے اپنا
یا، میں نے کسی کے گھر چوری کی ہے؟

اللہ، میں اب شعر کہوں تو، کیوں کر
اتنی ہے گھٹن کہ زندگی ہے دوبھر
چلتا ہے مرا قلم تو اماں جانی
کہتی ہیں علی کی تیغ ٹوٹے تجھ پر

ہر بات کو میری ناروا کہتی ہیں
مجھ کو چڑ بانک " برملا کہتی ہیں

اماں ہی پر یہ بات نہیں موقوف
باجی بھی، اکیلے میں برا کہتی ہیں

مانو، ہاں، میری بے گناہی اماں
کس سے دلواؤں میں گواہی اماں
کیا پوچھتی ہو"ارے یہ آنسو کیسے"
ائی تھی مجھے ابھی جمائی اماں

رم جھم ،رم جھم سی ہو رہی ہے ہلکان
پاپی برکھا اڑا رہی ہے اوسان
باجی اس بولتی گھٹا میں باجی
للہ، الہٹوں کی نہ کڑکاؤ کمان

سنتی ہوں میں ہر آن نئ صلواتیں
گونگے دن ہیں تو مرے اندھی راتیں
اماں کہتی ہیں۔ جوش صاحب کے حضور
کرنے لگتی ہیں، تیری آنکھیں باتیں

اللہ رے آنسو، ہوئے پھوٹے بھاری
کس نے چھاتی پر، اف چلا دی آری
پروا میں، ارے یہ نام کس کا سنکا
کس نے کلیجے پہ کٹاری ماری؟

www.pdfbooksfree.pk

بس ختم ہوئی مجھ بد بخت کی داستان ۔صد حیف کہ یہ تیسرا ایڈیشن بھی محبت کی داستان ہی پر ختم ہورہا ہے۔ یہ دور تو ان باتوں کا نہیں تھا۔پھر بھی کیا کیا جائے ۔کس کی مجال ہے کہ جبر قدرت کا مقابلہ کر سکے۔

اگر خدا نخواستہ ،کچھ اور جیا تو مزید حالات سناؤں گا۔ورنہ ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو جاؤں گا۔۔اور میری ابدی خاموشی سے ہزاروں داستان برستی رہیں گی۔

جوش

۲۰۔۱۰۔۱۹۷۴ سہ پہر

اسلام آباد

اختتام_______________ The End

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006